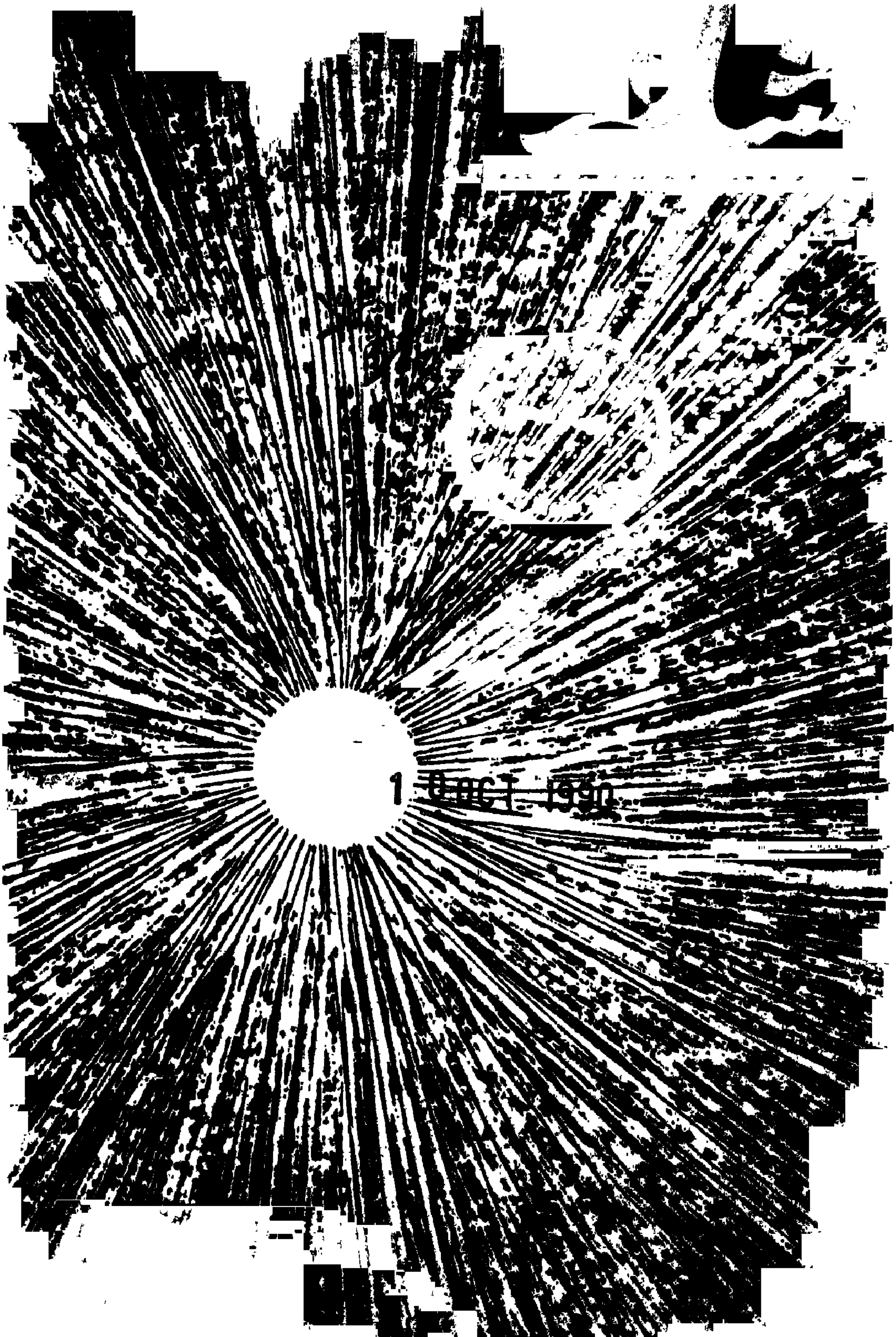




پ: ۱۲۱۵ھ
۱۸۰۰ء

مومنؔ دہلوی

م: ۱۲۶۸ھ
۱۸۵۲ء

گرفتگی ہے بیاں میں، زباں میں سوز و گداز
تری طرح سے کوئی شاعر ہوا نہ زمزمہ ساز
ترا کلام ہے اک سیلِ قلزمِ اسرار
ملا نہ ہائے ابھی تک کسی کو یہ انداز

[illegible] تخلص مومن۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں [illegible] دہلی میں پیدا ہوئے۔ پیدائش کے وقت شاہ [illegible] نے کان میں اذان دی اور نام رکھا۔ گھر والوں نے حبیب اللہ [illegible] صاحب کا تجویز کردہ نام ہی مقبول ہوا۔ [illegible] عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ شاہ [illegible]

ان کے فرزند محمد نصیر اور صاحب زادی عزیز بیگم ہیں۔ مومن کی بیٹی محمدی بیگم [م: ۱۲۹۲ھ] ہوشیار تھیں۔ ان کی اولاد میں سید ناصر حبیب اور [illegible] صاحب زادی کنیز فاطمہ قابلِ ذکر ہیں۔

شاعری کی ابتدا میں شاہ نصیر [م: ۱۲۵۴ھ] سے اصلاح لی پھر یہ سلسلہ ترک کر دیا۔ اردو کے باکمال شعرا میں مومن کا شمار ہوتا ہے۔ فارسی نظم و نثر پر یکساں قدرت تھی۔ [illegible] اپنے مکان کی مرمت کرواتے ہوئے چھت سے نیچے گر [illegible] اور پانچ ماہ بعد مئی ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔ [illegible] کے قبرستان [دہلی] میں وصیت کے مطابق دفن کیا گیا۔

کلیاتِ مومن کی روایات

مخطوطات ○ [illegible] لائبریری ○ [illegible] ○ [illegible]

اس [illegible] دیباچہ بھی تحریر کیا تھا [illegible] عبدالرحمٰن آہی [خلف میر حسین تسکین] [illegible] انھیں سنایا تھا [illegible] کلیاتِ مومن [illegible]

کلیاتِ مومن [اردو] ○ [illegible] ۱۲۹۳ھ / ۱۸۶۹ء ○ طبع سوم [illegible] [دسمبر [illegible]]

کلیاتِ مومن [فارسی] ○ [illegible] مطبوعہ رمضان [illegible]

انشائے مومن ○ مرتبہ: [illegible]

قصائدِ مومن ○ [illegible]

[illegible]

فکرِ امروز

اردو کا جنم ہی سیاست کی آغوش میں ہوا ہے۔ لفظ اردو کے معنی اور مفہوم ہی سے ثابت ہے کہ یہ لشکریوں کی زبان ہے جو اسلامی سیاست کے حقیقی مہرے تھے۔ یہی سبب ہے کہ اردو، سیاست کا اکثر و بیشتر شکار رہی۔ سیاسی پالیسیوں نے اردو ادب کی تخلیقی قوتوں پر بہت برا اثر ڈالا۔ ادب اردو کی قدیم تاریخ اس کی شہادت میں پیش کی جا سکتی ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ادب، زوال پذیر قوموں میں ترقی پاتا ہے۔ اور ترقی پذیر قومیں ادب کی طرف مائل نہیں ہوتیں۔ اس خیال میں صرف لفظی تغیر کی ضرورت ہے۔ یہ سچ ہے کہ ادب، زوال پذیر قوموں میں ترقی پاتا ہے لیکن ترقی پذیر قومیں ادب کی طرف مائل ہوتی نہیں بلکہ مائل نہیں رہتیں۔ ادب اور سیاست کے معیارِ زوال میں بہت فرق ہے۔ سیاست کے زوال کا مفہوم یہ ہے کہ قومیں اپنے حال سے بے خبر ہو جائیں، انھیں یہ پتہ نہ رہے کہ ان کی زندگی انھیں کدھر لیے جا رہی ہے۔ اور انتہائی نقطۂ نظر سے بعض قومیں دوسری قوموں کی محتاج اور دست نگر ہو جائیں لیکن ادب کا زوال سیاست کی تکمیل ہے۔ ادب کے زوال سے قومیں اپنے ماضی و مستقبل سے بے نیاز ہو جاتی ہیں۔ جب اصلاح و تہذیب اور بیداری و آزادی کے نغمات قوموں کے کانوں تک نہیں پہنچتے تو سیاست انھیں اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے اور وہ شخصی اغراض، شخصی پابندی اور شخصی غلامی کے طوفانوں میں گھر جاتی ہیں۔ انھیں کوئی سیدھا راستہ اور جادۂ مستقیم بتانے والا نہیں ملتا اور وہ ادب کے زوال سے اپنے سیاسی ارتقا کا اندازہ لگاتی ہیں۔ پھر جب ادب کو عروج ہوتا ہے تو سیاست پست و زوال و شکست کے غار میں گر کر سسکنے لگتی ہے۔

[illegible]
[illegible] ۱۹۳۴ء
[illegible] جنوری ۱۹۳۸ء

سیماب اکبرآبادی

بانی: علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
جاری شدہ ۱۹۳۰ء
سابق مدیر: اعجاز صدیقی مرحوم
اشاعت کا ۶۱ واں سال

شاعر

علمی ادبی تحریکی ماہنامہ
جلد — ۶۱
شمارہ — ۱
فون: ۳۵۹۹۰۴۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاونت
ناظر نعمان صدیقی

قیمت: ۵ روپے

زرِ سالانہ: ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے: ۴۰ روپے

تاحیات خریداری: ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے: ۱۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے: ۳۵۰ روپے

سرورق
سچائی

عکس
سلطان سبحانی

شمارہ نمبر ۱ — جلد ۶۱
۱۹۹۰ء

مردم شماری ۱۹۹۱ء

مردم شماری ۱۹۹۱ء کے لیے آپ نے کیا منصوبہ بندی کی ہے ؟ ۔ سابقہ تجربوں اور اعداد و شمار کے نتائج نے یہی بتایا ہے کہ کاغذ پر جو کچھ آگیا ہے وہ آپ نہیں ہے ۔ ہمارے گھروں تک آنے والے کارکن اپنی فہم و فراست کا جو ثبوت دیتے ہیں وہ سب پر عیاں ہے ۔ زبان کے خانے میں "مادری زبان" کا اندراج ہزار الجھاوے پیدا کرتا ہے ۔ پوچھنے بتانے اور پھر لکھنے کے عمل میں اصل اندراج کیسے گم ہو جاتا ہے یا گم کر دیا جاتا ہے چنانچہ اور زبانوں کی بہ نسبت اردو کے لیے اردو والوں کو ہر اعتبار سے تیاری کرنا پڑتی ہے ۔ اپنی زبان کے لیے جدوجہد کا یہ عمل کس قدر کامیاب ہو اس کے لیے منصوبہ بندی ناگزیر ہے کہ مذہبی، لسانی اور علاقائی تعصب کے بغیر یہ کام انجام نہیں پاتے ۔

مردم شماری ۱۹۸۱ء کی رپورٹ کے تناظر میں بعض صوبوں میں اردو کا جو بھی درجہ ہے اس کے مطابق عمل نہیں ہوتا ۔ علاقائی زبانوں کے بعد ہند [غیر ہندی علاقوں میں] یا انگریزی کے بعد اردو کا نمبر آتا ہے ۔ مہاراشٹر میں مراٹھی کے بعد اردو دوسری بڑی زبان ہے لیکن ترتیب یوں ہے ۔ مراٹھی، گجراتی، انگریزی، ہندی، اردو ۔ گویا تین سطحوں پر اردو کا زیاں اس کے حقوق کی بازیافت میں رکاوٹ بنتا ہے ۔ مردم شماری کے وقت، اعداد و شمار، عملی اور نتائج کے بعد کاغذ پر اور پھر پورے ہندوستان میں زبانوں کی سرکاری مردم شماری کہ یہ اعداد و شمار بہر طور ملک کی سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور دیگر فیصلوں اور ترقیاتی منصوبوں پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اردو کے مسائل کا تعلق بھی انھیں اعداد و شمار سے ہے ۔

مردم شماری ۱۹۸۱ء کی رپورٹ ۸۴-۱۹۸۳ء میں شائع ہو گئی تھی لیکن لسانی اطلاعات کئی سال بعد شائع کی گئیں اور یہ معلومات یقیناً حیرت انگیز ہیں کہ علاقائی زبانوں کے بعد ہندی بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے ۔ جموں و کشمیر کی سرکاری زبان اردو ہے لیکن مردم شماری کی رپورٹ تو یہاں کی سرکاری زبان کشمیری اور ڈوگری ہونی چاہیے جب کہ کشمیری زبان کے بعد ہندی بولنے والوں کی تعداد کو سب سے زیادہ بتایا گیا ہے ۔ ۵۹۸۷۳۸۹ آبادی والے جموں و کشمیر میں اردو بولنے والوں کی تعداد صرف ۶۸۶۷ ہے ۔

یہ اور ایسے ہی کئی حیرت انگیز نتائج یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مردم شماری میں کم از کم زبان کے معاملے میں سب کچھ طے شدہ پروگرام کے تحت اندراج کیا ۔ اردو زبان کو اس کا قانونی حق نہ ملنے کی بنیادی وجوہ میں سے ایک بڑی وجہ یہی لسانی اعداد و شمار ہیں جو طرح طرح کے توانین کو جنم دیتے ہیں، پھر یہی قوانین اردو زبان کے نفاذ میں سدِ باب بنتے ہیں ۔ ہندی سرکاری زبان ہے چنانچہ بہت آسانی کے ساتھ چھوٹی چھوٹی بولیوں اور زبانوں کو اس میں ضم کر کے اس طرح ہندی والے علاقوں میں تو یہ اول نمبر پر ہوتی ہے لیکن غیر ہندی والے علاقوں میں بھی دوسرے نمبر پر رہتی ہے اس پر یہ لسانی ستم ظریفی ہے ۔ اردو کو اس کا قانونی حق اور جائز مقام کیوں کر ملے ؟

ہمارے کرنے کے کام یہ ہیں کہ ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر مردم شماری کے لیے آئے ہوئے افسران کو تعاون دیں ۔ خود بھی صحیح اندراج کروائیں جہاں تک اس کے ساتھ جا سکتے ہوں جائیں اور مادری زبان کے خانے میں زبان کا صحیح اندراج کروائیں ۔ اردو کی تمام تنظیمیں، ادارے، انجمنیں، اور اپنے اپنے طور پر لائحہ عمل ترتیب دیں اور اس کو عام کریں ۔ اپنے احباب کو، بزرگوں کو، رشتے داروں کو خطوط کے ذریعے مردم شماری کی اہمیت اور زبان کے خانے میں اردو کے اندراج کو اجاگر کریں ۔

جن علاقوں میں اردو بولنے والے ہیں وہ اپنے علاقے کے اردو جاننے والے افسران کا مطالبہ کریں ۔ یہ مطالبہ کیا جائے کہ مردم شماری کے لیے وقت کا تعین اور اعلان کیا جائے ۔ اردو رسائل و اخبارات کے ذمہ داران اپنے اپنے جریدوں میں مردم شماری کی اہمیت، اس کی افادیت اور بہ طورِ زبان کے بارے میں بتائیں ۔

آپ اپنی پیاری زبان "اردو" کے لیے کچھ وقت ضرور دیجیے ۔

مختار صدیقی بنام اعجاز صدیقی

گوجرانوالہ
(پنجاب)

۲۹/۹/۵۰

قبلۂ محترم

سلام نیازمندانہ

نوازشنامہ ورود فرما ہوا۔ حضور کی ذرہ نوازی کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ اتنا جانتا ہوں کہ

وجودِ ذرہ ہے خورشید کی تجلی سے

حسب الحکم ایک مختصر مضمون ارسالِ خدمت ہے۔ معلوم نہیں کہ آفتابِ حکمت کی ضیا باریاں ذرے کی بے نشانی کو بنظرِ استحسان دیکھتی ہیں۔ یا نہیں۔ مگر ذرے کا حریت خانۂ مطلوب ہونا کم از کم فیضانِ آفتاب ضرور ہے۔

اسی قسم کے دو اور مضمون "مومن کا ایک شعر" اور "درد کا ایک شعر" مقامی رسائل میں شائع ہو کر پسند کیے گئے ہیں۔ ایک تنقیدی مقالہ نیز اکبرآبادی پر بابت تغزل و تصوف سپردِ قلم کیا ہے۔ جو ابھی چند اوراق میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ خیال تھا کہ وہ ارسالِ خدمت کروں۔ مگر وہ کافی طویل ہے۔ اس لیے شاید عبارتِ "بے محل" کا مصداق نہ بن جائے۔ آئندہ جو حکم ——— فرمان کی تعمیل خاکسار ہیچمدان کا ایمان ہے۔

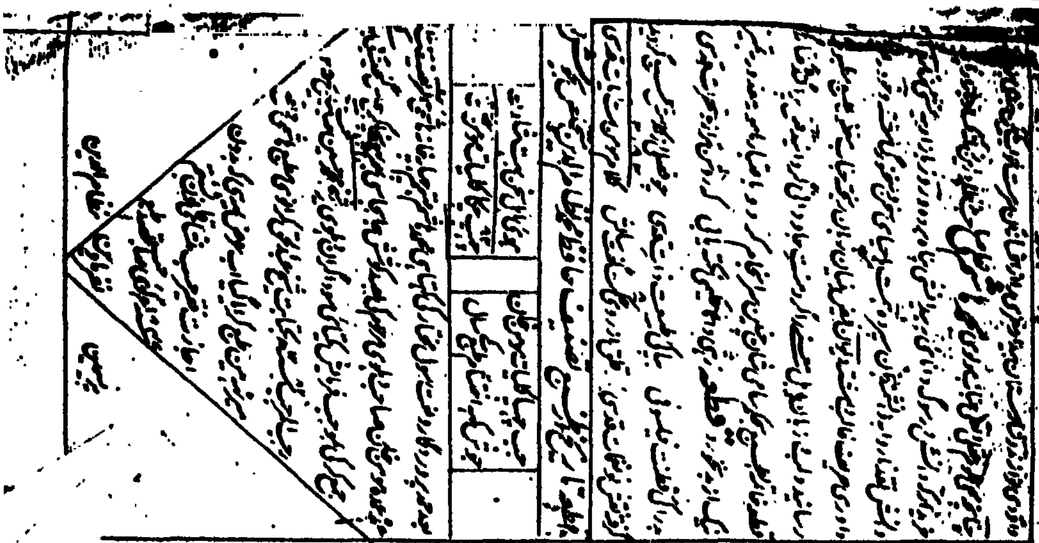
امید ہے اور مضمون کے متعلق اطلاع سے تو شاید محروم نہ فرمائیں گے۔ والسلام

خاکپائے سیماب

مختار صدیقی

[illegible] گوجرانوالہ

مختار صدیقی [یکم مارچ ۱۹۱۷ء – م: ۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء] کا تعلق سیالکوٹ (پنجاب) سے تھا، تعلیم گوجرانوالہ میں حاصل کی۔ بی اے لاہور سے کیا۔ تمام عمر ریڈیو اور ٹی وی سے وابستہ رہے۔ علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں میں تھے۔ میراجی کے ساتھ حلقہ اربابِ ذوق (لاہور) میں نظم کے نئے تجربے کیے۔ نئے نظم گو شعرا میں مختار صدیقی کا بھی نام شامل ہے۔ ایک شعری مجموعہ "منزلِ شب" لاہور سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ [ادارہ]





کلیاتِ مومن کے جو نسخے عام طور پر دستیاب ہیں وہ ۱۸۷۳ء ہی سے ماخوذ ہیں لیکن ۱۲۸۲ھ [مطابق مئی ۱۸۶۵ء تا اپریل ۱۸۶۶ء] کے مطبوعہ نسخے کا حوالہ کہیں نہیں ملتا۔ ۲۸۶ صفحات کا یہ کلیات مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔ مولانا مولا بخش قلق میرٹھی [۱۸۳۳ء - ۱۸۸۰ء] نے اس کی تقریظ لکھی تھی۔ مومن کے شاگرد رشید نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اس کی جمع و ترتیب کی اور فارسی میں دیباچہ تحریر کیا۔ اس نسخے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ جس وقت یہ شائع ہوا تھا غالب، شیفتہ [جامع کلیات مومن] اور قلق تینوں ہی حیات تھے۔ مذکورہ کلیاتِ مومن اور بعد کے نسخوں کی ترتیب میں بڑا فرق ہے۔ یہ کلیات کتب خانہ کالی داس گپتا رضا میں موجود ہے۔ لائبریری نمبر ۳۷۶۱/۴ ہے۔



نظمانے — محسن بھوپالی

[محسن بھوپالی نے ایک نئی صنفِ سخن کی داغ بیل ڈالی ہے اور اس کا نام "نظمانے" رکھا ہے۔ یہ ایک تجربہ ہے جو روایت کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔ رمز و ایما کی کیفیت، ایجاز و اختصار اور ایک ڈرامائی شان اپنی نظمانوں کی وہ خصوصیات ہیں جو قاری پر گہرے نقوش ثبت کرتی ہیں۔ — ڈاکٹر عبادت بریلوی — فلیپ نظمانے مطبوعہ [illegible] سے]

[illegible] — دیکھو تو اس لڑکے کو
بجو جیسی شکل ہے اس کی
کیسے ٹک ٹک دیکھ رہا ہے!

عینک والی بچی والے کو تو دیکھو
کتنا گھورتا اور شوخ ہے لیکن پھر کیا
میری جانب اس نے تو دیکھا بھی نہیں!

میرٹ

نقوی صاحب! اس لڑکے کو دیکھیں جو
تمہاری خالہ کا اکلوتا ہے
کوئی چھوٹی بات نہیں
میری بھی سفارش ہے
میرٹ کی بنیاد پہ اس کو لینا ہے

ارشد بھائی! میں عاجز ہوں
آپ کا کہنا سر آنکھوں پر
لیکن یہ ناممکن ہے!

CUTE — 1
MERIT — [illegible]

مفاہمت

پرسوں رات میں مرزا کی بیٹھک میں
دیر تلک — لوگوں کی غیبت میں مصروف تھا
— پہلی شب ارشد بھائی کے گھر
رات گئے تک [illegible] کی [illegible] بھی رہی
ہار جیت کی فکر میں سارا وقت کٹا
غیبت اور بہتان کی نوبت آ نہ سکی!

آج شام سے سوچ رہا ہوں
کدھر جاؤں — مرزا کی بیٹھک کی جانب
— یا پھر ارشد بھائی کے گھر!

محسن منزل ۴۳ ایف [illegible] ناظم آباد کراچی پاکستان

تارا چرن رستوگی

بیر دبارٹی، گوہاٹی ۷۸۱۰۱۴ (آسام)

سمینار اور اس کے ملتزمات

(تجربات و تاثرات کی روشنی میں)

گزشتہ ۱۵ - ۲۰ برسوں سے سمیناروں SEMINARS کا انعقاد خاصا مقبول ہو گیا ہے یو۔ جی۔ سی U.G.C. کی مالی امداد سے ہر یونیورسٹی کے تمام تر شعبے سمیناروں کا انعقاد وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں۔ مزید برآں دوسرے افراد بھی مذاکروں کو منعقد کراتے ہیں۔ سمینار کیا ہے؟ اس کے انعقاد کے لیے متوجہات کیا ہوتے ہیں اور اس کے ملتزمات جو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہیں کیا ہوتے ہیں یا کیا ہو سکتے ہیں، اس موضوع پر کوئی مضمون میری نظر سے نہیں گزرا چوں کہ میں نے متعدد شعبہ جات کے مذاکروں میں حصہ لیا ہے لہٰذا تجربات اور تاثرات کے منازل سے گزرنا علم و آگہی میں اضافہ کرنا ہی ہے۔ قبل مسیح کے ایک یونانی فلسفی نے کہا تھا کہ تجربات کی جلکی نیز اس جنگی کا جائزہ لینے کا عمل ہی اُبھار ہو سکتا ہے۔ میرے تاثرات و تجربات کی روشنی میں سمیناروں سے متعلق جو ملتزمات مجھ پر ملہم ہوئے ہیں انہی کو اس مضمون میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ملحوظ رہے، کالج اور یونیورسٹی میں منعقدہ مذاکرے SEMINARS یونیورسٹی گرانٹس کمیشن مخفف یو۔ جی۔ سی کے مالی تعاون سے کیے جاتے ہیں۔ اردو کے سرکاری، نیم سرکاری، نیز بہی خواہان اردو کے قائم کردہ ادارے یعنی اردو اکادمیاں، انجمن ترقی اردو، اقبال اکادمیاں، غالب اکادمیاں، وغیرہ بھی مذاکروں کا اہتمام و انصرام کرتی ہیں جس کے لیے وہ اپنے ادارے کے فنڈ اور چندے کی صورت میں وصول شدہ رقوم کو کفالت کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مذاکرے یونیورسٹیوں میں ہوں یا اداروں میں ان کی نوعیت و خاصیت میں فرق نہیں ہوتا، بلکہ کہنا یوں چاہیے کہ فرق نہیں ہونا چاہیے کیوں کہ اب ذاتی مفادات نیز منفعت پسندی کے رجحانات گرداب و طوفان کی طرح چھائے جا رہے ہیں۔ مذاکرہ کیا، بلکہ مذاکرہ کا ایک سوانگ سا رچایا جاتا ہے، بلکہ کہیں کہیں تو گانے بجانے والوں کا بھی اہتمام دیکھنے میں آیا ہے۔ لفظ مذاکرہ SEMINAR کے لیے بھی مستعمل ہے اور سمپوزیم SYMPOSIUM کے لیے بھی۔ مذاکرہ کے انعقاد کے پیشتر موضوع TOPIC کا تعین طشت و خایہ کا کھیل نہیں ہوتا کبھی کبھی عدم کار آگہانہ صلاحیت عجیب و غریب شعبدے بازی دکھاتی ہے۔ مثال کے طور پر "ایوانِ غالب" نئی دہلی ۲۰ میں ایک مجلسِ مذاکرہ کا انعقاد ہوا جس کا موضوع غالب کا یہ شعر تھا ؂

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

ایوانِ غالب کے ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو کے سابق پروگرام ایگزیکیوٹو جناب رفعت سروش تھے۔ اس نام نہاد مذاکرے کی جو روداد "ہماری زبان" میں شائع ہوئی وہ صراحت و وضاحت سے یہ بتاتی تھی کہ شرکا کی تقاریر کا تمام تر زور غالب کے محولہ شعر کی تشریح پر صرف ہوا۔ رفعت صاحب یا جو اصحاب مذاکرہ میں شریک ہوئے مذاکرہ کی روح کو سمجھے ہی نہیں۔ اوّل تو ایک شعر پر مذاکرہ کا انعقاد بذاتہٖ بغایت مضحک ہے اور اگر سلیقے سے کام لیا جاتا تو محولہ شعر سے ابھرنے والے پہلوؤں پر مقالے لکھوائے جا سکتے تھے۔ یعنی مثال کے طور پر:

۱۔ گرمیِ نشاطِ تصور کی کلامِ غالب میں نوعیت نیز اس کے منابع

۲۔ جس گلشنِ ناآفریدہ کا ذکر ہے وہ ہنوز معرضِ وجود میں آیا ہے یا نہیں؟

۳۔ کیا فی الواقع غالب آجکل کے شاعرِ تصور کہے جا سکتے ہیں؟

اور اس طرح کے موضوعات اخذ کرتے ہوئے مقالے لکھوائے اور پڑھوائے گئے ہوتے۔ یہاں ایک بہت ضروری جملہ معترضہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ غالب کے یہاں ماضی کا اجالا بہت ہے، جس پر نہ جانے کیوں غالب شناسی دھیان نہیں دیتی۔ مصرع اور شعر اڑالینا بھی غالب کو خوب آتا تھا۔ مثلاً

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

ہر کہ از بزمِ تو برخاست پریشاں برخاست

پہلا مصرع جوں کا توں اٹھاتے ہوئے اور دوسرے مصرع کو فارسی میں ملبوس کرتے ہوئے غالبؔ یوں نغمہ سنج ہوئے ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل　　جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

اور جانکی پرساد سرودؔ کا شعر لے کر غالبؔ نے کیا گل کھلایا دیکھیے ؎

از گرمیٔ نشاطِ تصور کشم سرود　　من عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ام

اب غالبؔ کہاں ٹھہرتے ہیں ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج　　میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

ملحوظ رہے قصبہ فرید پور ضلع بریلی کے قریب کا ساکن سرودؔ فارسی کا بے مثل شاعر گذرا ہے۔ دیوان ۱۸۲۱ء میں مرتب ہوا اور میری بیاض میں سرود کے ۶۔۷ اشعار درج ہیں۔ بریلی کے معروف محلہ ملوکپور میں میرا گھر تھا اور ملوکپور سے ملحق محلہ گڑھیا میں میرے ایک ہم درس گیانند سکسینہ ہوا کرتے تھے۔ گیانند کے ہاں میں نے جویاؔ آنولوی کو بھی دیکھا اور جانکی پرساد کے بڑے صاحب زادے جو گیانند کے ماموں تھے سرودؔ کا دیوان اپنے ساتھ دوتین مرتبہ لائے۔ گیانند کے ماموں جانکی پرساد صاحب کے پوتے تھے۔ غالب صدی نمبر "نیا دور" (لکھنؤ) میں میرا ایک مضمون "ماخوذات و مکررات غالب" مشمول تھا جس میں متعدد ماخوذات و مکررات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

غالب سے وابستہ اصحاب اتنے بے خبر ہیں، امر تعجب بھی ہے اور جائے تاسف بھی ہے۔ ویسے تعجب و تاسف کے دائرے میں وہ بے اعتنائی بھی جو غالبؔ سے متعلق یگانہؔ چنگیزی کے خیالات سے برتی گئی ہے آ جاتی ہے۔ ایوانِ غالب نئی دہلی میں منعقدہ سمینار کی بات چل رہی ہے تو ایک اور مذاکرہ کا خیال ذہن میں ابھرنے لگا۔ جناب رفعت سروش کے مستعفی ہو جانے کے بعد ایوانِ غالب میں ایک مجلس مذاکرہ جناب عبدالودود مرحوم پر منعقد ہوئی، غالباً ۱۹۸۵ء کے دوران میں ساہتیہ اکادمی میں ترتیب دی جانے والی انسائیکلو پیڈیا آف انڈین لٹریچرز ENCYCLOPEDIA OF INDIAN LETERATURES کے اردو موضوعات پر اندراجات کی انگریزی کی تصحیح کرنے کے سلسلے میں دہلی میں تھا۔ وقت نکال کر ایوانِ غالب جا پہنچا دراں حالیکہ مجھے مدعو نہیں کیا گیا تھا بزعم خود اپنے کو اردو کا ہیوی ویٹ HEAVY WEIGHT سمجھنے والے ایک ادیب مقالہ پڑھ رہے تھے۔ مقالے میں کبھی تبصرے کو تنقید سے تول دیا گیا تو کبھی تنقید کی کوکھ سے تبصرے کو جنم دیا گیا تھا اور اسی طرح خلط مبحث اوج ثریا پر پہنچ گیا تھا میں نے جب سوال کرنا چاہا تو وہ صاحب جو نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور طرہ یہ ہے کہ وہ اردو ادبیات میں پی ایچ ڈی بھی ہیں فرمانے لگے کہ "سوال و جواب کا سلسلہ تو یہاں ابھی تک نہیں ہوا ہے۔" جواباً میں نے عرض کیا کہ آپ نے پھر مذاکرہ کا ڈھونگ کیوں رچا رکھا ہے؟ خطبہ ہی مشتہر کیا جاتا۔" میرے اصرار پر سوال کی اجازت تو ملی مگر آں حضرت کا جواب اتنا گومگو تھا کہ بس۔ نہ جانے کیوں بہتیرے نقاد ان سے گھبراتے ہیں، غالباً اس لیے کہ وہ تحفظ مراتب سے کم واقف ہیں۔

پیش کیے گئے مقالے پر اگر سوال نہ کیے جائیں تو وہ کسی اعتبار سے سمینار کی سطح کا مقالہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ سوال کے ذکر نے ایک واقعے کے نقوش ابھار دیئے۔ سری نگر (کشمیر) میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام عالمی اردو سمینار میں خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ایک مقالہ پیش کیا جس میں موصوف زور خطابت کے تحت یہ بھی لکھ گئے تھے کہ تلسی داس کی راماین کا اولین نسخہ اردو رسم الخط میں تھا جس پر میں نے ثبوت فراہم کرتے ہوئے اولین نسخے دو ہیں۔ ایک ناگری پرچارنی سبھا بنارس (موجودہ وارانسی) میں اور دوسرا اسوڑن میں، مزید برآں میں نے اتر کانڈ کے شروع کے سنسکرت شلوک سناتے ہوئے پوچھا کہ غالباً تلسی نے سنسکرت بھی اردو رسم الخط میں پڑھی ہوگی۔ خواجہ صاحب بالکل لاجواب ہو گئے، بس یہی کہا کہ ڈاکٹر دھیریندر ورما نے انہیں یہ حوالہ دیا تھا۔ جس پر میں نے یہ کہا کہ سور رگھبیر ڈاکٹر سے میں بھی واقف تھا۔ مزید براں ان کی تصنیفات تو ابھی آن جہانی نہیں ہوئی ہیں۔ کسی میں بھی تلسی کے نسخے کا اردو رسم الخط ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ خواجہ صاحب اچھا لکھتے ہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے مگر وہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی بے تکی بات ضرور کہہ ڈالتے ہیں۔ جیسے اعجاز صدیقی مرحوم پر مضمون میں بھی لکھ دیا کہ تلمنڈا ہے، بنگالی زبان ٹیگور کے بعد وسیع ہوئی" سمینار میں اس بات پر وہ نرغے میں آ جاتے۔ ٹیگور کے پہلے بہت پہلے مائیکل مدھوسدن کی "تلوتما کاویہ" اور "میگھ ناتھ کاویہ" معرض وجود میں آ چکی تھیں۔ مدھوسدن کے دو سو سال پہلے تک کے بنگالی شاہکار میں گنوا سکتا تھا۔ ماہ فروری ۸۰ء میں عالمی اقبال سمینار علیگڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار فی الواقع بڑا WELL CONDUCTED سمینار تھا۔ [illegible] ہر لحاظ سے قابل ستائش تھا۔ عالمی مذاکروں میں بالعموم انگریزی زبان ہی میں مقالے پیش کیے جاتے ہیں جو نہایت اہم ہے کیونکہ عالمی سمیناروں میں

اردو زبان کے جاننے والے کم ہی ہو سکتے ہیں۔ کچھ مقالے موجودہ ایرانی (جو کلاسیکی فارسی سے مختلف بھی ہے اور نہیں بھی مگر تلفظ بالکل غیر مانوس معلوم ہوتا ہے) میں بھی پیش کیے گئے۔ برق صاحب نے جو کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر ہیں اچھی ایرانی بولتے ہیں اور معیاری لکھتے بھی ہیں اپنا مقالہ انگریزی میں پیش کیا عنوان تھا IOBAL-PARROT POET OF INDIA طوطی کا ترجمہ PARROT کرکے جو مضحک پہلو پیدا ہو گیا برق صاحب اسے سمجھ ہی نہیں سکے۔ کاش وہ اردو میں مقالہ پیش کر دیتے تو اچھا تھا۔ میرا مقالہ "مثنوی پس چہ باید کرد" پر انگریزی میں تھا جو خاصا مقبول ہوا اور پاکستان کے معروف ادیب ڈاکٹر ریاض احمد نے بڑی تعریف کی۔

بر سبیل تذکرہ نفسیاتی متعلقات PSYCHOLOGICAL ASSOCIATIONS نے نہ جانے کیا کیا لکھوا دیا۔ تو کہا یہ جا رہا تھا کہ موضوع کا تعین سوچ سمجھ کر کیا جائے۔ بہتر یہ ہوتا ہے کہ برائے تعین موضوع ذیلی کمیٹی تشکیل دی جائے سیمینار ہی کیا کسی جریدے کا خصوصی نمبر بھی اسی کا مقتضی ہوتا ہے۔ مثال کے طور اعجاز صدیقی مرحوم نے شاعر کا "قومی یکجہتی نمبر" نکالنے سے پیشتر ذیلی کمیٹی بنائی تھی اور مرحوم نے مجھ سے بھی مشورہ کرتے ہوئے موضوعات کی ایک فہرست ترتیب دی اور مشاہیر اردو ادب سے اپنی پسند کے موضوع پر تحریریں طلب فرمائیں اردو والے کچھ عجیب نوسا کے ہوتے ہیں۔ (جملہ معترضہ: نہ جانے کیوں بریلی میں اس تناظر میں "نوسا" کے بجائے "التماس" کہا جاتا تھا، اب یہ وہاں روزمرہ میں ہے کہ نہیں مجھے نہیں معلوم: دل یہی چاہتا ہے کہ اس سیاق و سباق میں "التماسی" ہی کو استعمال کروں)

* "شاعر قومی یکجہتی نمبر" میں میرے مضمون کے علاوہ جو مضامین شمول ہیں ان کا موضوع لہٰذا سے بالواسطہ تعلق ہے۔ اسی لیے اپنے موضوع پر اردو ہی میں نہیں ہندوستان کی کسی بھی زبان میں اتنا وقیع و ترتیبی کام کم ہی ہوا ہے۔ نومبر ۱۹۷۷ء میں اقبال صدی تقریبات میں شمولہ مذاکرہ بغایت اہم مذاکرہ تھا بلکہ اقبالیات میں ایک سنگ میل نصب کرنے والا مذاکرہ تھا جو وگیان بھون نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ موضوعات پر پیش کیے گئے سبھی مقالے بغایت اہمیت رکھتے ہیں جو ایک سوونیر SOUVENIR کی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس سیمینار کے بعد فروری ۱۹۸۷ء علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سیمینار اعلیٰ پیمانے کا ثابت ہوا۔ کیوں؟

اس لیے کہ ہر اجلاس میں پیش کیے جانے والے مقالوں کی سائیکلوسٹائلڈ نقول مندوبین کو دے دی گئی تھیں۔ جو مقالے طویل تھے ان کے پیش کرنے والوں نے بیس منٹ کے اندر ہی لب لباب پیش کر دیا۔ اعتراضات نیز ان کے جوابات سبھی درخور اعتنا تھے۔ مندوبین کی میز پر ماؤتھ پیس MOUTH PIECE کا اہتمام بھی تھا لہٰذا اعتراض کرنے والوں کو ڈائس تک جانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ مقالوں کی نقول مندوبین کے پاس ہوں اور مقالہ پیش کرنے والے متعین وقت (جو عموماً ۱۵۔ ۲۰ منٹ ہوتا ہے) میں اپنی بات پیش کر دیں تو سیمینار اپنے معیار اور ترتیب کے اعتبار سے کامیاب و یادگار بن جاتا ہے۔

اپریل ۱۹۸۶ء میں وہ عالمی اقبال مذاکرہ جو اقبال اکیڈمی حیدر آباد نے منعقد کرایا نہایت شاندار تھا مگر سرکاری میں ایسے مندوبین کم تھے جنھوں نے مقالوں کی نقول فراہم کی ہوں۔ اراکین اکیڈمی مجبورِ محض تھے لہٰذا دو چار ایسے اشخاص بھی دیکھنے میں آئے جن کو میں "جریان اللسان" کہتا ہوں۔ لفاظیت اور سامعین کے جذبات سے کھیلنے والے اصحاب ہوے بالکل کھوکھلے ہیں کیونکہ جہاں تنقیدی مواد سے بھرپور "مقالے" PAPER کی ضرورت ہوتی ہو ایسے مقالے کی کہ جس میں حشو و زوائد کے تحت آنے والی باتیں بھی قابلِ اعتراض قرار دی جاتی ہوں وہاں تقریر کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ ایک مثال غالباً بے محل نہ ہوگی۔ سال رواں ہی کے دوران (اپریل ۱۹۸۷ء) لکھنؤ کے شیعہ کالج کے زیر اہتمام دبیر سیمینار کا انعقاد ہوا۔ ایک نشست میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے ایک معروف پروفیسر (نام گرامی بوجوہ نہیں لکھ رہا ہوں) نے اپنا مقالہ پیش کرنا شروع کیا جس کو کسی اعتبار سے دبیریات کی نوع کے تحت نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ کاظم علی خاں صاحب جو نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے پہلو بدلتے نظر آنے لگے اور ۱۵ منٹ گذر جانے پر صدر سے بیل BELL بھی بجوا دی مگر فاضل پروفیسر صاحب تھے کہ رواں دواں پڑھے جا رہے تھے۔ سامعین میں سے کسی ایک حضرت نے لب لباب پیش کرنے کی گزارش کی مگر پھر بھی آنحضرت ہمہ تن گوش رہے اور فر فر پڑھتے رہے۔ جب دوبارہ گزارش کی گئی تو پروفیسر صاحب تڑپ کر بولے "کیا یہ مشاعرہ ہے؟" صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ بالآخر مجھ سے نہ رہا گیا اور صدر کی اجازت سے کر ڈائس پر جا کر میں نے کہا کہ "حضرت گستاخی معاف۔ مقالہ عمدہ ہو سکتا ہے مگر مقالہ پیش کرنے والے کو اگر متعین وقت سے زیادہ وقت دیا جائے تو دوسرے مقالوں کے لیے وقت ہی نہیں ملے گا۔ ایسی صورت میں مقالہ پیش کرنے والے صاحب کو لب لباب ہی پیش کرنا چاہیے۔"

مزید براں ، اس چاہیئے سے صرفِ نظر ، جو مقالہ پیش کیا جا رہا ہے اس کی وہیر پر سیمینار کے تناظر میں مجھے تو کوئی معنویت نظر نہیں آتی۔ اس کے بعد پروفیسر صاحب نے تلخیص پیش کی جس کے بعد دوسرے صاحب کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ پروفیسر صاحب نے جو تلخیص پیش کی وہ بھی "پھکوڑیات" ہی کہی جا سکتی ہے مگر ان کے نام و مرتبہ کی روشنی میں یہ کہنا خراب بات ہوتی لہٰذا میں نے بعد ازاں کچھ نہیں کہا۔ سیمینار کے مقالے اور ان پر ہونے والی بحثوں سے وہ اعتقادی فرقدین ابھرتے ہیں جو موضوع کے رموز و غوامض تک رسائی کے لیے عمیق مطالعہ کی رہنمائی کرتے ہیں۔ تنقید کو اعلیٰ معیار سے آشنا کرنے میں سیمیناروں کا انعقاد بہت بڑا رول ادا کر سکتا ہے۔ وجود اردو تنقید جس کو ضرب کلیمی نے معشوق کی موہوم کمر "اقلیدس کا فرضی نقطہ قرار دیا تھا سیمینار صورتِ حال کو سدھارنے میں بغایت اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ اُردو والوں میں نہ جانے کہاں سے ایسی دو اصطلاحیں در آئی ہیں جو اُردو ادب کے علاوہ کسی اور ادب میں میرے دیکھنے میں نہیں آتیں۔ یعنی منفی تنقید NEGATIVE CRITICISM اور مثبت تنقید CONSTRUCTIVE CRITICISM ایسی لغویات انگریزی ادب تو خیر عالمی ادب ہے، ہندوستان کی مشہور زبانوں جیسے بنگالی ، ہندی ، گجراتی وغیرہ میں ان کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ حقیقت تو حقیقت ہی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اُردو تنقید پر جذبات کا غلبہ طاری رہا ہے۔ اگر کوئی مقالہ ان جذبات کے لیے تلذذات فراہم نہ کرے تو وہ منفی رویہ کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال کا برہمن نژاد ہونا ثابت نہیں ہوتا اور فی الواقع شاعرِ اعظم برہمن (بہ معنی ایک مخصوص ہندو طبقہ) نہیں تھا تو لوگ کذا و کذا پر اتر آتے ہیں۔ حفظِ مراتب سے بھی غیر آشنا ہو جاتے ہیں۔

سیمیناروں کی ترویج نے غلط رویوں سے نجات دلانے میں اچھا کردار ادا کیا ہے۔ ٹیگور عظیم شاعر تھے، تخلیقی موسیقار تھے، کلاسیکی رقاص تھے، درخورِ اعتنا افسانہ اور ناول نگار تھے، قابلِ ستائش اداکار بھی تھے اور ڈائریکٹر بھی تھے۔ ان کے ہاں فلسفہ بھی ہے اور جاندار جذبات بھی ہیں۔ ٹیگور سب کچھ تھے۔ یہی نہیں دو ملکوں، ہندوستان اور بنگلہ دیش میں ان ہی کے تخلیق کیے قومی ترانے پیش کیے جاتے ہیں۔ ہندوستان کا دوسرا قومی ترانہ "بندے ماترم" کی دھن بھی ٹیگور ہی نے بنائی۔ الغرض وہ ہمہ جہات تخلیق کار تھے اور عظیم عملی کردار کے حامل بھی تھے مگر خوب صورت دوشیزہ ان کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ آپ کھل کر کہہ سکتے ہیں، کوئی بنگالی بُرا نہیں مانے گا۔ رویندر سنگیت یعنی ٹیگور کی دھن میں ان کے گانے بہت مروج ہیں اور ساتھ ہی نذرل سنگیت بھی خاصا مقبول ہے۔ نذرل یعنی قاضی نذر الاسلام جو بنگالی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے۔ اگر ان کی بابت یہ کہہ دیا جائے کہ وہ آتشک میں مبتلا ہو کر واصل بحق ہوئے تو بنگالی ادیب دست و گریباں ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں گے FACTS ARE FACTS حقیقت کی پردہ پوشی نہیں کی جا سکتی۔ امید ہے کہ اُردو حلقوں کو "مثبت اور منفی" جیسی دور از کار مصطلات سے گلو خلاصی مذاکروں کے انعقاد سے حاصل ہوگی۔

سیمینار کی ہر نشست، اس نشست کے صدر کی تقریر پر ختم ہوتی ہے۔ اس تقریر میں پیش کیے گئے مقالوں کی تلخیص بیان کرتے ہوئے، سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے صدر کوئی فیصلہ صادر نہیں فرماتا اور اگر کوئی صاحب ایسا کرتے ہیں تو وہ معیاری سیمینار کے آداب کے خلاف ہی ہوگا۔ ہاں اگر کسی بات پر اپنی رائے دینا ناگزیر ہو جائے تو اسے اکال تخت سے جاری کیا گیا حکم نامہ نہ بنا دیا جائے۔

سیمیناروں کے انعقاد کے بارے میں ابھی تک جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ اُردو و فارسی ادبیات کے تعلق سے کہا گیا ہے۔

انگریزی ادبیات کے نصابات میں سیمینار نہ جانے کب سے شمول رہا ہے۔ شعبۂ انگریزی کے تحت ہر ماہ نصاب میں شمول مشاہیرِ ادب نیز متعدد ادبی تحریکات سے متعلق کوئی نہ کوئی موضوع لے کر اس پر سیمینار کا انعقاد کیا جاتا ہے جس میں طلبہ و اساتذہ دونوں شرکت کرتے ہیں۔ ۱۹۹۳ سے ۱۹۶۹ تک یعنی ۱۶ سال تک بہ حیثیت پرنسپل متعدد شعبوں کے سیمیناروں میں حصہ لینے کا بھرپور موقع مجھے ملا اور میں نے ہمیشہ پر جوش شرکت کی۔ سیاسیات، سماجیات، فلسفہ، بشریات، بنگلہ، اسمیہ، ہندی کے شعبے آسام میں سیمیناروں کا انعقاد کرتے رہتے ہیں۔ سیمینار کے موضوع پر اپنے تجربات و تاثرات پر بھرپور نظر ڈالتے وقت ان سب سے ابھرنے والا تناظر میرے سامنے آجاتا ہے۔ ابھی تک پیش کیے گئے معروضات کی تلخیص کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے۔

(۱) سیمینار کے لیے موضوع کا انتخاب نیز متعلقہ عنوانات کا تعین۔ اپنی پسند کے لحاظ سے کسی ایک زاویہ پر مقالہ پیش کرنے کی گزارش، مدعو کیے جانے والے مشاہیر سے یہ گزارش ضرور کرنا چاہیئے کہ وہ مقالے ایک متعینہ مدت کے اندر ارسال فرمائیں۔

۲۔ شرکا کو پڑھے جانے والے مقالوں کی سائیکلوسٹائلڈ CYCLOSTYLED نقول فراہم کی جائیں۔
۳۔ جلہ نشستوں کا مطبوعہ ٹائم ٹیبل۔ اگر رد و بدل کیا جائے تو مندوبین کو اس کی اطلاع فراہم کی جائے۔
۴۔ مقالہ بڑا ہو سکتا ہے مگر مقالہ نگار کو ۲۰ منٹ سے زیادہ وقت نہ دیا جائے۔ لب لباب ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔
۵۔ پیش کردہ مقالے پر بحث و تحیص بہت ضروری ہے اور بہت اہم ہے بحث میں کج روی کو صدر نشست روک سکتا ہے۔
۶۔ نشست میں پڑھے گئے جملہ مقالوں پر روشنی ڈالتے ہوئے صدارتی تقریر کے بعد نشست برخاست کی جائے۔
۷۔ سیمینار کی آخری نشست میں جملہ نشستوں میں پیش کیے گئے مقالوں سے ابھرنے والے نکات کو بھی پیش کرنا چاہیئے۔ جس سے شرکا کو خاصی بصیرت حاصل ہوتی ہے۔
۸۔ آج کل یہ رواج بھی عام ہو چلا ہے کہ سیمینار کے آغاز میں کسی مشہور و معروف شخصیت کو خطبہ پیش کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ ملحوظ رہے، تہذیب ادب کا تقاضا یہی ہے کہ اس خطبہ کو زیر بحث نہ لایا جائے۔

زیر نظر مضمون قریب قریب اختتام پذیر ہونے والا تھا کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر سے فرستادہ "اقبال اور اردو نظم" مرتبہ آل احمد سرور موصول ہوئی۔ اس کتاب میں وہ مقالے جو "اقبال اور اردو نظم" کے موضوع پر اپریل ۱۹۸۴ء میں منعقدہ سیمینار میں پیش کیے گئے تھے مشمول ہیں۔ سات مقالوں پر محیط اس کتاب میں میرا مقالہ بعنوان "اقبال کی اردو نظم و غزل و رباعی! بانگ درا اور بال جبریل کے آئینے میں" بھی شامل ہے۔ پہلا مقالہ "نظم کیا ہے" جناب شمس الرحمان فاروقی صاحب نے پیش کیا تھا نے پیش کیا تھا جس پر بحث میں شرکت کرتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ فاروقی صاحب نے سوال ہی سوال اٹھائے ہیں نیز اتنے نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں کہ نقطے ہی نقطے رہ گئے اور "نظر" بالکل معدوم ہو گئی ہے۔ جواب تو انھوں نے دیا ہی تھا مگر میری تشفی کو کافی نہ تھا۔ اس واقعہ کو پیش کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ میری بات ہی صحیح تھی بلکہ مدعا یہ ہے کہ اس نوعیت کے مباحث اور اس طرح کے تبادلۂ خیالات صرف سیمیناروں ہی میں ہو سکتے ہیں۔ سری نگر کشمیر یونیورسٹی، علیگڈھ مسلم یونیورسٹی، حیدرآباد اقبال اکیڈمی، ساہتیہ اکادمی نیو دہلی، اقبال صد سالہ جشن کے تحت وگیان بھون نیو دہلی وغیرہ میں سیمیناروں کا معیار خاطر خواہ تھا، بہت بلند و قیع تھا۔ مگر غالب کے نام پر قائم کردہ اداروں کے سیمیناروں میں معیار بغایت پست نظر آیا۔ بایں ہمہ سیمینار کیسا بھی ہو علمی سطح پر تبادلۂ خیالات کے مواقع فراہم کرتا ہی ہے۔

توقعات غلط ثابت نہ ہوں، اس کے لیے کھلے ذہن سے سیمیناروں کا انعقا کیا جانا چاہیے۔ روشن خیالی کو آج کل کی مسموم فضا نے نرغے میں لے لیا ہے لہٰذا اہلِ علم و دماغ کو ظلمت پسند قوتوں کا ڈٹ کر سامنا کرنا ہی ہوگا۔ ۱۹۴۷ء یعنی حصول آزادی کے بعد سے اردو ادبیات کو قابل لحاظ اور درخور اعتنا فروغ حاصل ہوا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ ہم اردو کو ورطۂ سیاسیات میں نہ پڑنے دیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ اردو حلقوں میں کچھ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو "قصہ کرسی کا" میں مشغول رہتے ہیں کہیں کہیں سیمینار ذاتی مفادات کے حصول کے لیے استعمال ہوئے ہیں بایں ہمہ سیمیناروں کا انعقاد فروغ اردو کے لیے منارۂ نور سے کم اہم نہیں، رشد و ہدایت کا بہترین وسیلہ فراہم کرتا ہے۔ امید ہے کہ اس موضوع پر اہل دل و دماغ توجہ مبذول فرمائیں گے۔

بقیہ صفحہ ۳۲ خواب رو

کمرے کے ایک روشن دان میں جا بیٹھا ہے اور انہیں اپنی طرف متوجہ پاکر چپ نہیں رہ پایا ہے۔ چوں! ۔ چیں! ۔ دیوانے مولوی صاحب یاد ہے اچھی بیگم مر کر بھی کیوں کر آپ کے پاس لوٹ آئی تھی؟

دیوانے مولوی صاحب اسے کوئی جواب دینے کی بجائے اچھی بیگم کی تیمارداری کے لیے اس کے بدن پر جھک گئے ہیں۔

انہیں اپنے نواب محل میں منتقل ہوئے ابھی تین چار ماہ ہی ہوئے تھے کہ اچھی بیگم کو ایک وائرل بیماری نے آن لیا۔ دیوانے مولوی صاحب نے اپنی بیگم کی تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا اور اس رات جب وہ بخار سے بے ہوش پڑی تھی اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تھا تو وہ اس کے بستر کے پہلو ہی میں سجدے میں گر گئے، گھنٹوں اسی حالت میں پڑے رہے حتیٰ کہ صبح کے سورج کی کرنیں کھلکھلاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ دیوانے مولوی صاحب کو محسوس ہوا کہ کسی نے ان کی پشت پر چٹکیاں کھبوئی ہیں۔ انہوں نے جو مڑ کر دیکھا تو مبہوت رہ گئے۔ اچھی بیگم کھڑی تھی اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور منہ کا رنگ اڑا ہوا تھا اور وہ وفورِ مسرت سے کانپے جا رہی تھی۔ دیوانے مولوی صاحب اس سے لپٹ گئے بعد لپٹے لپٹے اسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا اور اللہ کا شکر بجا لائے۔ [باقی آئندہ]

حامدی کاشمیری

سحر نا آشنا کوئی نہیں ہے
مگر اب جاگتا کوئی نہیں ہے

پیامی بن کے آتے تھے پرندے
مگر اب رابطہ کوئی نہیں ہے

شکستہ پا نہیں ہیں ہم، ورنہ تو،
کریں کیا راستہ کوئی نہیں ہے

کوئی لوٹا نہیں گھر سے نکل کر
مگر یہ سوچتا کوئی نہیں ہے

بہا لو تم ہی اپنے ساتھ موجو
ہمارا آسرا کوئی نہیں ہے

ہم اس کی کھوج میں نکلے ہوئے ہیں
ہمیں اپنا پتہ کوئی نہیں ہے

مسعود منزل، شالیمار، سری نگر (کشمیر)

قمر وارثی

یہ حقیقت چشمِ حیرت پر کھلی رہ جائے گی
میں گزر جاؤں گا منزل دیکھتی رہ جائے گی

بخش دی اُس کے تجسس نے حیاتِ جاوداں
زندگی روٹھی تو شرحِ زندگی رہ جائے گی

رنگ و بو کے درمیاں تقسیم ہو سکتا نہیں
ورنہ کیا پہچان میرے نام کی رہ جائے گی

دھوپ کی چادر تنی رہنے دو اے سایہ گرد
رہروی ورنہ فریبِ رہروی رہ جائے گی

ہے وفا کا وہ دیا روشن کہ جس کے سامنے
کچھ رہا تو بس ہوا کی بے بسی رہ جائے گی

بس دیانت سے برتنے کی ضرورت ہے قمر
حرف بھی رہ جائے گا تاثیر بھی رہ جائیگی

ایل ۱۲۔۱۰، ۴۴۴ اورنگی کراچی۔ ۴۱

محمد احمد رمز

اب وہ موڑ آیا کہ ہر پل معتبر ہونے کو ہے
دیکھنا منظر نیا دیوار و در ہونے کو ہے

اب لہو کا رنگ گہرا ہے مری تصویر میں
ایسا لگتا ہے کہ قصہ مختصر ہونے کو ہے

اڑ چلی ہے ہر طرف دامن میں بھر لینے کی بات
قطرہ قطرہ اس کے دریا کا گہر ہونے کو ہے

میں بھی دیکھوں مجھ کو منظر سے ہٹا دینے کے بعد
اب تماشا کون سا بارِ دگر ہونے کو ہے

پھر تراشی جانے والی ہیں چراغوں کی لویں
شام ہوتے ہوتے گرم ایسی خبر ہونے کو ہے

مڑ کے دیکھوں تو عقب میں کچھ نظر آتا نہیں
سامنے بھی گم نشانِ رہگزر ہونے کو ہے

اب نئی راہیں کھلیں گی مجھ پہ امکانات کی
رمز میرے تن پہ ظاہر میرا سر ہونے کو ہے

۲۲۰/۲۴ (ڈیکشنشن) ترلوک پوری، دہلی ۱۱۰۰۹۱



رام لعل

شانتی نکیتن، ڈی ۔ ۲۲۹۰، اندرا نگر، فیض آباد روڈ، لکھنؤ ۔ ۱۶

پکھیرو

کسی سے ایک عرصہ کے بعد اچانک مل جانے سے اچنبھا تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن ایوا براؤن سے چونکہ پھر کبھی ملنے کا امکان نہیں تھا: اس لئے ہندوستان سے ہزاروں کیلومیٹر دُور اسٹاک ہوم کی ایک مضافاتی لائبریری میں اُسے دیکھ کر میں حیران سا رہ گیا۔

یہ واقعہ چار ستمبر ۱۹۸۵ء کا ہے۔ اس سے میری پہلی ملاقات تیرہ سال پہلے شملہ کی ایک ٹورسٹ لاج میں ہوئی تھی۔ اب وہ سگتونا کیوان کی پبلک لائبریری میں کتابوں کے ایک ریک کے پاس فرش پر پیروں کے بل بیٹھی تھی۔ اُس کے پاس سے گزرتے وقت میں نے اس کی اور خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ اس لئے کہ وہ پُشت سے سویڈن کی اُن ہزاروں گوری چِٹی لڑکیوں جیسی ہی نظر آتی تھی جن کے سُنہرے یا ریشیلے بال اگر بندھے نہیں ہوتے تو اُن کی پیٹھ پر یا گردن کے آس پاس ہی یقیناً جھول رہے ہوتے ہیں۔

اچانک کچھ میگزین اُوپر کے خانے سے پھسل کر ایوا براؤن کے اُوپر آگرے تو وہ بوکھلا کر چیخ اُٹھی اور میں جاتے جاتے پلٹ کر بھاگتا ہوا اُس کے پاس جا پہونچا۔ اُس کی مدد کے لئے میں نے فرش پر بکھرے ہوئے میگزین اٹھانا چاہے تو ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

حافظے کے کمپیوٹر ماضی وحال کی کئی مسافتیں آناً فاناً طے کرکے پھر جب ساکت ہو گئے تو ہم دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔ میں نے بڑی بے تکلفی سے اُسے اُس کے نِک نیم سے ہی مخاطب کرتے ہوئے پوچھا ــــ "تم ایوا ٹونی ٹھری ہونا؟"

اُس نے میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "بے شک ایوا ٹونی ٹھری۔ اور مجھے وہ ملاقات بھی اچھی طرح یاد ہے جب انڈیا میں میرے ٹریولنگ چیک گم ہو گئے تھے۔ لیکن افسوس تمہارا نام یاد نہیں آرہا ہے۔ شاید تم!"

پھر وہ شرمندہ سی ہو کر ہنس پڑی۔ "آئی ایم سو ساری! اوہ! میری یادداشت کتنی کمزور ہونے لگی ہے اگرچہ بڑھاپا ابھی بہت دُور ہے مجھ سے! کیا یہ صحیح نہیں ہے؟"

میں نے اس کی طرف گہری نظر سے دیکھا۔ وہ اب پچیس چھبیس سال کی سرخ وسفید اور شاداب لڑکی ہرگز نہیں رہ گئی تھی جیسا کہ اسے میں نے پہلی بار اپنے ملک میں دیکھا تھا۔ لیکن چالیس کے قریب پہنچ کر بھی وہ ایک تندرست، دلکش شخصیت تھی۔ اور مجھے یک بیک یہ بھی یاد آیا کہ وہ سویڈش نہیں تھی بلکہ وہ پیرس میں اپنے بیکر ماں باپ کے یہاں پیدا ہوئی تھی۔ جو اپنی مادری زبان فرانسیسی تو بڑی فرّاٹے سے بولتی ہی تھی لیکن اس کی انگریزی خاصی کمزور تھی۔ اُسے بعض معلومات میں نے اس کی عالمی زبانوں کی ایک کام چلاؤ جیبی ڈکشنری کی مدد سے بہم پہونچائی تھی اور وہ بے شکر کو تے شنکر کہا کرتی تھی۔ اُس کے اس غلط تلفظ کی وجہ سے میں اُس کا مذاق بھی اُڑاتا تھا لیکن وہ کوشش کرنے کے باوجود "ج" کی صحیح آواز اپنے حلق سے نہیں نکال پاتی تھی۔

میں نے اُسے اپنے نام کا پہلا حرف بتایا تو اُسے میرا پورا نام فوراً یاد آگیا۔ پھر وہ میرے ہاتھوں سے فرش پر سے اُٹھائے ہوئے میگزین لے کر اُنھیں اُن کی مخصوص جگہوں پر رکھتی ہوئی بولی "رام! اس کام سے ذرا نپٹ لوں تو تم مجھے ریستوراں میں لے چلو۔ بہت ہی قریب ہے۔ پوسٹ آفس اور بینک کے بیچ میں۔ گرچہ بہت بھرا رہتا ہے لیکن ہم اپنی اپنی بیئر اُٹھا کر باہر بینچ پر جا بیٹھیں گے۔ تمھیں کہیں اور تو نہیں جانا؟ سوری! میں یہ پوچھنا تو بھول ہی گئی، تم مجھے کتنا وقت دے سکو گے؟"

میرے جواب دینے سے پہلے ہی وہ اپنے کام سے فراغت پا گئی۔

اپنے پرس میں سے کاغذ کا ایک رومال نکال کر ناک کی نمی پونچھتے ہوئے بولی۔" چلو! اب میں تمہارے بارے میں بہت سی باتیں پوچھوں گی۔"
ریستوران کے اندر واقعی بہت بھیڑ تھی، جیسا کہ اُس نے کہا تھا۔ اور ہم سڑک کے کنارے رکھا ایک بنچ پر جا بیٹھے جس کے ایک کونے پر سرخ چہرے اور گہرے سیاہ بالوں والی ایک بھکارن جیسی عورت اپنے بچے کو آئس کریم کھلا رہی تھی
میں نے کہا:" ایوا لونٹی تھری' میں یہاں اپنی کتاب کے پبلیشر کی دعوت پر آیا ہوں۔ اس کی تعارفی تقریب کی تاریخ ابھی مقرر نہیں کی گئی ہے اس لئے ابھی کئی روز قیام کر سکتا ہوں۔ لیکن تم سے یہاں مل جانے کی تو قطعاً کوئی اُمید نہیں ہو سکتی تھی'۔
" اس دُنیا میں اب سب کچھ ممکن ہے کیونکہ یہ بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔"
اُس نے میری مسرت و حیرت کی ملی جلی کیفیت کو بالکل نظر انداز کر دیا جس میں ابھی تک میں مغلوب تھا۔
" اچھا' یہ بتاؤ' تم مجھے ابھی تک ایوا لونٹی تھری کہنے پر کیوں مصر ہو؟"
مجھے خوب یاد ہے میں شملہ والی لاج کے تیس نمبر کے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھی۔ تم بھی پاس پڑوس کے کسی کمرے میں رُکے ہوئے تھے۔ ہاں' یاد آ گیا۔ میں ہی اپنے چیک چوری ہو جانے کے بعد رو رو کر اس بات کو کوستی تھی کہ میرا روم نمبر تیس ہی بڑا منحوس ہے۔ اور تم نے میرا غم غلط کرنے کے لئے ہی یہ نام مجھے دیا تھا۔ خیر' میں واقعی کچھ خوش ہو گئی تھی' مجھے یاد ہے۔ تم نے تھوڑا سا قرض بھی مجھے دیا تھا' جس کی بدولت میں نئی دہلی پہنچ سکی تھی۔ لیکن اب اُس واقعے کی میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ ایسا ہو بھی کیوں؟ ہم دوسری باتیں کریں۔"
اس واقعے کی سچ مچ اب کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ سے شنکر نام کے جس لڑکے کے ساتھ اُس نے پہلی بار چرس کے سُوٹے لگائے تھے وہ ہی اُس کے پرس میں سے پانچ سو ڈالروں کے سفری چیک اُڑا کر غائب ہو گیا تھا۔ ایوا نے اپنے ملک کے بنک کو ٹیلیکس بھجوا کر نئی دہلی کے فرانسیسی سفارت خانے کی معرفت ایک ڈرافٹ منگوا لیا تھا اور دہلی پہنچتے ہی مجھ سے اُدھار لی ہوئی رقم مجھے منی آرڈر سے لوٹا دی تھی۔ دو اجنبیوں کی اتنی سی ملاقات کی اگر کوئی اہمیت ہو سکتی تھی تو وہ یہی تھی کہ ہم نے ایک دوسرے کو یاد رکھا تھا اور اب ہم پھر سے ساتھ ساتھ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔
" لیکن تم یہاں کیسے' کیا اپنا ملک چھوڑ بیٹھی ہو؟"

نہیں نہیں' میں اپنے پیارے ملک کو خیر باد کیسے کہہ سکتی ہوں! مر نہیں جاؤں گی؟ پیرس تو میرا محبوب ہے۔ بعض لوگ اُسے دیکھے بغیر ہی اُس پر فدا ہو جاتے ہیں۔ بس تعریف ہی سُن کر۔ میری رگ رگ میں اُسی کا خون دوڑ رہا ہے بھئی۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ میں اُسے چاہنے کے باوجود اُس سے دُور دُور رہنا چاہتی ہوں۔ اُسے آپ میری انفرادیت یا پھر انسانی فطرت کا نام دے سکتے ہیں۔ میں اپنے اندر کی اس شدید خواہش کو بھی نہیں دبا سکتی کہ دیس بدیس بھٹکتی پھروں۔ دُنیا بھر کے لوگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور سمجھنے کی کوشش کروں۔ اسے آپ میرا جنون کہہ سکتے ہیں لیکن میں جہاں جہاں گئی ہوں ایک نئے ایڈونچر کا احساس ہوا مجھے۔ سب جگہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ سب جگہ بُرے بھی نہیں ہیں۔ میرے ملک میں بھی ایسا ہی ملا جلا ہجوم ہے۔ لیکن جیسے موقعے مجھے مغرب میں رہ کر کام کرنے کے مل جاتے ہیں ویسے مشرقی ملکوں میں نصیب نہیں ہوتے۔ مجھے معلوم ہے' یہ بہت ہی پسماندہ ملک ہیں۔ وہ اپنے گرد و نواح کے لوگوں کو ملازمتیں نہیں دے سکتے تو ہم جیسے سفری پرندوں کو کیونکر دیں گے؟ اور وہ بھی عارضی! کیوں دیں؟ اس بات کے لئے مجھے شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بس یونہی کہہ گئی ہوں۔ بُرا مت ماننا۔ میں مشرق سے کچھ دوسری وجہوں سے بھی پیار کرتی ہوں۔"
" اچھا' یہ بتاؤ' تم یہاں کتنے دنوں کے لئے اور ہو؟ کوئی جاب وغیرہ کر رہی ہو؟"
" فی الحال میرے پاس ایک مہینے کا کام ہے۔ سوشل ڈیپارٹمنٹ کی ایک لڑکی چھٹی پر ہے۔ اسی کی جگہ کام کرتے ہوئے دو مہینے تو بیت ہی چکے ہیں۔ اچھا' تم بتاؤ' تمہارا قیام کہاں ہے؟ وہاں کا فون نمبر دے سکتے ہو؟ کیا میں تمہیں فون کر سکوں گی؟ میرا نمبر تو تم نوٹ کر ہی لو۔ یہ میرے بوائے فرینڈ کا ہے۔ اُسی کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ آج کل وہ ایک جزیرے پر اپنی ماں کے پاس گیا ہوا ہے۔ بیچاری بوڑھی پچھلی سردیوں میں برف پر پھسل گئی تھی۔ اُس کی ایک ٹانگ پلاسٹر میں ہے۔ کل فریڈی کا فون آیا تھا۔ اگلے ہفتے لوٹنے کی کوشش کریگا۔ جب اس کی ماں کے اپاہج لوگوں کے ہسپتال میں رہنے کے کاغذات مکمل ہو جائیں گے۔ خیر' اب تم میرا ساتھ دو تو ہم ذرا ایک اسٹور سے بھی ہو لیں۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں خریدنا ہیں مجھے۔ کیا تم میری مدد نہیں کرو گے رام؟"
وہ جلدی جلدی باتیں کرنے کی عادی تھی جو میں سن لیتا تو بھی یقین نہیں

کی شخصیت کا ایک گن یہ بھی تھا کہ دوسرد ں کو اس کی مدد کرنے کے لئے فوراً اپنے بس میں کر لیتی تھی۔ یوں بھلا میں کچھ دیر اور اُس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ کئی روز کے بعد اپنے مینز بازار کے کوٹھڑی ہاؤس سے نکلنے کا ایک سنہرا موقع مل گیا تھا۔ اور اتفاق سے باہر آتے ہی ایوا برآؤن سے ملاقات ہو گئی تھی۔ وہ بھی میری رفاقت سے بور نہیں ہو رہی تھی۔ جب وہ اسٹور سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پلاسٹک کے پھولے ہوئے تھیلے اٹھائے ہوئے بس میں سوار ہونے کے لئے جلدی جلدی سڑک کی طرف چل دی تو میں اُسی کے بارے میں ایک بنچ پر بیٹھا سوچتا سا رہ گیا۔ شملہ سے روانہ ہونے سے پہلے اُس نے مجھ سے ہندوستان کے کچھ قابلِ دید مقامات کے بارے میں پوچھا تھا۔ اور میں نے اُسے بہار میں واقع نالندہ کے کھنڈرات اور مہاراشٹر کی اجنتا و ایلورا کی صدیوں پرانی گپھاؤں کے بارے میں نہ صرف تفصیل سے بتایا تھا بلکہ اس کی ڈائری میں اُن جگہوں تک پہنچنے کے لئے ریل اور سڑک کے راستے تک بنا کر دے دیئے تھے۔ اچانک ٹرین حرکت میں آ گئی تو وہ ہڑبڑا کر ویٹنگ روم سے بھاگی بھاگی اپنے کمپارٹمنٹ تک پہنچی تھی۔ اسی گھبراہٹ میں اپنی ڈائری کہیں اٹھانا بھول گئی تھی۔ جسے میں نے گاڑی چھوٹ جانے کے بعد دیکھا۔ میں نے اُس میں سے اُس کا پتہ تلاش کرنا چاہا لیکن اُس نے تو کسی جگہ اپنا نام تک نہیں لکھا تھا۔ بیشتر صفحات پر فرانسیسی زبان میں ہی بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ کسی کسی جگہ اُس نے خاکے بھی بنا رکھے تھے۔ ایک جگہ بیچ کے دو صفحات پر پھیلا ہوا ایک پینورا ما بنایا گیا تھا جس میں انسانی کھوپڑیاں، مندر، بدھ کی مورتی، میز پر شراب کی بوتلیں اور گلاس، بے چہرہ لوگوں کے ہجوم اور ہاتھی اور بن گھوڑے اور مزاروں کے علاوہ دو انسانی اسکیچ بھی شامل تھے۔ جن میں ایک تو اُس کا اپنا تھا۔ کھلے کھلے جھولتے ہوئے بال اور حیرت زدہ آنکھیں۔ دوسرا اسکیچ شاید اس کے کسی ہم سفر بوائے فرینڈ کا ہوگا جس کے چہرے پر صرف داڑھی تھی۔ مونچھیں نہیں تھیں۔ بہت عرصہ بعد ایک فرنچ جاننے والے سے میں اس کی ڈائری پڑھوا سکا تو پتہ چلا کہ وہ یورپ کے باہر ترکی، کویت، افغانستان، پاکستان، ہندوستان اور نیپال تک میں گھوم آئی تھی۔ اُس کے تاثرات پڑھ کر مجھے ایک حساس مغربی لڑکی کا ذہن سمجھنے میں بڑی مدد ملی تھی جو آرٹسٹ ہونے کے علاوہ شاعرہ بھی تھی۔

ایک آدمی دیکھا جو پہاڑ جیسا ہے
اسے نام لے لے کر پکار رہا ہے
اُسے یقین ہے اُس کی آواز سُن سکتی ہے
تین ہزار میل دُور سے وہ پھر پکارتا ہے
اُسے اپنے قریب دیکھنا چاہتا ہے
اُداس ہے اُس کے بنا
لیکن وہ اپنی آزادی برقرار رکھنے کی بھی خواہش مند ہے
اگرچہ اُس کا دل بھرا ہوا ہے لیکن وہ کھوکھلا ہے
کیکٹس کی مانند
وہ بھی اپنی آزادی برقرار رکھنا چاہتا ہے "

" استنبول پہنچنے کے لئے پہلے تو ایک کشتی میں لفٹ ملی پھر ایک لاری میں جگہ مل گئی۔ انٹرنیشنل تجارتی میلے کی وجہ سے کسی ہوٹل میں جگہ پانا مشکل ہو گیا۔ آخر ایک وکٹورین سرائے نما ہوٹل میں خود کو دھانسنا پڑا۔ سیلون کے پردے گہرے رنگ کے تھے اور لمبے لمبے صوفے آمنے سامنے کی قطاروں میں رکھے ہوئے۔ کرائے میں بریک فاسٹ شامل تھا۔ کھانے اور ڈرنکس کے لئے الگ خرچہ دینا پڑتا تھا۔ شاور گرم ملا اور بیڈ آرام دہ۔ سٹرگشتی کرنے مارکیٹ میں نکلی تو ترکی کا بازار دیکھتے ہی اس پر عاشق ہو گئی۔ تنگ و تاریک گلیاں۔ جوتے مرمت کرنے والے موچی، سیاہ بلیاں۔ سمندر کا دلکش ساحل۔ واپس آتے ہی لوٹ کر سو گئی۔ "

" اگلے روز ایک بس سے سفر کیا جو پہلے تو ایک غلط سڑک پر پڑ گئی۔ پھر لوٹ کر صحیح سمت میں روانہ ہوئی۔ میرے دو ہم سفر فرانسیسی تھے جیک اور سوزانے۔ وہ کویت جا رہے تھے۔ لاری کا ڈرائیور انگریزی میں فرانسیسیوں کو کوس رہا تھا۔ جب اُسے معلوم ہوا کہ ہم فرانسیسی ہیں، تو وہ معذرت خواہ ہونے لگا۔ میں نے غصے سے کہا، تمہاری یہ معذرت میں قبول نہیں کروں گی۔ تمہیں کسی وجہ سے واقعی دکھ پہونچا ہوگا۔ اس کے بعد ہم دوست بن گئے۔ اُس سے میں نے ایک دیسی سگریٹ بھی قبول کی۔

" قصبے کی ایک خاص گلی، ڈھلوان پر بنی ہوئی دکانیں، طرح طرح کا سامان، پلاسٹک کے جوتے، ٹوپیاں، بیلٹیں، کھل۔ کیا میں مکمل طور پر ایک آزاد فرد ہوں؟ شاید نہیں۔ کم سے کم اُن معنوں میں ہرگز نہیں جن معنوں میں بدھ یا کوئی صوفی ہو سکتا ہے۔ اعتراف جرم اکثر بنیادی اسباب کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے۔ مثلاً سیکس کی ارج (URGE) اسے کسی دوسری جانب موڑ کر ایک جواز پیدا کر لیا جاتا ہے۔ اخلاقی اسباب کے محرکات کو واضح طور پر سب لوگ نہیں سمجھ

سکتے۔ کہ ان کی حقیقی نوعیت کیا ہے ؟ زیادہ تر لوگوں کے بھیجے میں ایک پُراسرار قسم کا منصف موجود ہوتا ہے جو خود اپنی شب خونی ہونے کی وجہ سے ایک کنفیوژن میں مبتلا رہتا ہے۔"

"بنارس کے گھاٹ پر ایک عورت گنگا میں پتھر کی ایک چھوٹی سی مورتی نہلانے کے لئے لے آئی ہے۔ اُوپر حدِ نظر تک نیلا آسمان محیط ہے۔ اُس سے میں مورتی کے بارے میں پوچھتی ہوں۔ وہ دونوں بازو پھیلا کر اپنی زبان میں کچھ کہتی ہے۔ میں کچھ بھی نہیں سمجھ پاتی۔ یاتریوں کے پیروں کے ساتھ گنگا کا پانی سیڑھیوں تک آیا ہوا ہے۔ بھاری بھاری کولہوں والی عورتیں بار بار ڈبکیاں لگاتی ہیں۔ پانی کی لہریں چکر کھا کھا کر سیڑھیاں چڑھنے لگتی ہیں۔ ان کے کالے، پیلے اور لال رنگ کے لباسوں میں گھیردار اسکرٹ (دبیز کوٹ) اور بلاؤز شامل ہیں۔ جن پر بیل بوٹے کاڑھے گئے ہیں۔ یہ کام مغرب پر سبقت لئے ہوئے ہے۔ ان کی گہری سیاہ آنکھیں دھوپ میں چمک چمک اٹھتی ہیں۔ ان کے کالے کالے بھیگے ہوئے لمبے گیسو ان کے کاندھوں پر اور گردن کے آس پاس بکھر بکھر جاتے ہیں۔"

"ایک بھیڑ والی پتلی گلی، لکڑی کے بیشمار کھوکھے، کالے فریم کی ہزار ہا سائیکلیں اور رکشے، لکڑی اور پتھر کی بنی شیو اور گوتم کی مورتیاں برائے فروخت۔ ایک بچّہ سیڑھیوں والی گلی میں کھیل رہا ہے۔ اس کا جنم بھی شاید انہیں سیڑھیوں پر ہوا ہوگا۔ کچھ لوگ رام نام ست ہے۔ رام نام ست ہے کہتے ہوئے قریب سے گزر رہے ہیں۔ اُن کے کاندھوں پر سادہ سے کپڑے میں لپٹی ہوئی ارتھی ہے جس پر گیندے کے پھول پڑے ہیں۔ کوئی ماتم نہیں، کسی اور دکھ کا اظہار نہیں۔ موت اسی سکّے کا دوسرا رُخ ہے۔ مرگھٹ پر مردے کو ایک چتا پر رکھ دیا جاتا ہے پھر آگ لگا دی جاتی ہے۔ بچّے وہاں بھی کھیل رہے ہیں۔ گاڑھے دھوئیں میں انسانی چربی جلنے کی تیز بُو شامل ہوگئی ہے جو آگ کی لپیٹوں میں سے نکل نکل کر آسمان کی طرف جا رہا ہے۔"

"ایسا لگتا ہے میں نے چھبیس سال کی عمر میں اپنی آدھی زندگی گزار لی ہے۔ اگرچہ اجتماعی زندگی پورے جوش و خروش سے میرے ساتھ بہہ رہی ہے۔ مختلف مذہبی احکامات کے بیچ میں سے ہو کر جن کا کوئی باہمی تعلق بھی ضرور ہے۔ یہاں انسان کی ایگو اپنی مناسب جگہ پر ہے۔ ایک طرف اسٹوپا ہے، بہت اونچا۔ اس کے پاس پورے احترام کے ساتھ جاؤ۔ کیا ہم ان کی دُنیا کو ٹھیک طرح سے سمجھ سکتے ہیں! کیا ہم پوری دُنیا کو سمجھ سکتے ہیں ؟ جس کے ساتھ ہم وابستہ ہیں اور وابستہ نہیں بھی ہیں۔ شدّاکِ چیچک زدہ چہرے کی آنکھوں میں بھی چمک رہا ہے۔

یہاں حُسن کی تجارتی سطح پر کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ کھال کی گہرائی تک بھی اتری ہوئی نہیں محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہ اپنا راستہ خود بناتی ہوئی چل رہی ہے۔ دکھ کا احساس یہاں سب کو ہے لیکن اسے بڑے صبر و وقار کے ساتھ برداشت کر لیا جاتا ہے۔ ایک محدود زندگی، ایک محدود موت، حیات بعد از مرگ، جس کے بارے میں مغرب کا بھی ایک نقطۂ نظر ہے۔ یہاں دکھ کا احساس اتنا سکوت آمیز کیوں ہے ؟ شاید اسی وجہ سے اتنی آسانی سے قابلِ برداشت بن جاتا ہے۔ (جیسے یہ بھی خدا کے ہی منصوبے میں شامل ہو) ہزاروں خیالات کی تکرار ہوتی ہے، جس طرح دھوپ کی کرنیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی رہتی ہیں۔ اُن میں گرد و غبار کے طوفان بھی اٹھ اٹھ کر شامل ہوتے رہتے ہیں۔ جن کا رنگ سُنہرا ہوتا ہے اور ان کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ بے شمار مکانوں اور تنگ و تاریک گلیوں کے اُوپر بھی وہی آسمان چمک رہا ہے۔ اُوپر اُٹھیں تو یہ سب نیچے اور پیچھے رہ جاتا ہے اور ہم ہر طرف پھیلے ہوئے حسن کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔ جہاں دیو قامت پہاڑ ہیں، ایک دوسرے کے بہت قریب قریب۔ اور کھردرے اور برف پوش۔

میرے سامنے پھولوں کی ایک دکان ہے۔ پیلے پیلے پھولوں سے بھری ہوئی۔ یہ پیلے پھول انسان کی بنیادی ایمان داری جیسے نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے ہندوستانی پھل، انگوروں کے گچھے، یہاں بھی یہ رنگ سے بھرے ہوئے ہیں، بلکہ ہماری دُنیا سے کچھ زیادہ ہی۔

"نمستے !"

"ہیلو ہیلو !"

"بائی بائی !"

اور ایک پُر اُمید مہین آواز "پیسہ، پیسہ، پیسہ، پیسہ دیا"

ایک ایسی گردان جس کے سامنے سپر ڈالتے ہی بنتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچّے، قطار در قطار، ان کی معصوم پھیلی پھیلی آنکھیں، ان کے سیاہ جسموں پر جڑی ہوئی سی بے شمار آنکھیں۔

آج تڑکے اُٹھ کر پورے دن کو اُگتے ہوئے دیکھا۔ ایک اوسط دن کی روئیداد :۔ نیپال کی ہپی کا ٹیج (HAPPY COTTAGE) میں بارہ بجے جاگی، کپڑے دھوئے، پنیر، ٹماٹر، آملیٹ، ٹوسٹ اور شہد اور کافی کے ساتھ ناشتہ تین روپے پچاس پیسے میں۔ ڈاک خانے میں جا کر معلوم کیا، ڈیڈی کا خط آیا ہوا رکھا تھا۔ چلتے چلتے ایک پان کے سامنے پھر رک گئی۔ دودھ کا ایک گلاس پیا۔ دو سو گرام پنیر

بھی کھایا۔ وہیں جارج اور مونیک مل گئے، جو پشو پتی ناتھ مندر جا رہے تھے۔ وہاں سے لوٹے تو لیف اور دوسرے لوگ مل گئے۔ وہ سب محل دیکھنے جا رہے تھے۔

دو لیمو خریدے۔ دور پہاڑوں کے پیچھے سورج غروب ہوتے ہوئے دیکھا۔ اچھا لگا۔ کاٹیج میں واپسی۔ ٹورسٹوں کے ساتھ گپ شپ۔ پھر چائے خانے میں۔ ٹوسٹ، شہد اور چائے۔ بستر لپیٹ کر لیف کے ساتھ پھر چائے خانے میں۔ اُسے وہیں چھوڑ دیا اور اِن ایڈن (INN EDEN) گئی۔ لیکن وہ دن بھر کے لئے بند تھی۔ اپنی ایک چوڑی پچیس روپے میں بیچ دی۔ گلیوں میں بے مقصد گھومتی پھری۔ اچانک ایک سنہری رنگ کی بشرٹ بھی سو روپوں میں دے دی۔ اس کے بعد مندر کی طرف۔ وہاں لیف مل گیا۔ ہم دونوں پہلے ہنگری آئی (HUNGRY EYE) گئے۔ وہاں سے میں اکیلی ڈریگون (DRAGON) پہنچی۔ چاؤمن، ٹماٹو سوپ، پنیر، ٹوسٹ اور چائے۔ موسیقی بھی سنی۔ پھر باہر آ کر کچھ بسکٹ خریدے۔ رات کافی سرد تھی۔ کافی دیر بھی ہو گئی تھی۔

"میں روز ہی مرتی ہوں اور پھر پیدا ہو جاتی ہوں۔ تجسیم کے ایک نئے شعور کے ساتھ۔ پرانے جسم کو خیرباد کہہ کر نئے جسم میں داخل ہو جاتی ہوں۔ جنگ! جنگ! ایک رکشہ مجھے دھکا لگاتی ہوئی نکل جاتی ہے۔ میں سڑک پار کر کے دوسرے فٹ پاتھ پر چلی جاتی ہوں۔ ہندوستان میں زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ کیا انشورنس کا محکمہ معاوضہ ادا کریگا، جب اُسے لکھا جائے گا۔ ڈیر سر! میری ایک ٹانگ بنارس میں ایک بھینس نے اپنے بائیں سینگ کے ساتھ بالکل کچل دی تھی۔ جواب آ جائے گا۔ آپ کو جو زحمت اُٹھانی پڑی، اس کے لئے دلی معذرت۔ یہ عجیب دُنیا ہے جہاں سانولے رنگ والے لوگ بنا ٹائر ٹیوب کے بھی رکشا دوڑاتے لے جاتے ہیں۔ اور گرد آلود بارش میں بھیگتے بھی جاتے ہیں۔ اور جہاں ایسے خطوط اپنے افسر کے سامنے ٹائپ کر کے پیش کرنے کا کوئی رواج نہیں جن کے بائیں طرف پورے دو انچ کا حاشیہ بھی چھوڑا جاتا ہو۔ کیا انہیں معلوم ہے؟ اسی کرۂ زمین پر ان کی جیسی ایک اور دُنیا بھی بستی ہے جہاں لوگ زیادہ آزاد ہیں اور ساٹھ سے دو سو ڈالر تک دے کر پوری شان کے ساتھ بیڈ پر سوتے ہیں؟ یہاں تو بس بھیڑ ہے اور گائیں ہیں اور بے پناہ شور ہے۔ جو ان کے اُوپر سے رات کی ہوا کی طرح گزر جاتا ہے۔ عام آدمی کی حیثیت اسی قسم کی ہے کہ وہ ہر بات کو بھگوان کی مرضی سمجھ کر بڑی خاموشی سے قبول کر لیتا ہے۔

"لندن کا پل گر رہا ہے۔ اب تک ایک دوسرا پل قریب ہی میں بنا دیا جانا چاہیئے تھا تاکہ ندی بہتی رہے۔ شوا کے مندر کے پاس سے ہو کر۔ بہت سے بندر اچھلتے کودتے پھرتے ہیں۔ لال رنگ کی بسیں مسافروں سے بھری ہوئی ہیں۔ 'میم صاحب! یو لائیک چائے؟ یو کم اِن مائی نائس ریستوران، یو ہیو گوڈ فوڈ ہیر' (MEM SAAB! YOU LIKE CHOY? YOU COME IN MY NICE RESTAURANT. YOU HAVE GOOD FOOD HERE) اور آگے کسی گلی میں کوئی میرے ساتھ ساتھ چلتا ہوا سرگوشی کرنے لگتا ہے، 'یو وانٹ چینج منی؟' (YOU WANT CHANGE MONEY?) یہ لوگ شکاگو کے گینگسٹروں (GANGESTERS) والے لہجے میں کیوں نہیں پوچھتے جب کہ انگریزی بول سکتے ہیں؟ اور آگے کسی گلی میں بلیک مارکیٹ ہے۔ جیسی کابل میں تھی۔ جیسے یہ سب ایک ضابطے کے مطابق کیا جا رہا ہو۔ لیکن یہ جگہیں موسیقیوں کا میلا کیوں معلوم ہوتی ہیں؟ بیچوں بیچ ایک چوکور میدان، آس پاس بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے چوکور کمرے اور مسکراتے ہوئے چہرے، 'نو ناٹ ٹوڈے، تھینک یو' (NO NOT TODAY, THANK YOU.) رکشے پاس سے گذر جاتے ہیں اور اکثر ٹریفک بند ہو جاتا ہے۔

"اپنے ماضی سے کٹ جانا کیسا لگتا ہے؟ اس زندگی کے مقابلے میں جو نزدیک بھی ہے اور بھلی لگ رہی ہے۔ حال مجھے اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے ہے اور ختم کر دینا چاہتا ہے۔ میں ہر منٹ میں مرتی ہوں اور ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی ہوں۔ نیچے کی ایک اور گلی میں بھیڑ کے ساتھ بہہ نکلتی ہوں۔ اس گلی کا اپنا ایک ریدم (RHYTHM) ہے۔ اپنا راگ، جو میں سُن سکتی ہوں۔ یہ سب کس قدر فطری لگتا ہے۔ بار بار ہارن کی پوں پوں سننا اور پٹیری دکانداروں کی حرکتوں سے لطف اندوز ہونا۔

بریک فاسٹ ۴/۔، رکشا ۵۰/۔، ممبئی کا ٹکٹ ۲۵/۔، بریڈ ۶۰/۔، مونگ پھلی ۲۵/۔ مونگ پھلی ۲۵/۔، سنترے ۱/۔، بسکٹ ۴۰/۔، چائے ۲۵/۔، چائے ۱۵/۔، سگریٹ ۴۰/۔ (۳۰/۵۰)۔ ناریل ۳۰/۔ دیسی کھانا ۵/۱، کافی ۶۰/۔ ٹوسٹ ۳۰/۔ (۷-۲۰)۔

"میں انا پورنا نہیں جا سکی۔ جب پندرہ سال کی تھی تب سے اس کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اسی پہاڑ کے بارے میں کتابوں میں پڑھا کرتی تھی۔

اور اس کے دشوار گزار راستوں کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ وہاں جو بھی پہنچ سکا لوٹ کر اُس نے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا۔ اکثر من گھڑت کہانیاں۔ مجھے اپنے کیون کی لائبریری سے دستیاب ہونے والی وہ ساری کتابیں ابھی تک یاد ہیں۔ آج میں نے شمال مشرق کی طرف سر اُٹھا کر دیکھا۔ سینکڑوں میل دور تک۔ کہیں پر نیلا کُہرا چھایا ہوا تھا۔ جس کے پیچھے اَنّا پورنا اوجھل تھا۔ پھر بھی اتنا ہی کافی لگا۔ بار بار اچھلتی کودتی لاری میں بیٹھ کر اسے پورے سکون سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا جو آٹھ ہزار فٹ اونچا اور دو سو میل دور تھا۔ نیچے بہت گھنا جنگل تھا۔ اونچے اونچے استادہ صنوبر کے پیڑوں سے بھرا ہوا۔ کہیں کہیں میدان بھی تھے۔ جن میں اونچے اونچے گھنے گھاس اُگے ہوئے تھے۔ ان پر کتنی بار برفیلی چٹانیں پھسل پھسل کر گری ہوں گی۔ انھوں نے کتنی بار برف باری دیکھی ہو گی۔ اتنی اونچائی پر بھی یہ ہریالی کتنی شاداب لگتی ہے! جھاڑیاں جھنڈ کی جھنڈ بناتی ہوئی۔ پیچ در پیچ راستوں سے ہوتے ہوئے ہم اچانک دھوپ میں پہنچ جاتے ہیں۔ کہیں کہیں گہری چھاؤں ہمیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ پہاڑی سڑک کتنی تنگ اور ڈھلوان ہے! نیپال ہی ایک ایسا ملک ہے جسے صرف جانا جا سکتا ہے۔ میں یہاں پیدل چلنے کی کتنی آرزومند ہوں! ہفتہ بھر یا شاید ایک دو مہینوں تک ایسا کر سکتی ہوں۔ ان وادیوں سے ہو کر پہاڑ تک پہنچنے کے لئے۔ میں پھر واپس آؤں گی۔"

ایک صفحے پر اسکنڈے نیوین زبان میں کچھ لکھا تھا۔ بعض الفاظ نارویجین اور سویڈش بھی تھے۔ شاید وہ وہاں کی زبانیں سیکھنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ ہندی اور اُردو میں بھی یہ مشق کی گئی تھی۔ سلام علیکم، وعلیکم السلام، نمستے، تھینک یو، مہربانی، اچھا ہے حقّا، یس، نو، ٹھنڈی، ٹھنڈی، گرم، الف، ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، چ، ح، خ۔

"استنبول سے ٹرین ریزے رم کے لئے، ریزے رم سے لوکل بس۔ پانچ پونڈ میں سستا پڑے گا یہ سفر۔ وہاں سے آگری دکودا توم ا۔ رات شاید وہیں گزارنی ہو گی۔

"آگری، دوگوبیا صنوت، وہاں سے بازرگان کی جانب۔ تبریز کے لئے بس۔ بس یا گاڑی سے تہران۔ مشہد کے لئے ٹرین۔ کوئی بھی براہِ راست سواری ہرات، قندھار کے لئے۔

خریدنا ہیں ـــــ یادداشت، موم بتیاں، پوسٹ کارڈ، سلک، البم کے کاغذ اور خطوط لکھنا ہیں ـــــ ممی ڈیڈی کو۔ پپ اور وہ اینک اور مریم کو۔

"پشاور میں بھی اسٹیشن پر لوگ بہت خوبصورت لگے۔"

ایوا براؤن نے مجھے ایک ہفتہ کے بعد فون کیا۔ بولی۔ "آج کہیں چلنے کا پروگرام بناؤ رام۔ میں بے حد تنہائی محسوس کر رہی ہوں۔ فریڈی نے اپنی چھٹی بڑھالی ہے۔ اُس کی ابا جان کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ اُس کی تدفین کے انتظامات میں مصروف ہے۔ مجھے بھی بلایا ہے۔ لیکن میں نے اُس کے پاس جانے سے معذرت کر لی ہے۔ میں ایسے غم زدہ ماحول میں کیوں جاؤں؟ تم آ جاؤ تو ہم کسی پب میں جا بیٹھیں گے۔ باتیں کریں گے۔ میں خوش ہونا چاہتی ہوں۔ سچ! تم دیکھنا تھوڑی دیر کے بعد میں کھل کھلا کر ہنسنے لگوں گی۔ میرے قہقہے اندر کہیں پر بند ہو گئے ہیں جیسے۔ تم میری مدد کر سکتے ہو۔ اگرچہ تم خود ایک ایسے ملک کے رہنے والے ہو جہاں قنوطیت بھی ایک قدر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن میں تم سے مل کر مشرق کی بہت سی اچھی باتوں کو پھر سے یاد کر سکوں گی۔ تم آ رہے ہو نا؟"

میں نے اُسے بتایا۔ "آج تو میرا دن بھر سونے کا پروگرام ہے۔ رات دیر تک لکھتا رہا۔ میں نے اپنے میزبانوں سے کہہ دیا تھا کہ باہر سے تالا لگا کر کام پر جائیں۔ وہ میرے لئے شاید ناشتہ بنا کر ٹیبل پر رکھ گئے ہیں۔ بہت سے پھل اور جام اور بریڈ بھی موجود ہیں اور پھر ٹی وی بھی ہے اور کچھ کلاسیک فلموں کے کیسیٹ بھی ہیں۔ پورے دن کا پروگرام طے ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں؟ چاہو تو فون پر ہی میرے ساتھ باتیں کئے جاؤ۔ نہیں، میں اپنے میزبان کو فون نہیں کر دوں گا۔ وہ فوراً واپس نہیں آ سکے گی۔ صرف میرے لئے باہر کا دروازہ کھولنے کے لئے۔ نہیں۔ وہ شام کو ایک پڑوسن نرس کے ساتھ اُس کی گاڑی میں لوٹتی ہے یا کسی کسی دن لوکل ٹرین سے میٹکاف آ جاتی ہے جہاں اس کا شوہر اپنے اسکول سے لوٹ کر پہلے سے گاڑی لئے ہوئے موجود ہوتا ہے۔ یعنی کبھی کبھی ساتھ ساتھ بھی لوٹتے ہیں۔ آج میں کسی طرح گھر سے نہیں نکل سکتا۔ تم سمجھ گئی ہو نا؟ پھر کسی دن مل لیں گے۔ مجھے معاف بھی کر دو کہ تمہیں مایوس کر رہا ہوں۔ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

دو دن کے بعد میں نے اسے فون کیا تو اس نے مجھے فوراً بلا لیا جہاں وہ آپ لینڈ ویز ہوکیونگ کے ایک سوشل ڈیپارٹمنٹ میں عارضی طور پر ایک جاب کر رہی تھی۔ جس وقت وہاں پہنچا، تو وہ ایک مشین سے خود کی ٹرالی اُتروا رہی تھی۔ اُس نے کہا۔

"یہ اچھا ہے کہ تمہارے تین چار گھنٹے خالی ہیں۔ اگرچہ بھی

وقت میرے لئے مصروف ترین ہوتا ہے۔ لیکن تمہارے ساتھ ساتھ رہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ دیکھوں گی، مجھے کام کرتا ہوا دیکھ کر تم کچھ خوشی محسوس کرتے ہو یا نہیں!"

ایک مغربی یوروپ کی عورت کو اس کے وطن سے دُور ایک نورڈک ملک میں شوقیہ مہم کے طور پر کام کرتے ہوئے دیکھنا ایک اچھا موقع تھا۔ شاید اُس نے خود ہی میری بے پناہ دلچسپی کا اندازہ کر لیا تھا۔ دو تین کیلومیٹر کے دائرے میں اس نے کے چند گھنٹوں کے لئے چار بوڑھوں کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری لے رکھی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے بوڑھے لوگوں کے لئے مخصوص گھر میں رہنا پسند نہیں کیا تھا۔ اُن کے اپنے اپنے مکان تھے۔ اُن کے بچے ان سے الگ رہتے تھے۔ اپنا ناشتہ کھانا بنانا اُن کے بس کا روگ نہیں تھا۔ گھر کی صفائی وغیرہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے آیوا کو اُن کی ہر خدمت بڑی لگن کے ساتھ کرتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے اُن کے بستروں کی چادریں اور دروازوں اور کھڑکیوں کے پردے بدلے، انکے کپڑوں کو پریس کیا۔ اُن کے لئے تھوڑی تھوڑی باغبانی کی جس جس طرح وہ ہدایت دیتے رہے۔ انکی ڈاک لیکر قریب کے ایک ڈاک خانے میں گئی۔ اور اُن کی آئی ہوئی ڈاک اُٹھا لانے کے علاوہ اُن کے چیک بھی کیش کرا کے لا دیئے۔ اُن کے پانی اور بجلی کے بل بھی جمع کرا آئی۔ ایک بوڑھا کچھ رومانی ہو اُٹھا تو اُس کے لئے میوزک کا کیسیٹ لگا کر اسکے ساتھ ڈانس کیا اور گانا بھی گایا۔

ان سب کاموں سے فراغت پا کر وہ مجھے ایک لائبریری کے اندر بنے ہوئے چھوٹے سے ریستوراں میں لے گئی۔ وہاں ہم نے اپنے اپنے پیسوں سے لنچ خریدا۔ لنچ کے دوران میں اُس نے مجھے بتایا "یہ جاب میں جس لڑکی کی جگہ پر کر رہی تھی وہ کل واپس آ رہی ہے۔ مجھے اطلاع دے دی گئی ہے۔ لیکن یہ سوچ سوچ کر مجھے بہت افسوس ہو رہا ہے کہ میں ان معذور لوگوں کی خدمت سے محروم ہو جاؤنگی۔ ان کے ساتھ میں نے کئی دن گزارے ہیں۔ وہ بھی مجھ سے بہت مانوس ہو گئے ہیں مگر انہیں میں نے نہیں بتایا کہ کل سے انہیں نظر نہیں آؤں گی۔ ہو سکتا ہے یہ خبر سن کر کسی کا دل ٹوٹ جاتا۔ وہ مر بھی سکتا تھا۔ لیکن اب کیا ہوگا؟"

"کس کا؟ ——— تمہارا؟"

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میری طرف ایک ٹک دیکھنے لگی۔

اُس کی خوبصورت نیلی آنکھیں لمحہ بہ لمحہ آنسوؤں سے لبریز ہوتی گئیں۔ اس نے اچانک تھوڑی اوپر اٹھالی تاکہ آنسوؤں کو بہنے سے روک سکے۔ پھر اچانک اپنے جھولتے ہوئے سنہرے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں لے کر سر کے عین وسط میں ایک حسین گولے کی شکل میں لپیٹ دیا۔ پرس میں سے دو ہیرپن نکال کر انھیں بالوں کے اندر یہاں وہاں ٹھونس دیا۔ اور بولی۔

"اب مجھے کوئی نئی جاب تلاش کرنی ہوگی۔ فریڈی کے لوٹنے سے پہلے پہلے۔ میں بیکار نہیں بیٹھ سکتی۔ تمہارے جانے کے بعد میں اطمینان سے ادھر کے سارے اخبار دیکھوں گی۔ شاید کوئی ایسی جگہ خالی ہو جہاں میں کام کرنا پسند کر سکوں۔"

ایک دن میں روسی ایئر لائنز کے دفتر سے نکلا تو سڑک کے دوسری اور کے فٹ پاتھ پر اچانک آیوا جاتی ہوئی دکھائی دے گئی۔ ہم کئی روز سے ایک دوسرے کو فون بھی نہیں کر سکے تھے۔ میں نے اُسے پکارا تو وہ حیران سی ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ پھر مجھے دیکھ لیا تو خوش ہو کر ہاتھ ہلانے لگی۔ وہ اس الجھن میں بھی نظر آئی کہ سڑک فوراً پار کر کے میرے پاس کیونکر پہونچے۔ ٹریفک بہت زیادہ تھا۔ تیز رفتار کاروں کا ایک دریا سا بہتا جا رہا تھا۔ اُسے وہیں رُکے رہنے کا اشارہ کر کے میں نے اگلے سگنل تک کا ایک لمبا چکر کاٹا۔ اُسکے پاس پہونچا تو وہ بڑی بے تابی سے میرے ساتھ لپٹ گئی اور بولی۔

"ہی رام! تم خوب مل گئے۔ میں تو ساری اُمید کھو چکی تھی۔ کیونکہ کل ہی مشرقی جرمنی جا رہی ہوں۔ اچھا سنو، یہیں کہیں تھوڑی دیر کے لئے نہ بیٹھ جائیں؟ میرے پاس وقت کم ہے۔"

ایک پب میں بیٹھتے ہی میں نے اُس سے کہا "آج واقعی ہماری الوداعی ملاقات ہے۔ وہ بھی اتفاق سے ہو گئی ہے۔ دو روز کے بعد میں بھی ماسکو جا رہا ہوں۔ تم کیا پیو گی؟"

"ہاں ٹھیک ہے، آج تم میرے لئے بیر خریدو۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ اور میں یاد رکھوں گی۔"

وہ میرے ہاتھ سے روپے لیکر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ کاؤنٹر پر گئی۔ اور دو بیر اٹھا کر لوٹ آئی۔

"جانتے ہو میں جلدی نہ کرتی تو ایک لمبی کیو میں ٹک جانا پڑتا۔ میں نے کئی لوگوں کو ایک ساتھ اندر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ خیر یہ بتاؤ کیا تم بھی میری طرح بہت خوش ہوتا کہ ایکبار پھر بچھڑنے سے پہلے

ہم مل گئے؟"

"تمہیں یہاں کوئی جاب نہیں ملی؟"

"ملی، ملی کیوں نہیں؟ جاب ہی کے سلسلے میں تو ساس نٹز جا رہی ہوں۔ لیکن فیری سے۔ تقریباً تیس پناہ گزینوں کے ساتھ جن کے کاغذات ٹریلی بورگ سے مشرقی جرمنی کو بھجوائے جا چکے ہیں۔ انہی لوگوں کو اسکاٹ کرنا ہے مجھے۔ وہاں سے انہیں مڈل ایسٹ بھجوایا جائے گا جس راستے سے وہ آئے تھے۔ وہ سب کے سب ترک ہیں۔ فرانسیسی بولنے والے ترک۔ ان میں کچھ عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ پرسوں پہلے اٹلی کے راستے سوئٹزرلینڈ میں داخل ہوئے تھے۔ بتاتے ہیں ان کے پہلے قافلے میں چھ سو اسّی لوگ تھے۔ کچھ چوری چھپے انگلینڈ اور دوسرے ملکوں میں چلے گئے جنہیں ہمارے ملک نے شہریت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ یہاں سویڈن میں رہ جانے کے لئے وہ پانچ سال سے جدوجہد کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ پاکستانی، ہندوستانی، بنگلہ دیشی، سری لنکن اور کچھ گریک بھی تھے۔ وہ سب عارضی طور پر قبول کئے گئے ہیں۔ روزی روٹی کمانے کے لئے گزارہ الاؤنس کے علاوہ انہیں کچھ کام بھی دیدیا جاتا ہے۔ فرانسیسی بولنے والوں کی میں مترجم ہوں۔ نسلی امتیاز کا شکار بھی ہوتے ہیں یہ لوگ۔ کوکلس کلان (KUKLUX KLAN) اور اسکن ہیڈز (SKIN HEADS) نام کی دو تنظیمیں ہیں جو انہیں پریشان رکھتی ہیں۔ ان کے دروازوں پر نگر گو ہوم (NIGGER GO HOME) لکھ دیا جاتا ہے۔ سڑکوں پر تنہا پا کر ان کی ارپیٹ بھی کر دی جاتی ہے۔ لیکن مقامی لوگ ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ بالکل غیر جانبدار رہتے ہیں۔ لیکن غیر جانبدار رہنے سے نسلی منافرت کا حل نہیں نکلتا۔ خانہ بربادوں کو فائدہ ہی کیا ملتا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔"

وہ لگاتار بولتی جا رہی تھی۔ ایک عجیب سے جوش میں۔ اس وقت اس کے چہرے پر جو کیفیت تھی اسے سادہ سے سادہ الفاظ میں حیرتناک ہی کہہ کر بیان کیا جا سکتا ہے۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو اس نے مجھے روک دیا۔ "سنو رام! ایک سویڈش لڑکی کا قصہ سنو۔ کیا نام تھا اس کا؛ ہاں، ایسنے۔ اس نے اریٹیریا کے ایک باشندے فوزو ابوالقادر سے شادی کر لی۔ مقصد یہ تھا کہ اسی بہانے سے اسے شہریت کے حقوق دلا دے۔ ایک دن اسے گھمانے کے لئے شہر لے گئی۔ لیکن راستے میں دونوں پر اچانک حملہ ہوا۔ دونوں زخمی ہو گئے۔ کبھی کبھی یہ خانماں برباد لوگ بھی غضبناک ہو اٹھتے ہیں۔ مقابلہ آرائی کرتے ہیں۔ اس کا سبب ان کی اندرونی بے قراری اور افسردگی ہوتی ہے۔ غیر یقینی زندگی بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔ ایک بیس برس کے پناہ گزین کا بھی قصہ سن لو۔ وہ جس فیکٹری میں لگایا گیا تھا وہاں کام کرتے ہوئے اس کی عینک ٹوٹ گئی۔ بیچارہ پھر سے عینک بنوانے کے لئے ڈیڑھ ہزار کرونے کہاں سے لاتا؟ فیکٹری کے مالک اس طرح کے نقصان کا معاوضہ دینے کے پابند ہیں۔ لیکن اس نے مقررہ میعاد کے اندر مالکوں کو اطلاع نہیں دی۔ اس لئے اس کی درخواست رد کر دی گئی۔ اس کا کیس میں نے ہاتھ میں لیا۔ تب بھی اسے کچھ نہ مل سکا۔ میں اس کے پاس یہ خبر لیکر پہنچی تو وہ غصے سے پاگل ہو اٹھا۔ بجائے اس کے کہ وہ میری کوششوں کا شکریہ ادا کرتا اس نے مجھ ہی پر حملہ کر دیا۔ تم جانتے ہو ایک عورت پر حملہ کس قسم کا ہو سکتا ہے؟ اس نے مجھے بالکل نوچ ڈالا۔ یہ میری بہت بڑی توہین تھی۔ یہاں کے قانون کے مطابق اس کی سزا بہت بڑی ہے۔ لیکن میں نے نہ تو پولیس کو بتایا نہ ہی اخبار والوں کو بھنک دی۔ بس اسے مجبور کیا کہ مجھ سے معافی مانگے۔ اس نے پرسکون ہو کر معافی مانگ لی۔ میں نے اپنی جیب سے ہی اس کے لئے نئی عینک بنوا دی ہے۔ اس وقت وہی لے کر آ رہی ہوں۔ میرے پرس میں ہے۔ لیکن کل کے قافلے کے ساتھ اسے واپس بھیجا جا رہا ہے۔ جرمنی کے ساتھ ایک نامعلوم منزل کی طرف۔"

ایوا برادون کی آنکھوں میں اب ایک سکون تھا۔ حیرتناک قسم کا ٹھہراؤ۔ وہ پلک تک جھپکے بنا میری طرف کئی لمحوں تک دیکھتی رہی۔ اب اس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ موجود نہیں تھی جو کچھ دیر پہلے مجھے دیکھتے ہی کھل گئی تھی۔ اچانک وہ گھڑی دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔ میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولی۔ "اب جاؤنگی فوراً۔ پھر کبھی مل سکیں گے یا نہیں کون کہہ سکتا ہے؟ مل گئے تو حیرانی مت ہونا۔ نہیں ملے تو غم بھی مت کرنا۔"

"سنو ایوا! کئی سال پہلے تم نے ایک ڈائری لکھی تھی۔ اسے تم شملہ کے ویٹنگ روم میں بھول گئی تھیں، یاد ہے؟ وہ انڈیا میں میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے۔ تم اپنا پتہ لکھ دو تو میں واپس جا کر پوسٹ کر دونگا۔"

"ہٹاؤ اب! میں نے ایسی ڈائری کئی بار لکھی ہے اور کتنی بار کہیں نہ کہیں چھوڑ دی ہے۔ اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے؟ میرا تعلق صرف اتنا ہے کہ کچھ لکھ کر من کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔ بس۔ اچھا گڈ بائی۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گئی۔

*

انوار عزمی

باعثِ آزارِ جاں تھیں راحتِ جاں ہو گئیں
جسم پر جتنی تھیں زنجیریں غزل خواں ہو گئیں

میں نے پہنایا بدن کو بے حسی کا پیرہن
موسموں کی سازشیں جب مجھ پہ عُریاں ہو گئیں

آرزوؤں کے شگوفے ہیں نہ خواہش کے گلاب
جس قدر فصلیں تھیں نذرِ باد و باراں ہو گئیں

شہر کی سڑکیں تھیں ہر احساس سے عاری مگر
میری آوارہ مزاجی سے پریشاں ہو گئیں

جن سے قائم تھی کبھی اہلِ نسب کی آبرو
آج وہ قدریں بھی عزمی طاقِ نسیاں ہو گئیں

بی۔ ۵/۵، زہرہ سینٹر، حیدری، نارتھ ناظم آباد کراچی



شاہد میر

سمندروں میں اگر خلفشارِ آب نہ ہو
سروں پہ سایہ فگن یہ غبارِ آب نہ ہو

وہ آسمان سمجھتا ہے اپنی آنکھوں کو
اسے بھی میری طرح انتظارِ آب نہ ہو

ہر ایک لب پہ ہیں نغمات خشک سالی کے
اب اس طرف کرم بے شمارِ آب نہ ہو

کہیں فریب نہ نکلے پکار دریا کی
ہم آب سمجھے ہیں جس کو غبارِ آب نہ ہو

پھر اہتمام سے آئے ہیں گھر کے ابر مگر
وہ کیا کرے کہ جسے اعتبارِ آب نہ ہو

سیاہ ہونے لگا ہے دیارِ تشنہ لبی
اب اس مقام سے روشن شرارِ آب نہ ہو

جو گھر سے نکلا ہے پانی کی کھوج میں شاہد
کہیں وہ دفن سرِ رہگزارِ آب نہ ہو

صدر شعبۂ نباتات گورنمنٹ کالج بانسواڑہ (راجستھان)



ظہیر انور

بھلا دے جو بھی ہوا، اس قدر ملال نہ کر
ذرا سی بات پہ یوں دل سے انتقال نہ کر

چھپا کے کاسہ، گزر جا تہی نظر ہو کر
گداگروں کے نگر میں کوئی سوال نہ کر

ترا خلوص سلامت یہ میرا ظرف بھی دیکھ
میں خود سنبھل نہ سکوں، اس قدر نہال نہ کر

زیادہ اونچا ہوا تو شجر ہے بے سایہ
مجھے حدود میں رہنے دے، بے مثال نہ کر

طبیب تھک چکے، رسوا ہوئیں دوائیں سب
خبر سنا کے یہ، بیمار کو نڈھال نہ کر

گزر رہا ہے مہینے کا آخری ہفتہ
پلا سکا نہ تجھے چائے کچھ خیال نہ کر

۱۳۔ اندرا نگر۔ جے پی روڈ، اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۵۸

فرمان فتح پوری

سی-۲۸، بلاک ۱۳ ڈی، گلشن اقبال کراچی-۲۷ (پاکستان)

خواجہ احمد عبّاس، ایک امر قلمکار

خواجہ احمد عباس اُردو کے ان بڑے قلمکاروں میں ہیں جو کبھی امر رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی وفات سے کم و بیش تیس سال پہلے اپنے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے ایک انٹرویو مطبوعہ افکار کراچی میں کہا تھا کہ

"تاریخِ پیدائش جون ۱۴، ۱۹۱۴ء ہے تاریخِ وفات ابھی معلوم نہیں"۔

ان کی وفات کو دو سال سے زیادہ ہو گئے۔ اب بھی اکثر کو ان کی تاریخِ وفات صحیح طور پر نہیں معلوم۔ معلوم بھی ہو تو لکھنے والوں نے اغماز برتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ خواجہ احمد عباس مرحوم جیسے ہمہ جہت قلم کار ہو، متوفی کہنے پر ابھی ان کا دل رضامند نہیں ہوتا۔

تبھی ان کی وفات کے فوراً بعد جب "نگار پاکستان" (کراچی) نے جولائی ۱۹۸۷ء کے شمارے کو خواجہ احمد عباس کے لیے وقف کیا اور "خواجہ احمد عبّاس ایڈیشن" کا نام دے کر ادیبوں اور ادبی پرچوں کو ان کی شخصیت اور کارناموں کی طرف توجہ دلائی تو ان کے نام کے آگے قوسین میں ۱۹۱۴ء تا ۱۹۸۷ء لکھ دیا گیا، لیکن تاریخِ وفات کا ذکر واضح طور پر نہیں آیا۔

بعد ازاں دسمبر ۱۹۸۷ء میں "ایوانِ اردو" دہلی نے سیّد شریف الحسن نقوی کی زیرِ ادارت اور مارچ ۱۹۸۹ء میں "دریافت" نے وزیر پانی پتی اور مخدوم منوّر کی زیرِ ادارت، شاندار اور بھرپور "خواجہ احمد عباس نمبر" شائع کیے۔ ان نمبروں میں خواجہ احمد عباس کی زندگی کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ لیکن تاریخِ وفات کا ذکر نہیں کیا گیا۔

خدا بھلا کرے اردو کے ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم کا جنھوں نے اپنے ایک مضمون میں ضمناً اتنا لکھ دیا کہ

"قدرت کو شاید یہی منظور تھا کہ میں خواجہ صاحب سے ان کے انتقال سے ڈیڑھ دن پہلے آخری بار مل لوں بس اتفاق ہی تھا کہ میں ان کے گھر کے سامنے گزر رہا تھا، مئی کی ۲۹ تاریخ تھی (عید کا دوسرا دن) شام کے ۶ بجے ہوں گے...... خیال آیا کہ کیوں نہ خواجہ صاحب سے عید کی ملاقات کر لی جائے، واقعی عید ہو گئی"۔

نرسنگ ہوم سے فلومینا (خواجہ صاحب کے گھر کی عمارت کا نام ہے) واپس آئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ۳۰ مئی کو رات میں انھیں پھر نرسنگ ہوم پہنچانا پڑا اور پہلی جون کا سورج طلوع ہونے سے پہلے ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۷ء کی یہ تاریخ مجھے اس لیے یاد رہے گی کہ اس دن خواجہ صاحب سے آخری ملاقات ہنستے بولتے ہوئی تھی"۔

ان سطور میں سن ہجری اور عیسوی دونوں کی رو سے خواجہ صاحب کی وفات کی تاریخ اور دن کا سراغ مل جاتا ہے۔ اب اگر خواجہ احمد عباس جیسے بڑے قلمکار کی تاریخِ انتقال یا زندگی کے مکمل ریکارڈ کو محفوظ رکھنا، ادبی مورّخ کے لیے ضروری ہو تو، وہ اوپر کی تفصیلات سے بخوبی اپنا کام نکال سکتا ہے۔

پاکستان میں خواجہ احمد عباس کی وفات کی خبر قدرے تاخیر سے پہنچی پھر بھی ان کے مدّاحوں اور ادب دوستوں نے انھیں خراجِ تحسین پیش کرنے میں دیر نہیں کی۔ "انجمن ترقی پسند مصنفین" کراچی کے زیرِ اہتمام جمعرات ۱۰ جون ۱۹۸۷ء بوقت ۵ بجے شام ادارہ یادگارِ غالب میں راقم الحروف کی زیرِ صدارت

ایک تعزیتی جلسہ ہوا۔ ڈاکٹر حنیف فوق، پروفیسر عتیق احمد، حسن عابدی اور وزیر پانی پتی نے تقریریں کیں۔

تقاریر میں اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ خواجہ احمد عباس کے بارے میں لکھنے لکھانے، رسائل کے خصوصی نمبر شائع کرنے اور پاکستان میں ان کی کتابوں کو دستیاب بنانے پر خاص توجہ دی جائے۔ "نگار پاکستان" نے اس سلسلے میں پہل کی اور جولائی ۱۹۸۷ء کا پورا پرچہ خواجہ احمد عباس کے لیے وقف کیا گیا۔ بعد ازاں دوسرے پرچوں کے خصوصی ایڈیشن بھی شائع ہوئے اور ان کی بعض تحریریں بھی منظر عام پر آئیں۔

خواجہ احمد عباس کی تحریریں فکر و نظر کے اعتبار کس نوع کی ہیں اور انسان، زندگی اور کائنات کے رشتوں کے حوالے سے ان کی سوچ کا انداز کیا تھا۔ اس سلسلے میں خود ان کی تحریریں اتنی واضح ہیں کہ چنداں کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر بھی بہت سے لوگوں نے اس باب میں لکھا ہے اور یقیناً آئندہ بھی لکھا جائے گا۔ لیکن عام قاری کو یہ سب پڑھنے کی ضرورت نہیں، اگر خواجہ احمد عباس کے مشہور ناول "انقلاب" کا صرف انتساب دیکھ لیا جائے تو پورا اندازہ ہو جائے گا کہ ادب سے ان کا منٹ منٹ کس طرح کا تھا اور طرز فکر و نقطۂ نظر کے اعتبار سے وہ کس قسم کے ادیب و قلم کار تھے۔ "انقلاب" کا یہ انتساب بیگم خواجہ مرحوم کے نام پر ہے اور اس طور پر ہے۔

" اپنی بیوی، دوست اور ساتھی مجتبائی خاتون مرحومہ کے نام

وہ جو پاس ہوکر دور ہو گئی   وہ جو دور ہوکر اور پاس ہو گئی

اس انتساب میں خواجہ نے اپنی بیگم کو بیوی، دوست اور ساتھی کہہ کر اپنے تصورِ حیات کے وہ سارے زاویے یا نکتے سمو دیے ہیں جنھیں سماجی انصاف، انسان دوستی اور تمدنی مساوات کی آرزومندیوں اور خوابوں کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ یہ تینوں نکاتِ حیات یا آدرش ان کی تمام تحریروں کے اجزائے لاینفک ہیں اور ان کی ساری تحریروں میں نمایاں اور جاری و ساری ہیں

اس انتساب کے یہ دو فقرے

وہ جو پاس ہوکر دور ہو گئی   وہ جو دور ہوکر اور پاس ہو گئی

کتنے فکرانگیز، کیسے معنی خیز، کتنے مختصر و دلکش اور کیسے حیات افروز و درد انگیز ہیں! دونوں فقرے اس بات کا واضح سراغ دیتے ہیں کہ خواجہ احمد عباس تخلیقی ذہن کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ و مفکرانہ طبیعت کے مالک تھے اور کم سے لفظوں میں بہت گہری باتیں ایسے سلیقے اور دل کشی کے ساتھ کہہ دیتے تھے کہ دوسرے طول طویل عبارتوں میں بھی نہیں کہہ سکتے ان کی سوچ اور طرز نگارش کی بھی وہ خصوصیت ہے جس نے ان کی ساری تحریروں کو خواہ ہندی میں ہوں یا اردو اور انگریزی میں، خواہ افسانہ و ناول نگاری سے ان کا تعلق ہو خواہ صحافت و فلم سے، قاری کے لیے جاذبِ نظر اور توجہ طلب بنائے رکھا ہے

خواجہ احمد عباس میں بہت سی خوبیاں تھیں اور ان کے ذہن و قلم کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ اسی لیے نثر اردو کی کئی اصناف کے تاریخی جائزے میں ان کا ذکر کیا جائے گا لیکن اردو ادب میں اگر ان کا نام مستقلاً جگہ پائے گا تو وہ صرف فکشن یعنی ناول اور افسانے کے حوالے سے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز فکشن ہی کے ذریعے کیا تھا۔ اس کو انھوں نے زندگی بھر موضوع قلم بنایا ہے اور اسی کی بدولت وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

خواجہ احمد عباس نے ابابیل کے نام سے ایک کہانی ۱۹۳۵ء میں لکھی تھی۔ یہ کہانی اگرچہ ان کی پہلی کہانی تھی لیکن اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ وہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں منتقل کی گئی۔ یہ کہانی دراصل ایک ظالم کسان کی زندگی سے متعلق ہے اور اس وقت لکھی گئی ہے جب کہانی نگار کو کسانوں کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر معلومات نہ تھی، البتہ علیگڑھ سے سوشل سروس کے بہانے وہ دیہات جایا کرتے تھے اور اسی آمد و رفت میں ان کے تیز مشاہدے نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو "ابابیل" کی صورت میں ان کی تخلیق بن کر اردو فکشن کا شاہکار شمار کیا گیا۔

خواجہ احمد عباس کی اس ابتدائی تخلیق ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے وہ کیسی حساس اور خلاق طبیعت کے مالک تھے۔ انسانی محبت کا جذبہ ان میں اتنا فطری اور طاقتور تھا کہ رنگ و نسل و مذہب یا کسی نوع کا سیاسی و سماجی نظریہ اس کی راہ میں حائل نہ ہو سکتا تھا۔ اگر ان کا کامٹ منٹ کسی نظریے کے ساتھ تھا وہ صرف انسان اور انسان دوستی، رواداری، بھائی چارہ اور مساوات سے تھا اور دنیائے انسانیت کے لیے اگر ان کا کوئی پیغام تھا تو وہ صرف امن، آشتی اور اخوت و محبت کا پیغام تھا۔

کہنے کو تو خواجہ احمد عباس سوشلسٹ اور مارکسٹ کہلائے لیکن ان کا تاریخی شعور اور طبعی میلان، ان محدودات کا اسیر ہو کر نہ رہ سکتا تھا۔ وہ کامٹ منٹ

کو کسی مصلحت کی بھینٹ چڑھانے پر رضامند نہ تھے خواہ یہ مصلحت بظاہر کیسی ہی مفکرانہ اور مدبرانہ کیوں نہ رہی ہو۔ وہ ہر قسم کے تدبّر و تفکّر اور فلسفۂ حیات کو ہر صورت میں انسان دوستی کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔ غالباً اسی لیے نظریات کے سارے پرستار، کیا اپنے یا پرائے، دونوں، ان سے ناراض تھے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر ان کے کردار پر صادق آتا ہے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش   میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

خواجہ احمد عباس کی اس منفرد ذہنی تعمیر میں جو باتیں محرک کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں، ان کی وضاحت بعض لکھنے والوں نے کچھ اس طرح کی ہے کہ کام کی اصل باتیں پسِ پردہ چلی گئی ہیں اور غیر ضروری باتیں سطح پر تیرنے لگی ہیں۔ ایسے میں اگر ان کے ذہنی محرکات کو بالاختصار بیان کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ ان محرکات میں درج ذیل خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) گھر کا ادبی و تہذیبی ماحول جس نے سماج اور ادب کے رشتوں کو جبلّی اور جذباتی سطح پر سمجھنے کا موقع دیا۔

(۲) ملک کا وہ سیاسی ماحول جس میں قومی تحریکوں اور آزادی کی لہروں نے تموّج پیدا کر رکھا تھا اور اس تموّج نے ان کے جذبہ حب الوطنی کو مہمیز کیا۔

(۳) بچپن سے صحت کی خرابی اور جسمانی آزار جس کے تحت انھوں نے قوم و ملک کی اصلاح کے لیے جلد سے جلد کچھ کر گزرنے کی شعوری کوشش کی۔

(۴) محبت میں ناکامی جس کی تصعید اور ترفّع کی خاطر انھوں نے میر تقی میر کے اس شعر

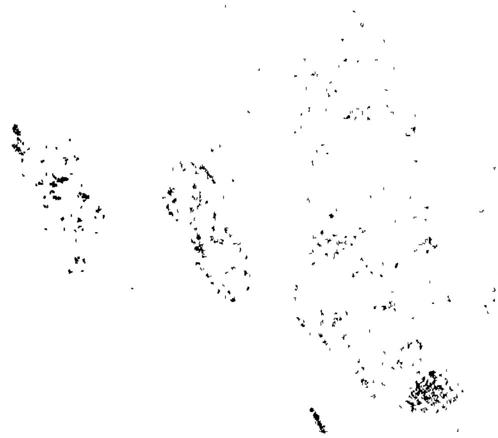
بڑے سلیقے سے مری نبھی محبت میں   تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

کے مطابق زندگی بسر کرنے کو پسند کیا

(۵) گھر کے بزرگوں کے زیر اثر لکھنے پڑھنے اور کتابوں کے درمیان زندگی گزارنے کا شوق جو آخر آخر ان کی عادت ثانیہ بن گیا۔

ان محرکات نے خواجہ احمد عباس کی شخصیت اور ذہن کو جس قالب میں ڈھالا وہ ایک محب وطن اور انسان دوست اہلِ قلم کا قالب تھا۔ اس قالب میں اچھے اور سچے فنکار، شاعر ادیب، نقّاد، افسانہ نگار، ناول نویس، صحافی، اور فلم ساز سبھی چھپے تھے۔ جیسے ہی انھیں موقع ملا سب کے سب نکل پڑے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے انداز سے انسانی تعمیر اور سماجی اصلاح کے لیے آگے قدم بڑھایا شاید یہی ہمہ گیر و ہمہ جہت اور وحدد رجہ بے باکانہ و مردانہ اقدام تھا جس کے سبب ان کے بعض ناقدین، جن کے نزدیک نظریاتی پاسداری کے آگے دوسری انسانی اقدار کوئی اہمیت نہ رکھتی تھیں، خواجہ احمد عباس کو طنز و تعریض کا نشانہ بنایا۔

نظریے کے پرستار بعض ادیبوں اور ناقدوں کے نزدیک خواجہ احمد عباس محض ایک اخبار نویس، صحافی اور ایک عوام دوست معمولی درجے کے ادیب تھے۔ اعلیٰ درجے کے ادب حتیٰ کہ معیاری فکشن نگاری سے بھی ان کا کوئی خاص تعلق نہ تھا۔ ایسے ناقدین کو خواجہ احمد عباس کے بعض انٹرویو اور خود نوشت کے ساتھ ساتھ ان کا ایک مکالمہ بھی ضرور پڑھنا چاہیے۔ یہ مکالمہ خواجہ احمد عباس اور کرشن چندر کے مابین ہے اور ان کے افسانوی مجموعے "دیا جلے ساری رات" میں شامل ہے۔ یہ جولائی ۱۹۷۷ء کے نگار میں بھی پورے کا پورا نقل ہوا ہے۔ اس میں خواجہ احمد عباس نے اپنے معترضین کو بہت مدلّل جواب دیے ہیں اور تخلیقی فنکار ہونے کے ساتھ ایک صاحبِ نظر نقّاد ہونے کا بھی ثبوت دیا ہے۔



خواجہ احمد عباس ایک نظر میں

❀

○ نام: احمد عباس
○ قلمی نام: خواجہ احمد عباس
○ پیدائش: ۷ر جون ۱۹۱۴ء
○ وطن: پانی پت [ہریانہ]
○ تعلیم: ابتدائی تعلیم [پانی پت]

۸ ویں جماعت تا ایل ایل بی انٹرمیڈیٹ کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بی۔ اے، ایل ایل بی کے دوران "نیشنل کال" اور ہندوستان ٹائمز میں بلا معاوضہ کام کیا [۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۵ء] اپنا ذاتی ہفت روزہ: ALIGARH OPINION جاری کیا۔ ۱۹۳۵ء میں بمبئی آگئے اور "بمبئی کرانیکل" میں کام کرنا شروع کیا۔ دو سال تک فلم کریٹک رہے۔ اسی اخبار کے سنڈے ایڈیشن کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور ایک کالم LAST PAGE [آخری صفحہ] شروع کیا جو ۱۹۴۱ء میں بلٹز میں منتقل کر دیا گیا۔ تین سال بعد ہندی بلٹز اور اردو بلٹز میں بھی کالم شروع کیا گیا۔

○ شادی: ۱۹۴۲ء میں اپنی رشتہ دار مجتبائی خاتون سے کی جو ۱۹۵۸ء میں دل کے آپریشن کے بعد انتقال کر گئیں۔

○ پہلا فلم: "دھرتی کے لال" جسے انھوں نے لکھا، پروڈیوس کیا اور فلم کی ڈائرکشن بھی دی۔ فرقہ وارانہ فسادات کے سبب فلم چل نہیں سکی اور وہ مقروض ہو گئے۔

○ دیگر فلمیں: تین چار سال بعد ایک اور فلم بنائی "انہونی" جو بہت کامیاب ہوئی۔ اس کے بعد ۱۳ مزید فلمیں بنائیں لیکن کامیاب نہیں ہو سکیں مگر "شہر اور سپنا" [۱۹۶۳ء] کو پریزیڈنٹ گولڈ میڈل ملا، راج کپور کے لیے کئی فلمیں لکھیں۔

○ وفات: یکم جون ۱۹۸۷ء۔

○ پہلا افسانہ: ابابیل [سالنامہ ادب لطیف لاہور مطبوعہ ۱۹۳۵ء]

تصانیف

1. I WRITE AS I FEEL (IST LAST PAGE COLLECTION)
2. OUTSIDE INDIA
3. TOMORROW IS OURS (NOVEL)
4. AN INDIAN LOOKS AT AMERICA
5. LET INDIA FIGHT FOR FREEDOM
6. INVITATION TO IMMORALITY (A PLAY)
7. AND ONE DID NOT COME BACK (NOVEL) (STORY OF DR. KOTNIS)
8. FACE TO FACE WITH KHRUSHCHOV
9. TILL WE REACH THE STARS (ON GAGARIN)
10. INQILAB (NOVEL)
11. THE BLACK SUN AND OTHER STORIES (SHORT STORIES)
12. ONE THOUSAND NIGHTS ON THE BED OF STONE (SHORT STORIES)
13. THE MOST BEAUTIFUL WOMAN OF THE WORLD (SHORT STORIES)
14. HOW THE FILMS ARE MADE (ON FILMS)
15. WHEN NIGHT FALLS (NOVEL)
16. INDIRA GANDHI : THE LAST POST
17. THAT WOMAN (ON INDIRA GANDHI)
18. I AM NOT AN ISLAND (AUTOBIOGRAPHY)
19. MAD, MAD, MAD WORLD OF FILMS (ON FILMS)
20. BOBBY (NOVEL)
21. THE WORLD IS MY VILLAGE
22. BREAD, BEAUTY AND REVOLUTION (2ND LAST PAGE COLLECTION)
23. BOMBAY (ON BOMBAY)

مسافر کی ڈائری [ڈائری] محمد علی [سوانح] مسولینی اور فاشزم [سیاسی] ایک لڑکی [افسانے ۱۹۴۰ء] زعفران کے پھول [افسانے ۱۹۴۸ء] میں کون ہوں [افسانے ۱۹۴۹ء] گیہوں اور گلاب [افسانے] پاؤں میں پھول [افسانے] کہتے ہیں جس کو عشق [افسانے ۱۹۵۲ء] دیا جلے ساری رات [افسانے ۱۹۵۸ء] چار دل چار راہیں [افسانے] پانچ دن پیار کے [افسانے] پیار کی پکار [افسانے] ہاؤس الف لیلیٰ [طویل افسانے] چراغ تلے اندھیرا [افسانے] اندھیرا اجالا [ناولٹ] پیرس کی ایک شام [افسانے] بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں [افسانے] زبیدہ [ڈرامہ] شیشے کی دیواریں [ناول] تین پہیے، ایک پہلا شب اور دنیا بھر کا کچرا [ناولٹ ۱۹۶۲ء] انقلاب [ناول ۱۹۷۵ء] نئی دھرتی نئے انسان [افسانے ۱۹۷۷ء] بمبئی رات کی بانہوں میں [ناول] میرا نام جوکر [ناول] سات ہندوستانی [ناول] فاصلہ [ناول] نیلی ساڑی [افسانے] سونے چاندی کے بت [مضامین، خاکے اور کہانیاں ۱۹۸۸ء] خواجہ احمد عباس کے بہترین افسانے۔ بھارت ہے [ڈرامہ]

خواجہ احمد عباس کی تصانیف کی یہ فہرست جناب وحید انور [بھوپال] نے فراہم کی ہے۔ کتابوں کا سنہ اشاعت اور ان کی ترتیب اب بھی تحقیق طلب ہے۔ دستیاب کتابوں کا سن اشاعت درج کر دیا گیا ہے۔ [ادارہ]

خواجہ احمد عباس

اپنی موت

[illegible] کے بیچ میں کر سرہانے لے گئے

نہیں۔ یہ میری موت ہے۔ پرانے "میں" کی موت۔ میرے تعصبات کی موت، اس منافرت کی موت جو میرے دل میں تھی۔

میری یہ موت کیسے ہوئی؟ یہ بتانے کے لئے مجھے اپنے پرانے مردہ "میں" کو زندہ کرنا پڑے گا۔

میرا نام شیخ برہان الدین ہے۔

جب دہلی اور نئی دہلی میں فرقہ وارانہ قتل و غارت کا بازار گرم تھا اور مسلمانوں کا خون سستا ہو گیا تھا، میں نے سوچا [illegible] پڑوسی بھی [illegible] سکھ۔ مجھ بھاگی اور کرنا اور جان بچانا تو کجا، نہ جانے کب کرپان بھونک دے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت تک میں سکھوں پر ہنستا بھی تھا، ان سے ڈرتا بھی تھا اور کافی نفرت بھی کرتا تھا۔ آج سے نہیں، بچپن سے۔ میں شاید چھ برس کا تھا جب پہلی بار میں نے ایک سکھ کو دیکھا تھا جو دھوپ میں بیٹھا اپنے بالوں میں کنگھی کر رہا تھا۔ میں چلا پڑا "امی وہ دیکھو عورت کے منہ پر کتنی لمبی داڑھی!" جیسے جیسے عمر گزرتی گئی یہ استعجاب ایک نسلی نفرت میں تبدیل ہوتا گیا۔ گھر کی بڑی بوڑھیاں جب کسی بچے کے بارے میں نامبارک بات کا ذکر کرتیں، مثلاً یہ کہ اسے نمونیہ ہو گیا تھا، یا اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی تو کہتیں "اب سے دور کسی سکھ فرنگی کو نمونیہ ہو گیا تھا یا اب سے دور کسی سکھ فرنگی کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کوسنا [illegible] کی یادگار تھا جب ہندو مسلمانوں کی جنگِ آزادی کو دبانے میں پنجاب کے سکھ راجوں اور ان کی فوجوں نے فرنگیوں کا ساتھ دیا تھا۔ مگر اس وقت تاریخی حقائق پر نظر نہیں تھی، صرف ایک مبہم سا خوف، ایک عجیب سی نفرت اور ایک عمیق تعصب۔ ڈر [illegible] سے بھی [illegible] زیادہ۔ مثلاً جب میں کوئی دس برس کا تھا، ایک روز دہلی سے علی گڑھ جا رہا تھا۔ ہمیشہ تھرڈ یا انٹر میں سفر کرتا تھا۔ سوچا کہ اب کی بار سکنڈ کلاس میں سفر کر کے دیکھا جائے۔ ٹکٹ لے لیا اور ایک خالی ڈبے میں بیٹھ کر گدوں پر خوب کودا، باتھ روم کے آئینے میں اچک اچک کر اپنا عکس دیکھا۔ سب پنکھوں کو ایک ساتھ چلا دیا، روشنیوں کو کبھی جلایا، کبھی بجھایا۔ مگر ابھی گاڑی چلنے میں دو تین منٹ باقی تھے کہ لال لال منہ والے چار فرنگی بوڑھے آپس میں غیر ملکی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے ڈبے میں گھس آئے۔ ان کو دیکھنا تھا کہ سکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا شوق رفوچکر ہو گیا اور اپنا سوٹ کیس گھسیٹتا ہوا میں بھاگا اور ایک نہایت کھچا کھچ بھرے ہوئے تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس گیا۔ یہاں دیکھا تو کئی سکھ داڑھیاں کھولے [illegible] بیٹھے تھے۔ مگر میں ان سے ڈر کر وہ ڈبہ چھوڑ کر نہیں بھاگا۔ صرف ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گیا۔

ڈر تو سکھوں سے بھی لگتا تھا مگر [illegible] سے [illegible]۔ مگر اگر یہ [illegible] تھے تو سکھ [illegible] جو میں [illegible] جاتا تھا۔ وہ [illegible] بولی بولتے تھے جو میں کبھی سمجھ نہ پاتا تھا۔ اس کے علاوہ [illegible]

تمیز کتنے عجیب الخلقت تھے، بجائے اس کے کہ [illegible] سر کے بال [illegible] کی طرح لمبے رکھتے تھے۔ [illegible] باشبہ کہ انگریزی فیشن کی نقل میں سر کے بال منڈانا کچھ مجھے بھی پسند نہیں تھا، [illegible] ہر جمعہ کو سر کے بال [illegible] کرائے جائیں۔ میں نے یہ بال خوب بڑھا رکھے تھے تاکہ ہاکی اور فٹ بال کھیلتے وقت بال ہوا میں اڑیں جیسے انگریزی کھلاڑیوں کے۔ ابا کہتے: "یہ کیا عورتوں کی طرح پٹے بڑھا رکھے ہیں۔" مگر ابا تو ٹھہرے ہی پرانے دقیانوسی خیال کے۔ ان کی بات کون سنتا تھا۔ ان کا بس چلتا تو سر پر استرا چلوا کر بچپن میں بھی ہمارے چہروں پر داڑھیاں بڑھوا دیتے ......

ہاں اس پر یاد آیا کہ سکھوں کے عجیب الخلقت ہونے کی دوسری نشانی ان کی داڑھیاں تھیں، اور پھر داڑھی داڑھی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً ابا کی داڑھی جس کو نہایت اہتمام سے نائی فرنچ کٹ بنایا کرتا تھا یا نانا ابا کی جو نکیلی اور چھوٹی سی تھی۔ مگر یہ بھی کیا کہ داڑھی کو کبھی قینچی لگے ہی نہیں، جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھتی ہی رہے، [illegible] اور نہ جانے کیا کیا [illegible] اور جب کئی فٹ لمبی ہو جائے تو اس میں کنگھی کی جائے جیسے عورتیں اپنے سر کے بالوں میں کرتی ہیں...... عورتیں یا مجھ جیسے اسکول کے فیشن ایبل لڑکے۔ اس کے علاوہ دادا جان کی داڑھی بھی کئی فٹ لمبی تھی اور وہ بھی اس میں کنگھی کرتے رہتے۔ مگر دادا جان کی بات اور تھی۔ آخر وہ ...... میرے دادا جان ٹھہرے اور سکھ پھر سکھ تھے۔

میٹرک کرنے کے بعد مجھے پڑھنے لکھنے کے لئے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھیجا گیا۔ کالج میں جو پنجابی لڑکے پڑھتے تھے ان کو ہم دہلی اور یو پی والے نیچ، جاہل اور اجڈ سمجھتے تھے۔ نہ بات کرنے کا سلیقہ، نہ کھانے پینے کی تمیز، تہذیب و تمدن چھو نہیں گئے تھے۔ گنوار، لٹھ [illegible] بڑے بڑے لسی کے گلاس پینے والے بھلا کیوڑہ پڑے فالودے اور لپٹن کی چائے کی لذت کیا جانیں۔ زبان نہایت ناشائستہ۔ بات کریں تو معلوم ہو لڑ رہے ہیں۔ اسی، تسی، ساڈے، تہاڈے ...... لاحول ولا قوۃ۔ میں تو ان پنجابیوں سے کتراتا تھا مگر خدا بھلا کرے ہمارے وارڈن صاحب کا کہ انہوں نے ایک پنجابی کو میرے کمرے میں جگہ دے دی۔ میں نے سوچا جب ساتھ رہنا ہی ہے تو تھوڑی بہت حد تک دوستی ہی کر لی جائے۔ کچھ دنوں میں کافی گاڑھی چھننے لگی۔ اس کا نام غلام رسول تھا۔ راولپنڈی کا رہنے والا تھا۔ کافی مزے دار آدمی تھا اور لطیفے خوب سنایا کرتا تھا۔

اب آپ کہیں گے ذکر تو ہو رہا تھا سردار صاحب کا، یہ غلام رسول کہاں سے ٹپک پڑا۔ مگر اصل میں غلام رسول کا اس قصے سے قریبی تعلق ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ جو لطیفے سنایا کرتا تھا وہ عام طور سے سکھوں کے بارے میں ہوتے تھے جن کو سن کر مجھے پوری سکھ قوم کی عادات و خصائل، ان کی نسلی خصوصیات اور [illegible] کا بخوبی علم ہو گیا تھا۔ بقول غلام رسول کے:۔

سکھ تمام بیوقوف اور بدھو ہوتے ہیں۔ بارہ بجے تو ان کی عقل بالکل خبط ہو جاتی ہے۔ اس کے ثبوت میں کئی واقعات بیان کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ایک سردار جی دن کے بارہ بجے سائیکل پر [illegible] جا رہے تھے [illegible] ایک سکھ کانسٹیبل نے [illegible] "[illegible] کی بتی کہاں ہے؟" سائیکل والے [illegible] "[illegible] صاحب ابھی [illegible]

ہے مگر [illegible] بارہ بجا تھا۔" اس پر [illegible] ایک [illegible] سفید داڑھی والے سردار جی نے [illegible] اور [illegible] اور اسی طرح کے بیسیوں لطیفے غلام رسول [illegible] اور انہیں جب وہ پنجابی مکالموں کے ساتھ سناتا تھا تو سننے والوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ اصل میں ان کے لطیفے کا مزہ پنجابی ہی میں تھا کیونکہ سکھوں کی عجیب و غریب حرکتوں کے بیان کرنے کا [illegible] پنجابی [illegible] سکتا ہے۔

سکھ نہ صرف بیوقوف اور بدھو تھے بلکہ گندے بھی [illegible] ایک ثبوت تو غلام رسول کا یہ [illegible] سیکڑوں سکھوں کو دیکھا تھا [illegible] وہ بال نہیں منڈاتے تھے۔ اس کے علاوہ برخلاف ہم مسلمانوں کے [illegible] کے جمعہ کو غسل کرتے ہیں، یہ سکھ کچھا باندھے [illegible] نل کے نیچے بیٹھ کر نہاتے تو روز ہیں مگر اپنے بالوں اور داڑھی میں نہ جانے کیا کیا گندی اور غلیظ چیزیں ملتے ہیں۔ مثلاً دہی۔ ویسے تو میں بھی سر میں [illegible] لگاتا ہوں جو کسی قدر [illegible] سے مشابہ ہوتی ہے مگر اس کی بات اور ہے۔ وہ ولایت کی مشہور پرفیومری سے نہایت خوبصورت شیشی میں آتی ہے اور دہی کسی گندے سندے حلوائی کی دکان سے۔

خیر جی ہمیں دوسروں کے رہنے سہنے کے طریقوں سے کیا لینا، مگر سکھوں کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ لوگ اکڑفوں، بدتمیزی اور مار دھاڑ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی جرأت کرتے تھے۔ اب دنیا جانتی ہے کہ ایک اکیلا مسلمان دس ہندوؤں یا سکھوں پر بھاری ہوتا ہے۔ مگر یہ سکھ مسلمانوں کے رعب کو نہیں مانتے تھے۔ کرپانیں لٹکائے اکڑ اکڑ کر مونچھوں بلکہ داڑھی پر بھی تاؤ دیتے پھرتے تھے۔ غلام رسول کہتا ان کی ہیکڑی ایک دن ہم ایسی نکالیں گے کہ خالصہ جی یاد ہی کریں گے۔

کالج چھوڑے کئی سال گزر گئے۔ طالب علم سے میں کلرک اور کلرک سے ہیڈ کلرک بن گیا۔ علی گڑھ کا ہوسٹل چھوڑ کر دہلی میں ایک سرکاری کوارٹر میں رہنا سہنا اختیار کیا۔ شادی ہو گئی، بچے ہو گئے، مگر کتنی ہی مدت کے بعد مجھے غلام رسول کا دوبارہ [illegible] آیا جب ایک سردار صاحب پڑوس [illegible] کوارٹر میں رہنے کو آئے ...... یہ راولپنڈی سے بھاگ کر آئے تھے۔ راولپنڈی کے ضلع میں غلام رسول کی پیشین گوئی کے مطابق سرداروں کی ہیکڑی اچھی طرح سے نکالی گئی تھی۔ مجاہدوں نے ان کا صفایا کر دیا تھا۔ بڑے سورما بنتے تھے، کرپانیں لئے پھرتے تھے۔ جانباز مسلمانوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ ان کی داڑھیاں مونڈ کر ان کو مسلمان بنایا گیا تھا، زبردستی ان کا ختنہ کیا گیا تھا۔ ہندو پریس [illegible] مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لئے [illegible] کہ سکھ عورتوں اور بچوں کو بھی مسلمانوں نے قتل کیا ہے۔ حالانکہ یہ اسلامی روایات کے خلاف ہے۔ کوئی مسلمان [illegible] عورت [illegible] پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ رہی عورتوں اور بچوں کی لاشوں کی تصویریں [illegible] تو وہ [illegible] مسلمانوں کو بدنام کرنے [illegible] عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہوگا۔ راولپنڈی [illegible] یہ بھی الزام [illegible] ہندو اور سکھ [illegible]

ماں کر، اور صرف وقت ہے کہ مسلمانوں کی جو عزت کی دھاک جمی ہے وہ اگر زمان مسلمانوں پر ہندو اور سکھ لڑکیاں بھی ہی لٹو ہو جائیں تو ان کا کیا قصور ہے کہ وہ شکل اسلام کے حلقے میں اور لڑکیوں کو اپنی پناہ میں لے لیں تو سکھوں کی تمام ننگ بہادری کا جنازہ ہو گیا تھا۔ سیدھا اسٹر کیا بیٹو کہ ہندو ہی کہ ان کال کر مسلمانوں کو ٹھکیاں دے۔ ہندی سے بھاگے ہوئے سردار اس کی خدمت کو دیکھ کر میرا سینہ عظمت اسلام کی روشنی سے بھر گیا۔

ہمارے پڑوسی سردار جی کی عمر کوئی ساٹھ برس کی ہو گی۔ داڑھی بالکل سفید ہو چکی تھی، حالانکہ موت کے منہ سے بچ کر آئے تھے۔ مگر حسرت برداشت دانت نکالے ہنستے رہتے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دراصل کتنا بے وقوف اور بے حس ہے۔ شروع شروع میں انھوں نے مجھ سے اپنی دوستی کے جال میں پھنسانا چاہا۔ آتے جاتے زبردستی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ بہانے سکھوں کا کوئی ساتھ ہو رہا تھا، اس دن پرشاد کی مٹھائی بھی بھیجی (جو میری بیوی نے فوراً مہترانی کو دے دی) پر میں نے زیادہ منہ نہ لگایا۔ کوئی بات ہوتی تو کھا سا جواب دیا اور بس۔ میں جانتا تھا کہ سیدھے منہ دو چار باتیں کر لیں تو یہ بے تکلف ہونے لگے گا۔ آج باتیں تو کل گالم گفتار۔ گالیاں تو آپ جانتے ہی ہیں ان سکھوں کی دال روٹی ہوتی ہے۔ کون اپنی زبان گندی کرے۔ ایسے لوگوں سے ملاقات بڑھا کر۔ ہاں ایک اتوار کی دوپہر کو میں اپنی بیوی کو سکھوں کی حماقت کے قصے سنا رہا تھا۔ اس کا عملی ثبوت دینے کے لئے عین بارہ بجے میں نے نوکر کو سردار جی کے ہاں بھیجا یہ پوچھنے کے لئے کہ کیا بجا ہے۔ انھوں نے کہلوا دیا "بارہ بج کر دو منٹ ہوئے ہیں"۔ میں نے کہا "بارہ بجے کا نام لیتے گھبراتے ہیں"۔ اور ہم خوب ہنسے۔ اس کے بعد میں نے کئی بار بیوقوف بنانے کے لئے سردار جی سے پوچھا "کیوں سردار جی! بارہ بج گئے؟" اور وہ بے شرمی سے دانت نکال کر جواب دیتے "ہمارے تو اس وقت بارہ بجے رہتے ہیں"۔ اور یہ کہہ کر خوب ہنسے۔ گویا یہ بڑا مذاق ہوا۔

مجھے سب سے زیادہ ڈر بچوں کی طرف سے تھا۔ اول تو کسی سکھ کا اعتبار نہیں کب بچے ہی کے گلے پر کرپان چلا دے۔ پھر یہ لوگ راولپنڈی سے آئے تھے۔ ضرور دل میں مسلمانوں کی طرف سے کینہ رکھتے ہوں گے اور انتقام لینے کی تاک میں ہوں گے۔ میں نے بیوی کو تاکید کر دی تھی کہ بچے ہرگز سردار جی کے گھر کی طرف نہ جانے دئے جائیں۔ پر بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ چند دنوں کے بعد میں نے دیکھا کہ سردار کی چھوٹی لڑکی موہنی اور ان کے پوتوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ وہ بچی جس کی عمر مشکل سے دس برس کی ہو گی، بالکل گڑیا سی لگتی تھی۔ گوری چٹی، اچھے ناک نقشہ۔ بڑی خوبصورت۔ کمبخت سکھوں کی عورتیں کافی خوبصورت ہوتی ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ غلام رسول کہا کرتا تھا کہ اگر پنجاب سے سکھ مرد چلے جائیں اور اپنی عورتوں کو چھوڑ جائیں تو پھر حوروں کی خواہش کی ضرورت نہیں۔ ہاں تو جب میں نے بچوں کو سردار جی کے پوتوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو میں ان کو گھسیٹتا ہوا اندر لے آیا اور خوب پٹائی کی۔ پھر میرے سامنے کم سے کم ان کی ہمت نہ ہوئی کہ ادھر کا رخ کریں۔

بہت جلد سکھوں کی اصلیت پوری طرح ظاہر ہو گئی۔ راولپنڈی اور لائل پور میں تو مسلمانوں کی بہادری کی بدولت ان کو مسلط ہو کر رہ سکا رکھا گیا تھا۔ پر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کی اقلیت میں پا کر انہوں نے ظلم ڈھانا شروع کیا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمانوں کو جام شہادت پینا پڑا۔ اسلامی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں عورتوں کو برہنہ کر کے جلوس نکالا گیا۔ جب سے مشرقی پنجاب سے بھاگے ہوئے سکھ اتنی بڑی تعداد میں دلی میں آنے شروع ہوئے تھے، اس وبا کا یہاں تک پہنچنا یقینی ہو گیا تھا۔ میرے پاکستان جانے میں ابھی چند ہفتے کی دیر تھی، اس لئے میں نے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ اپنی بیوی بچوں کو ہوائی جہاز سے کراچی بھیج دیا اور خود خدا پر بھروسہ کر کے ٹھہرا رہا۔ ہوائی جہاز میں سامان تو زیادہ نہیں جا سکتا تھا، اس لئے میں نے پوری ایک ویگن بک کرا لی کہ جس میں سارا سامان جائے گا۔ اس وقت میں پاکستان جانے کا تیار ہیں ہی لیکن ہر ہفتے ہم سے یہ کہہ کر سامان گھر میں کہا کہ وہیں رہا۔

حکومت کی آزادی کا جشن منایا گیا۔ مگر مجھے اس آزادی میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ میں نے چھٹی منائی۔ اس دن جو آزادی کا سورج طلوع ہوا پاکستان سنبھالنے اور اس کا حق ادا کرنا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کے جھگڑے فساد کے پہلے ہی ثابت کر دیا تھا کہ کس طرح ہندو اور انگریز مل کے مسلمانوں کو ختم کرنے کی سازش کی تھی۔ وہ زمانہ ہے تاریخ تھا کہ پاکستان سے کوئی لمحے مگر ہم انگریزوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے دباؤ میں آکر امرتسر کو ہندوستان کے حوالے کر دیا، حالانکہ دنیا جانتی ہے امرتسر خالص اسلامی شہر ہے اور یہاں کی سنہری مسجد جو (Golden Mosque) کے نام سے دنیا میں مشہور ہے ...... نہیں وہ تو گردوارہ ہے اور (Golden Temple) کہلاتا ہے۔ سنہری مسجد تو دلی میں ہے۔ سنہری مسجد ہی نہیں جامع مسجد کا لال قلعہ ہے۔ نظام الدین اولیا کا مزار، ہمایوں کا مقبرہ، صفدر جنگ کا مدرسہ۔ غرض کہ چپے چپے پر اسلامی حکومت کے نشان پائے جاتے ہیں پھر بھی آج اسی دلی بلکہ کہنا چاہیے شاہ جہان آباد پر ہندو راج کا جھنڈا بلند کیا جا رہا تھا۔ روئے اب دل کھول کے اے دیدہ خونبار .....

اور یہ سوچ کر میرا دل بھر آیا کہ دلی جو کبھی مسلمانوں کا پایہ تخت تھا، تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا ہم سے چھین لیا گیا تھا اور ہمیں مغربی پنجاب اور سندھ بلوچستان جیسے اجڈ اور غیر متمدن علاقے میں زبردستی بھیجا جا رہا ہے۔ جہاں کسی کو شستہ اردو زبان بھی بولنی نہیں آتی۔ جہاں شلوار جیسا مضحکہ خیز لباس پہنا جاتا ہے۔ جہاں ہلکی پھلکی پائو بھر میں جیسی چپاتیوں کی بجائے دو دو سیر کی نانیں کھائی جاتی ہیں۔ پھر میں نے اپنے دل کو مضبوط کر کے کہا کہ قائد اعظم اور پاکستان کی خاطر یہ قربانی تو ہمیں دینی ہی ہو گی مگر پھر بھی دلی چھوڑنے کے خیال سے دل مرجھایا ہی رہا ...... شام کو جب میں باہر نکلا اور سردار جی نے دانت نکال کر کہا "کیوں بابو جی! تم نے آج کوئی خوشی نہیں منائی؟" تو میرے جی میں آئی کہ اس کی داڑھی میں آگ لگا دوں۔ ہندوستان کی آزادی اور دلی میں سکھا شاہی آخر رنگ لا کر رہی۔ اب مغربی پنجاب سے آنے ہوئے رفیوجیز (Refugees) کی تعداد ہزاروں سے لاکھوں تک پہنچ گئی۔ یہ لوگ دراصل پاکستان کو بدنام کرنے کے لئے اپنے گھر بار چھوڑ کر، وہاں سے بھاگے تھے۔ یہاں آکر گلی کوچوں میں اپنا رونا روتے پھرتے تھے۔ کانگریسی پراپیگنڈا مسلمانوں کے خلاف زوروں پر چل رہا تھا اور اس بار کانگریسیوں نے چال چلی کہ بجائے کانگریس کا نام لینے کے راشٹریہ سیوک سنگھ اور شہیدی دل کے نام سے کام کر رہے تھے۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ ہندو چاہے کانگریسی ہوں یا مہاسبھائی، سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ چاہے دنیا کو دکھانے کی خاطر وہ بظاہر گاندھی اور جواہر لال نہرو کو کا لباس ہی کیوں نہ دیتے ہوں۔

ایک دن صبح کو خبر آئی کہ دلی میں قتل عام شروع ہو گیا ہے۔ قرول باغ میں مسلمانوں کے سیکڑوں گھر پھونک دئے گئے۔ چاندنی چوک کے مسلمانوں کی دوکانیں لوٹ لی گئیں اور ہزاروں کا صفایا ہو گیا۔ یہ تھا کانگریس کے ہندو راج کا نمونہ۔ خیر میں نے سوچا نئی دلی تو مدت سے انگریزوں کا شہر رہا ہے اور ماؤنٹ بیٹن یہاں رہتے ہیں۔ کمانڈر انچیف یہاں رہتا ہے کم سے کم یہاں وہ مسلمانوں کے ساتھ ایسا ظلم نہ ہونے دیں گے۔ یہ سوچ کر میں دفتر کی طرف چلا۔ کیونکہ اس دن مجھے پراویڈنٹ فنڈ کا حساب کرنا تھا اور دراصل اسی لئے میں نے پاکستان جانے میں دیر کی تھی۔ ابھی گول مارکیٹ کے پاس پہنچا ہی تھا کہ دفتر کا ایک ہندو بابو ملا۔ اس نے کہا یہ کیا کر رہے ہو جلدی واپس جاؤ۔ باہر نکلنا۔ کناٹ پلیس میں بلوائی مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ میں واپس بھاگ آیا۔

اپنے اسکوائر میں پہنچا ہی تھا کہ سردار جی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ کہنے لگے "شیخ جی فکر نہ کرنا۔ جب تک ہم سلامت ہیں تمہیں کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔" میں نے سوچا اس کی داڑھی کے پیچھے کتنا کر چھپا ہوا ہے۔ دل میں تو خوش ہے چلو اچھا ہوا مسلمانوں کا صفایا ہو رہا ہے ..... مگر زبانی ہمدردی جتا کر مجھ پر احسان کر رہا ہے۔ بلکہ شاید مجھے چڑانے کے لئے یہ کہہ رہا ہے کیونکہ سارے اسکوائر میں بلکہ تمام سڑک پر میں تن تنہا مسلمان تھا۔

مجھے ان کافروں کا رحم و کرم نہیں چاہیے۔ میں سوچ کر اپنے کوارٹر میں آگیا۔ میں مارا بھی جاؤں گا تو دس بیس کو مار کر۔ سیدھا اپنے کمرے میں گیا جہاں پلنگ کے نیچے، میری دونالی شکاری بندوق رکھی تھی جب سے فسادات شروع ہوئے تھے میں نے کارتوس اور گولیوں کا بھی کافی ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ پر وہاں بندوق نہ ملی۔ سارا گھر چھان مارا۔ کہیں پتہ نہ چلا۔

"کیوں حضور! کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟"

یہ میرا وفادار ملازم محمود تھا۔

"میری بندوق کیا ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے معلوم ہے۔ شاید اس نے چھپائی ہے، یا چرائی ہے۔

"بولتا کیوں نہیں؟" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

تب حقیقت معلوم ہوئی کہ محمود نے میری بندوق چرا کر اپنے چند دوستوں کو دے دی تھی جو دریا گنج میں مسلمانوں کی حفاظت کے لئے ہتھیاروں کا ذخیرہ جمع کر رہے تھے۔

"کئی سو بندوقیں ہیں سرکار ہمارے پاس۔ سات مشین گنیں، دس ریوالور اور ایک توپ۔ کافروں کو بھون کر رکھ دیں گے۔ بھون کر۔"

میں نے کہا "دریا گنج میں میری بندوق سے کافروں کو بھون دیا گیا تو اس میں میری حفاظت کیسے ہو گی۔ میں تو یہاں نہتا کافروں کے نرغے میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہاں مجھے بھون دیا گیا تو کون ذمہ دار ہو گا؟" میں نے محمود سے کہا۔

وہ کسی طرح چھپتا چھپاتا دریا گنج تک جائے اور وہاں سے میری بندوق اور سو دو سو کارتوس لے کر آئے۔ وہ چلا تو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔

اب میں گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ سامنے کارنس پر میری بیوی اور بچوں کی تصویریں خاموشی سے مجھے گھور رہی تھیں۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے کہ اب ان سے کبھی ملاقات ہو گی بھی یا نہیں لیکن پھر یہ خیال کر کے اطمینان بھی ہوا کہ کم سے کم وہ تو خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ کاش میں نے بھی پراویڈنٹ فنڈ کا لالچ نہ کیا ہوتا اور پہلے ہی چلا گیا ہوتا۔ پر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔

....

"ست سری اکال .... ہر ہر مہادیو"

دور سے آوازیں قریب آ رہی تھیں۔ یہ بلوائی تھے۔ یہ میری موت کے ہرکارے تھے۔ میں نے زخمی ہرن کی طرح ادھر ادھر دیکھا جو گولی کھا چکا ہو اور شکاری کتے اس کے پیچھے لگے ہوں، بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی۔ کوارٹر کے کواڑ پتلی لکڑی کے تھے اور ان میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر میں بند ہو کر بیٹھ بھی رہا تو دو منٹ میں بلوائی کواڑ توڑ کر اندر آ سکتے تھے۔ "ست سری اکال۔ ہر ہر مہادیو"

آوازیں اور قریب آ رہی تھیں۔ میری موت قریب آ رہی تھی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ سردار جی داخل ہوئے "شیخ جی! تم ہمارے کوارٹر میں آ جاؤ۔ جلدی کرو۔" بغیر سوچے سمجھے لمحے میں سردار جی کے برآمدے کی چکوں کے پیچھے تھا۔ موت کی گولی سن سے میرے سر پر سے گزر گئی۔ کیونکہ میں وہاں داخل ہی ہوا تھا کہ ایک لاری آکر رکی، اور اس میں سے دس پندرہ نوجوان اترے۔ ان کے لیڈر کے ہاتھ میں ایک ٹائپ کی ہوئی فہرست تھی۔ کوارٹر نمبر ۸ شیخ برہان الدین۔ اس نے کاغذ پر نظر ڈالتے ہوئے حکم دیا اور یہ غول کا غول میرے کوارٹر پر ٹوٹ پڑا۔ میری گرہستی کی دنیا میری آنکھوں کے سامنے اجڑ گئی۔ لٹ گئی۔ کرسیاں، میزیں، صندوق، تصویریں، کتابیں، دریاں، قالین، یہاں تک کہ میلے کپڑے ہر چیز لاری پر پہنچا دی گئی۔

ڈاکو!

لٹیرے!!

قزاق!!!

اور یہ سردار جی جو بظاہر ہمدردی جتا کر مجھے یہاں لے آئے تھے یہ کون سے کم لٹیرے تھے۔

باہر جا کر بلوائیوں سے کہنے لگے "شیخ صاحب پر تو ہمارا حق زیادہ ہے۔ ہمیں بھی اس لوٹ میں حصہ ملنا چاہیے" اور یہ کہہ کر انھوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کو اشارہ کیا اور وہ بھی لوٹ میں شامل ہو گئے۔ کوئی میری پتلون اٹھائے چلا آرہا ہے، کوئی سوٹ کیس، کوئی میری بیوی

بچوں کی تصویریں بھی لا رہا ہے اور یہ سب مال غنیمت سیدھا اندر کے کمرے میں جا رہا تھا۔

اچھا رے سردار! زندہ رہا تو تجھ سے بھی سمجھوں گا۔ پر اس وقت تو میں چوں بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ فسادی جو سب کے سب مسلح تھے، مجھ سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔ اگر انہیں کہیں معلوم ہو گیا کہ میں بھی ہوں......

ارے اندر آؤ تو سہی

دفعتاً میں نے دیکھا کہ سردار جی ننگی کرپان ہاتھ میں لئے مجھے اندر بلا رہے ہیں۔ میں نے ایک بار اس ورزشیل چہرے کو دیکھا جو لوٹ مار کی بھاگ دوڑ سے اور بھی خوفناک ہو گیا تھا، اور پھر کرپان کو جس کی چمکیلی دھار مجھے دعوتِ موت دے رہی تھی۔ بحث کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اگر میں کچھ بھی بولا اور بلوائیوں نے سن لیا۔ تو ایک گولی میرے سینے کے پار ہو گی۔ کرپان اور بندوق میں سے ایک کو پسند کرنا تھا۔ میں نے سوچا ان وحشی بندوق باز بلوائیوں سے کرپان والا بڈھا بہتر ہے۔ میں کمرے میں چلا گیا۔ جھجکتا ہوا خاموش۔

"اتنے نہیں، اوں، اندر آؤ۔"

میں اور اندر کے کمرے میں چلا گیا جیسے بکرا قصائی کے ساتھ ذبح خانے میں داخل ہوتا ہے۔ میری آنکھیں کرپان کی دھار سے چوندھیا رہی تھیں۔

"یہ لو جی۔ اپنی چیزیں سنبھال لو" یہ کہہ کر سردار جی نے وہ تمام سامان میرے سامنے رکھ دیا جو انھوں نے اور ان کے بچوں نے جھوٹ موٹ کی لوٹ میں حاصل کیا تھا۔

سردارنی بولی "بیٹا ہم تو تیرا کچھ بھی سامان نہ بچا سکے" میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

اتنے میں باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیں۔ بلوائی میری لوہے کی الماری کو باہر نکال رہے تھے اور اس کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کی چابیاں مل جاتیں تو سب معاملہ آسان ہو جاتا۔

"چابیاں تو اس کی پاکستان میں ملیں گی۔ بھاگ گیا نہ ڈرپوک کہیں کا۔ مسلمان کا بچہ تھا تو مقابلہ کرتا۔"

ننھی سو ہنی میری بیوی کے چند ریشمی قمیصیں اور غرارے نہ جانے کس سے چھین کر لا رہی تھی کہ اس نے یہ سنا۔ وہ بولی "تم جیسے بہادر ہو، باپو جی ڈرپوک کیوں ہونے لگے وہ تو کبھی پاکستان نہیں گئے۔"

"نہیں گیا تو یہاں سے کہیں منہ کالا کر گیا۔"

"منہ کالا کیوں کرتے وہ تو ہمارے ہاں ...."

میرے دل کی حرکت ایک لمحے کے لئے بند ہو گئی۔ بچی اپنی غلطی کا احساس کرتے ہی خاموش ہو گئی۔ مگر ان بلوائیوں کے لئے یہی کافی تھا۔

سردار جی پر جیسے خون سوار ہو گیا۔ انھوں نے مجھے اندر کے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی، اپنے بیٹے کے ہاتھ میں کرپان دی اور خود باہر نکل گئے۔ باہر کیا ہوا؟ یہ مجھے ٹھیک ٹھیک معلوم نہ ہوا۔ تھپڑوں کی آواز۔۔۔ پھر سو ہنی کے رونے کی آواز اور اس کے بعد سردار جی کی آواز۔ پنجابی گالیاں کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کسے گالیاں دے رہے ہیں اور کیوں۔ میں چاروں طرف سے بند تھا اس لئے ٹھیک سنائی نہ دیتا تھا۔

اور پھر۔۔۔۔ گولی چلنے کی آواز۔۔۔۔ سردارنی کی چیخ۔

لاری روانہ ہونے کی گڑگڑاہٹ اور پھر سناٹا۔ سکوت، پہیمہ سناٹا چھا گیا۔ جب مجھے کمرے کی قید سے نکالا گیا تو سردار جی پلنگ پر پڑے تھے اور ان کے سینے کے قریب سفید قمیص خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ ساتھ کا لڑکا ہمسائے کے گھر سے ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر رہا تھا۔

سردار جی! یہ تم نے کیا کیا! میری زبان سے نہ جانے یہ الفاظ کیسے نکلے۔ میں مبہوت تھا۔ میری برسوں کی دنیا خیالات، محسوسات، تعصبات کی دنیا کھنڈر ہو چکی تھی۔

"سردار جی! یہ تم نے کیا کیا؟"

"مجھے قرضہ اتارنا تھا بیٹا!"

"قرضہ؟"

"ہاں! راولپنڈی میں تمہارے جیسے ہی ایک مسلمان نے اپنی جان دے کر میری اور میرے گھر والوں کی جان اور آبرو بچائی تھی۔"

"کیا نام تھا اس کا سردار جی؟"

"غلام رسول"

"غلام رسول!"

اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے ساتھ قسمت نے دھوکا کیا ہو۔ دیوار پر لٹکے ہوئے گھنٹے نے بارہ بجانے شروع کئے ایک .... دو .... تین........... چار.........

.... پانچ

سردار جی کی نگاہیں گھنٹے کی طرف پھر گئیں جیسے مسکرا رہے ہوں اور مجھے اپنے دادا یاد آ گئے جن کی کئی فٹ لمبی داڑھی تھی۔ سردار جی کی شکل ان سے کتنی ملتی تھی۔ چھ .... سات .... آٹھ .... نو۔

جیسے وہ ہنس رہے ہوں، ان کی سفید داڑھی اور سر کے کھلے ہوئے بالوں نے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔

دس .... گیارہ .... بارہ۔

جیسے وہ کہہ رہے ہوں "جی اساں دسے ہاں تو جی کہیں گھنٹے بارہ بجے ہوتے ہیں۔"

پھر وہ نگاہیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔

اور میرے کانوں میں غلام رسول کی آواز دور سے بہت دور سے آئی۔ میں کہتا نہ تھا کہ بارہ بجے ان سکھوں کی عقل غائب ہو جاتی ہے اور یہ کوئی نہ کوئی حماقت کر بیٹھتے ہیں۔ اب ان سردار جی ہی کو دیکھو نا ———— ایک مسلمان کی خاطر اپنی جان دے دی۔

پر یہ سردار جی نہیں مرے تھے۔ میں مرا تھا!

◆ کہانی میری موت سے متعلق ◆

خواجہ احمد عباس مرحوم کی مندرجہ بالا کہانی "سردار جی" کے عنوان سے ماہنامہ ادب لطیف [سالنامہ ۱۹۴۸ء لاہور] میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد مایا [ہندی] الہ آباد میں یہ کہانی شائع ہوئی۔ اس کہانی پر ہندوستان بھر میں زبردست احتجاج ہوا تھا۔ عباس صاحب پر الہ آباد ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا گیا جو دو سماعتوں کے بعد خارج کر دیا گیا۔ خشونت سنگھ نے ۱۹۵۰ء میں پنجاب پر لکھی گئی کہانیوں کا ایک انتخاب انگریزی میں شائع کیا تھا۔ کہانی "سردار جی" اس میں سرِفہرست تھی۔ "سردار جی" یا "میری موت" کے عنوان سے یہ کہانی متعدد بار اردو اور ہندوستان کی دیگر زبانوں میں شائع ہو چکی ہے اور مختلف انتخابات میں شامل ہو چکی ہے۔ شاعر کے لیے مذکورہ کہانی ماہنامہ "نگار" بابت جولائی ۱۹۸۷ء کے شمارے سے منتخب کی گئی ہے۔ اس کہانی پر خواجہ احمد عباس مرحوم نے ایک مضمون "کہانی کی کہانی" کے عنوان سے تحریر کیا تھا جو کرشن چندر کے نام منسوب ہے۔

مشہور کہانی کار، فلم ساز اور ہدایت کار راما نند ساگر نے ۱۹۴۸ء میں ملک گیر فسادات سے متاثر ہو کر ایک ناول "اور انسان مر گیا" تخلیق کیا تھا۔ خواجہ احمد عباس مرحوم نے اس ناول کے دیباچے میں تحریر کیا تھا:

"...... یہ صحیح ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں نے فرقہ واریت کا بیج بویا اور اسے ہوا دی لیکن آج مذہب کے نام پر جو بربریت درندگی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے اس کے لیے ہندوستان میں ہندو اور سکھ اور پاکستان میں مسلمان ذمہ دار ہیں۔ صرف ہندو مہا سبھا اور جن سنگھ ہی نہیں بلکہ کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹ پارٹی بھی اس جنونیت کی اتنی ہی ذمہ دار ہیں جتنے کہ فرقہ پرست عناصر، کیونکہ ان جماعتوں نے سیاسی نعرے تو لگائے، سیاسی اور طبقاتی شعور پیدا نہیں کیا اور نہ اپنے کارکنوں کو ادب، تہذیب اور اونچے انسانی آدرشوں سے روشناس کروایا......"

۴۳ سال قبل کی یہ تحریر آج کے ہندوستان کا روشن ترین سچ ہے۔ ملک سیکولر ہے لیکن ملک کے سیاست داں اور ان کے اعمال ۱۹۹۹ء [ادارہ]

احساس تو مجھی پہ کر رہی ہے
چھو کر جو ہوا گذر رہی ہے

جس نے مجھے شاخ پر نہ چاہا
خوشبو مری اس کے گھر رہی ہے

ہے سختیٔ اشک کی ندامت
اس بار بھی ہم سفر رہی ہے

آہٹ تری یوں سماعتوں میں
رہتی تو نہ تھی کہ رہی ہے

ٹھہرا ہے وہ جب سے رہگزر میں
تتلی مری رقص کر رہی ہے

جو مجھ سے ملی ہے اُس سے مل کر
وہ چشم بھی معتبر رہی ہے

چپکے سے گھڑی مسافرت کی
دہلیز پہ پاؤں دھر رہی ہے

تارے بھی نظر نہ آئیں گھر میں
آنکھ ایسی گھڑی سے ڈر رہی ہے

ٹوٹا ہوا عکس لے کے اڑکی
آئینے میں پھر سنور رہی ہے

◆

آئینہ جھوٹا تو نہیں ہے
یہ چہرہ ایسا تو نہیں ہے

بارش سے شیشۂ خوابوں کا
دیکھو تو لو، ٹوٹا تو نہیں ہے

کاٹ رہی ہوں زہر کی فصلیں
زہر مگر بویا تو نہیں ہے

اتنی دیر تلک یہ لگتا
استارہ اچھا تو نہیں ہے

ٹپکا کیوں ہے آنکھ سے آنسو
یہ تارہ گرتا تو نہیں ہے

دروازہ تو ہے ہر گھر میں
کوئی گھر کھلتا تو نہیں ہے

مٹھی بھر غزلیں



شاہدہ حسن

◆

فضا میں خوشبوئے وصال ہی نہیں
جو تو نہیں، ترا خیال ہی نہیں

کہاں سے لاؤں آگ تاپنے کا فن
کسی کے عشق کو کمال ہی نہیں

ہوا گزر رہی ہے دور دور سے
اڑائے پیرہن مجال ہی نہیں

مرا لباس تیرا ہم نسب مگر
کہیں پہ لمسِ اتصال ہی نہیں

نفاق، حرفِ گفتگو تلک رہا
لہو میں رنجشِ ملال ہی نہیں

تھکن سے جل رہی تھی آنکھ رات بھر
ہوئی سحر تو اب نڈھال ہی نہیں

ہیں تیرے پاس میرے لمس کے دیے
فقط چراغِ ماہ و سال ہی نہیں

کہاں کا لوٹ آئی کچھ خبر نہیں
کہیں سفر کے خد و خال ہی نہیں

میں اپنے شعر میں ہوں عکسِ خوبرو
ہنر کے آئینوں میں بال ہی نہیں

◆

کوئی تارہ نہ دکھا شام کی ویرانی میں
یاد آئے گا بہت، بے سر و سامانی میں

دم بخود رہ گیا وہ پرسشِ حالات کے بعد
آئینہ ہو گئی میں عالمِ حیرانی میں

دل سلامت رہے طوفان سے تصادم میں مگر
ہاتھ سے چھوٹ گیا ہاتھ پریشانی میں

سہل کرتی میں تخاطب میں سکونا تجھ سے
مشکلیں اور تھیں اس راہ کی آسانی میں

یک بیک بڑھ گئی کیوں چشم میں تاریکیٔ شہر
کیا چراغ اور جلے خانۂ سلطانی میں

کون سی سمت میں پتوار چلانی تھی مجھے
میں ہی خود بھول گئی ناؤ کی سیلانی میں

اب تری یاد جو آئے بھی تو یوں آتی ہے
جیسے کاغذ کی کوئی ناؤ چلے پانی میں

ایسے عالم میں مری نیند کا آسیب نہ پوچھ
خواب مانگے ہیں تری چشم کی نگرانی میں

کھینچ رکھتی ہے مرے پاؤں کو دہلیز تلک
کوئی زنجیر ہے اس گھر کی نگہبانی میں

● آر۔۱۷۸، سیکٹر ۱۴۔اے، بفرزون نارتھ کراچی (پاکستان)

لے جو ناقۂ وحشت کو ساربان کوئی
دکھاؤں قافلۂ خواب کا نشان کوئی

خموشیوں ہی سے مشروط ہے جنم میرا
سو میری راکھ سے اٹھتا نہیں دھواں کوئی

خسارہ اور ہی ہوتا تھا بے گھری کا مگر
مجھے مکان میں رکھتا ہے بے مکاں کوئی

کسی سے ہونے نہ ہونے کے درمیاں جو ربط
وہیں تو ربط میں آتا ہے درمیاں کوئی

سراغ دے کے مجھے میری بے زبانی کا
مجھی میں آن بسا مجھ سا بے زباں کوئی

تو میرے عکس کو میزانِ آئینہ میں نہ تول
اٹھا رہا ہے ابھی میری کرچیاں کوئی

ترے خیال کی آبادیاں چھپاتی ہوں
کہ مجھ سے چھین نہ لے میری بستیاں کوئی

عجب ہے درد ملامت کہ گھٹتے گھٹتے بھی
گرا گیا ہے مرے سر پہ آسماں کوئی

◆

کیا عجب بے سر و سامانی ہے
آنکھ میں اشک نہیں پانی ہے

خوئے وحشت ہی تعارف تھا مرا
تو نے صورت مری پہچانی ہے

پھول کھلتے تو گرداب کے بیچ
یہ ہوا اور ہی طوفانی ہے

آئینے اُن سے نہیں ٹوٹے ہیں
جن کے چہروں پہ پشیمانی ہے

ایک تارہ ہے سرہانے میرے
رات کو اس پہ بھی حیرانی ہے

معتبر میرے پلٹنے کے بعد
اس گزرگاہ کی ویرانی ہے

تو بھی کرتا ہے بہت پیار مجھے
کس قدر پیار کی ارزانی ہے

جوگندر پال

۲۴ مندا کنی انکلیو، کالکاجی، نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۹

خواب رو

قسط نمبر ۵

مگر ایمان کی پوچھو تو ہم بھی ہمدردیوں کے مستحق ہیں۔ تاریخ کا یہی ایک فائدہ ہے کہ ذرا فاصلے سے سارا منظر عین فوکس میں آجاتا ہے۔ بھلا سوچو، جب دیوالئے ابا حضور اور ہوشمند ماموں جان ہر دو نے پاکستان بنانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی تو کیا انھیں علم تھا کہ ایک دم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بھاگنا پڑ جائے گا۔ ایسی قیامت ٹوٹی کہ وہ گھر پر تالے باندھ کر چابیاں سنبھالے ادھر بھاگ آئے۔ عجلت میں انھیں یہ بھی نہ سوجھی کہ کون گھروں کے اندر رہ گیا ہے اور کون ان کے ساتھ ہے ــــ نہیں ہاشم بھائی ہنسو نہیں۔ گھر لوٹنے کی امید نہ بھی ہو، آدمی گھر کو پکا تالا تو لگا کے ہی جاتا ہے۔ اب جو آگے ہوا، وہ بھی سن لو۔ یہاں کراچی پہنچ کر یہ دیکھ کر وہ دنگ رہ گئے کہ جو گھر وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے، ہو بہو وہی یہاں ان کے سامنے کھڑے ہیں۔ چابیاں تو وہ اپنے ساتھ لے ہی آئے تھے۔ آگے بڑھ کے انھوں نے اپنے گھر کے تالے کھول لئے۔ ایک اور عجوبہ یہ ہوا کہ گھروں کے اندر داخل ہو کر انھوں نے انھیں مادر زاد ننگا اور لٹا پٹا پایا۔ جن بھائیوں، بہنوں، ماؤں، بالکوں، یاروں، محبوبوں کو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے ان کا گھروں میں نام ونشان بھی نہ تھا ــــ ہائے! ذرا محسوس کرو ہاشم، اپنے گھر لوٹ کر تمھیں خالی گھر ملے ــــ سارا سامان غائب، جنھیں پیچھے چھوڑ گئے تھے، ان کی لاشیں بھی غائب ــــ بس دیواریں اور فرش اور چھت ــــ تو بولو، تمھیں کیسے لگے؟ مگر میں تمھیں محسوس کرنے کو کیوں کہہ رہا ہوں؟ تم تو پیدائش سے ہی محسوس کر رہے ہو۔ ممانی جان اپنی عینک کے شیشے صاف ہی اس لئے کرتی رہتی ہیں کہ انھیں اچانک کبھی اپنے میکے کے سارے لوگ نظر آنے لگیں گے ــــ نہیں ہاشم میرے بھائی، ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ماں باپ کے دکھ کے ساجھے دار نہ ہوں؟ مگر ہم کب تک محض ماتم کے نشہ کی خاطر بسر کئے جائیں گے؟ کب تک مہاجر بنے رہیں گے؟

ایک ہی سماج کے لوگ اگر مقامیوں اور غیر مقامیوں میں بٹ کر رہ جائیں تو فرقہ واریت ایک مستقل عذاب کی صورت کھڑی کئے رکھتی ہے۔ مثلاً غیر مقامی جب مقامی ہو جاتے ہیں تو مقامیوں کے غیر مقامی ہونے کی باری آجاتی ہے۔ چند ہی روز پہلے کا ذکر ہے کہ ہمارے لاکلب کے سالانہ ڈنر میں بہت سے وکلا جمع تھے اور خوب ہنس کھیل رہے تھے اور ہمارے اتنے بڑے ہنستے کھیلتے مجمع میں ایک واحد شخص تھا جو منہ دبائے بیٹھا تھا اور شاید کوئی منجھا ہوا وکیل ہونے کے باوجود صرف ہاں میں ہاں ملانے کے لئے اپنا سر ہلا دیتا تھا۔ میں سبھوں کو چھوڑ کر اس کی طرف سرک آیا اور اپنا تعارف پیش کیا ــــ

جواباً اس نے بھی اپنا نام بتایا۔ چندانی نام کا کوئی ہندو شیخ تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد اس کے سارے رشتہ دار ہندوستان چلے گئے تھے مگر اس کا اصرار تھا کہ سندھو دیش ہی اس کا اصل مقام ہے۔ کہنا میں یہ چاہ رہا ہوں میرے بھائی کہ اس وقت ساری محفل میں ایک وہی شخص غیر مقامی معلوم ہو رہا تھا، اور اس احساس سے مانو اپنی کچہری میں اس نے جنھیں بھی جو سزائیں دی تھیں ان سب کی میزان کو اس وقت بھگت رہا تھا۔ مجھے تعجب ہونے لگا کہ جب اس کے دیوتا بھی ایک ایک کر کے یہاں سے نکل گئے تو وہ یہاں کیا کر رہا ہے؟ یا پھر اگر اسے یہاں رہنا ہی ہے تو اپنی نئی زندگی پر ایمان لے آئے اور کلمہ پڑھ کے اوروں کی طرح ایک خدا کی بندگی میں باقی ماندہ آرام سے بسر کرے اور اپنی عاقبت سنوار لے۔ شاید ایسا نہ کر پانے کے باعث ہی بے چارہ مجرموں کے مانند ہمیشہ چپ سادھے رکھتا ہے، نہ سادھے تو بولتے ہی پکڑا لیا جائے کہ اپنے پرانے سندھو دیش میں کوئی غیر ہے۔

نہیں، مائی ڈیر ہاشم، چندانی کے برعکس ہم وہاں سے یہاں بھاگ تو آئے ہیں مگر اسی کے مانند ابھی تک اپنے ذہن سے باہر

آنے میں تال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس لئے ذہن عطا کیا ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں کُل کائنات کے ذہن تک رسائی نصیب ہو۔ مقام بدل جائے تو کیا؟ ہر نئے مقام پر ہم صرف وہیں سانس لے سکتے ہیں، یا بصورت دیگر ہندو سادھوؤں کی طرح ہمیں سانس روک کر جینے پر قدرت ہو۔ اگر ہمیں کھلے کھلے سانس لینا ہے تو اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ اپنے ہر نئے مقام پر ہم فوری طور پر مقامی ہو جائیں، اتنے کہ ہم سے نفرت کرتے ہوئے مقامیوں کو محسوس ہو وہ اپنے آپ سے ہی نفرت کر رہے ہیں۔ بتاؤ! کیا میری بیوی اپنے بچوں کے باپ کو گھر سے نکال کر خوش رہ سکتی ہے؟ —— نہیں، بھائی میرے، نہیں! اصل مسئلہ دراصل یہی ہے۔ ہمارے اور ان کے علاقوں میں اسی لئے آئے دن بم پھٹتے رہتے ہیں کہ چار پانچ دہائیوں کی یکجائی کے باوجود ذہنی طور پر ہم الگ الگ کروں میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ تم نے شاید پچھلے ہفتے اخبار میں پڑھا ہو، گونگے نواب کے عقب میں رکشوں کے اڈے پر ایک نہایت خطرناک بم پایا گیا۔ کسی نے دیکھ لیا ورنہ کشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ آج ہی پھل بازار میں ایک معمولی سے جھگڑے سے بات جو بڑھی تو خنجر زنی کی وارداتوں میں تین ہلاک ہو گئے اور چھ اسپتال میں پڑے ہیں جن میں دو شاید جانبر نہ ہو سکیں ——

اوہو، امپارٹنٹ یہ نہیں کہ ادھر کے مارے گئے یا ادھر کے۔ امپارٹنٹ صرف یہ ہے کہ چند بے گناہ خوامخواہ مارے گئے نہیں، آزادی کنفیوژن کا نام نہیں: آزادی انسان کے بالقصد ارتقائی نظام سے تکمیل پاتی ہے چنانچہ آزاد ہونے کے لیے ہمیں پابند ہوئے بغیر چارہ نہیں۔

اسحق مرزا کو محسوس ہونے لگا ہے کہ وہ اپنے خط میں فلسفہ بگھارنے لگا ہے ایسے موقعوں پر ہاشم علی اپنے کانوں میں انگلیاں ڈال لیتا ہے —— دیکھو چھوٹے نواب اپنی اتنی بڑی نقلی سفید داڑھی ایک طرف ڈال دو اور بات بات میں نکتے مت پیدا کرو۔ صرف باتیں کرو —— تم بہت ڈل ہو ہاشم۔ آخر سوچنا کب شروع کرو گے؟ —— چھوٹے نواب، تم سوچنے والوں نے تو دنیا بھر میں فساد برپا کیا ہوا ہے۔ اور ہم شریف آدمیوں کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔

ہاشم علی کو تاؤ میں آتے پا کر اسحق مرزا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی ہے۔

ر بھائی شریف آدمی تم بور ہو گئے ہو تو میں اپنی سفید داڑھی اتار کر اپنی چٹھی اچانک یہیں ختم کئے دیتا ہوں۔ میری زندگی کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ تمہیں سدا بور کئے رکھوں۔ جس شخص میں بور ہونے کی اتنی صلاحیت ہو جتنی تم میں ہے، وہ ہمیشہ ڈل نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے دعا کرو کہ آئندہ بھی تمہیں جلد ہی چٹھی لکھنے پر خود کو آمادہ کر سکوں اور اس دوران کسی کی گولی کا شکار نہ ہو جاؤں —— ہاں بھئی، نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ ایکا ایکی کوئی سڑک کے کسی کونے سے گولیوں کی بوچھار کرنے لگتا ہے اور یوں اس کے کھیل تماشے میں سامنے والوں میں سے جو بھی گر گیا، گر گیا۔ جب سے یہ بھگدڑ عام ہوئی ہے میں بھی تمہارے مانند خوب کھانے پینے لگا ہوں۔ حالانکہ تمہیں معلوم ہے تمہیں اس قدر کھاتے ہوئے پا کر مجھے کتنی کوفت ہوتی ہے۔ میرا پنجابی پڑوسی بابو فقیر محمد شاید اسی لئے مجھے اکثر اپنے گھر کھانے پر بلانے لگا ہے —— ایک بات کہوں اسحق باؤ، وہ مجھ سے کہتا ہے تم ہندوستانی لوگ —— معاف کرنا، تم ہو تو سو فیصد پاکستانی مگر ہم پنجاب والے ہمیشہ سے ہر اس شخص کو ہندوستانی ہی کہتے ہیں۔ جو پنجابی نہ ہو۔ معاف کرنا، تم لوگ سوچ کے بہت باریک ہو جو ہم کو بہت اچھا لگتا ہے، پر تمہارے بدن کی باریکی ہم کو —— وہ کیا کہتے ہیں؟ —— دو آنکھ یا ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ مرد نے کوئی کھاتا کلی تھوڑا ہی ناچنی ہوتی ہے۔ تم خوب کھایا پیا کرو اسحق باؤ۔ خوب تگڑے ہو جاؤ —— نہیں! —— نہیں، اسحق باؤ! یہ لسی کا گلاس تو تم کو ختم کرنا ہی پڑے گا —— تو ہاشم، مائی ڈیر، میں آج کل لسی پہ لسی لنڈھائے جا رہا ہوں اور میرا وزن اسی ایک سال میں چھ پونڈ بڑھ گیا ہے اور میری سندھن نہایت خوش ہو ہو کر کہتی ہے، ماشاءاللہ اب بالکل میرا بھائی دکھنے لگے ہو —— والسلام!

۵

دیوانے مولوی صاحب کی آنکھ آج علی الصبح کھل گئی ہے اور کھلتے ہی بڑے راحت آگیں سبک پن کے احساس سے ان کے منہ سے گویا کوئی پرندہ اڑا ہے اور کمرے میں چہچہانے لگا ہے اور وہ لیٹے لیٹے ہنسنے لگے ہیں اور یہ سوچ کر ہنسی کو روک نہیں پا رہے ہیں کہ اچھی بیگم ٹھیک کہتی ہے۔ میں دیوانہ ہوں۔ کوئی اس طرح بے وجہ بھی ہنسے جاتا ہے۔

"آپ بجا فرماتی ہیں اچھی بیگم" ایسے لمحات میں اچھی بیگم کی محبت سے فراواں ہو کر دیوانے مولوی صاحب کے لہجے میں تشکر اور تعظیم کا ملا جلا جذبہ امنڈ آتا ہے اور وہی والہانہ پن پیدا کر دیتا ہے جو محبوب کے لیے تو ہی تو کے تخاطب سے پیدا ہوتا ہے۔ "آپ واقعی بجا فرماتی ہیں۔ ہم نرے پورے دیوانے ہیں۔"

"اے توبہ!" اچھی بیگم اپنے میاں کی داڑھی سے مکھی اڑانے لگتی ہے۔ "آپ کے دشمن دیوانے ہوں۔ وہ تو ہمیں ذرا پیارے ہے۔"

"ہائے اچھی بیگم، یہ ستم مت ڈھاؤ۔" معاملاتِ دل کے ذکر پر دیوانے مولوی صاحب کے ہاتھ آپ ہی آپ اپنی ٹوپی ٹیڑھی کرنے کے لیے اٹھ آتے ہیں۔ "ہمارے دشمن بھی ہمارے مانند دیوانے ہوگئے تو آپ کی ترجیحیں بٹ پاکر ہم خودکشی کرلیں گے۔"

اس ڈھلتی عمر میں بھی اچھی بیگم ویسے ہی شبابی انداز میں اپنا مرجھایا ہوا ہاتھ اُن کے مُنہ پر رکھ دیتی ہے جیسے چیاخ سے چومتے ہوئے ان کا ڈینچر باہر نکلنے میں آجاتا ہے۔

پُرانے لکھنؤ کے دنوں میں بھی اچھی بیگم کو اپنے میاں پر پیار آنے لگتا تو انھیں دیوانہ کہے بغیر اسے چین نہ آتا۔ "اچھی بیگم"۔ دیوانے مولوی صاحب اکثر اپنی بیگم کو بتاتے ہیں اور بتا بتا کر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ "ان آخری دموں میں بھی ہمارے ہوش و حواس اسی لیے قائم ہیں کہ آپ ہمیں دیوانہ کہہ لیتی ہیں، ورگرنہ اس گھور بڑھاپے میں کسے خبر رہتی ہے کیا کیا ہے۔ آپ مجھے دیوانہ کہتی ہیں تو میرا جی چاہتا ہے پونے دو کا پہاڑہ آپ کو منولے تک فرفر سُنادوں۔"

"دیوانے کے دیوانے!"

دیوانے مولوی صاحب کو اچھی بیگم ویسے ہی دکھنے لگتی ہے جیسے اس وقت، جب وہ اسے بیاہ کے لائے تھے۔

دیوانے مولوی صاحب منہ اندھیری سویرے میں اپنی اچھی بیگم کے پہلو میں لیٹے بدستور ہنسے جارہے ہیں اور پلوں میں اچھی بیگم کی رفاقت میں ساری عمر ازسرِنو جی رہے ہیں اور یوں میلی میلی صبح میں ان کا ماضی جگمگا اٹھا ہے۔

دیوانے مولوی صاحب نے اچھی بیگم کو پہلی بار حجلۂ عروسی میں دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی انھیں پتہ چل گیا کہ یہ وہی ہے۔

"کون وہی؟ میں کون ہوں؟" گویا اچھی بیگم گھبرا گئی ہو کہ وہ کوئی اور ہے اور اگر انھوں نے اسے نہ بتایا تو وہ لاعلم رہے گی کہ اس کی سانسیں کون لے رہا ہے۔

"ارے بھئی اور کون؟ وہی، جسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہم پاگل ہو رہے تھے۔"

"مگر آپ نے ہمیں دیکھا ہی کب؟"

"نہیں دیکھا، اسی لیے تو دیکھتے ہی پہچان گئے۔" دیوانے مولوی صاحب نے شعر تو کبھی نہیں کہا، تاہم شاعری وہ ہمیشہ جیا کیے ہیں۔

اچھی بیگم کی پہچان ان کی تمام عمر واثق دیوانے مولوی صاحب

کی نگاہ کے دم سے رہی۔ ان کے والدین اور بھائیوں اور بہنوں کو سدا یہ شکایت رہی کہ اچھو نے ایک بار جو سسرال جانے کے لیے منہ موڑا تو وہ اس کی شکل کو ترس گئے۔ یہ نہ تھا کہ وہ سسرال میں ان کی جدائی کو محسوس نہ کرتی تھی۔ اس کے محسوسات کا تو یہ عالم تھا کہ میاں کی آغوش میں اس کا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگتا تو وہ مانو اپنے بابل کے گھر کِلکلی مچا رہی ہوتی۔ اچھو کا بابل دمے کا مریض تھا۔ جب کبھی اُسے سانس کا دورہ پڑتا تو اپنی دوائی کھانے کی بجائے وہ اسے آوازیں دینے لگتا اور وہ دوڑی دوڑی آتی اور اس کی چھاتی مَل مَل کر ایک ایک کرکے اس کی سانس کی ساری گانٹھیں کھول دیتی اور اپنے عذاب سے نجات پاکر وہ سوجاتا اور نیند کی راحت میں اس کا جسم کسی نومولود کے بدن کے مانند بے عیب اور کورا معلوم ہونے لگتا۔

سسرال میں اچھی بیگم جب کبھی فرصت سے اکیلی بیٹھی ہوتی تو اپنے ابّو کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کی آنکھوں میں ساون بھادوں گھِر آتے اور منہ پہ یہ بول چھینٹوں کی طرح اٹھنے لگتے۔

ہم تو بیلا رے کھونٹے کی گئیاں
جدھر ہانکو ہنک جائیں رے
سُن مورے بابل رے!

گہرے بادلوں میں بجلی کے جاموش کوندے جھلمل کررہے ہوتے:

ہم تو رے بابل پیڑوں کی چڑیاں   رات بسیں اُڑ جائیں رے
سُن مورے بابل رے!   سُن مورے بابل رے!

مگر اچھو کے بابل کے بجائے اس کا میاں اس کے پیچھے چپ چاپ کھڑے اُسے سُن رہا ہوتا اور جب وہ اس کے سامنے آجاتا تو کھڑے بادلوں سے ہم ہم شروع ہوجاتی۔

"چلو، ہم تمھیں آج ہی تمہارے ابّو کے پاس چھوڑ آتے ہیں۔" نواب کمال اپنی دلہن کو لحت لحت سمیٹنے لگتے۔

"چلوں تو جاؤں۔" اچھو اپنے آپ کو سنبھالنے لگتی۔ "مگر آپ کی نگاہ سے دور رہ کر وہاں کسی کو نظر کیسے آؤں گی؟"   "تیرے بغیر ابّو پہ کیا بیتی ہوگی؟"   "چلو"

جس کی قسمت نے جاگ کر اُسے اچھی بیگم جیسی پیاری دلہن سونپ دی اُسے مولوی بن جانے کے بعد بھی دیوانہ ہوئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ دیوانے مولوی صاحب کے منہ سے چھوڑا ہوا اچھی چھپاتے ہوئے واقعی مسعود [illegible]



پرکاش تیواری

فکرِ جہاں

روز و شب میں سوچتا ہوں
زندگی کے گلستاں میں
درد کی پرچھائیوں کو
جنگ کی بربادیوں کو
موت کی پرچھائیوں کو
روحِ انساں میں سسکتی
زخموں کی گہرائیوں کو

روز و شب میں سوچتا ہوں
بھوک پیاسی زندگی کو
خون آلود آدمی کو
اور بڑھتی تیرگی کو

روز و شب میں سوچتا ہوں
اس سیاست کی ڈگر کو
اس تشدد کے سفر کو
خاک و خوں میں چھٹپٹائے
بے کس و بے بس بشر کو
اور کارِ دو جہاں میں
اک قیامت کی نظر کو

روز و شب میں سوچتا ہوں
اور اس فکرِ جہاں میں
بھول جاتا ہوں غم اپنے!!

● ۱۹۹، سیکٹر ۱۲، آر۔ کے۔ پورم۔ نئی دہلی۔ ۲۲



قاضی فراز احمد

کرفیو آرڈر

شہ نشینوں سے ہٹا لو یہ نشستوں کا وجود
اپنے در اور دریچوں کو مقفل کر لو
ذہن میں اپنے ارادوں کے شجر بوتے رہو
اور کسی گوشے میں طوفان لیے سوتے رہو

رہگذاروں پہ چڑھا زنگِ بیاباں کا غلاف
کارگاہوں میں مشینوں پہ نیا گرد و غبار
فکر و پرواز کو زنداں کی حفاظت میں دو
جھوٹی باتیں کرو۔ بچوں کو حراست میں لو
طفلِ معصوم خموشی کو جھٹک سکتا ہے
راستے پر کوئی سناٹا بھٹک سکتا ہے

گوشے گوشے میں شب و روز کو سونا کر لو
شہر کو شہرِ خموشاں کا نمونہ کر لو
اپنے قدموں کی یہ زنجیر مکمل کر لو
اپنے غاروں کی یہ تصویر مکمل کر لو

ماں کی بیمار سی گھٹتی ہوئی کھانسی کو تم
اپنی بیوی کی بلکتی سی اداسی کو تم
تنگ کمروں کے عذابوں میں مقید کر لو
اپنے در اور دریچوں کو مقفل کر لو

● پوسٹ بکس نمبر ۲۲۱، دوحہ (اسٹیٹ آف قطر)

ملکہ نسیم

ایک شام

خوبصورت سا کوئی لان ہے بہکی ہوئی شام
سرخیاں پھولوں کی
چہرے میں گھلی جاتی ہیں
اک طرف
بینت کی نازک سی پڑی ہے کرسی
اس میں سایہ ہے کوئی
بند ہیں جس کی پلکیں

اور
پلکوں پہ کئی راز مچل اٹھے ہیں
اشک!
آنکھوں سے چھلک اٹھے ہیں
ساحلی ریت پہ یادوں کے بھنور بنتے ہیں
ریت پر نقش ہیں
کچھ بھاگتے قدموں کے نشاں
ہاں! مگر
ٹوٹ چکے ہیں وہ گھروندے سارے
جن کو کچھ ہاتھوں نے مل کر کبھی تعمیر کیا

اور
کچھ جلنے کی بو نے
اسے جب چونکایا
لوٹ آئی ہے وہ
چھوٹے سے کچن میں اپنے
اور
مشغول ہوئی پھر سے
انہیں کاموں میں
اپنے
آنچل میں لپیٹے ہوئے
صدیوں کی تھکن

● ایف۔ ۱۲، نودیسٹ کالونی، چار املی، بھوپال

انور خان

۸۴۸/۲۲ کنگھی والا چال تیسرا منزلہ، شیخ برہان قمرالدین اسٹریٹ بمبئی ۸



حسرتِ حاصل

"دیکھ پپّو، آج جیادہ ٹائم اپنے کو رکنے کا نہیں ہے کیا دو تین ڈھنگ کے جوتے پار کر کے نکل آئیں گے۔ گولا، نائیک یا کنگار و میں سے تو ایک بھی ہاتھ لگ گیا تو بس ہے۔" وکّی نے پپّو سے کہا "آج موسم اچھا ہے۔ آٹھ دن سے سالا بارش نے موڈ کھراب کر دیا۔ آج آسمان صاف ہے۔ دھوپ بھی نکلی ہے۔ کرلا میں مال بیچ کر ریگل چلیں گے۔ ادھر نائٹ گیمس چل رہی ہے۔"

"کرلا پر کیوں" پپّو نے کہا "ادھر چور بازار ہی میں آئیں گے۔ مال بیچ کر پہلے ولّی دربار چلیں گے۔ آج میرا موڈ ڈبا گوشت اور بریانی کھانے کا ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے" وکّی نے کہا "ادھر سے ریگل کے لیے بس مل جائے گی۔"

"آج نورانی کا قیمہ پاؤ بھی اچھا تھا" پپّو نے کہا۔

"ہاں بیضہ اور ٹماٹر کا مار دینے سے اس کا ٹیسٹ فرسٹ کلاس ہو گیا۔ سالا گھوٹالا اچھا بناتا ہے۔" وکّی نے کہا۔ "میں کالج میں تھا تو میٹرو کے پاس چلیا کا ہوٹل ہے نا۔ ادھر ہی ناشتہ کرتا تھا۔ آج بھی اس کے قیمے کا جواب نہیں" پپّو نے کہا۔

"وہ چلیا کے ہوٹل کا بن پاؤ BUN BRED بہت پاس کیا ہوں۔" وکّی بولا۔ "ایک چائے منگا کر بیٹھ جاتا تھا مگر ٹیبل ڈپی پکڑاتا تھا جس پر بن پاؤ کی بر فی رکھی ہوتی تھی۔"

"کڑکی کی وجہ سے؟"

"کڑکی تو یار تھی" وکّی نے کہا۔ "لیکن زیادہ مزا ایڈونچر میں آتا تھا۔"

"کسی کو شک نہیں ہوا کبھی؟" پپّو نے پوچھا۔

"شک ہو جائے تو پھر کام میں مزا ہی کیا" وکّی نے کہا "ایسا ہو جائے تو وکّی اپنا نام بدل ڈالے۔ دیکھ چار نمبر بس آ رہی ہے۔"

"خالی ہے" پپّو نے کہا "وہ بھی سانتا کروز کی۔"

بس کے دھیمے ہوتے ہی دونوں لپک کر چڑھ گئے۔ اپر ڈیک پورا خالی پڑا تھا۔ صرف دو چار آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں آگے جا کر بیٹھ گئے۔

وکّی اور پپّو دونوں ہی جوتے اڑانے میں ماہر تھے۔ سویرے سات آٹھ بجے میونسپل ریڈنگ روم پر پہنچ جاتے۔ انگریزی اخبار میں جنم دن، اموات، برسی کے کالم غور سے پڑھتے۔ دوسری خبروں کا بھی اسی غرض سے مطالعہ کرتے کہ شہر کے کسی مشہور تاجر، لیڈر یا فلمی شخصیت کو اوپر والے کا بلاوا آیا ہے۔ پھر ان میں سے کسی مناسب مقام کا انتخاب کر کے وہ نکل پڑتے۔ اس وقت بھی وہ اشوک نام کے ایک فلم پروڈیوسر کے انتقال کی خبر پڑھ کر نکلے تھے۔ فلمیں تو اشوک نے دو تین ہی بنائی تھیں مگر ان کے حساب سے یہ بھی بہت تھا۔ پھر اس کی ایک فلم سیٹ پر تھی۔ اس لیے ماتم گساران کی تعداد بہت زیادہ نہیں تو کم بھی نہ ہو گی۔ یہی سوچ کر وہ نکلے تھے۔

وکّی کی شخصیت متاثر کن تھی۔ چھ فٹ کا قد۔ بھرا بھرا جسم گندمی رنگ مگر کھلتا ہوا۔ نقوش بھی متناسب تھے۔ بریف کیس ہاتھ میں ہوتا تو لوگ کبھی ایگزیکیٹو سمجھتے۔ شیو ہمیشہ بنا ہوا ہوتا۔ قمیص پتلون جیسی قیمت۔ پرانی چپل وہ صرف دھندے کے وقت پہنتا تھا تاکہ اُسے چھوڑ کر نیا جوتا پہن کر نکل آئے۔ سینما دیکھنے یا تفریح کی خاطر نکلتا تو سات آٹھ سو سے کم کا جوتا پیروں میں نہیں ہوتا تھا۔ دو دو سونے کی وزنی انگوٹھیاں انگلیوں میں رہتیں۔ جوتے اتارتے ہوئے کوئی دیکھ بھی لیتا تو کسی کی اتنی ہمت نہ ہوتی کہ وکّی کو

ڈبے جھپکتے ہوئے کوئی اس طرف توجہ دلاتا بھی تو وہ اور پھیل جاتا۔ استعجاب کا اظہار کرتا کہ پھر میرا جوتا کون لے گیا اور کسی اور کا جوتا پہن کر باہر نکل آتا۔ چونکہ ان کا جانا زیادہ تر اچھے علاقوں میں ہوتا تھا جہاں متمول لوگ رہتے تھے اس لیے پٹائی کی انھیں فکر نہ تھی۔ وکی نے اس کام کو چنا ہی اسی لیے تھا کہ اس میں ندرت تھی۔ یہ عام چوروں کا کام نہیں تھا۔ اس میں وہ اسٹائل سے رہ سکتا تھا۔ آمدنی معقول تھی۔ پولس کا خوف نہیں تھا۔ کام بھی بس دو تین گھنٹے کا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی آرٹسٹک طبیعت کو اس میں تسکین ملتی تھی۔

پپّو اس کی انڈراسٹڈی تھا۔ اس کو وکی کا اسٹائل بہت پسند تھا۔ ایک طرح سے وہ اس کا آئیڈیل تھا۔ گربجویٹ وہ بھی تھا مگر وکی کی شخصیت اور اس کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس کے کام کی صفائی، اعتماد اور وقت ضرورت نئی منصوبہ بندیاں اسے حیران کر دیتی تھیں۔

"یار کالج میں تو تو نے بہت لڑکیوں کو پٹایا ہوگا" پپّو نے رشک آمیز نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے یار مت پوچھ، کالج کے دن یاد آتے ہیں نا تو میں پاگل ہو جاتا ہوں۔ کیا لطف تھی!" وکی نے کہا "اور پتہ ہے کالج میں میں نے کیا آئیڈیا کیا تھا؟"

"کیا؟" پپّو نے پوچھا۔

"یار میں کالج کی ڈرامہ سوسائٹی کا ممبر بن گیا۔"

"واہ" پپّو نے اس کی ستائش کی۔ واقعی لڑکیوں سے دوستی کا اس سے بہتر ذریعہ نہیں ہو سکتا۔

دو دو مہینے ریہرسل، ہر شام لڑکیوں کے درمیان، ڈرامے کے دنوں میں تو اور بھی مزا آتا تھا۔ اتنا ایکسائٹمنٹ رہتا تھا اور ایسے چانس کہ مت پوچھ۔ ایک واقعہ بتاتا ہوں۔ ایک لڑکی تھی ہمارے ساتھ رنکی۔ بنگالی لڑکی تھی۔ بہت ایڈوانس۔ باپ وکیل تھا۔ اس کی اپنی گاڑی تھی۔ کالج کے سالانہ فنکشن میں ہمارے ڈرامے کی تیاری چل رہی تھی۔ لیکن اس کے پہلے اس کا ڈانس تھا۔ اس کی ماں، اس کا میک اپ خود کرتی تھی۔ اس کا گرو بھی ساتھ تھا۔ میں نے یونہی ڈریسنگ روم میں جھانکا تو وہ چولی ٹھیک کر رہی تھی۔ گرو تو باہر پبلک میں بیٹھا تھا۔ ماں بھی اس وقت نہیں تھی۔ میرے کو دیکھ کر اس پر ذرا بھی ری ایکشن نہیں ہوا نا۔ میرے کو دیکھ کر مسکرائی اور بولی وکی ذرا یہ چولی کے ہک تو لگا دے میرے سے لگ نہیں رہے۔

پپّو، وہ سال یہاں کالج میں پہلا سال تھا میرا۔ نیا نیا معاملہ تھا۔ میرے تو ہاتھ کانپنے لگے۔ آگے بڑھ کے جیسا تیسا میں نے ہک لگا تو دیا مگر اس کا سفید رس ملائی کے مافک انگ۔ میرے تو کان جلنے لگے۔"

"پھر کچھ معاملہ آگے بڑھا؟" پپّو نے پوچھا۔

"نہیں یار۔ وہ سالی بہت پہنچی ہوئی تھی۔ گاڑی بنا تو بات ہی نہیں کرتی تھی۔ سائنس لیتی تھی تو ہرا نوٹ خرچ ہوتا تھا اس پر۔ وش کر لیتی تھی اپنے کو یہی بہت تھا۔"

یعنی کالج میں ایسا کوئی میرینس لفڑا نہیں ہوا؟" پپّو نے پوچھا۔

"بس ایک بار، میں تو یار خود ہی بچتا تھا کہ کوئی گلے نہ پڑ جائے۔ وہ غالب نے کہا ہے نا کہ بچو شہد کی مکھی بن مصری کی نہیں۔ تو اپنا بھی یہی اصول تھا۔ اور ادھر سالا ایک سے ایک پیسے والے کی لڑکی، بس ٹائم پاس کرنے کو آتی تھی۔ پھر اپنے کو کیا واندہ تھا۔ بس ایکبار میں بہت بری طرح پھنسا تھا۔

"کیا نام تھا اس کا" پپّو نے پوچھا۔

"کمد نام تھا اس کا"

"نام تو سنا ہوا لگتا ہے" پپّو نے کہا "وہ کمد کرپلانی تو نہیں؟ میں جب کالج اڈمیشن لیا تو وہ ایم۔ اے میں تھی۔ مگر یار واقعی چیز تھی۔"

"ہاں وہی!" وکی نے کہا "تو کیا ہوا۔ وہ کالج میں نئی نئی آئی تھی جب میں نے اس کو دیکھا۔ ہمارا ڈائریکٹر دکشت بھی کمال کی نظر رکھتا تھا۔ وہی ڈھونڈ کر لایا تھا اس کو۔ تو نے تو دیکھا ہی تھا نہ اس کو۔ ایسا لگتا تھا کہ کدھر سے بھی پن چبھو دو تو رس ہی رس نکلے گا۔ تو کیا ہوا کہ انٹر کالجیٹ ڈرامہ کمپٹیشن میں اس کو ایک غریب لڑکی کا رول کرنا تھا۔ وہ گاڑی سے اُتری تو دکشت نے اسے دیکھ کر سر پیٹ لیا۔ کپڑے ایک دم چکا چک۔ خوبصورت نارنجی شلوار قمیض، گلے بوٹے بنے ہوئے۔ میرا دل تو اسے دیکھ کر دھک دھک کرنے لگا۔ ڈرامہ شروع ہونے میں بس آدھا گھنٹہ تھا۔ اس سے دکشت نے کہا تھا کہ ایک میلا شلوار قمیض ساتھ لے کر آنا۔ وہ بھول گئی۔ دکشت نے مجھ سے کہا یار وکی اسے لے جا باہر کہیں ڈھونڈیں۔ اس کو بول کپڑے ذرا اچھی طرح میلے کرے۔ تو بھی مدد کر اس کی۔ اب ٹائم ہی کتنا باقی ہے!"

تیرے تو مزے ہو گئے ہوں گے" پپّو نے کہا۔

"ارے یار مت پوچھ۔ میں تو جیتے جی سورگ میں پہنچ گیا۔ اور معلوم ہے کیا کمال ہوا؟" وکی نے کہا۔

"کیا ہوا؟"

"یار، اسے جج لوگوں نے انعام بھی اناؤنس کر دیا، پتہ نہیں شکل دیکھ کر یا کیا؟" وکی نے کہا "اپنا نام سن کر تو مجھے پیٹ گئی مارے خوشی کے۔ اس سے سالا میرا چکر بہت چلا۔ وہ تو ڈھے پڑی تھی شادی کے لیے۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میرا بھی دل بہت تھا۔ مگر یار اپنے پاس تھا ہی کیا۔ سالا دو شرٹ پر تو میں نے پورا سال نکالا تھا۔"

"اس کا باپ ہوٹل ووٹل ڈال کر دیتا" پپّو نے کہا "یہ تو بہت اچھا موقع تھا۔"

"یہی تو بات ہے نا یار" وکی نے کہا "یقین مان اپنے اوپر آج تک کسی کا ایک پیسے کا احسان نہیں ہے۔ اپن اپنے باپ کا احسان نہیں لیے تو معشوقہ یا اس کے باپ کا کیوں لیتے۔" اس نے تو کئی بار اشارہ کی مگر اپنا دل نہیں مانا۔"

"پھر اس کا کیا ہوا؟"

"پتہ نہیں یار، وکی نے کہا "میں تو بی۔ اے کر کے نکل گیا۔ میرے ساتھی تو سب ایک ایک کر کے جا چکے تھے۔ پھر میرا من بھی کالج میں نہیں لگا۔ امتحان پاس کرنا کیا مشکل تھا۔ بس پہلے ہی پرچے میں ذرا مشکل تھی۔ باقی تو میں اتنے سپلیمنٹ جمع کر لیتا تھا۔ جو سوال معلوم تھا کہ آنے ہی والے ہیں۔ رات میں گھر پر ہی لکھ لیتا تھا۔ باقی کتاب تو پاس رہتی ہی تھی۔ ایک سے ایک ہوشیار آئے مگر وکی کو کوئی پکڑ نہیں سکا۔"

"بس نتا کروز آ گیا برو۔"

"چلو۔"

"پروڈیوسر کا گھر ڈھونڈنے میں وقت نہیں ہوئی۔ سڑک سے اندر گھسے تو کئی چھوٹی موٹی گلیاں نظر آئیں۔ دو ایک راہ گیروں سے پوچھا اور کچھ ہی دیر میں وہ مکان کے سامنے تھے۔ سیڑھی چڑھتے ہوئے انہوں نے چہروں پر سنجیدگی اور ہلکی سی اُداسی طاری کر لی۔ اوپر پہنچے تو فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔ باہر دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں آٹھ دس آدمی کھڑے ہوئے تھے۔ وکی اور پپّو بھی اس انداز سے کھڑے ہوئے کہ دروازہ کھلنے پر اندر نظر جا سکے۔ اس دوران باہر کھڑے لوگوں کے جوتوں کا تو انھوں نے ایک ہی نظر میں جائزہ لے لیا تھا۔ پوزیشن بری نہیں تھی۔ اور ابھی تو اور لوگ آنے والے تھے۔

دروازہ بند ہونے کا مطلب یہ تھا کہ جن خاص لوگوں کا انتظار تھا وہ اب تک آئے نہیں تھے یا پھر متوفی کی بیوہ اور گھر کی دوسری عورتوں کا میک اپ مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس بات کا وکی کو خوب تجربہ تھا۔ جب دروازہ کھلتا تو گھر کی عورتیں سوگوار مگر پوری طرح سجی سنوری ہوتیں۔ ساڑی بلاؤز کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا ہوا معلوم ہوتا۔ بالوں کے بگڑنے میں بھی ایک بناؤ ہوتا۔ وکی کی جمالیاتی حس کو اس منظر سے بڑی تسکین ملتی تھی۔ اُسے اپنے کالج کے ڈرامے یاد آ جاتے تھے۔

کچھ دیر بعد دو چار آدمی زینے طے کرتے نظر آئے۔ انھیں دیکھ کر لوگوں میں کانا پھوسی شروع ہو گئی جس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ نو وارد فلمی دنیا کے جانے مانے لوگ ہیں۔ ان میں ایک شخص دھوتی، کرتا اور واسکٹ پہنے ہوئے تھا اور کچھ زیادہ ہی دکھی نظر آ رہا تھا۔ وکی نے پپّو سے کہا "یہ ضرور اشوک کی اگلی فلم کا فائننسر ہوگا۔ نئے آنے والوں نے آس پاس دیکھے بغیر دروازے تک پہنچ کر اطمینان سے گھنٹی بجائی۔ ملازمہ نے تھوڑا سا دروازہ کھولا پھر انھیں پہچان کر پورا دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوئے اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔

"اب زیادہ وقت نہیں لگے گا" وکی نے کہا "تیاریاں مکمل ہیں۔ تم نے دیکھا پروڈیوسر کی لاش ڈرائنگ روم میں رکھی ہوئی ہے سرہانے اگربتی جل رہی ہے۔"

اکا دکا لوگ آتے ہی جا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہو گئی۔ اندر سے کچھ لوگ باہر نکلے اور باہر کھڑے لوگوں سے گفتگو میں مصروف ہو گئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ تیاریاں پوری ہو گئی ہیں۔ بس گاڑی کا انتظار ہے۔ کچھ دیر تو انھوں نے مرحوم کے متعلق باتیں کیں کہ وہ کتنا اچھا آدمی تھا۔ اپنے پیچھے کتنا قرض چھوڑ گیا ہے۔ پس ماندگان کے لیے اس نے کیا کچھ چھوڑا ہے۔ پھر حسب معمول وہ فلموں کے تعلق سے گفتگو کرنے لگے کہ کون سی فلمیں سیٹ پر جا رہی ہیں۔ کس کے پاس بہت کام ہے۔ کچھ فلموں کے خوب چلنے کی پیشین گوئی کی، کچھ کے فلاپ ہونے کی۔ سوگواری کا تاثر قریب قریب ختم ہی ہو گیا۔ وکی اور پپّو بے تعلقی سے سب کی باتیں

سنتے رہے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ فائنل ایکٹ شروع ہو تو وہ فٹافٹ اپنا کام پورا کر کے اسٹیج سے رخصت ہوں۔

ایک نوجوان بے حد شاندار جوتے پہنے ہوئے تھا۔ پپّو کی نظر بار بار اُن پر چلی جاتی۔ وکّی نے اسے محسوس کر لیا۔

"پیارے، اُس کی آس چھوڑ دے، اپنے مطلب کا نہیں ہے۔"

"کیوں؟" پپّو نے سرگوشی کی۔

"مر جائے گا۔ وہ صدمے سے" وکّی نے دھیرے سے مگر مضبوط لہجے میں کہا "اس کا چہرہ دیکھ، قمیض دیکھ۔"

"قمیض تو بہت قیمتی ہے۔" پپّو نے کہا۔

"بدھو، ذرا غور سے دیکھ۔" وکّی نے کہا "تیرے کو نہیں لگتا کہ درزی سے کالر پلٹایا گیا ہے۔"

پپّو نے غور سے دیکھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔

"اِن باتوں کو تو ابھی نہیں سمجھ سکتا۔" وکّی نے زچ ہو کر کہا "اس کا جوتا ہرگز مت اٹھانا نہیں تو لفڑا ہو جائے گا۔ یہ جوتا اسے کسی نے باہر سے بھیجا ہے۔ کوئی رشتہ دار یا دوست خارجہ میں ہوگا۔"

"اتنا سب سوچتے رہے تو دھندا کیسے ہوگا۔" پپّو نے کہا۔

"بیٹا! وکّی کے ساتھ رہنا ہے تو سوچنا ہی ہوگا۔ یہ بھی ایک آرٹ ہے۔ تو ایسی سستی بات کرے گا تو اپنے ساتھ نہیں چلے گا۔ یہ سمجھ لے۔ کام پولس کا ہو یا چور کا، برا ہی ہوتا ہے۔ اُس کو آرٹ بنانے میں ہی آدمی کا کمال ہے۔ نہیں تو سالے تیرے میں اور معمولی چھپّل چور میں فرق ہی کیا ہوا؟"

"ساری یار" پپّو مرعوب ہو گیا۔ وکّی کی انھیں باتوں کا وہ دلدادہ تھا۔

اِس دھندے میں تو پپّو اس لیے آیا تھا کہ کالج سے نکلنے کے بعد پانچ سال چپلیں گھسنے کے باوجود بھی سو روپے کی نوکری اُسے نہیں ملی تھی لیکن اب تو اُسے بھی دھندے میں لطف آنے لگا تھا۔ اور پھر وکّی کے ساتھ کام کرنے میں کچھ اور ہی مزا تھا۔

دروازہ کھلا اور باہر کھڑے لوگ داخل ہوئے تو دروازے پر ہجوم ہو گیا۔ پہلا مرحلہ تو دروازے پر جگہ حاصل کرنا تھا۔ اس میں انھیں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بیٹھنے کے بعد وکّی نے کمرے کا اطمینان سے جائزہ لیا۔ ڈرائنگ روم زیادہ وسیع نہ تھا۔ تپائیاں، ٹیبل وغیرہ غالباً ہٹا دیے گئے تھے۔ لاش بیچ فرش پر رکھی ہوئی تھی۔

اور اُس پر سفید کپڑا پڑا ہوا تھا۔ صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ وکّی نے ایک دزدیدہ نظر اندر کے کمرے میں ڈالی۔ اس کا خیال غلط نہ تھا۔ مرحوم کی بیوہ سر پر آنچل لیے سفید ساری میں ملبوس نیم وا پردے کے پیچھے اس انداز سے کھڑی تھی کہ اس کا سراپا بہت کچھ نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ کون کون لوگ آئے ہیں۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے وکّی کو یہ اندازہ بھی ہوا کہ وہ کافی لوگوں سے واقف تھی کیونکہ جب کسی واقف کار سے اس کی نگاہیں چار ہوتیں تو وہ سر کے ہلکے سے خم سے پہچان کا اظہار کرتی۔ عورت روئی ضرور تھی مگر اس احتیاط کے ساتھ چہرہ خراب نہ ہونے پائے یا پھر لوگوں کی آمد سے پہلے اُس نے میک اپ درست کر لیا تھا۔ ان باتوں کا اندازہ تو وکّی نے منٹوں میں کر لیا مگر پتہ نہیں کیوں اس کا چہرہ وکّی کو بار بار ڈسٹرب کر رہا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ فاصلے کی وجہ سے یا دونوں کمروں کی روشنی میں فرق ہونے سے اور اس لیے بھی کہ وہ پردے کے پیچھے تھی، ایک بار بھی وہ اس عورت کے چہرے کو ٹھیک سے دیکھ نہ پایا۔

وہ ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ پپّو نے اُس کا زانو دبایا۔ اُس نے ایک غلط انداز نظر پپّو پر ڈالی۔ اُس نے اشارہ کیا کہ کام ہو گیا ہے۔ اب انہیں موقع دیکھ کر خاموشی سے نکل جانا تھا۔ وکّی نے دیکھا کہ نوجوان جو بہت شاندار جوتا پہن کر آیا تھا، اس کی نظریں بار بار دروازے کے قریب پڑے اپنے جوتوں پر چلی جاتی ہیں۔ شاید وہ جان بوجھ کر اس طرح بیٹھا تھا کہ جوتوں پر دھیان رہے۔ چوری کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اسے نہ ہو مگر جوتے اتنے بیش قیمت تھے کہ وہ انھیں نظروں سے اوجھل نہیں رکھ سکتا تھا۔

وکّی نے آنکھ مار کر پپّو کو اس کی طرف متوجہ کیا۔

"واقعی یار" پپّو نے ہونٹوں پر آئی ہنسی کو دباتے ہوئے کہا "اس کا دھیان تو اپنے جوتوں ہی پر ہے۔"

"لفڑا ہو جاتا ابھی" وکّی نے کہا "اس لیے میں نے منع کر دیا تھا، لیکن یار یہ عورت کا چہرہ پتہ نہیں کیوں مجھے کھٹک رہا ہے۔"

"پہچانتا ہے کیا؟" پپّو نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نہیں یار، ایسا لگتا ہے کہ میں اس کو کہیں دیکھا ہوں۔"

"لگ تو مجھے بھی رہا ہے۔ اپنے کالج کی کوئی لڑکی ہوگی۔ مگر یار یہ عورتیں شادی کے بعد اتنی بدل جاتی ہیں کہ سالی پہچانی نہیں جاتیں۔ اور اس کا چہرہ بھی ٹھیک سے دکھائی نہیں دے رہا ہے۔" پپّو نے

کہا۔

"یہی تو مشکل ہے" وکّی نے کہا "ایک بار چہرہ دیکھوں تو ابھی یاد آجائے۔"

"تو میں نکلتا ہوں" پپّو نے کہا "تیرے کو چانس ملے تو بس اسٹاپ پر آجانا۔"

"ٹھیک ہے۔"

ارتھی اٹھانے کی تیاریاں شروع ہوئیں تو شاید آخری دیدار کے لیے وہ عورت کمرے میں آئی۔ وکّی تو اسی لمحے کا منتظر تھا۔ سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ لوگ ارتھی کے قریب بڑھے۔ اسی ہڑبونگ میں پپّو وہاں سے سرک گیا۔ عورت کے چہرے پر ٹھیک سے نظر پڑی تو وکّی ششدر رہ گیا۔ یہ تو کنگ تھی۔ کند کریلانی۔ دبلے پتلے چھریرے جسم کی جگہ اب اس کے سامنے ایک بھرپور عورت تھی جس کا جسم فربہ پن کی طرف مائل تھا۔ رخسار بھر گئے تھے۔ رنگ نکھر گیا تھا۔ کند کا سوگوار چہرہ اسے اور بھلا لگا۔ دوشیزگی کے دنوں میں اس کی چھب اور تھی اور اب کچھ اور۔ الھڑپن کی جگہ وقار نے لے لی تھی۔ شوخی کی جگہ شائستگی نے۔ اور اس پر جنسی کشش کی فراوانی! وکّی ٹھٹک کر اسے دیکھتا کھڑا رہا۔ ممکن ہے اس کی نگاہوں کی حدت کند نے محسوس کی ہو کیونکہ پلٹ کر اس نے وکّی کو تیکھی نظروں سے تاکا۔ اور لوگ بھی اس کے بے تکے پن سے گھورنے پر برا مان کر فہمائشی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن وکّی کو اس کا احساس بھی نہ ہوا۔ کند اسے پہچان کر ٹھٹکی ضرور مگر فوراً لوگوں کی موجودگی کے خیال سے سسکیاں لیتے ہوئے اس نے ساڑی کا پلو منہ میں ٹھونس لیا اور نظریں ارتھی پر گاڑ دیں۔ ساتھ آئی عورتوں نے اسے تسلی دی اور سنبھالتے ہوئے اندر کے کمرے میں لے گئیں۔ دہلیز پر پہنچ کر ہی کند نے ایک بار پھر مڑکر وکّی کو دیکھا۔ وکّی کو اس کی نگاہوں میں پتہ نہیں کیوں آسودگی جھلکتی نظر آئی۔ جیسے وہ اپنی اداکاری کی داد چاہ رہی ہو۔

وکّی اطمینان سے مڑا۔ اور اپنی بوسیدہ چپلوں کے بجائے ایک نیا قیمتی جوتا پیروں میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ زینے کے پاس وہ جوتوں کے فیتے باندھ رہا تھا کہ ملازمہ باہر آئی اور آہستہ سے بولی۔

"آپ کو مالکن نے کل بلایا ہے۔"

"کل — کتنے بجے"

"شام پانچ بجے"

"ٹھیک ہے" وکّی نے کہا "میں آجاؤں گا۔"

پپّو اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔

"بہت سالڈ SOLID ہاتھ مارا یار تو نے" اس نے وکّی سے کہا "اس پر نظر تو میری بھی تھی مگر موقع نہیں ملا۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ لیکن میں تو سمجھا تھا کہ عورت کے چکر میں تو یونہی نکل آئے گا۔"

وکّی نے اس کی پھولی ہوئی قمیص سے اندازہ تو کر لیا کہ کوئی جوڑے جوتے اس میں ہونے چاہئیں۔ جوتے اس طرح رکھے گئے تھے کہ کوئی یہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا کہ قمیص میں کوئی اور چیز رکھی ہے۔

وہ کچھ لینے ہی جا رہا تھا کہ اس کی نظر بس اسٹاپ پر کھڑے ایک شخص پر پڑی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"ارے تو"

"ارے تو"

دونوں کی زبان سے ایک ساتھ نکلا۔

یہ وجے شرما تھا۔ ان کے کالج کا ساتھی۔ ایم۔ اے کر کے لیکچرار ہو گیا تھا۔

"تو یہاں کہاں" وکّی نے پوچھا۔

میں تو یہیں رہتا ہوں یار، اسٹیشن کے پاس" وجے نے جواب دیا۔

"کہاں جا رہا ہے" وکّی نے ایک سوال اور داغ دیا۔

"آج ڈیمانسٹریشن ہے، یونیورسٹی کے باہر، وہیں جا رہا ہوں۔"

"ڈیمانسٹریشن کس لیے؟"

"پگار بڑھانے کی خاطر" وجے نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اور اگر پگار نہ بڑھی تو؟" وکّی نے پوچھا۔

"شاید اسٹرائیک ہو جائے" وجے کے چہرے پر خوف کے سائے منڈلائے۔

وکّی یہ کہتے کہتے رک گیا کہ اگر ایسا ہو تو میرے پاس آجانا۔ پتہ نہیں کیوں دل آزاری کرنے کو اس کا دل نہیں ہوا۔ وجے شرما اپنے زمانے کا بہت ذہین طالب علم تھا اور ہمیشہ فرسٹ کلاس میں پاس ہوتا۔ وکّی کو بڑی حقارت سے دیکھتا تھا۔ بلکہ پہلے تو وہ اسے چور کہہ کر بلایا کرتا تھا مگر دوستوں کی شکایت پر کہ تم ایک فنکار کی توہین کرتے ہو اسے نام سے بلانے لگا تھا۔ کالج کے دنوں میں وکّی سوچا

کرتا تھا کہ یہ شخص کسی روز ہاتھ لگا تو گن گن کر بدلے گا مگر اس وقت وہ نفرت کہیں غائب ہو چکی تھی۔ اُسے بس اتنا یاد رہ گیا تھا کہ یہ شخص اُس کے بہترین دنوں کا ساتھی ہے۔ ہاں ایک آسودگی کا احساس ضرور ہوا مگر وہ بھی اسے اچھا نہیں لگا۔ کیا کمینہ پن ہے۔ اس نے خود سے کہا۔

ایک بار پھر انھوں نے چار نمبر بس پکڑی اور چور بازار واپس آئے۔ جوتے بیچ کر وہ ہوٹل دلی دربار پہنچے۔ وہاں شاندار لنچ لے کر انھوں نے رنیگل کا رُخ کیا۔ مگر اس دوران وکی کا ذہن کمد میں اُلجھا رہا۔ اس کا بھرپور سراپا بار بار اس کے ذہن کو کریدتا رہا۔ اُسے حاصل کرنے کی تمنا اس کے دل میں پھر ایک بار جاگ اٹھی تھی اور وہ اس کی دسترس سے کچھ ایسی دور بھی نہیں تھی۔

اگلے روز پانچ بجے ایک بار پھر وہ کمد کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ آج دروازہ خود کمد نے کھولا۔ شاید وہ اس کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ آج بھی وہ سفید ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ کلائیاں خالی تھیں اور سینہ بھی۔ اُس کی نگاہیں اٹک گئیں۔ کمد کی چمکتی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ سمجھ گیا کہ کمد اداس نہیں سوگوار ہونے کی وہ محض اداکاری کر رہی ہے۔

فلیٹ بالکل خالی تھا۔ کمد نے شاید ملازمہ کو کہیں بھیج دیا تھا۔ فریج سے شربت نکال کر کمد نے اُس کے سامنے رکھا اور بسکٹ وغیرہ۔ اس دوران دونوں بالکل خاموش رہے۔ دونوں ہی سوچ رہے تھے کہ گفتگو کہاں سے شروع کی جائے۔ کمد کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہے۔ آخر وکی نے پہل کی۔ اور اسی ہڑبڑاہٹ میں وہ بات کہی جو کہنا نہیں چاہتا تھا۔

"مجھے اشوک کی موت کا افسوس ہوا،" اس نے کہا مگر کمد کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ دیکھ کر رک گیا۔

"شاید تمہیں اس کا افسوس نہیں"۔ اس کے لبوں سے نکلا۔

کمد کے چہرے پر کوئی ردّ عمل مرتب نہیں ہوا۔ نہ تائید، نہ تردید، نہ استعجاب۔

"میں نے کچھ غلط کہا؟" وکی الجھ گیا۔

"نہیں،" کمد اسے دیکھ کر مسکرائی "تم بالکل صحیح سمجھے۔ میں دراصل سے محسوس کر رہی ہوں کہ ایک بار پھر میں آزاد ہوں۔"

"اشوک تمہیں پسند نہیں تھا؟"

"اُن معنوں میں نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔" اس نے کہا "جب میں نے اشوک سے شادی کی تھی تو میں بہت خوش تھی کہ ایک فلم پروڈیوسر سے شادی کر رہی ہوں۔ ڈراموں کی وجہ سے مجھے فلم لائن کا بڑا موہ تھا۔"

"کیا اُس نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ تمہیں فلموں میں چانس دے گا؟" وکی نے شربت کا گھونٹ لیا۔

"شادی کے وقت تو اُس نے یہی کہا تھا" کمد نے اعتراف کیا "لیکن اگر وہ وعدہ نہ بھی کرتا تو میں اس سے شادی کرتی کیونکہ وہ فلموں سے وابستہ تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مجھے دودھ دوہنے والی گائے سمجھتا تھا۔ جس سے بہ آسانی فلموں کے لیے پیسہ مل سکتا ہے اور ٹھاٹ سے زندگی گزاری جا سکتی ہے۔"

وکی کو اچھا نہیں لگا کہ وہ اشوک کے بارے میں اس طرح گفتگو کریں۔ ابھی کل ہی اسی کمرے سے اُس کی ارتھی اٹھی تھی۔ اس نے گفتگو کا رُخ موڑنے کے ارادے سے اُس سے پوچھا۔

"تمہارے بچے نظر نہیں آتے؟"

"نہیں ہیں" کمد نے اختصار سے کہا۔ پھر ایک لحظہ کو رک کر بولی "میں نے ہونے نہیں دیے۔"

"تمہیں پسند نہیں؟"

"خواہش تو بہت تھی" کمد نے کہا "لیکن وہ اکثر اتنا پی کر گھر لوٹتا تھا کہ کسی لائق ہی نہ رہتا تھا۔ پھر مجھے بھی نفرت ہو گئی۔ میں نے سوچا ایسے ذلیل شخص کا بچہ میری کوکھ میں کیوں پلے۔ تم نے شادی کر لی؟"

"نہیں" وکی اب کچھ کنفیوز سا ہونے لگا۔

"کیا کام کرتے ہو؟"

"بزنس۔ جوتوں کا کاروبار ہے۔" وکی نے مختصر سا جواب دیا۔

اُس روز وکی دو گھنٹے کمد کے پاس بیٹھا رہا۔ گفتگو کا سرا بار بار ٹوٹ جاتا۔ ایک آدھ ادھورا جملہ۔ کوئی سوال۔ اپنائیت کا احساس بھی تھا مگر درمیان میں شیشے کی ان دیکھی دیوار بھی تھی۔

"اشوک سے تمہیں ذرہ بھر بھی لگاؤ نہیں؟" ایک بار وکی نے پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ اُس کی زندگی شراب تھی اور فلمی عورتیں۔ گھریلو، سیدھی سادی عورتوں سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے وہ صرف بنک سمجھتا تھا جس میں سے وقت ضرورت پیسے نکالے جا سکتے ہیں۔ کئی بار میں نے سوچا کہ خودکشی کر لوں مگر صرف اس لیے نہیں کی کہ اس طرح تو وہ تمام جائداد کا وارث ہو جاتا۔ میرے مرنے سے تو وہ بہت خوش

ہوتا۔"

"تم طلاق بھی تو لے سکتی تھیں۔"

"طلاق لے کر بھی کیا ہوتا۔ مجھے تو مردوں ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔"

"اب کیا ارادہ ہے؟" وکی نے پوچھا۔

اُس نے وکی کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ تو تم پر منحصر ہے۔ مگر اب وہ پرانی ناسمجھ کمد نہیں تھی۔ ایک خود دار عورت تھی وہ چاہتی تھی کہ یہ بات وکی کی طرف سے آئے۔

وکی نے اُس کے خوبصورت گداز لو دیتے جسم کو حسرت سے دیکھا۔

بس ایک جملے کی بات تھی۔ اور یہ گداز گرم جسم۔

وکی جانتا تھا کہ وہ گھر بسا کر نہیں رہ سکتا۔ یہ اس کی فطرت ہی میں نہیں تھا۔ ورنہ شاید وہ بہت پہلے شادی کر چکا ہوتا۔ اب یہ جسم اُسے للچا رہا تھا اور وہ اسے حاصل کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ کم از کم اس وقت تو وہ ہاں کہہ ہی سکتا تھا۔ اور کمد اسے یقیناً سیراب کر دیتی۔

اُس نے کمد کے دہکتے جسم پر نظر ڈالی۔ یہ وہ کمد نہیں تھی جس سے اُس نے کالج میں محبت کی تھی یہ تو تیس بتیس سال کی ایک خوبصورت بیوہ جسم کے بدلے اپنا تحفظ مانگ رہی تھی۔

ایک لمبی سانس لے کر اُس نے اپنے پھیپھڑوں کو آکسیجن پہنچائی۔ اس جسم کو حاصل کیے بنا وہ نہیں رہ سکتا۔ چاہے سب کچھ داؤں پر لگ جائے۔ اُس کے ہونٹ ہلے بھی لیکن وہ جملہ ——— اس کے سینے ہی میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

شرمندہ شرمندہ سا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کمد کا چہرہ اتر گیا۔ لیکن وہ اب بھی مایوس نہ تھی۔

"پھر کب آؤ گے؟" اُس نے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" وکی کی آنکھوں کے آگے سائے لہرائے۔

"مگر میں آؤں گا ضرور" اس نے بہت ہی دھیمے سے کہا جیسے خود سے کہہ رہا ہو۔ "میں آؤں گا۔ ضرور آؤں گا۔"

مضمحل قدموں سے وہ باہر آیا۔ وکی تم بہت بے وقو[illegible] سیڑھیاں اترتے ہوئے اُس نے خود سے کہا۔ تمہیں جینے [illegible] حق ہیں۔ کوئی حق نہیں۔

دھنک رنگ

سہیل کاکوروی

میں تیرا ذکر جو سنتا ہوں سنبھل جاتا ہوں
یک بہ یک اپنے رویّوں میں بدل جاتا ہوں

دردمندی درد داری وفا اور خلوص
لے کے ہر گھر میں یہی طرز عمل جاتا ہوں

یوں تو میں توڑ کے رکھ دیتا ہوں شعلوں کا غرور
پھول کی وادی میں جاتا ہوں تو جل جاتا ہوں

راکھ ہو جاتا ہے سب ترکِ محبت کا بھرم
شمع رو دیکھ کے تجھکو میں پگھل جاتا ہوں

کیسی گنجان سی بستی کی طرف شام ڈھلے
اپنی تنہائی سے گھبرا کے نکل جاتا ہوں

● ۲۶ قندھاری لین، لال باغ۔ لکھنؤ۔۱

فضل افضل

لفظ و معنی کی نئی تفسیر لکھ
خون میں ڈوبی ہوئی تحریر لکھ

آزما کر دیکھنے کے باوجود ــــ!
سان پر ہے آج بھی شمشیر لکھ

ہم جنوں پیشہ ہیں، اے اہل خرد
ہم کو اپنی آنکھ کا شہتیر لکھ

ہو گیا ہے ہم سے وابستہ قصور
لے! ہمارے جرم کی تعزیر لکھ

آسمانوں کو کھنگال آئے ــ مگر
ہو سکی نہ قلب کی تسخیر لکھ

● عقب صدر چپہ ٹخانہ، یادگیر۔ کرناٹک۔

خسرو متین

ان اندھیروں میں حکمرانی کر
کچھ ہماری بھی پاسبانی کر

میرے پیروں کو پھر معجزہ دے
ریگ زاروں کو پانی پانی کر

ہم قفس میں بہت ہی شاداں ہیں
آب و دانے میں بس روانی کر

پھر کوئی شاہ ولی آیا ہے
خانقاہوں پہ مہربانی کر

خوشبوؤں کا کوئی چراغ جلا
میرے گھر میں بھی شادمانی کر

● ۲۴۹ کلیان واس، دہلی۔ ۹۱

محی الدین عادل

آؤ صحرا کو چلیں خواب سمندر لے کر
وہ بھی جائے گا کسی سمت مقدر لے کر

اس کے کہنے کا زمانے سے تھا انداز جدا
لوگ پھرتے تھے اسی جرم میں پتھر لے کر

کتنی نوکیلی ہوا ہے کہ بدن ڈکھتا ہے
اب کے موسم بھی چلا آیا ہے خنجر لے کر

جانے کیا شب نے کہا شام سے سرگوشی میں
پنچھی پیڑوں پہ چلے ڈوبتے منظر لے کر

دو دنوں کا ہے نگر پھر تو وہی ویرانہ
کیا ہے خانہ بدوشوں میں کوئی گھر لے کر

● گلاب چند لین، اجی۔ ایس۔ روڈ جگسلائی جمشید پور

عنبر شمیم

بہت مشکل ہے رکھنا سر سلامت
اندھیری رات ہے خنجر سلامت

فضائے رنگ و بو کیا، آرزو کیا
ہر اک سو خون کا منظر سلامت

بلا کی دھوپ ہے شہرِ ہوس میں
نہ سایہ ہے نہ اب پیکر سلامت

ہر اک پل حادثے کا منتظر ہے
ہر اک چہرہ پہ ہے اک ڈر سلامت

بچھا دینا جہاں تک دھوپ جائے
مگر رکھنا یہ بال و پر سلامت

● ۱/۲۲ مدار شاہ لین، پل خانہ باوڑہ۔

فیض الحسن

طائرِ ہجر کو اک بار کوئی پر دے دے
جیسے ہارے ہوئے سالار کو لشکر دیدے

کتنی نازک ہے تری شیشہ بیانی لیکن
پہلے اس گونگے کو الفاظ کے پتھر دیدے

یوں تو نادیدہ جزیروں میں بکھر جاؤں گا
گردشِ ذات! مجھے کوئی تو محور دیدے

دشتِ یکتائی میں دستار نہ کھو آؤں کہیں
آج کے عہد میں اک تو مجھے ہمسر دیدے

گھر کی محروم فضا کو وہی آہٹ مل جائے
میری خلوت کو وہی شب کا منظر دیدے

● ۲۵۰۔ جے جے کالونی بازار روڈ باندرہ بمبئی ۵۰



ندا فاضلی

۱۰۳ - امرا پارٹمینٹ ، ڈانڈ پاڑہ - ۱ ، کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲

دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۱۱

مس ٹنڈن کالج آتے آتے ایک دن اچانک غائب ہو جاتی ہے۔ کالج کے نوٹس بورڈ میں اس کی موت کی اطلاع لگ جاتی ہے۔ کالج آتے وقت مندر کے پاس اس کی سائیکل ایک کار سے ٹکراتی ہے اور وہ سر کے بل گر جاتی ہے اور اسپتال کے راستے ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس خبر نے کالج کے ماحول میں ایک کمی سی پیدا کر دی ہے باغ ، کلاس ، مندر سب ادھورے سے لگنے لگے ہیں۔ کچھ دن یہ ادھورا پن محسوس ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ہر چیز معمول پہ آجاتی ہے۔ لیکن جب بھی وہ تنہائی میں اس بارے میں سوچتا ہے تو اس کی یادداشت میں محفوظ کوئی شعر اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہ اپنے آپ ہی میں الجھنے لگتا ہے۔ سائیکل ، مندر میں گھنٹی بجاتے ہوئے ہاتھ ، پیپل کا پیڑ ۴۵ اور ۹۰ کے زاویے اور بلاوز اور ساڑی کے درمیان جگ مگ کرتا آئینہ ، جن میں اب موت بھی شامل ہو چکی ہے ، ذہن میں ایک ساتھ ابھر کر کسی عجیب سے احساس میں ڈھل جاتے ہیں۔ ایک لاشکل سا احساس جو محسوس تو ہوتا ہے لیکن کوئی روپ نہیں لے پاتا۔ وہ سارے شعر جو پہلے اسے تیز طرار اور خوبصورت لگتے تھے ، اس کی ترجمانی کا ساتھ نہیں دیتے۔ مس ٹنڈن اور ندا کا رشتہ ایک بے نام تاثر کا سا ہے لیکن اس نے ندا کے ذہن میں نئی شعری زبان کا تجسس جگا دیا ہے۔ اس تجسس نے لائبریری میں اس کی کتابوں کا انتخاب ہی نہیں بدلا ، گوالیار کی ایک ہندی کی ادبی سنستھا "نو گائن" کے بھی قریب کر دیا ہے۔

کالج میں سری صاحب کا لڑکا خسرو بھی ہے۔ اس کے رئیسانہ ٹھاٹ باٹ نے کئی لڑکوں کو اس کے قریب کر دیا ہے وہ کار میں آتا جاتا ہے اور کالج کے کینٹین میں جتنے لڑکے اس کے ساتھ ہوتے ہیں ان سب کا بوجھ اکیلے اٹھاتا ہے کالج کی کئی لڑکیاں اس کی دوست ہیں۔ کلاس روم میں کبھی کبھار ہی اس کے دیدار ہوتے ہیں اس کا سلسلۂ نسب کئی پشتوں پیچھے ایک صوفی فقیر سے جڑتا ہے۔ سندھیا کی راج گدی ابھی فقیر کی دعاؤں کا کرشمہ بتائی جاتی ہے۔ اس فقیر کے مزار کی آن بان راجہ کی احسان مندی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ خسرو کے باپ اس مزار کے سجادہ ہیں۔ چار ساڑھے چار فٹ کے چھوٹے سے منمناتی آواز کے رئیس۔ سرکاری خزانہ سے وظیفہ کے علاوہ موروثی جاگیر نے بھی ان کی صوفیانہ شان و شوکت میں اضافہ کیا ہے۔ ندا ان کے بیٹے کا دوست بن کر وہاں جاتا ہے لیکن ایک دو ملاقاتوں کے بعد باپ اسے اپنے درباریوں میں شامل کر لیتا ہے۔ اب اس کی شامیں انھیں کی محفلوں میں گذرتی ہیں۔ سورج ڈھلتے ہی ماحول بدلتا ہے۔ شراب شروع ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی مخصوص نشست پر شاہانہ انداز میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ محفل کے سارے لوگ ان کی ہر بات کو نہایت توجہ سے سنتے ہیں۔ نشے کی بے تکلفی ، ان کی جنسی فتوحات ادویات سے متعلق عجیب و غریب نسخوں کی تیاری ادویات کے ترکیب استعمال کی ہر روز ایک نئی داستان سناتی ہے۔ موضوع سیاست کا ہو یا مذہب کا ، ہر بات گھوم پھر کر ادھر ہی آجاتی ہے۔

"پچاس اچھی نسل کے مرغے ہوں۔ انھیں صبح شام زعفران اور میوے کھلائے جاتے ہیں۔ سات دن کے بعد ہر روز اس طرح پالا ہوا ایک مرغا حلال کر کے اس کا گوشت باقی کے مرغوں کو کھلاتے جائیے۔ یہ عمل آخری مرغے تک جاری رہے اور پھر جو بچا سواں مرغا بچے اس سے آدھا گلاس یخنی بنا کر پیجئے اور پھر دیکھئے کس طرح زمین آسمان کے ستاروں کا سفر کرتی ہے"۔

اپنی جاگیر میں انھوں نے اس کا انتظام کیا ہوا ہے۔ وہاں دو چار آدمی اسی کام پر مامور ہیں۔ ان کی طبی سائنس کے مطابق جانوروں کو پالا جاتا ہے۔ اور پچاس مرغوں سے ایک مرغا یا پچاس بکروں سے ایک بکرا بنا کر روزانہ ان کے پاس بھیجا جاتا ہے جو شراب کے ساتھ ان کے مختصر سے جسم میں

پہونچ کر بڑھاپے میں جوانی کا معجزہ دکھاتا ہے۔ دن میں وہ عقیدتمندوں کے لیے صاحب درگاہ کے سلسلے کے صوفی ہیں۔ ان کے تعویذ اور دعائیں بہت پُراثر ہیں۔ لیکن شام ہوتے ہی وہ اپنے شیطان کو مارنے کی نت نئی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ اس نیک عمل میں کبھی کبھار ندا کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ وہ اس معاملہ میں نہایت کشادہ ذہن ہیں۔ ان کی کوٹھی کے احاطے میں کئی گھر آباد ہیں۔ یہ سب انھیں کی رعیت ہے۔ ان میں سے کچھ ان کی جاگیر کی دیکھ بھال کرتے ہیں کچھ گھر میں کام کرتے ہیں۔ اس احاطے میں ایک لڑکی کافی چونچال ہے ——— اس چونچال کو عمر نے اور پرکشش بنا دیا ہے۔ سترہ اٹھارہ برس کی یہ لڑکی انھیں کی کوٹھی کے چوکیدار کے گھر کا اجالا ہے۔ ایک شام اسے احاطے سے گذرتا دیکھ کر وہ ندا کی طرف دیکھتے ہوئے مسکراتے ہیں۔ ندا پہلی بار اس کو دیکھتا ہے۔ اور آتے جاتے اشاروں کی خاموش زبان میں اس سے بات چیت شروع کر دیتا ہے۔ یہ اشارے کچھ دن میں مسکراہٹوں میں بدلتے ہیں اور مسکراہٹیں جلد ہی کاغذ کے پرزوں کے لین دین میں جگمگانے لگتی ہیں۔ سری صاحب ایک تجربہ کار عاشق کی طرح اس معاشقہ کی جگہ جگہ رہنمائی فرماتے ہیں۔ اور ندا اس رہنمائی میں ہفتوں کا سفر دنوں میں طے کر لیتا ہے۔ دونوں اسکول کے راستے میں ایک دوسرے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ایک شام وہ طے شدہ پروگرام کے تحت اس کوٹھی کی ایک سونی جگہ ندا سے ملنے آتی ہے۔ اکیلے میں یہ دونوں کی پہلی ملاقات ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ ملاقات ہاتھوں اور ہونٹوں کی حدوں سے آگے بڑھے سری صاحب کے قدموں کی آہٹ ایک دوسرے کو الگ کر دیتی ہے لڑکی انھیں وہاں دیکھ کر بہت بری طرح سہم جاتی ہے۔ وہ قریب آکر مسکراتے ہیں اور اس کے رخساروں کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کوئی بات نہیں، ڈرو نہیں کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں ان کے جاتے ہی لڑکی تیر کی طرح بھاگتی ہوئی اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ یہ ندا سے اس کی آخری ملاقات تھی۔ اس معاشقے کے ہر راز سے سری صاحب واقف ہوتے ہیں، وہ نہایت چالاکی سے ان کا استعمال کرتے ہیں اور دوسرے کے شکار کو اپنی فتوحات میں شامل کر لیتے ہیں۔ وہ کئی دنوں تک اپنے باپ اور بدنامی کے ڈر سے مجبوراً ان کے نسخوں کی تجربہ گاہ بنی رہتی ہے۔ ان کی بیگم کو جب اس کی بھنک پہنچتی ہے تو وہ چوکیدار کو بلا مقصد الگ کر کے اپنے شوہر کو گناہوں سے دور کرتی ہیں۔ چوکیدار نئی نوکری کی تلاش میں اپنی لڑکی کو ساتھ لے کر کہیں چلا جاتا ہے۔

ندا کے ذہن میں ایک الجھاؤ پیدا ہوتا جا رہا ہے۔ الفاظ و احساس کی دوری کی اس کشمکش نے اس کی شعر سازی کو قریب قریب ختم کر دیا ہے۔ وہ سارے لفظ جو اس کے ساتھ ہیں، ان سے اس کشمکش کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ پہلے یہ خود ایک ربط میں ڈھل کر شعر کا روپ دھار لیتے تھے، جدھر لفظ لے جاتے تھے ادھر ذہن مڑ جاتا تھا۔ مگر اب جذبہ و احساس ان میں خود کو تلاش کرنے لگے ہیں۔ شاعری کی زبان اسے مصنوعی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں اسے اپنے اردگرد کی مانوس فضا دکھائی نہیں دیتی اور کہیں اس کی جھلک ملتی بھی ہے تو اظہار کے رائج پیرائے اس میں اجنبیت سی ابھار دیتے ہیں۔ گھر اور گھر سے باہر کی پرچھائیاں شاعری کے برعکس افسانوی ادب میں زیادہ گہری اور جانی پہچانی نظر آتی ہیں۔ روسی انقلاب سے پہلے کا فکشن جس میں ٹالسٹائی، چیخوف، ترگنیف، گوگول، گورکی وغیرہ ہیں، ذہن کی بے چہرہ پیچیدگیوں کو موزوں شکلیں دینے لگے ہیں۔ ان کے کرداروں کے تضادات اور سوچ کا تجزیاتی انداز، اسے اپنے آپ سے قریب کیے ہوئے ہیں۔ ان کرداروں کے ساتھ وہ خود کو اجنبی محسوس نہیں کرتا۔ ان میں سے بیشتر اسے شہر میں جگہ جگہ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ادب میں آس پاس کے جانے پہچانے منظروں کی اسی جستجو نے ندا کو ہندی کے سنت کویوں کی گھریلو فضاؤں سے جوڑ دیا ہے۔

الگنی پر سوکھتے کپڑے، گلیوں میں کھیلتی کلکاریاں، شاخوں میں چہچہاتے پرندے، ٹیڑھی میڑھی ڈالیں، نماز پڑھتے دالان، لالٹینیں روشن کرتے ہوئے ہاتھ، روشن دانوں میں آباد کبوتر، گنگناتے ہوئے کمرے، سوتی دوپہریں، نہاتی شامیں، سوئٹر بنتی کلائیاں اور ایسے ہی دوسرے منظروں سے ندا کے شب و روز جڑے ہوئے ہیں۔ اس کے دکھ سکھ انھیں سے ہم رشتہ ہیں۔ وہ ان کی زبان سمجھتا ہے۔ یہ اس کے مکالمے سمجھ لیتے ہیں۔ ان سے الگ ہو کر نہ وہ کچھ سوچتا ہے نہ سوچ سکتا ہے۔

ایک ڈوبتی ہوئی شام کو، ویران پہاڑی کے ایک پرانے سے مندر میں سورداس کی رادھا کرشن کے ویوگ میں ہرے بھرے درختوں سے شکایت کرتی ہے۔ پجاری کا چمٹا اس کے ویوگ کی اداسی کو چاروں طرف پھیلی ہوئی خاموشی پر پھیلا رہا ہے۔ ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی گائیں، سامنے بہتا ہوا تالاب، سب اس کے سوگ میں شریک ہو جاتے ہیں۔

مدھوبن تم کیت رہت ہرے
ووہ وِیوگ شیام سندر کے ٹھاڑھے کیوں نہ جَرے
کون کاج کھڑے رہے بن میں، کیوں نہ اُکٹھ پرے

(مدھوبن تم کیسے ہرے بھرے ہو۔ میں تو اپنے شیام کے فراق میں جل رہی ہوں اور تم پر کوئی اثر نہیں ہے۔ میری طرح تم بھی اس آگ میں کھڑے کھڑے کیوں نہیں جل گئے۔ تمھارے اس طرح کھڑے رہنے کا کیا کارن ہے۔ اتنے بھاری غم میں تم جڑ سے کیوں نہیں اکھڑ گئے) مدھوبن کے پیڑ پھول خاموشی سے رادھا کے درد کو سنتے ہیں اور شرمندہ ہو کر اداس ہو جاتے ہیں انسان اور فطرت کا یہ مکالمہ جس میں چرند، پرند، پیڑ اور انسان ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساجھے دار ہیں ندا کو چونکاتا ہے۔ اس الجھن کے بول دھیمے دھیمے اس گانٹھ کو کھولنے لگتے ہیں، جو کئی دنوں سے ذہن میں کہیں الجھی ہوئی تھی۔ اسے لگتا ہے مس ٹنڈن کے کالج سے اچانک غائب ہو جانے اور رادھا کا شیام سے بچھڑنے میں کوئی ان دیکھا رشتہ ہے اپنی ظاہری شباہتوں کے نیچے ہر دکھ ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ سورداس کے شبدوں میں ندا کو اس سونے پن کی جھلک نظر آتی ہے جو آہستہ آہستہ اس میں گھر کرتا جا رہا ہے۔ سورداس اس کا تعارف رحیم، کبیر، میرا اور جائسی سے کرا دیتے ہیں اور وہ ان کی چھایا میں اپنی دھوپ سکھانے لگتا ہے۔ اس ذہنی قربت نے اس کی زبان کو تصویری اور زمینی بنا دیا ہے۔ کئی مہینوں کی خاموشی کے بعد وہ کئی نظمیں کہتا ہے ایک نظم کے دو مصرعے یوں ہیں۔

سائے کو چھونا سائے کو کھونا ہے ، سندرتا کا پیار جنم کا رونا ہے

یہ نظم "سندرتا" کے عنوان سے ماہنامہ سریتا کے اردو ایڈیشن کے پہلے شمارہ میں شائع ہوتی ہے۔ اس کی اشاعت پرچہ کو راس نہیں آتی اور ایک دو شماروں کے بعد اسے بند کر دیا جاتا ہے۔ یہ نظمیں دعا صاحب، ریاض صاحب اور ان کے ساتھ کے دوسرے مقامی اساتذہ کے مذاق کا موضوع بنتی ہیں۔ گوالیار میں داغ اور نوح کے انداز میں جس طرح کی غزلیں عام ہیں۔ ان سے اس لب ولہجہ کا کوئی تال میل نہیں بیٹھتا۔ مضامین، زبان، محاورے سب طے شدہ ہیں۔ ان سے انحراف غلطی میں شمار ہوتا ہے۔ داغ اور نوح کے اشعار سند کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن ہندی کویوں کو بدلے ہوئے لہجے کو قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہوتی۔ اردو میں جسے انحراف سمجھا جاتا وہ دیوناگری کی روایت کا حصہ ہے۔ یہ روایت خسرو، محمد قلی قطب شاہ اور ولی کے بعد اردو کے شعوری سطح پر دور ہو جاتی ہے۔ ہندی کا حلقہ ندا کی ہمت افزائی کرتا ہے اور وہ ان سے ذہنی قربت محسوس کرنے لگتا ہے، ان ادیبوں اور شاعروں میں ونود شکل، نریش سکسینہ، ادم پربھاکر، مکٹ بہاری سروج اور بہت سے دوسرے شامل ہیں۔ ہندی کی آدھونک (جدید) کویتا کے ردعمل کے طور پر نو گیت کا انکر پھوٹتا ہے۔ یہ گیت چھایاوادی روایت اور پرگتی وادی بیانیہ گیت سے الگ ہو کر نئے سرے سے اپنا رشتہ بولیوں کی زندہ روایات سے جوڑتا ہے۔ اس میں اپدیش اور خیال آرائی کی جگہ دات دن کے نجی تجربے، لمحوں میں بٹا ہوا وقت جانی پہچانی جزئیات سے جڑ کر چلتا ہے۔ ندا بھی ادم پربھاکر، شولبھ، سوم ٹھاکر اور نریش سکسینہ وغیرہ کے ساتھ اس تحریک میں شامل ہے۔ اس کے گیت بھی انھیں کے ساتھ دھرم دیر بھارتی کی ادارت میں دھرم یگ میں نمایاں طور پر شائع ہوتے ہیں۔ یہی گیت رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ اردو رسائل "تلاش"، "تحریک"، اور "تخلیق" میں چھپتے ہیں۔ گیتوں کی اس زمینی زبان کا اثر ندا کی نظموں اور غزلوں پر بھی پڑتا ہے۔

خط ہے کہ بدلتی رت یا گیتوں بھرا ساون ، اٹھلاتی ہوئی گلیاں شرماتے ہوئے آنگن
سمٹی ہوئی چوکھٹ پہ اک دھوپ کی بلی سی ، نیبو کی کیاری میں چاندی کے کئی کنگن
غزل

ہندی کی طرح اردو میں ابھی نئی شاعری کی چہل پہل ہے۔ ہر طرف اپنی بات کو اپنی طرح کہنے کی کشمکش نمایاں ہے۔ کبیر کے لفظ "انوبھو سوداگی ہے" ہر تخلیق کی کسوٹی ہے۔ اردو میں نئی آوازیں، رد و قبول کے مراحل سے نبرد آزما ہیں جب کہ ہندی میں انھیں تاریخی حقیقت کے طور پر قبول کیا جا چکا ہے۔ (باقی آئندہ)

دھنک رنگ

م.ح. شاہین صدیقی

گر ہو سکے تو لے شدہ معیار چھین لے
اے برف بڑھ کے آگ کا کردار چھین لے
صدیوں رہوں میں دھوپ کے صحراؤں کا مزہ
تھک کر جو بیٹھ جاؤں تو دیوار چھین لے
شعلوں کا رقص سارے مناظر لہو لہو
کوئی تو مجھ سے قوتِ دیدار چھین لے
آنکھوں سے گفتگو کا سلیقہ بھی سیکھ لوں
شاید زمانہ طاقتِ گفتار چھین لے
چہرے پہ کالی رات کے الفاظ ہیں عیاں
ہاتھوں سے میرے صبح کا اخبار چھین لے

● ڈیتو۔ ڈاکخانہ بارا ودیا چا گند ضلع گیا۔

حسنین صدیقی

خیال و خواب کا یہ سلسلہ انوکھا ہے
نہ جانے کون مرے ساتھ ساتھ چلتا ہے
کہ مسیح پکاریں کسے کہیں قاتل
ہر ایک شخص اٹھائے صلیب چلتا ہے
کوئی بتائے کہ یادوں کے ریگزاروں میں
وہ کون ہے جو ہمیں بار بار چھلتا ہے
فروغ نشہ سے ان خواب خورآنکھوں میں
وہ ایک سایہ سا چلتا دکھائی دیتا ہے
شکستگی کی یہ منزل ہے کونسی کہ یہاں
ہر ایک پڑاؤ پہ کچھ چھوٹتا سا لگتا ہے

● آکاش والی، احمد آباد۔ ۳۸۰۰۰۹ (گجرات)

فریاد آزر

شدید غم سے میرا کوئی سلسلہ نہیں ملا
یہی سبب ہے غالباً مجھے خدا نہیں ملا
زمین گھر چکی تھی سرد آگ کی لپیٹ میں
زماں سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ملا
کہاں سے دیکھتا میں بڑے خوبرو جہان کو
ہزار خواہشیں تھیں کوئی زاویہ نہیں ملا
حصارِ کائنات سے نکل کے ڈھونڈتے تجھے
مگر خلا سے آگے کوئی راستہ نہیں ملا
نہ جانے ہے کہاں وہ، کس مزاج کا ہے کون ہے
مجھے مرے نصیب کا لکھا ہوا نہیں ملا

● شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

جمال اویسی

اُجالے یہ اُجالے کس لیے ہیں؟
شبِ غم کے حیالے کس لیے ہیں؟
کئی پرچھائیاں کچھ بولتی ہیں
نگاہوں میں یہ ہالے کس لیے ہیں؟
یہ کیسا بین ہے، کیا ہو رہا ہے
درونِ روح نالے کس لیے ہیں؟
لیے پھرتے ہو ذہنوں میں اندھیرے
تو پھر ہم صبح والے کس لیے ہیں؟
اویسی سے نہ پوچھو شعر کیا ہے؟
بصیرت کے حوالے کس لیے ہیں؟

● روم نمبر ۳۰۰، حیدر خاں ہاسٹل اے ایم یو علیگڑھ ۱۔

سلیم محی الدین

اونچی اڑان بھرتا، کیا سوچ کر پرندہ
لاتا کہاں سے منظر، بے بال و پر پرندہ
پھیلا ہوا ہے نقشہ، ماضی کی ہجرتوں کا
سہما ہوا ہے مجھ میں، وہ بے خطر پرندہ
اب تک لہو میں روشن تیری ہی جستجو ہے
ہارا نہیں ہے اب تک، محوِ سفر پرندہ
میرے خدائے برتر، تیری عنایتوں سے
سرسبز و تازہ دم ہیں، شاخ و شجر پرندہ
سونی سبھی منڈیریں، آکاش چھوڑ ہی ہیں
موسم اتار لایا، میرے ہی گھر پرندہ

● گادی پورہ، پربھنی ـــ ۴۳۱۴۰۱

حنا انجم

زباں پہ قفل لگے تھے، صدا بھی کر نہ سکی
دعا کا ذکر ہی کیا، بد دعا بھی کر نہ سکی
رہی ہمیشہ بزرگوں کی میں نگاہوں میں
خطا کہاں کی، خیالِ خطا بھی کر نہ سکی
رہائی مل گئی دورانِ قید ہی مجھکو
تھی عمر بھر کی، میں پوری سزا بھی کر نہ سکی
مجھے سلیقہ ہے حدِ ادب میں رہنے کا
قدم لکیر کے باہر ذرا بھی کر نہ سکی
میرے وجود کی خوشبو رہی گھر آنگن تک
کچھ اس لیے دخل تیرا صبا بھی کر نہ سکی

● ۸۸ [illegible] ـــ ۲۰۱۲۷۱ (یوپی)

مکتوب

فضا ابنِ فیضی ـــــــ مئوناتھ بھنجن۔ (یو پی)

شاعر کے شمارے موصول ہوئے۔ اس لطف کے لیے شکر گزار ہوں۔ ہندوستان کا یہ اردو جریدہ ملک کے شائع ہونے والے دوسرے جرائد کے مقابلے میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ ہم عصر شعری وادبی رجحانات وعوامل کے ساتھ ساتھ ماضی کے علمی وادبی ورثے اور روایت کے صحیح وموثر سرمائے کی دریافت وبازیافت کے ضروری عمل کو آپ نے جس محنت وریاضت کے ساتھ اس رسالہ کی وساطت سے جاری وباقی رکھا ہے۔ وہ قابلِ توصیف بھی ہے اور قابلِ رشک بھی، زیرِ نظر دونوں شمارے باعتبارِ ضخامت مختصر ہیں، مگر مضامین ومقالات اور دوسرے شعری وادبی مشمولات کے دل پذیر تنوع نے اسے بہت بہتر بنادیا ہے۔ جرعات کے صفحات ہوں۔ یا فکرِ امروز کے۔ بازیافت کے کالم ہوں یا آثار لفظ لفظ کے۔ خود نوشت کے اوراق ہوں یا بساطِ سخن کے، ہر گوشہ "دامانِ باغبان وکفِ گل فروش" ہے۔ ان خوبیوں اور خصوصیتوں کے علاوہ اردو زبان کے مسائل ومعاملات پر آپ جس جوش وجذبہ اور خلوص وانہماک سے متواتر لکھتے رہتے ہیں۔ وہ خاصے کی چیز ہے۔ اردو زبان کی ترقی وبقا کے لیے جارحانہ عزم کا ثبوت آپ جس دلسوزی وجاں فشانی سے دے رہے ہیں۔ اس کے لیے آپ کے حق میں دعا نکلتی ہے۔

اخلاق اثر ۔ صادق منزل، چوکی امام باڑہ۔ بھوپال۔ ۴۶۲۰۰۱

شاعر کے دونوں شمارے ساتھ ساتھ موصول ہوئے۔ جلوہ صد رنگ معیار دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔

جوگندر پال کا "خواب رو" بہت خوب ہے۔ دیوانے مولوی اور اسحاق کے کردار گہرائی لیے ہوئے ہیں۔ جوگندر پال نے پہلی قسط میں لکھنو کا نقشہ بڑی نفی چابکدستی سے کھینچا ہے۔ اپنے لکھنو کے بارے میں جب وہ تحریر فرماتے ہیں کہ پھر جب کراچی پہنچ کر ان کی سانس میں سانس آئی تو انھوں نے اپنے دلوں سے اینٹ اینٹ سارا شہر ہی لکھ کر لیا۔ خدا جانے جہاں یہ شہر واقع تھا وہاں اب کیا رہ گیا ہوگا۔ تو آخری جملہ پڑھتے پڑھتے کیٹس کی نظم آن اے گریشین ارن کا ہجلا حصہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے۔ اور دوسری قسط کے آخری حصے تک پہنچایا تو حکیم صاحب اور ظہمین کی گفتگو ایک بار پھر اس نظم کو یاد دلاتی ہے۔ "چل اندر کہو؟" ظہمین اپنے میاں کو پان کا بیڑا پیش کرتے ہوئے جواب دیتی ہے۔

تو دم یہاں آ گئی تو وہاں کیا رہ گیا ہوگا؟

سیاق وسباق مختلف ہے۔ مگر کیٹس کی یاد آگئی ہے جو کوئی بری بات نہیں۔ ادب یا آرٹ میں آجانے کے بعد زندگی اور عکس کا ہر ہیئت کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

دوسری دونوں قسطوں کو پڑھتے پڑھتے محسوس ہوا کہ لکھنو کچھ زیادہ ہو گیا ہے۔

بشیر بدر پر آپ کا نوٹ اس لیے اچھا لگا کہ وہ شاعر نفسِ امام کے ہم عصروں اور عصری ادب میں مزاغ دلی کی شامل کر سکتا ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں میں ایسے اشعارات بلاہوتے ہیں جو زندگی کے ادراک کے اظہار میں بڑے معاون ہوتے ہیں اور نشست کی تو بہت ہیں۔ مگر وہ مجھے کیوں اپنے قاری کے سوچنے کے لیے کچھ چھوڑتا ہے۔

نہیں چاہتے۔ ان کے بیش سال پہلے کے شعر (ص ۱۰ شمارہ ۷) کو بھی مجروح کیا گیا تھا اور درجِ ذیل شعر کو بھی۔

ابھی میں سب سے تھے، مری ماں، بہن بھی، بیوی بھی
سمجھ رہا تھا جسے میں وہ ایسی ویسی تھی

اب پانچ ہزار سالہ تہذیبی قول میں "بیوی کو رات کی سیج پر ویشیا ہو" کی تشریح بھی ان کے لیے لازمی ہو گئی۔ علی گڑھ ادب میں پروفیسر محمد حسن نے شہر یار کی ایک طوائف (امراؤ جان ادا) کے لیے لکھے "بس ایک بار میرا کہا مان جایئے" بڑی خبر لی تھی۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ آئندہ کسی شعر کے مفہوم کے اظہار میں کہیں "ویشیا" کے معاملات جنس نہ بیان کرنے لگیں۔ شعر میں جو خیال آجاتا ہے کبھی کبھی اس کی تشریح ہی اس کے اثر کو کم کر دیتی ہے۔

مختار شمیم ۔ شعبۂ اردو، گورنمنٹ گرلز پی۔ جی۔ کالج، اندور ۴۵۲۰۰۲

شاعر کے شمارہ ۵ اور ۶ موصول ہوئے۔ نور الحسن کی دلچسپ خودنوشت کی وجہ سے شاعر کے اگلے شمارے کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔ شمارہ ۵ میں نارنگ صاحب کا خط بھی "مکتوبات" کے منفرد پیرائے کے مخصوص مزاج کی آئینہ داری کر رہا ہے۔

میرے خیال میں اب ابو محمد سحر صاحب کا مضمون جلد شائع ہونا چاہیے تاکہ نارنگ صاحب کی خوش فہمیاں دور ہو سکیں۔ بشیر بدر پر اقبال مسعود کا مضمون پسند آیا۔

[نارنگ صاحب کے مقالے کے جواب میں ابو محمد سحر صاحب کا مقالہ بہت پہلے موصول ہو گیا تھا جو اپنی طوالت اور شاعر کے محدود صفحات کے سبب ہنوز شائع نہیں ہو سکا ہے۔ جلد ہی شاعر کے صفحات میں اضافہ کیا جائے گا اور سحر صاحب کا مقالہ نیز دیگر اہم ترین مگر طویل مقالے جو اپنی اشاعت کے منتظر ہیں، شائع کیے جائیں گے۔ ادارہ]

مرزا خلیل احمد بیگ ۔ نیشنل ور لاسٹ ہاؤس علی گڑھ

ساہتیہ اکادمی نے میری کتاب "پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی" شائع کی تھی اور جو میں نے آپ کو بھی تبصرہ کے لیے بھجوائی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آپ نے اپنے رسالے شاعر کے تازہ شمارے (نمبر ۵) میں سرورق کے اندرونی صفحے پر پنڈت کیفی کے حالات مع تصویر شائع کیے اور تمام تر معلومات اور مواد حتیٰ کہ کیفی صاحب کی تصویر تک میری مذکورہ کتاب سے لی لیکن کہیں بھی میرا یا میری مذکورہ کتاب کا حوالہ نہیں دیا۔ یہ محض ایک دوستانہ گلہ ہے، احتجاج نہیں۔

[آپ کی کتاب وتاتریہ کیفی مرحوم پر تازہ ترین تھی لہٰذا اس سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن تمام تر مواد اور تصویر وغیرہ کے لیے صرف آپ کی کتاب سے مدد لی گئی ہے یہ غلط ہے۔ شاعر (ادارہ) کی فائلوں کے علاوہ بعض دوسری کتابوں کو بھی سامنے رکھا گیا تھا جو آپ کے اشاریہ کتب میں بھی شامل نہیں۔ "قبا دِ سخن" اور "بساطِ سخن" جیسے عنوانات کے تحت جو مواد دیا جاتا ہے ان کے حوالے اسی ایک صفحے پر نہیں دیے جا سکتے۔ جب یہ گوشے کتابی ترتیب دیے جائیں گے اس وقت تمام حوالوں کی نشاندہی ممکن ہو سکے گی۔ ادارہ]

چندر کانت تیواری ۔ ۱۹۹ سیکٹر ۱۶ ۔ چنڈی گڑھ

شاعر کے شمارہ نمبر ۷ اور ۸ مل گئے ہیں۔ آپ بھی بار بار انھیں لوگوں کا کلام اور نثری تخلیقات شائع کر رہے ہیں جو کبھی کا کچھ نہیں ہے۔ سب لوگ خود پرست اور مطلب پرست ہیں۔ انھوں نے کبھی کسی کا بھلا نہیں کیا۔ انھوں نے صرف اور صرف اپنی ذات ہی کو زندگی بھر موضوع بنایا ہے۔ مجھے شاعر میں ان ناموں کی تکرار سے بہت تکلیف ہوتی ہے۔ دراصل شاعر کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو اپنی تخلیقات کی اشاعت سے زیادہ رسالے کے استحکام اور مالی تعاون میں مدد دیں۔ مگر شاعر میں شامل ہونے والے ان سارے ناموں میں سے کتنے ایسے ہیں جو رسالے کی توسیعِ اشاعت میں تعاون دیتے ہوں، رسالہ خرید کر پڑھتے ہوں۔ رسالے کے لیے اشتہارات فراہم کرتے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایک آدھ نام ہی لیا جا سکتا ہے۔ میں اردو کے ظلیلے والوں سے بھی واقف ہوں اور نام نہاد قلم کاروں سے بھی۔

شاہد جمیل ۔ سب جج سکنڈ اور سیشن جوڈیشیل آفس، شیکاری (بہار)

شاعر کے شمارے ۷ اور ۸ ایک ساتھ موصول ہوئے۔ مختصر ہونے کے باوجود مواد کی کمی نہیں کھٹکی۔ شمارہ ۷ کا ٹائٹل پیج پہلو (سلطان سبحانی) سادہ لیکن انتہا انگیز ہے، پسند آیا۔ اس شمارے کی خاص چیز وہاں میں بشیر بدر کی تحقیق بھری غزلیں، ان پر لکھا گیا اقبال مسعود کا مضمون اور "بساطِ سخن" میں جینت پرمار کا بنایا ہوا عکس سب بہت خوب ہیں۔ جینت کو مطلوبہ خاص مبارکباد!

تعارف آپ نے بہت عمدہ لکھا ہے۔ امید ہے کہ اس سلسلے کے تحت آئندہ مظہر امام، حسن نعیم، کمار پاشی اور سلطان اختر وغیرہ سے بھی ملاقات کرائیں گے۔ کیوں نہ آپ عصری ادب کے مقبول افسانہ نگاروں کو بھی اس طرح کا کالم (مثلاً بساطِ داستاں نو جدید) کے تحت متعارف کرائیں۔ میں کہتا ہوں یہ سلسلہ بھی پسند کیا جائے گا۔ [بساطِ سخن جدید میں آپ کے مذکورہ ناموں کے علاوہ بھی نثر ونظم کے بہت سے نام شامل کیے جا رہے ہیں۔ ادارہ]

ان دنوں اداریوں میں آپ اردو پر بہت زور دے رہے ہیں "اردو مادری زبان اور ہماری خرابیاں" کے تحت ایک نیا سوال اٹھایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جن ریاستوں میں اردو زبان نہیں کے برابر بولی جاتی ہے وہاں کی زبان آئندہ بھی نہیں سکتی۔ یہاں کی اکثریت بھی مقامی زبان بولتی ہے۔ لہٰذا نسل در نسل وہی زبان یا بولی ارتقا پذیر رہتی ہے۔ سارا آندھرا، کیرالا اور گجرات وغیرہ کے مسلم عوام کی اکثریت اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے سے قاصر ہے۔ لیکن یہ سوال کہ ہم بہاری ہو کر اور اپنی مادری زبان انگلش کی جگہ صحیح زبان کو مانتے ہوں (ہمارا کہنا تو یہ ہے) مسلمانوں کی مادری زبان بھی نہیں ہو سکتی۔ آزادی کے بعد انگریزی کو ملک کا نہ تو اور پھر بدلیں کے مسلسل چاہنے اردو کو مقابل ہونے سے الگ تو کر ہی دیا، مغربی تہذیب کی چمک دمک نے ایسا تیر چلایا جس سے اردو والے ٹک کر لے گئے۔ نتیجتاً وہ اپنے اسلاف کی تہذیب سے کٹ کر رہ گئے جس کا بیشتر سرمایہ اسی کی زبان اردو میں تھا۔ اب تو یہ ایک OAP کی جماعت بن گئی ہے۔ کس سے کہیے کہ ہم بیٹیوں کی زبان اور تہذیب کو بچانے کی کوشش میں جب تک اس کے لیے بھرپور حلقہ پیدا ہوتے ہیں ہماری ہی سب سے پہلی ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اس کے تحفظ کے لیے کوشاں رہیں۔

کہ لفظ اس طرح نہیں لکھا ہے۔ اگر دو سے دلچسپی ہنوز چیزے بیکار است۔
اب تو کان بھی پک گئے ہیں اردو اردو سن سن کر۔

شمارہ ۸ میں شامل مظفر حنفی صاحب کی غزل (جو اس نے ہم کو چھیل، ترا دل اور پہاڑ دیے ہیں) اس سے قبل شاعر ہی کے شمارے ستمبر تا دسمبر ۸۸ء میں شائع ہو چکی ہے۔

شاعر میں شامل "فکر امروز" کے تحت علامہ سیماب اکبرآبادی کی تحریر، فقرے بڑی کارآمد اور بصیرت افروز چیزیں ہیں جنھیں میں بڑی دلچسپی اور دل جمعی سے پڑھتا ہوں۔

رفعت سلطان۔ ۴۴۔ مالی پورہ، پیر گیٹ، بھوپال (ایم پی)

تماشائے فن جدید میں بشیر بدر کا اسکیچ اور سوانحی خاکہ دیکھا، آپ نے بشیر بدر کی شخصیت کو جس گہرائی سے دیکھا، مختصر، بامعنی اور خوبصورت جملوں سے جیسی نمائش کی ہے وہ بے مثل اور لاجواب ہے۔

ان فقروں کو جتنی بار پڑھو نئی معنویت کا احساس ہوتا ہے۔ بشیر بدر کی غزل کی طرح آپ کی جدید تذکرہ نگاری جس کی اساس لفظی بت تراشی کو ان شاء اللہ دوام حاصل ہوگا۔

لندن میں منعقد کتابی میلے میں انٹرنیشنل بک ٹرسٹ میں پہلی مرتبہ بشیر بدر فن و شخصیت کی بھی نمائش ہو رہی ہے میں اس لیے لکھ رہی ہوں کہ میرا مطالعہ ہے کہ ان کی غزل میں نشیمن یا اس طرح اور کئی الفاظ جو قدیم غزل کے کلیدی استعارے ہیں ان کے یہاں کبھی نظر نہیں آتے۔ اقبال مسعود نے اپنے مقالے میں ایک شعر بشیر بدر سے منسوب کیا ہے جو ان کا نہیں ہے

چمن پر جب گری بجلی قیامت ہو گئی برپا
نشیمن جل گئے کتنے چمن والوں سے مت پوچھو

(نامعلوم)

بشیر بدر کے سوچنے کا انداز بھی اس سے متضاد ہے وہ کہتے ہیں!

پھول والی کے جلنے کا مجھے افسوس ہو
سیکڑوں بے گھر پرندوں کے ٹھکانے ہو گئے

ادھر چند برسوں میں بشیر بدر پر ۲۵ سے زائد مضامین سپرد قلم کیے گئے ہیں ان میں اقبال مسعود کا مضمون انفرادیت کا حامل ہے۔

ارشد لکھنیاوی۔ ۳۲۲، جلد ہارنس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵-۱۱

شاعر کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے لیے آپ کی جی توڑ کوشش رسالے کے ہر ورق سے ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ شمارہ ۸ میں بشیر بدر پر جناب اقبال مسعود کا مضمون کافی بلند تھا لیکن اس کے بعض جملوں سے مبالغہ کی بو آتی ہے۔ مثلاً بشیر بدر کی شاعری سے متعلق مصنف کا یہ خیال کہ میر نے جس طرح اپنے شعروں میں پوری کائنات کو سمیٹ لیا ہے... جدید اردو غزل میں یہ شرف ڈاکٹر بشیر بدر کو حاصل ہے۔" اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ جس دھڑلے سے بشیر بدر خود کو میر اور غالب کا حریف بتاتے ہیں اس سے اقبال مسعود بھی دھوکے میں آگئے۔

بشیر بدر سے متعلق یہ کہا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا کہ وہ عصر حاضر کا سب سے زیادہ متنازعہ شاعر ہے۔ کوئی اسے میر و غالب کا ہم پلہ تصور کرتا ہے تو کوئی اسے بعض شاعروں کا سارق گردانتا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ بشیر بدر ایک اچھا شاعر ہے اور دس اسے جدید غزل گو شعرا میں سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔ معروف ایک شاعر ہے۔ اچھا شاعر وہ ہوتا ہے جو اور فرد فرد کے مسائل پر عاملانہ سنجیدگی سے غور کرے اور جس کی غزل کا لہجہ اپنے فن کے ساتھ نرم، ملائم اسلوب کا ہے جس کے الفاظ تو تیکھے ہیں...

ایسے خوبصورت جملے ملتے ہیں جن سے تھوڑی دیر کے لیے کانوں میں رس گھلتا محسوس ہوتا ہے اور بس۔

بشیر بدر کی موجودہ شاعری میں اگر اس سے زیادہ کچھ تلاش کرنے کی سعی کی گئی تو گمان اغلب یہی ہے کہ اس کوشش سے اردو ادب میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہو سکے گا۔

آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر۔ ۳۴۱۹، سیکٹر ۲۲۔ ڈی، چنڈی گڑھ

شاعر کا دیرینہ قاری اور مداح ہوں۔ اردو جرائد میں یہ لاثانی ہے۔ اقبال نمبر نے بھی دھوم مچا دی ہے۔ جس انہماک سے آپ معیاری اردو ادب کی تخلیق کے لیے ایک INSPIRATION کا کام کر رہے ہیں اس سے یہ امید بندھتی ہے کہ اردو زبان ہر ناساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔

حبیب الرحمٰن۔ چہار اشرا کالج، نئی کالونی ۷۲، بائسس روڈ، بمبئی ۸

شاعر اور اخبارات میں آپ کا مضمون "اردو میں پتے لکھیے" شائع ہوا تھا، تب سے ہم چند دوستوں نے اس تحریک میں حصہ لینا شروع کر دیا ہے اور روزانہ اس پر عمل کر رہے ہیں ہم نے اسے "اردو پتہ مہم" کا نام دیا ہے۔ ابھی تک تو ہم آپس ہی میں خطوط کا تبادلہ کر رہے ہیں مگر مشکل (یا سازش) یہ ہے کہ ابتدا میں ہمارے خطوط قدرے تاخیر سے پہنچ رہے تھے مگر اب غیر معمولی تاخیر کے ساتھ پہنچ رہے ہیں۔ ۲۵ دن اور اس سے بھی زائد۔

ہمارے ایک دوست جب مقامی پوسٹ آفس میں شکایت لے کر پہنچے تو ہیڈ کلرک نے ان سے صاف طور پر کہہ دیا کہ آپ اپنے پتے انگریزی یا ہندی میں لکھیے، اردو میں نہ لکھیے ورنہ ہم ذمہ دار نہیں۔ اس ضمن میں آپ کی مفید تجاویز کے منتظر ہیں۔

محمد قمر الزماں۔ ڈپٹی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، جگو معرکولیری

پوسٹ سنڈرا ضلع دھنباد (بہار)

باوجود کوشش میں آپ کے حالیہ شماروں میں چھپے کلام تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ شاعر کے ایک شمارے میں "مکتوبات" کے کالم میں املا اور اعراب کے موضوع پر خاصی بحث کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں عرض ہے کہ اردو میں شاید ایسے لغات کی اب بھی کمی ہے جو انگریزی لغات کی طرز پر ہوں۔ انگریزی لغات میں شروع ہی میں اپنے لغت میں تلفظ کے اصول اور سسٹم کا بیان کرتے ہیں۔ اردو لغات میں ایسا نہیں ہے بہت سے الفاظ کو تو شاید اس لیے اعراب سے محروم کر دیتے ہیں کہ وہ بہت عام فہم ہیں اور سبھی لوگ ان الفاظ سے واقف ہیں۔ لیکن اگر کوئی نو سیکھا جس کی مادری زبان اردو نہیں ہے، ایسی لغت سے استفادہ کرنا چاہے تو سوائے ذہنی الجھن کے اس کو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اردو لغت دیکھ کر وہ مطلوبہ لفظ کا تلفظ جاننے سے قاصر رہے گا۔ اگر کچھ بالتلفظ لغات ہیں بھی تو کم دستیاب ہیں۔ اس سلسلے میں ماہرین اردو زبان کوئی مفید قدم اٹھائیں تو مناسب ہوگا۔

پرتپال سنگھ بیتاب۔ ۹۔ سی، گورنمنٹ کوارٹرس گاندھی نگر، جموں

شاعر شمارہ نمبر ۸-۹ میں شامل میری غزل کا مقطع آپ نے بگاڑ دیا۔ دوسرا مصرع بہت بچگانہ ہو گیا ہے۔ اصل شعر یوں ہے:

بیتاب روایات کی وہ مشعل کہاں ہیں!
تاحد نظر رنگ ہے اور بے ثمری ہے

شاعر میں کلام شائع ہونے سے IMPROVE KIMAAN

ہونا مقصود ہوتا ہے۔ اپنے ہی شعر کا ذکر چھپا دیکھ رہے ہیں گے تو یہ مقصود بہت PROMOTE ہو وہ بھی جاتا رہے گا۔ حالانکہ میری شعری شخصیت کی تشکیل میں شاعر کا ایک اہم حصہ ہے۔

[آپ کی غزل کے مقطع کا دوسرا مصرع سہو کتابت کا نتیجہ ہے، کسی اصلاح کا نہیں۔ ادارہ]

سید خوشنود قمر۔ ۸، مدار گیٹ اوجین (ایم۔ پی) ۴۵۶۰۰۱

شاعر کے تازہ شمارے ۷ و ۸ موصول ہوئے، ان دونوں شماروں کو بھی شاعر کی اپنی روایت کے مطابق ہی پایا، شمارہ ۸ میں پرتپال سنگھ بیتاب کی غزل کے تیسرے شعر میں ایک رکن بڑھ گیا ہے، ان کا شعر:

چل پاؤں کی زنجیر مرے ساتھ ابھی کچھ اور
شاید ابھی باقی مری کچھ دربدری ہے

میرے خیال سے شعر اس طرح ہونا چاہیے:

چل پاؤں کی زنجیر مرے ساتھ ابھی اور
شاید ابھی باقی مری کچھ دربدری ہے

اس غزل کے آخری شعر کے ثانی مصرع میں ایک رکن کم ہے۔ ع
"تاحد نظر ریگ ہے بے ثمری ہے"

میرے خیال سے مصرع ثانی اس طرح ہونا چاہیے۔ ع
"تاحد نظر ریگ ہے اور بے ثمری ہے"

"دیواروں کے بیچ" کمار پاشی کے مخصوص طرز تحریر نے دلچسپ بنا دیا ہے، حمید سہروردی کا "خواب در خواب" بھی پسند آیا!

شمارہ نمبر ۸ میں جاوید اکرم کی غزل کے آخری شعر کے ثانی مصرع کی ترتیب غلط ہے جس سے شعر بے وزن ہو گیا ہے۔ ع
"وطن سے بھی گئے، اہل وعیال سے بھی گئے"

مصرع کی ترتیب اس طرح ہونا تھی۔ ع
"گئے وطن سے بھی، اہل وعیال سے بھی گئے"

اسی طرح راجد سحری کی غزل کے تیسرے شعر کا مصرع ثانی، ع
"اسی سے اسے مانگا تھا، اسی سے چھینا ہے"

اس مصرع میں "اسی" کے بجائے "اس" ہونا چاہیے ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو، پھر بھی میرے نزدیک اس شعر میں فن شاعری کے مطابق عیب تنافر حرفی ہے، جس سے شعر کا حسن ختم ہو گیا ہے۔ آپ جیسے صاحب نظر کی ادارت میں نکلنے والے رسالے میں ایسی فاش غلطیاں بھلی نہیں لگتیں۔ احمد کمال پروازی کی غزل، سرشار بلند شہری کے "دوہے" اور تیرتھ راہی کا "منظر پس منظر" بہت پسند آئے۔

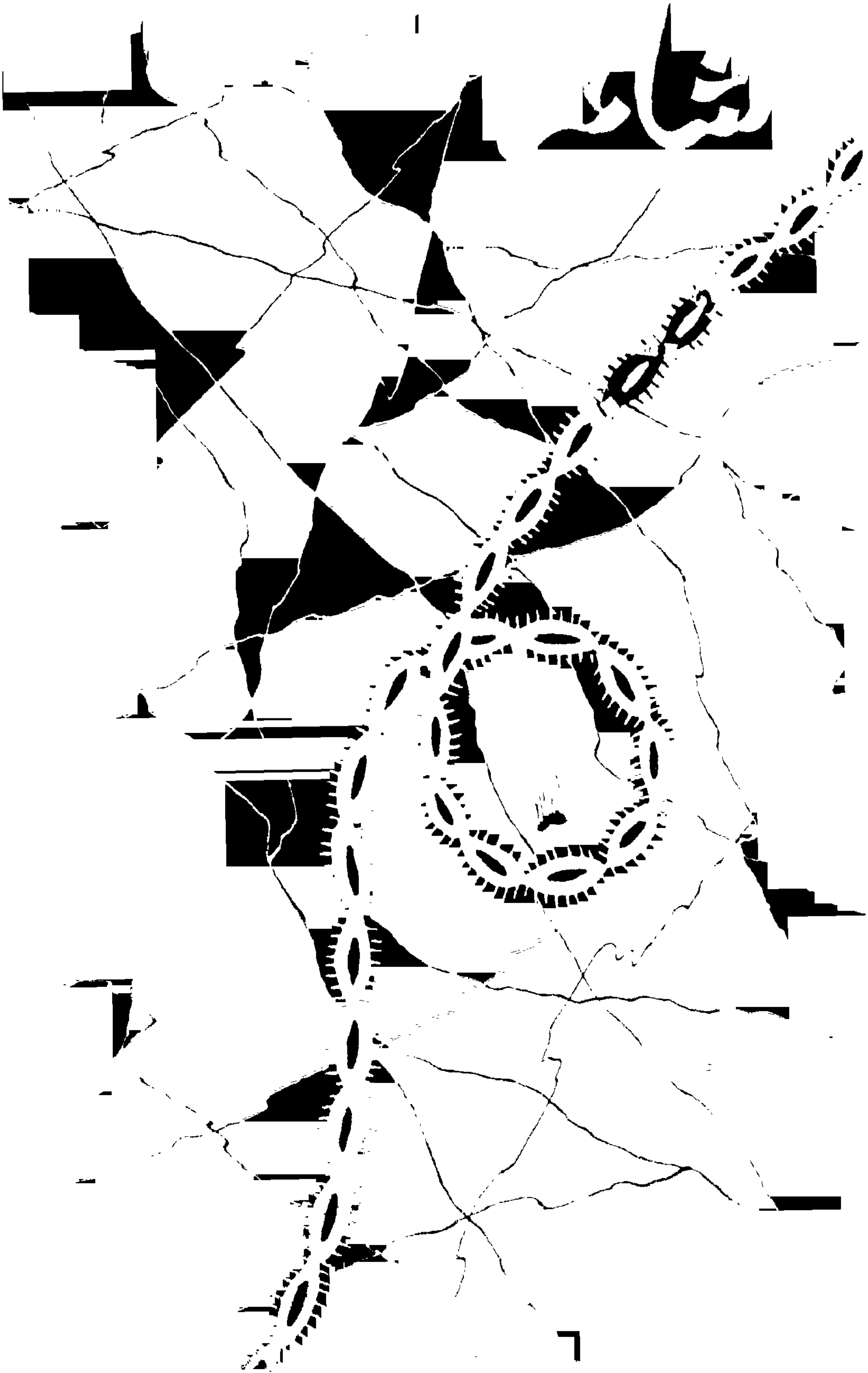
شمارہ نمبر ۱۰-۹ جلد ۶۰ کے سرورق کا عنوان "تمنا" اور علی سلطان، سبحانی کا تھا۔ عنوان اور نام شائع نہ ہو سکا ادارہ اس کے لیے معذرت خواہ ہے۔

Regd. No. MH-B.Y.W. 311 Price Rs 5

THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

61 Years of Publication * (Publishing Date: 27-28) * Issue No1 1990 * Telephone No 359904

Registered with the Registrar of Newspapers at R N No 14482/57


شاعر



ماہر القادری

پ: ۱۹۰۶ء ــــــ م: ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء

تحقیق و تدوین: افتخار امام صدیقی

غزل میں تیری حلاوت ہے، نظم میں جذبات
ہے ان صفات کا مجموعہ ایک تیری ذات
جو صرف شاعرِ جاوید ہی میں پائی جائیں
سخنوروں کو نہ کڑوی لگے یہ میری بات

تعلیق: اعجاز صدیقی مرحوم

منظور حسین [تاریخی نام: ۱۳۲۳ھ] تخلص: ماہر ... مشہور نام: ماہر القادری ... ضلع بلند شہر [یوپی] کے ایک مشہور زمیندار گھرانے ... والد کا نام: شیخ محمد مشتاق علی [قصبہ کے پہلے ...] ... ۳۰ ستمبر ۱۹۰۶ء] ابتدائی تعلیم اپنے والد سے ... پرائمری اسکول میں دوسری جماعت تک تعلیم حاصل کی، ... اسکول ... میں داخلہ لیا، ترقی کر کے بعد میں یہ ... میٹرک کا امتحان دیا، ریاضی میں ... ۱۹۲۹ء میں دسویں کا امتحان پاس کیا۔ عربی ... حاصل کی۔

... [م: ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء] ...

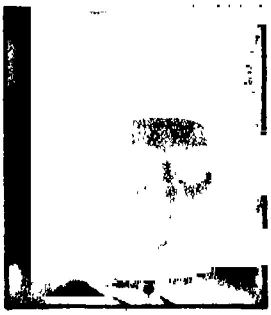
بچوں کا رسالہ "غنچہ" شائع ہوتا تھا، اس کے مدیر بھی ہوئے۔ ... ماہ بعد ماہنامہ "مدینہ" بند ہو گیا اور وہ واپس حیدرآباد چلے گئے۔ ۱۹۴۱ء تک حیدرآباد ہی میں حکومت کے مختلف شعبوں میں کام کرتے رہے۔ بحیثیت شاعر ملک کے مختلف حصوں میں معروف ہو گئے۔ ۱۹۴۱ء میں وہ ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے بمبئی گئے۔ بعض دوستوں کے اصرار پر فلموں میں گانے لکھے۔ مشہور فلموں میں "قسمت" کی تقدیر، "جیون"، "زبان"، "زینت" وغیرہ میں گیت لکھے جو مقبول ہوئے۔ فلمی دنیا ان کے مزاج کے منافی تھی چنانچہ ۱۹۴۳ء میں دہلی چلے گئے۔ ۱۰ نومبر ۱۹۴۷ء کو پاکستان ہجرت کی اور کراچی میں مستقل قیام کیا۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں کراچی سے ماہنامہ "فاران" جاری کیا جس کا شمار ہند و پاک کے معیاری رسائل میں ہونے لگا ... نظر میں [تبصرہ] ... پاکستان کے ... حلقوں میں انہیں شہرت حاصل ...

ماہر القادری کو نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ ...

تصانیف ماہر القادری

[illegible]

فکرِ امروز



① عہدِ جدید کا شاعر مفکر بھی ہے اور مبلغ بھی۔ ② وہ انسان کو من حیث الانسان دیکھتا ہے اور انسانی ضروریات کو ملحوظِ نگاہ رکھتے ہوئے ان کے انصرام کی تدبیر بتاتا ہے ③ وہ انسان کو تدبیرِ منزل سے آشنا کرتا ہے ④ وہ انسان میں تمام صفاتِ الٰہیہ کو مجتمع دیکھنا چاہتا ہے مثلاً رحم، عدل، مساوات وغیرہ ⑤ وہ جنگ و پیکار، خود غرضی، تن آسانی اور شخصی تفوق کو لعنت سمجھتا ہے ⑥ وہ سرمایہ دار کے مقابلے میں مزدور کی حمایت کرتا ہے ⑦ وہ مذہب کو عبد و معبود کے درمیان ایک لاشریک واسطہ سمجھتا ہے ⑧ وہ تمام دنیا کے انسانوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے ⑨ اس کا ہر پیام عالمگیر اور ہر خیال ہمہ گیر ہوتا ہے ⑩ وہ اخلاق و تمدن اور تہذیب و سیاست کا تجزیہ کر کے ان کا ایک بلند معیار قائم کرتا ہے ⑪ وہ فطرت اور انسانیت کو مربوط و ہم رنگ دیکھنا چاہتا ہے ⑫ وہ انسانی زندگی میں احساسات و جذبات کی کارفرمائی چاہتا ہے اور ذہن و خیال کو عملی زندگی سے منطبق دیکھنے کا آرزومند ہے۔

[انسانِ کامل مطبوعہ ماہنامہ "کنول" آگرہ مارچ ۱۹۲۶]

سیماب اکبرآبادی

بانی علامہ سیماب اکبرآبادی

بہ یادگار اعجاز صدیقی مرحوم

شاعر

شاعر کا ۶۱ واں سال

علمی ادبی تہذیبی ماہنامہ

جلد ــــ ۶۱
شمارہ ــــ ۲

فون: ۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت: ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاحیات خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۳۵۰ روپے

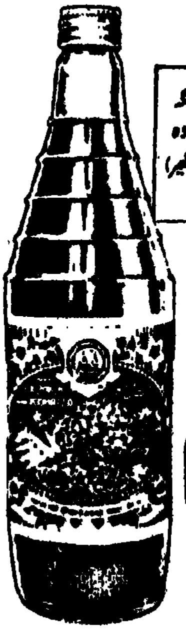
رمضان المبارک

رُوح کی پاکیزگی کا مہینہ

شربت رُوح افزا

روزہ کی حالت میں تمام دن کچھ نہیں کھایا پیا جاتا، اس لیے بدن میں پانی، شکر اور نمکیات کی کمی ہو جاتی ہے اور کئی شکایتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ افطار کے وقت ایک دم پانی پینے یا بے سوچے سمجھے کوئی بازاری شربت پینے سے قے، دست جیسی تکلیفیں بھی آگھیرتی ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے افطار کے وقت یا رات کو کسی بھی وقت پیاس میں

صرف شربت رُوح افزا لیجیے



اگر آپ کو دودھ یا دہی کی لسی پینی ہو تو اس میں چینی کی جگہ صرف روح افزا ڈالیے۔ روح افزا ملک شیک کے علاوہ روح افزا سے آپ آئس کریم، فالودہ، کسٹرڈ، فیرنی (کھیر) اور فروٹ سلاد بھی بنایئے!

افطار کے وقت رُوح افزا کو نہ بھولیے

۸۰ سال سے بھی زیادہ مدت سے سب کا من پسند

شربت رُوح افزا

جڑی بوٹیوں، حیات بخش عناصر اور قدرتی وٹامنز کا نادر مرکب۔

رُوح افزا کب استعمال کریں؟

رمضان المبارک میں افطار کے وقت یا رات کو کسی بھی وقت پیاس میں۔ اس کے علاوہ گرمی کے عام دنوں میں پیاس، تھکن، لو لگنا، درد سر، چکر آنا، سستی، کمزوری وغیرہ میں۔

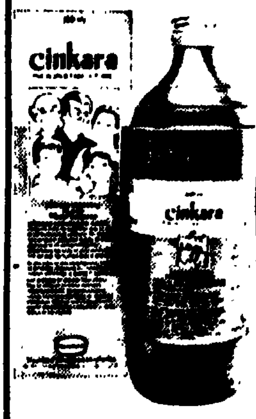
سنکارا

روزہ داروں کے لیے الکحل سے پاک،
لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

عبادت و ریاضت کے اس خاص مقدس مہینے میں صحت و قوت کی بحالی کے لیے سنکارا لیجیے اور معدہ کو طاقت حاصل کرنے کی نیت سے غیر ضروری چیزوں سے نہ بھریے۔ سنکارا اس کے لیے بہت ہے۔ جدید سائنٹفک تحقیقات نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ سنکارا طالب علموں، جوانوں، بوڑھوں، دفتر میں کام کرنے والوں، سخت قسم کی جسمانی محنت کرنے والوں، عورتوں اور مردوں سب کے لیے ہر موسم میں یکساں مفید ہے۔

سنکارا پابندی سے پیجیے اور اطمینان سے روزے رکھیے!

رمضان المبارک میں سنکارا کے اوقاتِ استعمال: افطار، سحر اور تراویح کے بعد تنہا یا پانی یا دودھ میں ملا کر بڑوں کے لیے دو بڑے چمچے، کم عمر والوں کو ایک بڑا چمچہ۔



سنکارا

مشہور عالمی ٹانک
ہر موسم میں سب کے لیے

گھر بھر کی صحت کے لیے ہر موسم میں گھر کے ہر فرد کے لیے

[illegible]

ہمدرد

سرورق
فکروخیال

عملی
سلطان سبحانی

شمارہ نمبر ۲ ۔ جلد ۶۱

مسعود حسین خاں ۔ حامدی کاشمیری ۔ اعلیٰ حماد عباس
اندر پرتاپ بیتر ۔ خمار قریشی ۔ بلقیس ظفر الحسن
وامق جونپوری ۔ بشیر نواز ۔ محمود ایاز
مظہر الزماں خاں ۔ فاروق شفق ۔ محمد پالنی
ملک نسیم ۔ ممتاز منیر ۔ سید معز التہب رضوی
مظفر حسن ۔ نفیس نقی ۔ پریم چند کوشک
مصطفیٰ پرویز ۔ سلیم انصاری ۔ عالم خورشید
خورشید سمیع ۔ احسن شمسی ۔ رام لعل
نشاد احمد فاروقی

ہمیں آزادی چاہیے

آج جتنے سوال ہمارے درمیان ہیں انھیں دہرائے جانے کے بجائے اب ازسرِ نو ان کے بارے میں غور کرنا ہے کہ یہ سوال کیا ہیں اور کیوں ہیں؟ میرے خیال میں یہ سارے سوال وہ چاہے زبان و ادب کے بارے میں ہوں یا ملکی و غیر ملکی سیاست کے بارے میں ہوں، زندگی کے آج کے سارے سوال اپنے آپ میں اتنے گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ کرنا محال نظر آرہا ہے، مگر ایسا کیے بغیر یہ سوال اپنی نئی معنویت نہیں دیں گے اور فرسودہ ترین یہ سوال زندگی کو پیچیدہ تر کرتے جائیں گے۔ زندگی کی نئی تعبیرات کے لیے ضروری ہے کہ سارے سوالوں کو ازسرِ نو دیکھا جائے۔ ہمیں اپنے سارے سوالوں کو پہلے رد کرنا ہے۔

سوال رد کرنے سے پہلے جی چاہتا ہے کہ تمام سرحدوں ہی کو رد کر دیا جائے۔ غالباً سوال در سوال زندگی پیچیدہ تر بھی اسی لیے ہو گئی ہے کہ سرحدوں نے ہمیں محدود کر رکھا ہے۔ ہر ایک سرحد کے پیچھے بے چین انسانوں کا ایک سمندر ہے جسے کسی نہ کسی نظریے، ازم یا مذہب کے ذریعے قابو میں کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ازم، نظریے اور مذہبی تصورات، اقدار اور روایات کی شکست و ریخت بھی مسلسل ہے، ایک انتشار ہے جو بڑی طاقتوں نے اس زمین پر بپا کیا ہوا ہے۔ یہ زمین آزاد ہے، سارے انسان آزاد ہیں، جغرافیائی تبدیلیوں کا مطلب سرحدیں نہیں ہے۔ سوالوں کو ازسرِ نو دیکھنے کے لیے سرحدوں کا رد ضروری ہے۔ صدیوں پرانا گروہی تصور جس نے رفتہ رفتہ سرحدوں کو جنم دیا اب اتنا فرسودہ اور ناقابلِ اعتبار ہو گیا ہے کہ تغیر و تبدل کا فطری عمل اپنے آپ میں سکڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

بڑی طاقتوں کی اجارہ داری انھیں سرحدوں سے بنی ہوئی ہے۔ انسان ہی انسان پر حکومت کرے، ظلم ڈھائے، اپنی ہی جانوں کو ہلاکت میں ڈالے، یہ سب کچھ کس لیے اور کس کے لیے؟ آج کوئی نظریہ اپنی سابقہ اثر پذیری کے ساتھ باقی نہیں —— اپنے اپنے نظریوں کو باقی رکھنے اور انھیں تھوپنے کا عمل انسانی تہذیب میں اور بے چارگی کا مظہر ہے۔ سرحدوں سے سرحدوں کی حفاظت ہی جنگوں کو جنم دیتی ہے۔ کیا یہ زمین صرف جنگوں کی آماجگاہ بن کر رہ جائے گی؟ بڑی طاقتوں نے اپنے آپ کو اور اس دنیا کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ کیا انسانوں کا یہ سمندر سرحدوں کو توڑنے کے لیے بے چین نہیں ہے؟! کیا ۲۱ویں صدی کی تمام تر جولانیوں کا سامنا یہ سرحدیں کر سکیں گی؟! زندگی کی نئی تعمیر و تشکیل کے لیے سوالوں کا رد کرنا اب ناگزیر ہے —— ان سوالوں کو ازسرِ نو ترتیب دینا اور ان پر غور و فکر کرنا آج کی نئی دانشوری کا تقاضہ ہے۔ مسائل اور سوال اب مفروضوں کے سہارے حل نہیں ہو سکتے۔ یہ کہہ دینے سے کام نہیں چلے گا کہ ایسا تو ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ یہ دراصل شکست خوردہ اور اپنے خول میں سمٹے ہوئے لوگوں کا محض ایک خیال ہے جو اب قطعی بے جان معلوم ہونے لگا ہے۔

کائنات میں مسلسل تغیر و تبدل کا عمل جاری ہے، نامعلوم ستارے معلوم کی سمت آرہے ہیں، سیارے اپنے مزاج اور اپنے رنگوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ پُراسرار کائنات مزید پُراسرار ہوتی جا رہی ہے یا پھر اپنے آپ میں پھیلی ہوئی پُراسراریت کو ختم کرتی جا رہی ہے اور زمین اپنے دیگر سیاروں کے ساتھ خلا میں تحلیل ہوتی جا رہی ہے۔

کیا تمام عصری سوالوں کا رد تخلیق کاروں سے ممکن ہے؟ فنونِ لطیفہ میں نئے جہانوں کا اظہار زیادہ شدید، پُراثر اور تیز تر، حرف و لفظ ہی سے ممکن ہو رہا ہے۔ مگر اب تو حرف و لفظ کی صرف شکلیں رہ گئی ہیں، ان کے پیچھے جو کچھ ہے، وہی ہے جو حرف و لفظ کے باہر یا اوپری سطح پر ہے۔ زندگی کی تمام معلوم و نامعلوم تہیں ابھرے پن میں گم ہو گئی ہیں۔ حرف و لفظ، ہیئتیں اور موضوعات اور موضوعات و مواد کی ایک ہیئت سے تو توقعات وابستہ نہیں کی جا سکتیں۔ مگر تمام سوالوں کا رد تخلیق کاروں ہی سے ممکن ہے کہ کائنات اور زمین کے درمیان انسانی ذہن اپنی ابتدا سے آج تک اور شاید اس دنیا کے اختتام تک، ایک مکمل جہان پہلے انسان سے آخری انسانی ذہن تک پھیلا ہوا ہے، اس مکمل جہان کی نشاندہی، اس کی تعبیرات، روپ سروپ، ایک نئی دنیا، ایک نئی کائنات، تخلیق کاروں ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ مگر یہ تخلیق کار کہاں ہیں؟ تمام انسان آزاد ہیں مگر آزاد ہو کر بھی غلام ہیں۔ ہمیں ایک نئی آزادی چاہیے۔۔

HAMID HASAN QADIRI.
HEAD OF THE DEPARTMENT OF
PERSIAN & URDU.
St. John's College.

آگرہ [illegible]

AGRA

DATED [illegible]

سید حامد حسن قادری بنام اعجاز صدیقی

۵۵۲
۶۲

مکرمی اعجاز صاحب — السلام علیکم

کل منظر صاحب کو پرچم کوثر کا بھیج دیا۔ آج آپ کو یہ عجیب نظم بھیجتا ہوں۔ یہ ترکیب ذہن میں آ گئی۔ آپ نے اردو سبھا کا تذکرہ کیا تھا۔ [illegible] وقت کی چیز ہو جائے گی۔ [illegible] آپ [illegible] کو پسند آ [illegible]۔ البتہ [illegible] کو اور ان کی نظموں کو [illegible] محفوظ ہو گئی۔ [illegible] ہے۔ بہرحال اگر آپ کو پسند نہ ہو تو مجھے واپس بھیج دیجئے [illegible] ہو گا۔

[illegible]

مشکلات [illegible]

[illegible]

[illegible]

حال معلوم ہے [illegible] میں اگلوں سے [illegible] ہو | وہ غفلت ہے [illegible] شرکا [illegible]

[illegible] کچھ معلوم دنیا [illegible] | [illegible] ہے اپنے [illegible]

[illegible] چند [illegible] | [illegible] حیرانی

[illegible] وغیرہ [illegible] | [illegible] خواہش شیطانی

[illegible] مطلب کیا | [illegible] نصرانی

[illegible] عالمگیر [illegible] | [illegible] کی دیوانی

[illegible] فارغ | [illegible] ارزانی

اس کے بعد [illegible] سال پہلے دسمبر ۱۹۸۹ء میں [illegible] کا [illegible] چھپا [illegible] تھا۔ اس کا آغاز میں بھی چند شعر تھے۔ کہتے ہیں:

[illegible] منہ پر لگی | [illegible] کیسی [illegible] لگی

سید احمد خان کی [illegible] | [illegible] پر لگی

آگے چل کر فرماتے ہیں:

علم ہے [illegible] | [illegible] لگی

کچھ نہ [illegible] قیمت چاہئے | اس سے [illegible] لگی

[illegible] | قل ھو اللہ پڑھنے [illegible] کی [illegible]

علم سے [illegible] فضل | [illegible] لگی

غرض [illegible] آدمی تھے اللہ ان کی مغفرت کرے! [illegible] آیا [illegible] وقت [illegible]۔ [illegible]

[illegible] آپ [illegible]

[illegible]

والسلام

احقر حامد حسن قادری

٭ پروفیسر سید حامد حسن قادری [پ: مارچ ۱۸۸۷ء قصبہ بچھراؤں ضلع مراد آباد (یو پی) - م: ۵ جون ۱۹۶۴ء، کراچی] اردو کے مشہور ادیب، محقق اور شاعر۔ "داستانِ تاریخ اردو" [طبع اوّل: ۱۹۴۱ء، طبع دوم: ۱۹۵۱ء، آگرہ۔ طبع سوم: ۱۹۶۵ء، کراچی] کے مصنف۔ تاریخی قطعات تخلیق کرنے میں ماہر۔ بقول ڈاکٹر محمد ایوب قادری مرحوم انھوں نے تقریباً پونے تین ہزار تاریخیں لکھی ہیں جو چار جلدیات میں قلمی صورت میں موجود ہیں۔ [ماخذ: "کاروانِ رفتہ" صفحہ نمبر ۱۰۹، مطبوعہ ۱۹۸۳ء، کراچی] دو سو سے زائد تاریخیں قرآنی آیات سے نکالی تھیں۔ [ادارہ]



تضمینی رباعیاں

شمس الرحمٰن فاروقی

لا اعلم

ہے حال میں ماضی ماضی حال میں سب
لکھا ہے خطِ شکست میں سب بود و ہست
ہم روے زمیں پر است و ہم زیر زمیں
ایں صفحۂ خاک ہر دو رو لغو پر است

شیخ ابو سعید ابی الخیر

اب میں ہوں اور آفاق کی پہنائی دشت
سر پر ہمارے آب تمنا کا طشت
تشنہ بکنار جوئے حیواں خفتم
گر جوئے من آب زندگانی بگذشت

شیخ ابو سعید ابی الخیر

ملتی نہیں خبر یہ کس سے ہرگز
اور دل کو گلہ نہیں یہ کس سے ہرگز
صحرائے دلم عشق تو شورستاں کرد
تا مہر کسے دگر نروید ہرگز

استاد ابوالفرج رونی

دل ہو دل میں کچھ سے یہ باتیں ہرگز
مٹ جائے کسی طرح یہ قسمت کا لکھا
تا کام گرفتن اختیار کردم اے بود
باقی ہمہ کار اتفاقی ہست مرا

شیخ فریدالدین عطار

سالسیہ نشاط کی کشش ہی یا جنت
ب ایک ہی دلق پا رسا سی زلفت
دست و حکایت چند پرسی آخر
شبہ بروز خند افتاد و برخفت

مولانا عرفی مازندرانی

ہے فرق بہت از مردی تا مردی
کس شیر نہ بجز عشق میں کاہ پامردی
امروز جہان قحط بلا است گرنی
نہ مرد زمانہ ام بہ بے نامردی

میرزا عبدالقادر بیدل

اوروں کے معنی پہ ہزار تمہید
پھیلی ہے حضور کی زنجیر زدہ
گفتم سخنے کنید لبش آب کمال
خوابے جنبید چوں نہ خوابے جنبید

ڈی۔ڈی۔جی (پی) روم نمبر ۲۲۶، ڈاک بھون نئی دہلی ۱



حامدی کاشمیری
مسعود منزل، شالیمار، سری نگر (کشمیر)

اکتشافی تنقید — چند پہلو

معاصر تنقیدات میں اکتشافی طرز ہی ایک ایسا نظریہ تنقید ہے، جو اپنے وجود اور ضرورت کا جواز رکھتا ہے، یہ تنقید کے ایک الگ اور قائم بالذات شعبے پر دلالت کرنے کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب سے اپنے باطنی رشتے کی توثیق کرتا ہے، واضح رہے کہ یہ نظریہ ہیئتی نظریہ نقد سے قطعی مختلف نہیں ہے، لیکن یہ نہ ورہے کہ ہیئتی تنقید سے بعض مماثلتوں کے باوجود اس سے عدم مماثلت کے بعض پہلو بھی رکھتا ہے۔

—— جہاں تک مماثلتوں کا تعلق ہے، ان میں ایک اہم مماثلت یہ ہے کہ دونوں نظریات شاعر کی ذات اور اس کے عہد کے مقابلے میں پیش نظر تخلیق ہی کو مرکز توجہ بناتے ہیں اور تخلیق کے خود مختار اور آزاد وجود کو تسلیم کرتے ہیں، دونوں اس کی تجسیمیت بقول این سم جسامت BODINESS کی شناخت پر زور دیتے ہیں۔ یہ امر بھی مشترک ہے کہ لسانی تجزیہ سے ہی تخلیق کی باطنی اور نادیدہ کائنات کی سیاحت کی جاتی ہے، —— اور تقابل اور تشریح سے تخلیق کے حیات افروز عناصر اور معنویت کا پتہ لگاتے ہیں، لیکن اس کے بعد دونوں کے طریق کار کے اختلافات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ سب سے بڑا اختلافی پہلو یہ ہے کہ ہیئتی تنقید پورے لسانی ڈھانچے میں انفرادی پیکر کے کلی تاثر سے واسطہ رکھنے کے باوجود ان کے انفرادی تفاعل کو خاص اہمیت دیتی ہے، اور ہر لفظ کے اندر پنہاں معنی کی تلاش پر دھیان دیتی ہے۔

شاعری کی پیکریت یا تجسیمیت کا تجزیہ یا اس کے اندر معانی کے نظام کی تفہیم و توضیح کی مناسبت سے انکار نہیں، لیکن جب تک تخلیق کے بطن میں تشکیل پذیر نامیاتی تخلیقی تجربے کی وحدت و کلیت کو دریافت نہ کیا جائے جو اس کی کلی ساخت اور مربوط لسانی نظام پر منحصر ہے تا جو تنقید کا اصلی مقصد ہے، اس وقت تک پیکروں کی شناخت یا ان میں مضمر معانی کی نشاندہی کا عمل محض جزوی، غیر تسلی بخش اور عجلت آمیز ہو جاتا ہے۔ تخلیق شعر کی طرح تنقید بھی ایک کلی اور مربوط عمل ہے، یہ بات بھی خاطر نشان رہے کہ تنقید اگر تخلیق کے لسانی یا ساختیاتی نظام کا تجزیہ اس فوری مقصد کے تحت کرنا چاہتی ہے کہ معانی کو سمجھایا جائے تو یہ تنقیدی نہیں بلکہ محض درسی عمل ہے، تنقید نگار تخلیق کے اندر تشکیل پذیر تخیلی صورت حال میں کردار و واقعہ کے ڈرامائی عمل کی شناخت کرتا ہے، اور ایسا کرنے کے لیے اسے لفظ و پیکر کے معانی کو کریدنے کے بجائے ان متنوع تلازمات کو جو معانی نہیں ہیں سا کر حیاتی گرفت میں لاتا ہے۔ میکبتھ کی مثال لیجئے، اس کے کرداروں، پیکروں یا علامتوں کے الگ الگ تجزیہ کو اپنا مطمح نظر بنانے کو جیسا کہ ہیئتی تنقید کے پرستار کرتے ہیں ان کے بجائے اس کے کلی ربوط تخیلی وجود کو، جو اس کے لسانی وسائل سے قابل شناخت بن جاتا ہے، مرکز توجہ بنانا اکتشافی تنقید کا کام ہے، جہاں تک اس کے کردار، واقعات، لیڈی میکبتھ کا عالم خواب میں ہاتھوں پر خون کے دھبوں کا دھونا، جادوگرنیاں، چلتا جنگل وغیرہ خون، خوف، غیر یقینیت، روشنی، سایہ اور تاریکی جو لفظ و پیکر کے کلی نظام سے نمو کرتے ہیں، انفرادی حیثیت سے زیادہ ایک مجموعی تخیلی صورت سے منسلک ہو جاتے ہیں، ولیری اسی بنا پر شعری کائنات کو DREAM WORLD قرار دیتا ہے، اور فرائیڈ نے بھی اسے حقیقت کے مقابلے میں التباس سے موسوم کیا ہے، جو خواب سے مماثل ہے، ولسن نائٹ نے میکبتھ کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے کردار و واقعہ یا پلاٹ کی الگ الگ وضاحت نہیں کی ہے بلکہ ڈرامے کی کلی تخیلی فضا کو نشان زد کی ہے، جو ہر تجسیمی عنصر اور اس کی فنی ہاٹ کی پہچان ہے، یہ میر اور غالب کے ہاں ملتی ہے، اقبال کی نظم لالۂ صحرا اور فیض کی تنہائی اسی قسم کی کلی اور

بانی کی غزلیات میں ملتی ہے، یہ تخیلی فضا شعری تجربے کی پرداخت کرتی ہے جو فن پارے کا منتہائے مقصد ہے، اور اسے حقیقی دنیا سے الگ کر کے اس کی بقا و انفرادیت کی ضامن بن جاتی ہے۔

اختلاف کا دوسرا پہلو یہیں سے نمودار ہوتا ہے، ہیئتی تنقید کے علم بردار تخلیق کے تجریدی مفاہیم کے پیچھے دوڑتے ہیں، جب کہ اکتشافی تنقید کی رو سے یہ تخیلی صورتِ حال ہی ہے نہ کہ معانی، جو تخلیق کی تشکیل کرتی ہے، اور اس کے وجود کو استحکام عطا کرتی ہے، فن کی یہی تخیلی صورتِ حال نقاد کی توجہ کی متقاضی ہے، اور اسی کی پیچیدگی، وسعت اور تہہ داری کے مطابق فن کی تخلیقی درجہ بندی ممکن ہو سکتی ہے، شاعری اجتماعِ معانی کا نام نہیں، بلکہ تجربے کی وحدت پذیری ہے، شاعر کے باطن میں جو تجربے پلتے ہیں، اور اظہار کے لیے مضطرب ہوتے ہیں، وہ اصلی شکل میں منتشر، وحشی، بے نام اور متضاد ہوتے ہیں، شاعر ہیئت کے شعور سے ان پر مکمل گرفت حاصل کرتا ہے اور ان کے منتشر اور متناقض عناصر کو ایک وحدت پذیر اور انضمامی شکل و صورت عطا کرتا ہے، اور یہی تکمیل یافتہ لسانی ہیئت تجربے کو ایک جادوئی صورتِ حال میں منتقل کرتی ہے، یہ صورتِ حال کردار و واقعہ کے عمل اور ردِ عمل سے تشکیل پاتی ہے اور اپنے اندر خواہ وہ غزل ہو یا نظم، رزمیہ ہو یا المیہ ایک ڈرامائی عنصر کو جنم دیتی ہے جو قاری کی دل چسپی، حیرت اور تجسس خیزی کا باعث بنتا ہے اور جمالیاتی مسرت کو راہ دیتا ہے۔

بلاشبہ تخلیقی عمل کی غایت اور انتہائے کمال اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایک مربوط تخیلی صورتِ حال کی تشکیل ہو سکے، شاعر اپنے تجربات اور احساسات کی نوعیت کے مطابق اپنے لسانی نظام کو وضع کرتا ہے، اور لہجے، لفظیات اور آہنگ کے اختلافات کو روا رکھتا ہے۔ اردو میں میرؔ کی سرگوشیانہ شاعری اقبالؔ کی بلند آہنگ شاعری سے آسانی سے تمیز کی جا سکتی ہے، حالاں کہ دونوں کی غیر معمولی تخلیقی اہمیت مسلّم ہے، دونوں کی تخلیقی قوتوں کی پہچان کا واحد معیار یہ ہے کہ آیا ان کی شاعری کی لسانی دروبست، خواہ اس کے عملی برتاؤ میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، ایک تخیلی صورتِ حال کو جنم دیتی ہے یا نہیں؟ اقبالؔ کے متعدد اشعار میں لفظ و پیکر کے خلّاقانہ برتاؤ سے ایک تخیلی صورتِ حال خلق ہوتی ہے، اگرچہ ان کا لہجہ خطیبانہ اور بلند آہنگ ہوتا ہے، حیرت کی بات یہ ہے کہ اکثر مقامات پر ان کا لہجہ ہی دیگر شعری وسائل کے مقابلے میں ایک تخیلی فضا کی تخلیق میں اہم رول ادا کرتا ہے، اور اسی وصف کی عدم موجودگی جوشؔ کی شاعری کو نثری سطح پر لے آتی ہے۔

شعر کو علم، معنی یا موضوع کے مماثل گرداننے سے اس کے فنی یا تکنیکی پہلو سے دانستہ یا نادانستہ چشم پوشی واقع ہو جاتی ہے، اس طرح سے شعر فہمی یا شعر سنجی کے یک طرفہ معیار قائم ہو جاتے ہیں، شعر اگر محض موضوع ہے تو اس کی لفظیاتی ترتیب، بحر و وزن، ردیف و قافیہ، ہیئتی التزام، آہنگ اور لہجہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر کا تجسیمی پہلو ہے اور اسے اس کے معنوی ابعاد سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

لہٰذا یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ تخلیق کے اندر بننے والی یہی تخیلی صورتِ حال اس کا تجربہ ہے، جو بقول کولرج "انسان کی کلّی روح کو متحرک کرتی ہے" اور اس کی تلاش و تعین کا کام اکتشافی تنقید کے دائرے میں آتا ہے، یہ بات واضح رہے کہ شاعری زندگی کی ترجمانی کا کام نہیں کرتی، نہ ہی تنقیدِ حیات کا کام کرتی ہے اور نہ ہی زندگی اور فطرت کی عکاسی کرتی ہے یہاں تک کہ اسے کسی ہدایت نامے سے بھی مطلب نہیں رکھتی، یعنی زندگی سے اخذ کردہ تجربات کی فراست ترسیل بھی اس کے دائرہ کار سے خارج ہے، یہ کوئی پیغام دیتی ہے نہ زندگی کرنے کا کوئی نسخہ تجویز کرتی ہے، یہ لوگوں کے انفرادی یا اجتماعی مسائل، دل چسپیوں یا ما بطنوں ان کے تعصبات، ان کے اخلاقی یا ذہنی گھتیوں کے بارے میں بھی اطلاعات فراہم نہیں کرتی، یہ فلسفہ طرازیوں میں بھی دل چسپی نہیں رکھتی، ممکن ہے کہ شاعری کے مقصدی کردار کے مبلغین چیں بہ جبیں ہو کر پوچھیں کہ اگر شاعری یہ سب نہیں کرتی تو پھر یہ کس مرض کی دوا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کسی مرض کی دوا نہیں، یہ ایک مخصوص اور منفرد ذہنی عمل ہے، جو زبان کے تخلیقی برتاؤ سے کردار و واقعہ کے عمل اور ردِ عمل سے "جہانِ دیگری" کی تخلیق کرتا ہے، اور یہی اس کا منتہائے مقصد ہے۔

کانٹ نے دو باتوں پر زور ڈال کر اس نظریے کی بنیاد فراہم کی ہے، اول یہ کہ فن مقصدیت کے بغیر مقصد رکھتا ہے، دوم یہ کہ حسن و جمال کو افادیت سے لاتعلق ہو کر دائرہ خیال میں لاتا ہے، یہ دونوں باتیں فن کے انفرادی وجود کی ضمانت فراہم کرتی ہیں۔ اسی نظریے کو پوؔ نے بھی یہ کہہ کر تقویت دی ہے کہ نظم صرف نظم کی خاطر لکھی جاتی ہے۔ ایلیٹ بھی اسی نظریے کا حامی ہے "جب ہم شاعری پر غور و فکر کریں، تو ہمیں بنیادی

طور پر اس پر شاعری کی حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہیے نہ کہ کسی اور حیثیت سے"۔

ایلیٹ کے بعد چیکا گو کے نقاد اور اکثر و بیشتر نقاد فن کی اسی خود مختاریت پر زور دیتے رہے۔

چوں کہ شعری تجربے کی لسانی تشکیل کا عمل ایک مخصوص اور منفرد نوعیت کا ہے اور معینہ فنی اصولوں کے تحت ہی تکمیل کو پہونچتا ہے، اس لیے جہاں تک فن کے شائقین کا تعلق ہے، ان میں سے بھی ہر ایک اس میں دل چسپی نہیں لے سکتا اور نہ ہی اس کے باطنی تجربے تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اس کے لیے لازماً ایک مخصوص تربیت یافتہ، بالیدہ اور درّاک ذہن کی ضرورت ہے، جس سے عام قاری بہرہ ور نہیں ہے، اس لیے شاعر اور قاری کے درمیان ایک ناقابل عبور فاصلہ قائم رہتا ہے، یہ فاصلہ طے کر کے ہی شعری حقیقت کا سامنا کیا جا سکتا ہے، ظاہر ہے یہ کام ایک دیدہ ور نقاد ہی انجام دے سکتا ہے، وہ شخصیت کی تمام تر قوتوں کے ساتھ شعری تخلیق تک رسائی حاصل کرتا ہے، اور اس کے اندر اس نیم تاریک اور نیم روشن اسراری فضا میں صورت پذیر شعری تجربے کا سامنا کرتا ہے اور پھر اپنے تنقیدی فریضے کی تکمیل کرتے ہوئے اپنے قارئین کو بھی مہم بازی کی ترغیب دیتا ہے، اور تجربوں کے گنج گوہر تک رہنمائی کرتا ہے۔

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود نقاد کن وسائل کی مدد سے شعری تجربے کو دوسروں تک منتقلی کا کام انجام دیتا ہے؟ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ شعری تجربے سے روشناس ہو کر بعد میں اس کی تفصیل یا تلخیص قاری تک منتقل کرتا ہے، یہ خیال صرف اس لیے ہی درست نہیں کہ شعر کی نثری تلخیص یا توضیح ممکن نہیں، بلکہ اس لیے بھی کہ یہ اصل تجربے کا بدل نہیں ہو سکتی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ قاری بھی تجربے کا بچشم خود مشاہدہ کرنے میں اپنی جمالیاتی حس کی تسکین کر سکتا ہے، بصورت دیگر اسے شاعر کے خیالات کی تشریح و تفسیر میں کیا دل چسپی ہو سکتی ہے؟ یہ الگ بات ہے کہ مروجہ تنقیدات تشریح و تفسیر پر ہی سارا زور ڈالتی ہیں اور قارئین ناکردہ گناہوں کی سزا بھگتنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

تنقید کے مفسرانہ انداز سے قارئین ان معنوی اور لسانی نزاکتوں کی تفہیم سے بھی محروم رہتے ہیں، جو شعر کی ہیئت کے اجزائے ترکیبی کے تجزیے سے برآمد ہوتی ہیں، قارئین کے لیے شعر کی معنویت، ضرورت اور وقعت کے قائم ہونے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ اس کے لیے غیر معمولی جذب و کشش سے معمور ہو، وہ اس کی جذب و کشش کو اسی وقت محسوس کرے گا جب شعر کے داخلی تجربے میں اپنی شرکت کو ناگزیر محسوس کرے گا، یہ کام خود شاعر کے دائرہ اختیار سے باہر ہے، اس لیے کہ شعر کی تکمیل کے بعد شاعر کا اس سے کوئی راست رشتہ باقی نہیں رہتا، یہ کام صرف ایک تنقید نگار ہی بطریق احسن انجام دے سکتا ہے، وہ شعر کی اسراری فضا کے جادوئی دروازوں کو وا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور پھر قارئین کو بھی اجنبی جلوؤں سے روشناس کراتا ہے، گویا تخلیق اور قارئین کے درمیان رابطے کا کام انجام دینا تنقید کا بنیادی کام ہے۔

نقاد اگر زور زبردستی سے فن تخلیق سے کسی مرکزی خیال یا موضوع کی کشید کر کے اس کا خلاصہ اپنے الفاظ میں قاری تک منتقل کرتا ہے، تو غریب قاری اس کا منہ دیکھتا رہ جاتا ہے، اس کا اس طریقے سے تخلیق سے نہیں بلکہ معانی سے واسطہ پڑتا ہے، جو فلسفہ یا اخلاق کا بدل بن جاتے ہیں، نتیجے میں اس کا دامن گوہر مراد سے نہیں بلکہ خزف ریزوں سے بھر دیا جاتا ہے اس لیے ایسی تمام تر تنقیدیں بشمول ہیئتی تنقید، ادبی تنقید کے تقاضوں کو کما حقہ پورا نہیں کرتیں، وم سیٹ اور بیارڈزلی نے اپنے مقالے INTENTIONAL FALLACY میں لکھا ہے:

"YET IT (POEM) IS, SIMPLY IS, IN THE SENSE THAT WE HAVE NO EXCUSE FOR INQUIRING WHAT PART IS INTENDED OR MEANT."

ایلیٹ نے ولسن نائٹ کے THE WHEEL OR FIRE میں تشریح معانی کی ضرورت کو کالعدم کیا ہے، لکھتا ہے "اگر ہم شیکسپیئر کی تخلیق میں مکمل طور پر زندہ ہیں، تو ہمیں کسی تفسیر کی ضرورت نہیں"۔

اس صورت حال کے پیش نظر اکتشافی تنقید کی ضرورت کا احساس اور بڑھ جاتا ہے، اس نظریہ تنقید کی رو سے نقاد صحیح معنوں میں تخلیق کے بطن میں اترتا ہے اور قاری کو بھی اپنے تجربے میں شریک کرتا ہے، کوئی بھی نقاد اس وقت تک اپنے فریضے سے عہدہ برآ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، جب تک وہ فن کار کے تخلیقی عمل کے تمام تر مدارج سے خود بھی گذرنے کو یقینی نہ بنا لے، اس کارروائی میں نقاد کے رویے اور طریق کو خصوصی دخل رہتا ہے، اکتشافی تنقید ان لوازم کی پاس داری کرتی ہے، وہ نہ صرف تخلیق کے بطون میں تخیلی تجربے سے متصادم ہونے کو منتج

مقصد بناتی ہے، بلکہ لسانی وسائل کے گہرے مطالعے کو کامیابی کی کلید تصور کرتی ہے، اکتشافی تنقید تخلیق میں برتے جانے والے ہر ہر لفظ کے تلازمی، صوتی، پیکری، استعاراتی اور علامتی امکانات کی تلاش دیانت کے ہم جویانہ عمل میں مصروف رہتا ہے، وہ شعر کے جملہ الفاظ کے تلازمی امکانات کو دریافت کرکے اس کے کلی لسانی نظام سے ایک مربوط، پیچیدہ اور تہہ دار تخیلی فضا کا ادراک کرتا ہے، ایسا کرتے ہوئے وہ قاری کی مساوی شرکت کو ممکن بنانے کی سعی کرتا ہے۔ اس کا طریق نقد ہی ایسا ہے کہ قاری تخلیق کے حرف و پیکر سے نمو کرنے والے انسلاکاتی امکانات کا احاطہ کرنے کی ترغیب پاتا ہے، یہ ترغیب اس کی پوری جمالیاتی شخصیت کو رنگ و نور سے آشنا کراتی ہے، روز مرہ زندگی کا میکانکی عمل اس کے ذوق، نظر اور حسیات کو بے رنگ اور زنگ آلود کرتا ہے، لیکن جب وہ کسی فنی تخلیق سے رابطہ قائم کرتا ہے، تو اس کی شخصیت کا سارا غبار اور زنگ اتر جاتا ہے، اور وہ تخلیق سے پھوٹنے والے تجربے کی شعاعوں سے نہا جاتی ہے، وہ سب سے پہلے حرف و پیکر کے جادو کی لپیٹ میں آجاتا ہے، حرف و پیکر سے یہ ذہنی اور حسیاتی وابستگی اس کو پہلے مرحلے سے بخیر و خوبی گذارتی ہے، اس کے بعد وہ ایک ایسے ترغیبی، تجسس آفریں اور دل چسپ تجزیاتی انداز کو روا رکھتا ہے کہ قاری کے لیے اس تجزیاتی عمل میں شریک ہونے کی خواہش تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے، وہ نقاد کی رہنمائی میں تخلیق کے جادوئی دروازوں کو وا ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور پھر وہ خود بھی نادیدہ طلسمی دنیا میں داخل ہو کر دل فریب و توقعات سے دوچار ہو کر مسرت، حیرت، لطافت اور بصیرت کے نت نئے جذبوں سے آشنا ہو جاتا ہے

آیئے ہم غالب کے شعر ؎

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

جس کے بارے میں سطور بالا میں گفتگو ہو چکی ہے، اور جس سے حالی سے لے کر فاروقی تک تقریباً سبھی نقادوں نے قطعی طور پر معینہ معنی اخذ کرنے پر زور دیا ہے، کہ تخیلی تجربے کی شناخت کی سعی کریں، یہ اکتشافی تنقید ہی سے ممکن ہے، یہ بات خاطر نشاں رہے کہ شعر میں شعر کے خالق کے بجائے ایک فرضی کردار ابھرتا ہے، جس کا شاعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، شعر تکمیل پذیر ہوتا ہے، تو شاعر سے اس کا رشتہ ساقط ہو جاتا ہے، اب شعر تکمیل یافتہ اور قائم بالذات وجود ہے، جو اپنی زندگی، حرارت اور توانائی رکھتا ہے، شعر میں فرضی کردار کی آواز کو شاعر کی آواز قرار دینے کی شعر کی وہی درگت بنتی ہے، جو محولہ بالا شعر کی مختلف شارحین کے ہاتھوں بنی ہے، انہوں نے غالب کو وحدت الوجود کے نظریے کا حامی تسلیم کرکے ان کے شعر سے اسی نظریے کو منسوب کیا ہے، حالانکہ شعر کو اس نظریے سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔

زیر نظر شعر میں پہلے مصرے کے الفاظ کی دروبست شعری کردار یقین آفریں لہجے میں ایک خارجی معروض یعنی سمندر کی تقلیب کا اعلان کیا ہے، وہ وجود بحر کو صورتوں کی نمود پر مشتمل قرار دیتا ہے، اور ایک خالص علامتی صورت حال کی تخلیق کرتا ہے۔ "وجود بحر" اور دوسرے مصرعے میں لفظ "یاں" سے ظاہر ہوتا ہے ایک مواج سمندر سامنے ہے، اور شعری کردار سمندر کے وجود کے بارے میں ایک نئی بات کا انکشاف کر رہا ہے، وہ ایک ایسے شخص یا اشخاص سے مخاطب ہے، جو گرد و پیش کی اشیاء و مظاہر جن میں سمندر شامل ہے، روایتی نظر سے دیکھتے ہیں، اور محض ظاہر بین ہیں، اس (ان) کے نزدیک سمندر کا وجود قطرہ و موج و حباب پر مشتمل ہے، لیکن شعری کردار جو مظاہر کے دل وجود دیکھ رہا ہے، سمندر کے بارے میں ان کے خیال کی تکذیب کرتا ہے اور تضحیک آمیز لہجے میں قطرہ و موج و حباب کی بے بضاعتی کا اعلان کرتا ہے، وہ سمندر کے وجود کا قائل ہے مگر اسے نمود صور پر مشتمل گردانتا ہے، گویا یہ ایک تخیلی سمندر ہے، جو صورتوں کی نمود سے متشکل ہو جاتا ہے، سمندر سے دیوتاؤں کی صورتوں کے برآمد ہونے اور ان کے مظاہر سے محظوظ ہونے کی آرزو ورڈس ورتھ کی نظم THE WORLD IS TOO MUCH کا شعری کردار بھی کرتا ہے:

HAVE SIGHT OF PROTENS RISING FROM THE SEA OR LEAVE OLD

TRITON BILLOW HIS WREATHED HORN.

زیر بحث شعر میں شعری کردار اپنے لہجے کے اتار چڑھاؤ سے سمندر کے طلسمی وجود کی توثیق کرتا ہے، مجموعی طور پر شعری کردار، اس کا

(باقی صفحہ ۱۵ پر دیکھیے)

مٹھی بھر غزلیں



صدیق مجیبی

◆

اب یہی بہتر ہے نقشِ آب جُو دے مجھے
یوں ہی رُسوا خاطرِ احباب ہونے دے مجھے

نیند آنکھوں میں پرندوں کی طرح اتری ہے آج
اے نفس آہستہ چل غرقاب ہونے دے مجھے

ایک ٹکڑا ابر کا پھرتا ہے مانندِ غزال
اے سری چشم ہوس سیراب ہونے دے مجھے

عمر بھر میں ایک کام ایسا تو کر شوقِ جنوں
میں اگر دریا ہوں تو سیماب ہونے دے مجھے

میں بھی پتھر بن کے زیرِ آب سو جاؤں کہیں
کیا ہوا ایسا کہ اب گرداب ہونے دے مجھے

پیاس کہتی ہے کہ چل دریا اُٹھا لائیں یہیں
وہ یہ کہتا ہے کہ رک پایاب ہونے دے مجھے

◆

حجاب درمیاں اٹھا نہ صورتِ نہاں کھلا
عجیب بزم تھا کہ اسے کبھی نہ بدگماں کھلا

ہوائیں خوشبوؤں کے رخت باندھ کر نکل چلیں
چمن کے گرد دشت دشت بابِ بوستاں کھلا

مرے تباہ حال گھر کے کھلنے کا حال کوئی دن
اگر کسی مقام پر حسابِ دوستاں کھلا

ہوا کی ساز باز نے نہ کارگر کیا بھرم
دعا کو ہاتھ ہی اٹھے نہ جنبشِ بادباں کھلا

مجیب بے کسی میں اس کے روبرو کھڑا تھا میں
نہ حرف حرف آئے لب مرے نہ رو ہی بے زباں کھلا

علیم تو خبیر تو مرے خدا تو ہی بتا
میں کس مکاں پہ چل کے گیا چھوڑ کر مکاں کھلا

جہانِ این و آں مجیبی رزم گاہِ شوق ہے
نشہ بہ بال وہ کھلے نظر میں آسماں کھلا

◆

شامِ الم کہ صبحِ طرب کچھ نہیں ہے اب
زندہ ہوں اور اس کا سبب کچھ نہیں ہے اب

منظر عجیب چشمِ تحیر میں ہے مری
میرے لیے تو کچھ بھی عجب کچھ نہیں ہے اب

کیسا ضمیر، کس کا خدا، کیسی رسم و راہ
جب امتیازِ نام و نسب کچھ نہیں ہے اب

کن انگلیوں کو ڈھونڈنے نکلی ہیں تتلیاں
اس دشتِ بے لباس میں جب کچھ نہیں ہے اب

تیز دل پہ سر ہیں سرِ کلاہ آفتاب کی
عالم پناہ تیرا غضب کچھ نہیں ہے اب

یا رب غبارِ راہ ہوں گھر کبھی نہ جاؤں
اس کے سوا تو میری طلب کچھ نہیں ہے اب

زخمی ہیں یا بے حسی سے مجیبی دل و دماغ
لذت فزائے صحبتِ شب کچھ نہیں ہے اب

◆

ایک بے منظر ادا سی چار سو آنکھوں میں ہے
جتنا باقی ہے مرے دل کا لہو آنکھوں میں ہے

جسم و جاں پامالِ صدماتِ تغافل ہو چکے
اب تو جو ہے ماورائے گفتگو آنکھوں میں ہے

ختم ہوتا ہی نہیں بیدار لمحوں کا عذاب
نیند جیسے کوئی زخمِ بے رفو آنکھوں میں ہے

تشنگی کا اک پرندہ چیختا ہے ذہن میں
قریۂ جاں کی کتنی آب جو آنکھوں میں ہے

بھیگتے اشکوں پہ لکھی تحریر روشن ہے ابھی
ایک وعدہ، ایک پیکر، ہو بہو آنکھوں میں ہے

میں بیاباں کی بکھرتی دھند ہوں ہے سمت وحشت
اب کوئی سودا ہے سر میں اور نہ تو آنکھوں میں ہے

کس طرف دیکھوں مجیبی کس سے رشتہ جوڑ لوں
روبرو نیلا ہے پھر بھی دشت ہو آنکھوں میں ہے

● سینٹرل اسٹریٹ، ہندپیری، رانچی (بہار)

◆

موسم کا تقاضا ہے کہ ہر بندِ قبا کھول
خوشبوؤں کے در بند ہیں اے بادِ صبا کھول

منظر کو دھنک رنگ بنا فرشِ زمیں پر
اے ابرِ کرم، موجِ ہوا، بابِ دعا کھول

تحریر کر ان آنکھوں میں کچھ خواب سہانے
اک روز تو اے گیسوئے شب اپنی ردا کھول

آ لوح و قلم لے کے خدا دشتِ گماں میں
سینے میں مرے دفترِ اسرار تو کھول

بازارِ سخن گرم ہے اربابِ ہوس سے
تو اپنی دکاں سب سے الگ سب سے جدا کھول

ہنگامے بہت ہو چکے صدیق مجیبی
آرام سے اب بیٹھ کہیں تسمۂ پا کھول

◆

شریکِ غم کوئی کب معتبر نکلتا ہے
سوائے دل کے سو وہ بے خبر نکلتا ہے

یہ کیسا شہر ہے کیسی ہے سرزمیں اُس کی
جہاں کی خاک پلٹتا ہوں سر نکلتا ہے

جدھر نہیں ہے پیاسے ادھر بارشیں ہیں تیروں کی
جدھر غنیم ہے دریا ادھر نکلتا ہے

اسے خبر ہے کہ ظلمت سے صف بہ صف ہر سو
اجالا ہاتھ میں لے کر سپر نکلتا ہے

حفیظ ہاتھوں کا سایہ ہے آسماں جیسا
یقین ہوتا ہے دل کو نہ ڈر نکلتا ہے

مجیب عہد ہے دشتِ سفر پہ چھائی ہوئی
نہ ختم ہوتا ہے رستہ نہ گھر نکلتا ہے

مجیبی سونپ دی جس کو متاعِ جاں میں نے
اسی کا قرض ہمارے نام پر نکلتا ہے



رشید امجد

سی/۵۴۲ (بی/۸۳) اولڈ لین نمبر ۱۔ گلستان کالونی، راولپنڈی

شام کی دہلیز پر خود کلامی

شام نے ابھی اپنی سُرمئی پلکیں اٹھائی ہی تھیں کہ دروازے پر دستک ہوئی، وہ ہانپتا ہوا اندر آیا اور بولا ——"سب کچھ ختم ہوگیا۔"

میں نے پوچھا —"کیا ہوا؟"

چند لمحے چپ رہا۔ پھر کہنے لگا —"میں زندہ نہیں ہوں"

"وہ تو مجھے معلوم ہے تم نے کئی دن پہلے اپنے مرنے کا اعلان کیا تھا"

اس نے تیز نظروں سے مجھے دیکھا —"میرا مذاق تو نہیں اُڑا رہے؟"

"نہیں" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے تمھاری بات کا پورا یقین ہے"

اُس نے اطمینان سے سر ہلایا اور ٹانگیں پسار کر کرسی سے ٹیک لگائی، کبھی آدمی مر کر بھی نہیں مرتا اور کبھی کبھی مرنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے چنانچہ جب کچھ دن پہلے اُس نے مرنے کا اعلان کیا تو مجھے زیادہ حیرت نہ ہوئی لیکن دوسروں کا رویّہ بڑا مختلف تھا۔ انہوں نے پہلے تو مذاق اُڑایا۔ مگر جب وہ اپنی موت پر اصرار کرتا رہا تو اُسے پاگل سمجھنا شروع کر دیا۔

اُس کا چھوٹا بھائی کہنے لگا۔ "مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا کہ ایک دن یہی ہوگا، پچھلے کئی ہفتوں سے اس کی حرکتیں ہی ایسی تھیں"

بیوی نے بھی اثبات میں سر ہلایا —"مجھے بھی اب لگتا ہے پچھلے کئی دنوں سے اِن کا رویہ عجیب سا تھا"

مجھے معلوم نہیں کہ اُس کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب ہے یا نہیں لیکن وہ یہ اصرار ضرور کئے جا رہا ہے کہ اب میرا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اب وہ ایک مشین ہے جس کا ہر عمل معمول کے مطابق ہے، مخصوص وقت پر اٹھنا، تیار ہو کر دفتر جانا — دفتر میں بھی معمول کا ایک عمل۔ شام کو وقت پر واپسی،

دفتر میں ہمارے ساتھی چند دن تو بہت پریشان رہے کہ اُس جیسے ہنس مکھ اور خوش اخلاق شخص کو یہ کیا ہوگیا ہے — آگے بڑھ بڑھ کر ملنے والے کو یہ کون سی گہری چپ لگ گئی ہے — خاموشی سے اُنالو سارا دن فائلوں میں ڈوبے رہنا،

ایک دن یونہی میں نے پوچھا۔

"زندگی کے دنوں اور ان دِنوں میں کیا فرق ہے؟"

اُس نے خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔ شور اور خاموشی میں بڑا وقفہ ہوتا ہے۔

چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا — زندگی تو پانی پر تیرتا ہوا پھول ہے اور موت بھیگ کر ڈوب جاتا"

میں نے کہا "شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو، جب معمول کا بوجھ ہماری ہمت سے زیادہ ہو جاتا ہے تو ہم پانی کی تہہ میں اُترنے لگتے ہیں۔ لیکن ایک بات بتاؤ"

اُس نے سر اُٹھایا،

"رشتے اور جذبے تو بڑے طاقت ور ہوتے ہیں۔ کسی بچے کی کلکاری بھی تمہیں سطح پر نہیں لاتی"

اُس کی آنکھیں لمحہ بھر کے لئے چمکیں — "یہ جو سب سے چھوٹا لڑکا ہے نا — سومی، جب وہ اپنی ننھی منی اُنگلیوں سے میرے گال تھپتھپاتا ہے تو لگتا ہے میں پھر اکٹھا ہونے لگا ہوں"

"تو اکٹھے ہو کیوں نہیں جاتے، کہیں تمہیں بکھرنے میں مزہ تو نہیں آنے لگا؟"

"اکٹھا ہو جانا اور پھر بکھر جانا — بکھر کر دوبارہ اکٹھا ہونا، مجھے معلوم نہیں اذیت کہاں ہے؟ اور لذت کہاں —؟ بس یہ کوئی ایک لمحہ ہی ہے جسے ہم زندگی بھر تلاش کرتے رہتے ہیں،

"ایک لمحہ"

"ہاں صرف ایک ہی لمحہ کبھی مل جاتا ہے اور پوری زندگی گزار کر بھی ہاتھ نہیں آتا"

اور اس کے باہر پانی کی ایک منھ زور لہر ہے — اُچھلتی ناچتی منھ زور لہر، جو آہستہ آہستہ سب کو کھینچ کر تہہ میں لے جاتی ہے۔

یہ سارا منظر خواب اور جاگنے کے درمیان کا ہے۔

خواب کے لمحوں اور جاگنے کے لمحوں کے درمیان ایک وقفہ ہے۔ جہاں سے کبھی ہم پلک جھپکنے میں گزر جاتے ہیں اور کبھی ہمیشہ کے لئے رہ جاتے ہیں!

۲

میں — شاید میں نہیں ہوں۔

مجھے اپنے ہونے میں شبہ ہے اور نہ ہونے کی بھی کوئی تصدیق نہیں۔ اپنے ہونے کا احساس تو خوشبو کی طرح ہے جسے کلی کی طرح ہم اپنے اندر چھپائے پھرتے ہیں۔ لیکن جونہی کلی کھلتی ہے یہ خوشبو ہماری نہیں رہتی۔

اب یاد نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جب آوازوں نے اپنی پہچان بدلی تھی اور رشتے بے آواز ہوئے تھے۔ یونہی ہوتا ہے کبھی چیزیں بدل جاتی ہیں اور کبھی ہم خود بدل جاتے ہیں۔ زندگی ایک ایسے تختہ سیاہ کی طرح بن جاتی ہے جس پر کچے حروف میں زندگی کے معنی لکھ دیے جاتے ہیں — ایک ایسی تحریر جس کے مفہوم سے ہم آشنا نہیں ہوتے لیکن اُن کے مطابق زندگی کرنے کی پابندی ہوتی ہے۔

میرے رشتے، میرے جذبے، میری شرکتیں سب اجنبی ہیں شاید کبھی میری ان سے آشنائی رہی ہو۔ لیکن اب میرے لئے اُن کے کوئی معنی نہیں ہیں۔

یہ بکھرے بالوں والا میرا چھوٹا بھائی، اُس کے لئے زندگی کتنی آسان ہے، نہ کچھ کرنا، بس کتابیں اُٹھا کر کالج جانا اور سارا دن تھے چکیں لگانا — میرا اس سے کیا رشتہ ہے، یہی کہ ماں باپ کے بعد میں ہی اس کا کفیل ہوں، اور مجھ پر یہ فرض عائد کر دیا گیا ہے کہ بڑے ہونے کے ناطے مجھے یہ سب کچھ کرنا ہے۔ اور یہ عورت — ہر وقت میری چھوٹی خوشنودی کیلئے مصنوعی مسکراہٹ کا جال لئے مجھے قابو کرنے کے چکر میں رہتی ہے — میرا اس سے صرف بدن کا ہی ایک رشتہ ہے۔ ضرورتوں کا رشتہ، جذبوں سے عاری، مجھے معلوم ہے اسے مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں — صرف پہلی تاریخ کو ملنے والی تنخواہ نے اس کے قدم باندھ رکھے ہیں۔ اور میں اُس شخص کو بھی جانتا ہوں، جس سے یہ اب بھی ہنس ہنس کر ملتی ہے، وہ اس کا پرانا کلاس فیلو، اب تو وہ کمبخت میرا افسر ہوگیا ہے — بس اُس دن اتفاق ہی سے میں نے اُن کی باتیں سن لی تھیں، میں کبھی تو حیران تھا کہ وہ آخر میرے گھر آنے پر اتنا مصر کیوں ہے — لیکن میں اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

"ابو جی — آپ کب آئیں گے — یہ آواز، جذبوں سے بھری یہ آواز، بس یہ ایک ایسا لمحہ ہے جب ساری بکھری ہوئی چیزیں ایک جگہ اکٹھی ہونے لگتی ہیں — ایک مرکزی نقطہ — میں جلدی سے باہر نکل آتا ہوں، لگتا ہے میں ایک کمپیوٹر ہوں، احساس سے عاری، جذبوں سے خالی۔ گھر سے دفتر، دفتر سے گھر — دفتر میں وہ افسر — اور گھر میں یہ بیوی" "ابو جی — آپ کب —" نہیں نہیں میں اس آواز کو نہیں سننا چاہتا، میں کسی کو نہیں جانتا کسی کو نہیں پہچانتا، تہہ میں ڈوبا ہوا پھول، پھول نہیں رہتا پتی پتی ہو کر پانی ہی بن جاتا ہے۔

یہ پانی کیا ہے؟

لیکن اس سے بھی پہلے یہ پھول کیا ہے، جو پانی کی سطح پر تیرتا ہے۔ پھر کسی دن ایکا ایکی ڈوب جاتا ہے۔

ڈوبنے اور تیرنے کے درمیان جو وقفہ ہے۔

یہ کیا ہے۔

خواب کا یا جاگنے کا۔

اور ان کے درمیان ایک پل صراط ہے جو اس پر سے جلدی سے گزر جائے وہ پار چلا جاتا ہے، جو نہ گزر سکے ہمیشہ کے لئے وہیں رہ جاتا ہے۔

میں بھی درمیان ہی میں رہ گیا ہوں — تیرتے ہوئے ڈوب گیا ہوں اور ڈوب کر بھی تیرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

خواب کیا ہے — جاگنے کا لمحہ کیا ہے۔

میں خواب دیکھ رہا ہوں یا جاگ رہا ہوں؟

۳

بہت دنوں سے مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے تالاب کی ٹھہری سطح کے نیچے کوئی بڑی لہر مضطرب سی ہے، اُس کی حرکتوں اور گفتگو میں ایک عجیب طرح کی بے چینی ہے۔ یوں لگتا ہے یہ کوئی خود کلامی ہے۔ فائلوں پر جھکے جھکے وہ اچانک سر اٹھا کر خلاء میں کسی کو گھورتا ہے بہت دیر تک کسی گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد یوں سر ہلاتا ہے

جیسے کسی سے باتیں کر رہا ہو۔ پھر انگوٹھے کی پور کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے دوبارہ خالوں میں ڈوب جاتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کیا بات ہے، کس سوچ میں ہو؟"

وہ خالی نظروں سے دیکھتا ہے ۔۔ فیصلے کا لمحہ بڑا دشوار ہے اور عجیب بھی۔

"کیسا فیصلہ" میں حیرت سے پوچھتا ہوں۔

"ہونے یا نہ ہونے کا ۔۔ خود کو دریافت کرنے کا۔ وہ یوں بولتا ہے جیسے میری بجائے کسی اور سے مخاطب ہو۔

میں سوچتا ہوں شاید واقعی اس کا ذہن ماؤف ہو رہا ہے۔ کل اُس کی بیوی بھی کہہ رہی تھی کہ اب تو کسی کو دکھانا ہی پڑے گا"

میں نے پوچھا ۔ "کیا ہوا؟"

کہنے لگی ۔۔ "بس بیٹھے بیٹھے جنون سا ہوتا ہے۔ لگتا ہے کوئی غیر مرئی چیز ان کے سامنے ہے جسے پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یا پھر چپ چاپ بیٹھے اپنے آپ سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں ان پر کسی کا سایا ہو گیا ہے۔

"سایا ۔۔" وہ ہنسا ۔۔ "ہم سب سائے ہی تو ہیں کسی اور کے" اور یہ سایا بھی کیا چیز ہے ۔۔ اصل سے علیحدہ بھی، منسلک بھی،

سائے معدوم ہوتے ہیں تو چیزیں وجود میں آتی ہیں اور چیزوں کے اجزا بکھرتے ہیں تو سائے بن جاتے ہیں۔

سائے سے وجود اور وجود سے پھر سایا

دائرہ در دائرہ ۔۔ ایک سفر، نہ ختم ہونے والا سفر

"میں کیا کروں؟" اُس نے بڑی بے بسی سے پوچھا ۔۔ مجھے پتہ نہیں چل رہا کہ میں سایا ہوں یا وجود"

"کچھ بھی رہو ۔۔ لیکن اپنے آپ کو محسوس کرو۔"

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا ۔۔ شاید تم ٹھیک ہی کہتے ہو"

پھر مشین کی طرح اُٹھا اور اپنا ٹفن بکس لے کر دفتر سے نکل گیا۔

اُس کے جانے کے بعد مجھے یوں ہی احساس ہوا کہ اُس کی باتوں میں کوئی عجیب سی بات تھی۔ کوئی چھپی ہوئی بات جس نے مجھے بے چین سا کر رکھا ہے، میں نے سوچا کہ گھر جانے سے پہلے اُس کے یہاں سے ہوتا جاؤں گا لیکن اُس شام بچوں کے لئے کچھ چیزیں لینا تھیں، بازار میں برسوں پرانا ایک ساتھی مل گیا، اُسی کا ذکر چھڑ گیا اور چائے پیتے ہوئے اتنی دیر ہو گئی کہ مجھے اس کے یہاں جانا یاد ہی نہ رہا۔

گھر پہنچا تو میری بیوی پریشان حال دروازے میں کھڑی تھی،

"خیر تو ہے" میرا دل ڈوب سا گیا۔

"انو بھائی نے خودکشی کر لی۔" ۔۔۔۔۔ "کیا!"

صفدر آیا تھا کہہ گیا ہے کہ آپ جب بھی آئیں سول ہسپتال پہنچیں۔

میں اُلٹے پاؤں واپس مڑا۔ ایمرجنسی کے کاریڈار میں صفدر اور اس کے کچھ رشتہ دار پریشان کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکا اور میرے کندھے سے سر ٹکا کر رونے لگا۔

"میں نے پوچھا ۔ "ہوا کیا؟

"انہوں نے ۔۔ انہوں نے "وہ آنسوؤں میں بات مکمل نہ کر سکا۔ ۔۔۔۔۔ میں اسے ایک طرف کر کے اندر گیا۔

وہ زندگی اور موت کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ گلوکوز اور خون کی بوتلیں دونوں طرف لٹکی ہوئی تھیں، میں قریب چلا گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس نے آنکھیں کھولیں۔ اُن میں عجیب طرح کی چمک تھی۔ اپنے آپ کو محسوس کر لینے والی چمک۔ میں نے کہا ۔ "یہ تم نے کیا کیا؟

وہ بولا نہیں ۔۔ شاید بول ہی نہیں سکا۔

مجھے کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا کروں، میں نے اس کی موت پر بھی اسے پرسا نہیں دیا تھا اور اب زندہ ہونے پر بھی مبارک باد نہ دے سکا، ۔۔ بس کچھ کہے بغیر چپ چاپ باہر نکل آیا۔

بقیہ صفحہ ۱۱ - اکتشافی تنقید - چند پہلو

ڈرامائی لہجہ، موج خیز سمندر، نمود صور اور قطرہ و موج و حباب کے عمل سے ایک مربوط اور متحرک تخیلی فضا کی تخلیق ہوتی ہے، جو تجسس اور تحیر کے امکانات سے معمور ہے۔

یہ تخیلی منظر نامہ سراسر علامتی نوعیت کا ہے، اس لیے کسی معینہ یا قطعی مفہوم کا متحمل نہیں ہو سکتا، علامتی شعر فوری طور پر معنی و مطلب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا، اگر شعر سے معنی ہی نکالنا ہے، تو کسی ایک معنی ہی پر اصرار کیوں؟ غور کیجیے تو زیر بحث شعر سے التباس، تخلیقیت، تخلیقی پیکریت، لاشعور، زندگی، جبلیات، اسراریت، دیومالا، واہمہ اور نہ جانے کیا کیا معانی اخذ کیے جا سکتے ہیں۔



وقار واثقی

وہ لڑنے آیا ہے، لیکن سبب نہیں ملتا
جو گھر سے لے کے چلا تھا غضب نہیں ملتا

یہ آج کیسی پراگندگی ہے ذہنوں میں
ادیب ملتے ہیں، لیکن ادب نہیں ملتا

وہ لمحے حسن کا تعین نہ کر سکا ورنہ
وہ کب نظر نہیں آتا، وہ کب نہیں ملتا

غضب ہوا کہ مرا راز کھل گیا مجھ پر
مرا مزاج، کسی سے بھی اب نہیں ملتا

وہ اپنے خول میں کچھ اس طرح ہوا ہے گم
کہ بزمِ فکر و ادب میں بھی اب نہیں ملتا

سیاہ شامِ شفق رنگ اگر نہیں آتی
وقار سلسلۂ روز و شب نہیں ملتا

۱۵۲۵- رسول آباد، احمد آباد-۲۸



نامی انصاری

غنچۂ وصل کھلے، شامِ وفا روشن ہو
جامِ اقرار سے پھر ساری فضا روشن ہو

دل میں اترے ترے پائل کی صدا آخرِ شب
شہر سو جائے تو نقشِ کفِ پا روشن ہو

زخم کچھ ایسا لگے دل پہ کہ پانی نہ ملے
خنجرِ عشوہ چلے یوں کہ ہوا روشن ہو

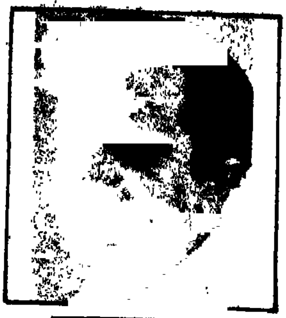
خاکِ امید کو آنکھوں میں جگائے رکھئے
جانے کب شمع بجھے، بندِ قبا روشن ہو

برف کی تہہ سے کہیں رنگِ حنا اگتا ہے
لبِ انکار پہ کیا حرفِ دعا روشن ہو

مڑ کے دیکھیں گے نہ پیچھے کی طرف اہلِ جنوں
سر پہ خیمہ نہ سہی دشتِ بلا روشن ہو

فیض نے کی تھی جو ایجاد قفس میں نامی
آج محفل میں وہی طرزِ ادا روشن ہو

۱۴/۲۱- اے، نواب صاحب کا احاطہ، رسول لائنز، کانپور۔



خورشید افسر بسوانی

جہاں دریچۂ عشرت مآب دیکھتے ہیں
وہیں جھکی ہوئی شاخِ گلاب دیکھتے ہیں

تمام دن تو ابھرتے سراب دیکھتے ہیں
مگر ہم اب بھی سنہری ہی خواب دیکھتے ہیں

کسی محاذ میں تلوار پر نہیں دیکھی
ہم آج اس کی چھری پر جو آب دیکھتے ہیں

تمام دشت نظر میکدہ فضا ہے کہ ہم
ہرن کی آنکھ میں موجِ شراب دیکھتے ہیں

وہی سفر، وہی رہوارِ زندگی ہے مگر
ہزار مصلحتیں ہم رکاب دیکھتے ہیں

جو کیچوؤں کی طرح جی رہے ہیں پو کر
وہ کیکڑے بھی سمندر کا خواب دیکھتے ہیں

کبھی تو رنگِ تماشا میں تو بھی آ افسر
تجھے ہمیشہ یہ حالِ خراب دیکھتے ہیں

بسواں ۲۶۱۲۰۱، ڈسٹرکٹ سیتاپور (یوپی)

عبدالقوی دسنوی

صدر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال، (مدھیہ پردیش)

ورودِ مسعود سے نذرِ مسعود تک

جب سے ورودِ مسعود کی اشاعت عمل میں آئی ہے اُردو دنیا میں تھوڑی ہلچل پیدا ہو گئی ہے۔ اس کا ذکر، ڈرائنگ روم میں، علمی ادبی نشستوں میں کبھی تیز لب ولہجہ کے ساتھ اور کبھی سنجیدہ انداز میں ہوتا رہتا ہے۔ رسائل میں تبصرے بھی اکثر نظر سے گذرتے رہے ہیں۔ شکوہ شکایت کی نوبت پہنچی ہے مراسلہ بازی بھی ہوئی ہے۔ دکھ درد کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ کبھی سنجیدہ قلم اُٹھے ہیں، کبھی ناسمجھی کی باتیں ہوئی ہیں، کچھ عالمانہ تحریریں بھی منظرِ عام پر آئی ہیں، کچھ تحریریں تخاصمانہ انداز اختیار کر گئیں ہیں، کچھ طالب علمانہ محسوس ہوتی ہیں کہیں مطلب کی باتیں لکھی گئی ہیں۔ کہیں بے مطلب زور آزمائی کی کوشش کی گئی ہے کچھ تحریروں کو پڑھ کر خوشی ہوئی، کچھ پڑھنے کے بعد کبھی سنجیدہ ہوا کبھی رنجیدہ ہوا، کبھی مضطرب ہوا۔ یہ دیکھ کر خون کے آنسو ہی رویا جا سکتا ہے کہ اُردو کی چار بلند قامت ہستیاں، میدانِ ادب میں قلم آزما ہوئیں، یہ چاروں نامور ادیب، مشہور محقق، معروف ناقد، محترم استاد اور نمایاں علمی، ادبی صلاحیتوں کے مالک ہیں، سب کے سب اس زندگی ناپائیدار کی بے شمار بہاریں دیکھ چکے ہیں اور ان سے لطف اندوز ہو چکے ہیں۔ یہ سب کے سب عزت واحترام کے بلند مقام پر مسند نشیں ہیں۔ شہرت ہر قدم ان کے قدم چومتی ہے اور قدر و منزلت ان کی پیشانی کو بوسہ دیتی ہے۔

اردو کے ادیب اور استاد کی حیثیت سے دوسرے بے شمار اساتذہ اور ادیبوں کے مقابلے میں عیش و آرام اور شان و شوکت کے وہ بہت سے ساز و سامان سے ان کی رہائش گاہیں آراستہ اور پیراستہ رہتی ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے عام طور سے اساتذہ اور ادبا کی آرزوئیں ان کو مضطرب رکھتی ہیں۔ یہ سب سماج میں ایک خاص مرتبہ رکھتے ہیں اور عوام میں خواص میں، حکمرانوں میں کہیں بھی ان کے احترام میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ کہیں ان کی انا کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ پھر بیٹھے بٹھائے ان میں ایک نے اپنے ہاتھ میں زنگ آلود تلوار لے کر بے تحاشہ دوسروں پر حملے کیوں کر دیئے۔ اور دوسروں نے بھی اپنی مدافعت میں اپنی اپنی زنگ آلود تلواریں کیوں اٹھالیں۔ یہ سوالات کچھ عرصہ سے دل و دماغ میں ایک خاص انتشار پیدا کیے ہوئے ہیں۔

وقت تیز رفتاری سے بدل رہا ہے، زمانہ ترقی پذیر ہے۔ حالات کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ اُردو کے مسائل کچھ اور چاہتے ہیں پھر یہ میدانِ ادب میں زور آزمائی کیسی؟ یہ میں میں کیا؟ یہ تو تو کیوں؟

کم صلاحیت کے لوگ یہ سب کچھ کریں تو بات کچھ سمجھ میں آجاتی ہے، بے صلاحیت لوگ اگر فساد برپا کریں تو حیرت نہیں ہوتی لیکن منتخب روزگار لوگوں کا اس طرح ایک دوسرے کے لیے رسوائی کا باعث بننا افسوس ناک ہے۔ اردو والے جن پر ناز کرتے ہیں، فخر کرتے ہیں، جن کی تحریریں پڑھ کر تسکین محسوس کرتے ہیں۔ جن سے کچھ سیکھتے رہے ہیں۔ جن کے وجود سے دلوں میں طاقت اور توانائی حاصل کرتے رہے ہیں جن کی تحریروں سے آنکھوں کو منور کرتے رہے ہیں۔ دماغ کو نور بخشتے رہے ہیں، دل کو سکون پہنچاتے رہے ہیں، احساسات کو مطمئن کرتے رہے ہیں ان کا یہ حال دیکھ کر وہ مایوسی لگی دل دل میں اپنے آپ کو محسوس کر رہے ہیں اس کا اظہار کم از کم اس وقت میرے بس کی بات نہیں۔ بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ کیا ہو رہا ہے؟ اس کا حاصل نقصان کے علاوہ کیا ہے۔

"ورودِ مسعود" آپ بیتی ہے اور آپ بیتی کے سلسلے میں محترم مسعود حسین خاں کا خیال بجا ہے کہ:

"اس کو لکھتے وقت صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانا چاہئے خواہ گریباں ہی کیوں نہ ہو۔۔۔"

لیکن اب یہ مقصد صداقت کا اظہار بھی نہیں ہونا چاہئے یا صداقت کے نام پر "اذیت رسانی" سے ہمیشہ بچتے رہنا چاہئے وہ خود پروفیسر

اسلوب احمد انصاری صاحب کے تبصرہ (مطبوعہ نقد و نظر ۱۹۸۸ء جلد-۱ شمارہ ۲) کے جواب میں یہ اعتراف کرتے ہیں :

"..... موصوف نے "ورود مسعود" پر تبصرہ کرتے وقت بعض ایسی محترم شخصیتوں کی وکالت کرنے کی کوشش کی ہے جن کی خوبیوں کے تذکرے میں مصنف نے صفحوں کے صفحے رنگ دیے ہیں لیکن اگر ان کی بشریت کے حوالے سے کہیں چھینٹ پڑ گئی ہے تو ان کے خیال میں قیامت آ گئی ہے۔"

لیکن کیا یہ سچ نہیں کہ ان چھینٹوں نے ان محترم شخصیتوں کے دلوں کو یا ان کے قدر دانوں کو نہ صرف تکلیف پہنچائی ہے بلکہ ان میں سے دو کو اس قدر بے چین کر دیا ہے کہ وہ اس کا جواب دینے پر مجبور ہو گئے ہیں اور وہی "سچ" (اگر سچ ہے) دوسروں کی نظر میں جھوٹ بن کر ان کی پریشانی کا باعث بنے ہیں۔ "سچ" تو سچ ہوتا ہے یک طرفہ نہیں ہوتا۔ اس سچ کا جواب جسے ورود مسعود کے اوراق میں جگہ دی گئی ہے ڈاکٹر گیان چند نے پہلے "ہماری زبان" کے صفحات پر عہد اردو زبان: تاریخ، تشکیل، تقدیر از مسعود حسین خاں" پر تبصرہ کرتے ہوئے اس طرح تحریر کیا ہے :

چوں کہ امرت رائے اردو کی تھالی میں نہیں کھاتے اس لیے میں ہی بے ننگ و نام ہوں جس پر مصرع (یہ جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی تھالی میں چھید کرتے ہیں) کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں ہمارے بڑے محقق ہیں ان سے توقع کی جاتی ہے کہ کسی پر اعتراض کرتے وقت اپنے الفاظ اس کے منہ میں نہ رکھ دیں گے اس لئے واقعی جو کچھ کہا ہے اسے حزم و احتیاط کے ساتھ نقل کریں گے۔ اس بیان کے مرکب جملے کو یہ اعزاز دیا جا سکتا ہے کہ تین سطروں کے اس جملے میں جتنی غلط بیانیاں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہیں اس کی نظیر اردو میں شاید ہی ہو۔"

[عصری ادب۔ دہلی افسانہ نمبر جنوری تا اپریل سنہ ۱۹۸۹ء]۔

اور ـــــــ :

آب میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے خطبے کے دوسرے حصے کو لیتا ہوں کہ یہ بے ننگ و نام جس تھالی میں کھاتے ہیں، اسی میں چھید کرتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ ایک رسمی پر تکلف خطبے میں وہ ایک زندہ شخص کا نام لے کر اس لہجے میں ذاتیات پر اتر آئے۔ کسی رسالہ کا مناظرانہ مضمون ہوتا تو دوسری بات تھی۔ مجھے اپنی صفائی میں اپنی فات اسفل اوقات پر لکھ کر قارئین کی بصر خراشی کرنی ہوگی۔"

اور ڈاکٹر محمد حسن نے "ورود مسعود" پر اپنے تاثرات کا اظہار اسی عصری ادب میں اس طرح کیا ہے۔ !

مسعود حسین خاں اردو میں ماہر لسانیات سمجھے جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ انھوں نے اپنی سوانح حیات کا نام ایسا منتخب کیا جو لسانیات کیا معمولی زبان دانی سے بھی ناواقفیت ظاہر کرتا ہے۔ اپنے بارے میں ورود مسعود کہنا کچھ ایسا ہے جیسا کوئی اپنے لیے نزول اجلال کے الفاظ استعمال کرے یا عرض کرنے کے بجائے فرمایا کہنے لگے

کسی نے کہا کہ چھوٹے ذہن، شخصیات کے دائرے میں سوچتے ہیں۔ ان سے بڑے ذہن، مسائل کے دائرے میں اور عظیم ترین تصورات کے دائرے میں۔

"ورود مسعود" کا دائرہ چھوٹے ذہن والا دائرہ چھوٹے ذہن والا دائرہ ہے اور مصنف نے آپ بیتی کو دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے زیادہ استعمال کیا ہے....."

اور ـــــــ :

"ورود مسعود" میں دوسرے حضرات کے بارے میں بھی بہت کچھ غلط بیانیاں اور کچھ نشتر زنی بھی ہے۔ سرور صاحب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ صحیح نہیں..... "گیان چند جین صاحب کے بارے میں بھی غلط بیانیاں ہیں....."

"ورود مسعود" پر ہی پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب نے اپنے رسالہ نقد و نظر (دسمبر ۱۹۸۸ء) میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"یہاں اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ مقصود نہیں کہ اس میں بہت سی کفتنی باتیں معرض بحث میں آ گئی ہیں۔ جن پر اظہار

رائے نہ مناسب ہے اور نہ ضروری۔ البتہ جو بات سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں IMPERSONALITY کی شدید حد تک کمی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ شاید ہی کوئی خوش نصیب انسان ایسا ہوگا جس کا ذکر مصنف نے تحقیر کے ساتھ یا کم از کم کدورت و کراہیت کے ساتھ نہ کیا ہو۔"

اور اس تحریر کا اختتام اس طرح ہوا ہے :

> "کتاب کا عنوان "ورودِ مسعود" بھی قاری کے حسِ مزاح کو اکساتا ہے۔ ایک صاحبِ نظر پڑھنے والے نے جب موصوف سے پُر اشتیاق لہجے میں یہ استفسار کیا کہ کیا یہ نام تاریخی ہے تو موصوف نے بڑی معصومانہ شد و مد کے ساتھ جواب دیا کہ نہیں تاریخی نہیں، واقعی ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا شاید غیر ضروری نہ سمجھا جائے کہ موصوف کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے سگے بھتیجے ہیں جو ان کے لیے مثل شجرِ سایہ دار کے تھے جس کے نیچے خاں صاحب عمر بھر مامون و مصئون اور شاداں و فرحاں رہے۔"

پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب کے اس تبصرہ کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر مسعود حسین خاں صاحب نے نذرِ مسعود میں تحریر کیا ہے :

> "علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے سابق "تیشہ در" ــ اسلوب احمد انصاری نے ــــ اپنی معروف زمانہ خبثِ باطنی کا ثبوت دیتے ہوئے "ورودِ مسعود" کو ڈھنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ میں عام طور پر کم اور کج فہموں کا جواب خاموشی سے دینا پسند کرتا ہوں، لیکن چونکہ تصنیفِ مذکور اب کمیاب بلکہ نایاب ہوگئی ہے اس لیے مبادا قارئین کی رسائی اس تک نہ ہوسکے اور وہ اسلوب احمد انصاری صاحب کی رکاکت اور دریدہ دہنی (یہ الفاظ موصوف نے تبصرے میں میرے لیے استعمال کیے ہیں) تک محدود ہو کر رہ جائیں بعض دوستوں کے اصرار پر مناسب سمجھا۔
>
> کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند"

اور ان دونوں کتابوں "ورودِ مسعود" "نذرِ مسعود" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے خامہ بگوش (مشفق خواجہ) نے "سخن در سخن" میں نہایت صاف صاف لکھا ہے کہ :

> "ورودِ مسعود" میں ڈاکٹر گیان چند جین کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا، بلکہ کسی حد تک ان کی تحقیر کی گئی ہے ــــ"

آگے یہ بھی تحریر ہے :

> "نذرِ مسعود" میں ان (پروفیسر مسعود حسین خاں) کی تازہ تحریر شامل ہے جس میں انھوں نے پروفیسر اسلوب احمد انصاری کی "مزاج پرسی" کی ہے۔ پروفیسر صاحب کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے اپنے رسالے "نقد و نظر" (علی گڑھ) میں ورودِ مسعود پر ایک نامسعود تبصرہ لکھا تھا۔"

البتہ مشفق خواجہ صاحب نے ان دونوں تحریروں کے بارے میں اپنی رائے محفوظ کرلی ہے لیکن ڈاکٹر خلیق انجم نے "نذرِ مسعود" پر تبصرہ کرتے ہوئے نہایت جرأت مندی سے کام لیا ہے اور حرفِ حق کے اظہار میں تامل کی راہ اختیار نہیں کی۔ انھوں نے نہایت بے باکی سے اپنی یہ صائب رائے پیش کی :

> "آخر میں ضمیمہ "ورودِ مسعود" کے عنوان سے مسعود صاحب کا ایک مقالہ ہے، پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے ششماہی "نقد و نظر" دسمبر ۱۹۸۸ء کے شمارے میں مسعود صاحب کی خود نوشت سوانح "ورودِ مسعود" پر تبصرہ کیا تھا۔ تبصرہ میں بہت سی نامناسب اور نازیبا باتیں کی تھیں۔ مسعود صاحب نے اس مقالے میں انھیں باتوں کا جواب دیا ہے۔ یہ مضمون مسعود صاحب جیسے عالم اور قابلِ احترام شخصیت کے شایانِ شان نہیں۔ اگر اس کتاب میں یہ مقالہ شامل نہ ہوتا تو بہتر تھا۔ بلکہ اگر یہ مقالہ لکھا ہی نہیں جاتا تو اور بہتر ہوتا۔" (ہماری زبان دہلی ۸ مارچ ۱۹۹۰ء)

یہاں بلاشبہ ڈاکٹر خلیق انجم نے نہ صرف ایک اچھے تبصرہ نگار کا حق ادا کیا ہے بلکہ اردو کے ایک بہی خواہ کا فرض بھی ادا کردیا ہے۔ میں انھیں اس جرأت مندانہ اظہار پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور انھیں کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے اس خیال کا اظہار کرتا ہوں کہ کاش ہمارے محترم اساتذہ پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر گیان چند جین اور ڈاکٹر محمد حسن اپنے مذکورہ بالا تبصرے نہ لکھتے تو بہت اچھا ہوتا اور محترم مسعود حسین

(باقی صفحہ ۳۹ پر دیکھیے)

ستارہ جو سفر کا استعارہ تھا

انور زاہدی

میں نکلا تھا سفر میں جب
ستارہ آسماں پہ تھا درخشاں
اور ہوا تھی ہمسفر میری
مرے رستے میں
بحر و بر، فلک، کوہسار سب ہی تھے
مرے شوقِ سفر کا راہبر لیکن ستارہ تھا
وہ دریا کا کنارہ تھا
سفر میں مبتلا تھا میں
مرے بالوں میں تھی آوارگی کی گرد کی چاندی
مرے چہرے پہ شبنم عمر بھر کی داستانوں کی
سلگتے زرد پتے میرے ہاتھوں میں
مرے سانسوں میں خوشبو
—— گزرے وقتوں کی
سفر کی آخری منزل میں
استادہ تھا دریا کے کنارے پہ
ہوا نوخیز تھی
سر پہ سجا تھا آسماں کا سائباں
لیکن مری نظروں سے اوجھل تھا
—— ستارہ
جو مرے شوقِ سفر کا استعارہ تھا

● مکان نمبر ۱۱، گلی نمبر ۴۲، جی-۶/۴ اسلام آباد (پاکستان)

میں کیا کیا ہوں؟

عزیز اندوری

نہ جانے کب سے یہ خول میرے بدن پہ یوں ہی چڑھا ہوا ہے
تذبذب و بے مائیگی، نراشا، قدم قدم پہ مری سانسوں کو لے رہی ہے حساب کب سے؟
میں چاہتا ہوں کہ بھوگ کے اس کرم سے جلدی نجات پاؤں
کبھی میں پربت کی اونچی چوٹی پہ چھائے کہرے میں ڈوب جاؤں
کبھی سمٹ کر میں بے یقینی کا اک نقطہ قرار پاؤں ——
کبھی میں چاہوں کہ جنسیت کے عظیم بھوت ہر دشا سے مجھ پہ کچھ اس طرح سے ٹوٹ کے لپکیں کہ ڈھیر کر دیں
مرے بدن کو گلا کے رکھ دیں
کبھی میں ناقوس کی صدا پر "ہری" کی شکلوں میں ایسے گونجوں
کہ سارے عالم کا سیس میرے مقابل آکر جھکا ہوا ہو۔
کبھی اذاں کے پاک نغمے کچھ ایسے ہونٹوں پہ میرے بکھریں
کہ بے تحاشہ تمام عالم عقیدتوں کے سجود کر لے
کبھی میں جانگوں پہ شیر نر کے نقوش رنگیں بنا کے سوچوں
کہ سارا جنگل —— جہاں پہ لوگوں کی بھیڑ سی یہ لگی ہوئی ہے
جہاں پہ بھیڑ اور بکریوں کی طرح چلتے ہیں لاکھوں سایے
میں اس کا راجا بنا ہوا ہوں ——
کبھی میں اپنی جٹا کے بکھرے سے خشک تاروں سے اک رسن بنا کر
گلے کے چاروں طرف لپیٹوں
اور اتنی زوروں سے اس کو کھینچوں
کہ میری آنکھوں سے خون ٹپکے
کہ میری سانسوں سے میرے بے حس بدن کا رشتہ بھی ٹوٹ جائے
کہ میری سانسیں ——
تذبذب و بے مائیگی، نراشا کے روز و شب کے حساب سے
تنگ آچکی ہیں ——

● ۱۷، "آشیانہ" جونا رسالہ، اسٹریٹ نمبر ۱، اندور ۴۵۲۰۰۶

جوگندر پال

۲۴ منڈاکنی انکلیو، کالکاجی نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۹

خواب رو

قسط نمبر ۲

"میں ملک الموت کے ساتھ کیوں چل دیتی دیوانے مولوی صاحب!" اچھی بیگم جوشِ مسرت کے دباؤ سے تھک گئی تھی، تاہم بولتے ہوئے اسے چین بھی محسوس ہو رہا تھا۔ "بس اس لیے چل دی کہ اس نے مجھے بتایا چلو تمہارے دیوانے مولوی صاحب وہاں جاں بلب پڑے ہیں۔ میں گھبرا گئی اور جیسی تھی ویسی ہی اٹھ کر ننگے سر ننگے پاؤں اس کے ساتھ ہو لی۔ نا معلوم وہ مجھے کس کائنات میں لے آیا اور ـــــ اور یہ سوچ کر میرا کلیجہ منہ کو آنے لگا کہ میرے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور ـــــ اور پھر میں اسے چھوڑ کر وہاں سے جو الٹے پاؤں بھاگی تو پتہ نہیں کہاں کہاں بھٹکتی پھری۔ آپ کی تلاش میں مجھے اتنا بھی ہوش نہ تھا کہ میں مر چکی ہوں، اور جب ہوش آیا تو یہ دیکھ کر میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا کہ میں آپ کے سر پر زندہ کھڑی ہوں۔"

دیوانے مولوی صاحب نے اپنے پلنگ سے سٹے ہوئے پلنگ پر سوئی اچھی بیگم کی طرف دیکھا ہے اور اس کی طرف بے اختیار کھینچ کر اس سے لپٹ گئے ہیں۔ اچھی بیگم نے سوئے سوئے آنکھ کھولی ہے اور جیسے سپنے میں انھیں دیکھ کر مسکرا دی ہے اور پھر آنکھیں موند کر بدستور مسکرائے جا رہی ہے۔ انہوں نے اسے جگانا چاہا ہے مگر ہاتھ روک لیا ہے کہ سوئی رہے، کوئی بڑا میٹھا سپنا دیکھ رہی ہے۔

اچھی بیگم کو بھی دیوانے مولوی صاحب کی دیوانگی کے علاج پر یہی اعتراض تھا کہ کہیں ان کا میٹھا سپنا ٹوٹ نہ جائے، ٹوٹ گیا تو وہ بھی ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ جیسے میٹھے میٹھے سپنوں کے تُوں اپنے باپ دادا کے گھر اور شہر میں بیٹھے ہیں، آرام سے پڑے رہیں۔

"نہیں نواب مرزا" اس نے اپنے بڑے بیٹے کی بن نہ پڑنے دی جو اپنے ابّا کے ماؤف ذہن کا علاج کرنا چاہتا تھا۔ "اگر وہ اپنے اس پاگل پن ہی سے سنورے سنورے سے ہیں تو تمہارا کیا بگڑتا ہے؟"

"مگر امّی جان ــــ"

"نہیں بیٹے، یہ کوئی علاج نہیں کہ ہم انھیں بے گھر کر دیں۔" اچھی بیگم دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ "ان کا جھوٹ موٹ مجھے بھی اب سچ معلوم ہونے لگا ہے۔ ہمیں اور ہماری نسلوں کو اسی لکھنؤ ہی میں تو رہنا ہے، پھر اس لکھنؤ سے ہمارا واسطہ؟ ہماری آنکھیں اگر یہیں سے زمین کھود کر ہمارا ماضی دریافت کر لیتی ہیں تو برا کیا؟"

"مگر امّی جان، ڈاکٹر نے مجھے یقین دلایا ہے کہ علاج کے بعد وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"نہیں نواب بیٹے، ٹھیک ہو کر ان کی حالت بگڑ جائے گی۔"

اسی اثنا میں چاندنی بی نے اچھی بیگم کا پاندان تیار کر کے اس کے سامنے لا رکھا۔

"امّی جان، آپ پان میں تمباکو کھانا چھوڑ دیں۔ ڈاکٹر بھی کئی بار کہہ چکا ہے۔"

"اے بیٹی، ڈاکٹر کیا جانے؟ تمباکو کھانے کے لیے ہی تو پان کھاتی ہوں۔" وہ پھر نواب مرزا کی طرف متوجہ ہو گئی۔ "تمہارے ابّو آج مجھے بتا رہے تھے، بھئی حد ہو گئی بیگم۔ برسوں باہر رہ کے بعد کل جانے مجھے کیا سوجھی، میں رکشے میں بیٹھ کر کنہیا کی بھول بھلیوں کی طرف ہو لیا۔ جلیبیاں بڑی رغبت سے کھایا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا، سارا راستہ اس قدر بدل چکا تھا کہ کیا مجال، کہیں پرانے نشان کا چپہ بھر بھی دکھنے میں آ جائے۔ نئے بازاروں کے نئے نام، نئے لوگ ــ وہ کہنے لگے۔ بس ایک میں تھا جو پرانا تھا اور اپنے ہی شہر لکھنؤ میں بھولا بھٹک رہا تھا اور کنہیا کی بھول بھلیوں کو بے سود ڈھونڈے جا رہا تھا۔" اچھی بیگم پاندان سے پتہ نکال کر اپنے لیے پان تیار کرنے لگی۔

"آپ کو میری قسم، امی جان" نواب مرزا نے اچھی بیگم کو ٹوکا۔

"اتنا تو کیجیے کہ کم پان کھایا کریں۔"

"ہاں، کوشش کر دیکھوں گی۔" اچھی بیگم نے جواب دیا۔ "مگر پہلے تم اپنے ابو کی سن لو۔ انہیں یہ سوچ کر بڑی الجھن ہو رہی تھی کہ بھول بھلیاں گئیں کہاں۔ بارے میرے اس جواب پر اُن کی تسلّی ہوئی کہ لکھنؤ کے اطراف کے بین نقش جو بدل چکے ہیں۔ ممکن ہے بھول بھلیاں اُسی مقام پر ہوں جہاں وہ بھٹک رہے تھے۔ ہاں، ورنہ وہ بھٹکتے کیوں؟۔"

نواب مرزا نے وہاں سے اٹھتے ہوئے ایک دفعہ پھر کہا۔ "میری دانیں امّی جان، میں انھیں علاج کے لیے لے جاؤں گا۔

"نہیں، بیٹا، کہہ دیا نا، اپنے سپنوں سے باہر آ کے ان کے لیے جینا اجیرن ہو جائے گا۔"

دیوانے مولوی صاحب اپنی خوابیدہ بیوی کے چہرے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں جو ابھی ابھی سوتے میں ذرا سی ہل جل کر ان کی طرف دیکھ کے مسکرا دی تھی۔ اس کی مسکراہٹ ویسے ہی اس کے ہونٹوں پر پڑاؤ ڈالے دیوانے مولوی صاحب کی طرف سر اٹھائے ہوئے ہے اور پتہ نہیں چل رہا کہ ان دونوں میں سے کون جاگ رہا ہے اور کون سو رہا ہے۔ نہیں، جو جاگ رہا ہے وہی سویا ہوا بھی ہے اور جاگ بھی رہا ہے اور اپنے بے صدا احساس کی تاب نہ لا کر گنگنانے لگا ہے۔ آپی کنواں آپی پنہارن آپی گاگر۔ ری آپی گاگر۔ احمد پیا کی گاگر بھر لائی رے۔ بھر لائی رے۔

گنگناتے گنگناتے دیوانے مولوی صاحب کمرے کے دروازے کو چیں چیں کر کے کھلتا اور وہاں اپنی سہ سالہ پوتی ثریا کو کھڑیاں پا کر ہڑبڑا کے کھڑے ہو گئے ہیں اور اسے سرعت سے اٹھا لائے ہیں اور پلنگ پر لٹا کر پوچھا ہے۔ "ہماری ثری بیٹی اتنی جلدی کیوں جاگ پڑی ہے۔؟"

"آنکھ کھل گئی ہے، بڑے ابو۔" ثری چپ ہو کر یوں نظر آنے لگی ہے جیسے اسے رونا آتا ہی نہ ہو۔

"آنکھ کھلنے کو تو ساری عمر پڑی ہے ثری بیٹی۔" دیوانے مولوی صاحب ذرا مارک کر اپنے جملے کی معنویت پر غور کر کے بڑے خوش ہوتے ہیں۔ "ابھی بہت سویرا ہے بیٹیا، سو جاؤ۔" انہوں نے اسے چھاتی تک چادر میں لپیٹ دیا ہے۔

"نہیں بڑے ابو، میں نہیں سوؤں گی۔" ثری نے ٹانگیں ہلا کر چادر اُتار دی ہے۔ "بڑے ابو، دادی اماں بہت بُری ہیں۔"

"نہیں ثری" دیوانے مولوی صاحب نے اس پر پھر چادر ڈال دی ہے۔ "تمہاری دادی امّاں بہت اچھی ہیں۔"

"نہیں بڑے ابو، رات کو میں یہیں سوئی تھی۔ وہ مجھے امّی کے کمرے میں کیوں ڈال آئیں؟"

"تو کیا ہوا؟" انہوں نے اچھی بیگم کے ساتھ جوڑ کر لٹا دیا ہے۔ "تو اب پھر اپنی دادی امّاں کے ساتھ سو جاؤ۔"

"دادی امّاں!۔ دادی امّاں!" بچی نے اچھی بیگم کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ "میں آ گئی ہوں دادی امّاں۔"

اچھی بیگم نے سوتے جاگتے اس کی طرف دیکھا ہے۔ "پھر یہاں چلی آئیں؟"

"ہاں، دادی امّاں، میں یہیں سوؤں گی۔"

"ہاں، سو جاؤ۔"

"نہیں دادی امّاں، مجھے نیند نہیں آ رہی۔" ثری نے اپنی دادی امّاں کو گدگدایا ہے۔ "آپ بھی نہ سوئیں۔"

"نہیں، بیٹی۔" دیوانے مولوی صاحب ثری کو سمجھانے لگے ہیں۔ "ابھی تھوڑی دیر اور سو لو۔"

"پھر آپ کیوں جاگ رہے ہیں بڑے ابو؟" اس نے ایک بار پھر اچھی بیگم کے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔

"مجھے نیند نہیں آ رہی، بیٹی۔"

"مجھے بھی نیند نہیں آ رہی ہے بڑے ابو۔"

"اچھا بابا، لو، ہم بھی سو جاتے ہیں۔" وہ اس کی طرف منہ کر کے لیٹ گئے ہیں۔ "تم بھی سو جاؤ۔"

"نہیں بڑے ابو۔"

"سو جاؤ بیٹی۔" اچھی بیگم نے بھی پھر آنکھیں کھول کر اس کی طرف پہلو بدل لیا ہے۔ "اپنی آنکھیں بند کر لو۔ میں تمہیں لوری سناتی ہوں۔"

ثری نے لیٹے لیٹے تال بجائی ہے۔ "ہاں، دادی اماں، تم لوری سناؤ، پھر میں ضرور سو جاؤں گی۔"

اچھی بیگم آنکھیں موند کر لوری گانے لگی ہے۔

اللہ اللہ اللہ ہو

اللہ ہو اللہ ہو

جھجو جھو، جھجو جھو

جھجو جھو، جھجو جھو۔ اللہ اللہ اللہ ہو

اور لوری گاتے ہوئے اسے معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ ثری کی بجائے دیوانے مولوی صاحب کا سر تھپتھپائے جا رہا ہے۔

(ب)

نواب مرزا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پکنک پر نکل رہا ہے۔ جب باورچی نے ڈرائنگ روم میں آکر اطلاع دی ہے کہ سارا سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا ہے تو دیوانے مولوی صاحب نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا ہے۔ "نواب میاں، ذرا دھیان سے جائیو۔ زمانہ خراب ہے۔" پھر وہ اپنی بات پر ہنس دیے ہیں۔ "ہمارے وقتوں میں بھی ابا حضور یہی کہا کرتے تھے بھئی۔ زمانہ آئی بری شے ہے کہ کبھی اچھا ہونے میں نہیں آیا۔"

"نہیں، ابّو۔" نواب مرزا بھی اپنی بیوی کو اٹھتے ہوئے پاکر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ "آپ کے زمانے میں تو ہر کس و ناکس اچھا بننا چاہتا تھا۔" پھر اس نے چپکے سے اضافہ کیا ہے۔ "شاید اسی لیے خواص چوری چوری برائی کو ترجیح دیتے تھے۔"

"بھئی کیا خوب، نواب نواب!" دیوانے مولوی صاحب نے قہقہہ بلند کیا ہے۔

"آداب عرض ہے!" نواب مرزا اپنے ابّو کا شکریہ بجالایا ہے۔

"نواب میاں، گاڑی تیز نہیں چلانا۔" اچھی بیگم نے اپنے بیٹے کو ہدایت کی ہے۔

"آپ گھبرائیے نہیں، امّی جان، ہماری گاڑی پچاس پچپن سے اوپر جاتے ہی کھڑی ہو جاتی ہے۔"

"ارے بیٹے میاں۔" دیوانے مولوی صاحب سے پھر نہیں رہا گیا ہے۔ "تم اپنی امّی جان کی بات کر رہے ہو، یا گاڑی کی؟"

"آپ کی منہ شگافیاں بہت ہو لیں، دیوانے مولوی صاحب۔" اچھی بیگم نے سر جھٹک دیا ہے۔ "جاؤ بیٹے، گاڑی میں بچے انتظار کر رہے ہیں۔"

چاند بی بی اور نواب مرزا کو کمرے سے باہر نکلتے ہوئے پاکر دیوانے مولوی صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ "آؤ، اچھی بیگم، ہم ذرا باغ میں بیٹھتے ہیں۔"

"آپ چلیے۔ میں تھوڑی دیر میں کام سنبھال کر آتی ہوں۔"

نواب محل کی عمارت کے پیچھے تین سیڑھیاں نیچے ایک بہت بڑا باغ ہے۔ دیوانے مولوی صاحب باغ میں جانے کے لیے محل کی پشت کے دروازے کی طرف ہولیے ہیں۔ دروازے کے باہر برآمدہ ہے اور برآمدے سے کوئی دس پندرہ ہاتھ پر ایک نہایت وسیع دوب کے تختے کے کونے میں کئی رنگوں کے گلاب اُگے ہوئے ہیں۔ دیوانے مولوی صاحب جب دروازے کے باہر قدم رکھتے ہیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ یہ کھلے کھلے پیلے، گلابی، سرخ اور سپید گلاب شادمانی سے چلّاتے ہوئے ان کی جانب دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ دیوانے مولوی صاحب بھی ان کی طرف تیز گام چلنے لگے ہیں۔

"ہاں، ہاں بھئی، میں آ تو گیا ہوں۔" وہ بھی ان کے جھرمٹ میں مسرت سے تمتما اٹھے ہیں۔ "بے صبر کیوں ہو رہے ہو؟ اپنی شاخوں پر اس طرح اچھلوگے تو ٹوٹ جاؤگے۔"

"دیوانے مولوی صاحب، آپ کل کیوں نہیں آئے؟" ایک بہت بڑا سرخ گلاب شکایت کرتے ہوئے اور سرخ ہو گیا ہے۔ "میری پتّیاں کل ہی گرنا چاہ رہی تھیں۔ میں نے ان کی بہت منت سماجت کی، اری نیک بختو، ہمارے مولوی صاحب کو بھی ہماری بہار دیکھ لینے دو۔"

دیوانے مولوی صاحب نے چاہا ہے کہ اسے چھو کر پیار کریں، مگر ان کی چھونے کی خواہش ہی سے دو تین پتّیاں نیچے گر گئی ہیں اور انہوں نے اسے جی ہی جی میں چوم لیا ہے۔ "جیتے رہو!"

"ہمیں لمبی عمر کی دعا کیوں دیتے ہیں مولوی صاحب؟" ایک اور پھول بول اٹھا ہے۔ "آپ جانتے ہیں ہم چند روزہ جیو ہیں۔"

"نہیں پیارے، تم تو ہمیشہ آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہو۔ اِس شاخ سے اس لیے غائب ہو جاتے ہو کہ اُس پر نظر آنے لگو۔"

دیوانے مولوی صاحب سے چند گھڑیاں ہمکلام رہے ہیں اور پھر انہیں لگا ہے کہ یہ رنگ برنگے پالے تھک سے گئے ہیں۔ جن کے منہ نہ ہوں اور جو فطرتاً خاموشی سے مہکنے کے لیے پیدا ہوئے ہوں، وہ بولیں تو اپنے سارے وجود سے بولتے ہیں اور جھٹ تھک کر چور ہو جاتے ہیں۔ دیوانے مولوی صاحب نے انہیں باتیں کرتے کرتے نیند کی آغوش میں گرتے دیکھا ہے اور شفقت سے سر ہلاتے ہوئے وہ چپکے سے وہاں سے سرک گئے ہیں اور طویل و عریض لان کے دوسرے کنارے کی طرف رُخ کر لیا ہے جہاں نواب محل کی باہری چہار دیواری کے اندر ہی ایک گوشے میں ایک بہت پیارا سا تالاب بنا ہوا ہے۔

بارش ہو یا سوکھا، یہ تالاب سدا پانی سے بھرا رہتا ہے اور اس کے گرد و پیش بھانت بھانت کے پرندے چہچہاتے رہتے ہیں۔ لان کی ہری بھری گھاس اتنی نرم ہے کہ اسے جوتوں تلے کچلنا انھیں بری معلوم ہونے لگا ہے، اس لیے انھوں نے ذرا تھم کر جوتے اتارے ہیں اور انھیں جھولے میں ڈال لیا ہے جسے وہ اپنے لباس کا حصہ سمجھ کر کندھے پر لٹکائے رکھتے ہیں، اور پھر وہ گج قدم چلنے لگے ہیں، آنکھوں پر زور ڈال ڈال کر نیچے دیکھتے ہوئے، کہ کوئی انجان کیڑا پاؤں تلے نہ آجائے۔

اس وقت اچانک ان کی نظر میں ایک بھولا بسرا نہایت بوڑھا اور ...

(باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھیے)

عتیق اللہ

اس لمحے

اس لمحے
کہ تم میرے ساتھ ہو
خدا میرے نزدیک ہے
میں اس کے قدموں پر سر رکھ دیتا ہوں
اپنی کمیوں، بدنصیبیوں اور بیوقوفیوں کو بھول کر
اس کے شفقت بھرے ہاتھوں کا لمس
اپنی پیٹھ پر محسوس کرتا ہوں

دیکھتے دیکھتے
ہرا بھرا درخت بن جاتا ہوں

جیسے
میں ایک نہیں کئی اشیا میں بدل گیا ہوں
چھوٹے سے چھوٹے ذرے میں
کائنات کی کائنات سرسراتی ہے
تمام رستے
مجھے اپنی طرف آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں
لگتا ہے
تھوڑی دیر کے لیے زمین رک گئی ہے
لوگوں نے
اپنی نفرتیں
اپنی جیبوں میں بھر لی ہیں
اور مجھے
خوش آمدید کہہ رہے ہیں ■

تمہارے عقب میں

مجھے تمہارے عقب میں
اپنی ماں کی شفقت بھری گود یاد آرہی ہے
کیا تم بھی
مجھے اپنے جسم سے جھٹک کر دور پھینک دوگی ؟
تمہارا لمس کچھ بول رہا ہے
جیسے ایک نئی زبان کی تخلیق ہو رہی ہے
یا ہونے والی ہے
آنکھ سے تتلاتے ہوئے لفظ پھوٹ رہے ہیں
میں سر سے پاؤں تک ایک سنہرے خواب میں نہلا دیا گیا ہوں
تو کیا پھر وہی
کھردرے تنوں والے کھجور کے پیڑ
ہاتھ اٹھائے میرے راستے پر کھڑے ہوں گے

تو کیا پھر وہی
وحشی بھینسے
نتھنے پھیلائے مجھے بیدردی سے اچھالتے ہوئے
آگے نکل جائیں گے

تو کیا پھر اسی طرح
چقماق کے پرزوں سے لویں پھوٹیں گی
اور ــــ میرے جسم کو جگہ جگہ سے جھلس دیں گی ؟

یا
میں پھر چھلنی چھلنی کر دیا جاؤں گا
اس عظیم کائنات کے دھڑ سے لٹکے ہوئے
ہم بالشتیوں کے برابر انسان
کتنے مجبور ہیں

ایک دوسرے سے
کتنے غیر متعلق ہیں ؟ ■

● اے جی - ۶۵ و، شالیمار باغ، نئی دہلی - ۳۳

آمنہ ابوالحسن

ڈی - ۱۰۵، گراؤنڈ فلور، کرزن روڈ اپارٹمینٹ، کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی۔۱

پَرتَو

"بڑی ماں۔ بڑی ماں۔ آجایئے۔ چھوٹی ماں آپ کو یاد کر رہی ہیں۔"

"آتی ہوں ابھی۔ پانچ منٹ میں۔" فرح نے کہا۔

ان پانچ منٹوں میں اندر جاکر کام نپٹانے کی بجائے روزی برابر کواڑ پکڑے کھڑی رہی اور خاصی بے چین رہی۔ پھر جیسے ہی فرح آئی روزی نے بلا تاخیر دریافت کیا۔

"اتنی دیر لگا دی آپ نے۔ کیا کر رہی تھیں وہاں؟"

"میں کھانا کھا رہی تھی روزی۔"

"کھانا ــــ؟ توبہ توبہ ــــ!!" روزی نے حقارت سے کہا۔ اور اپنے رخسار پیٹے۔

"آپ کو وہاں کھانا نہیں کھانا چاہیئے تھا بڑی ماں۔"

"کیوں بھئی؟" حیران ہو کر فرح نے پوچھا۔

"اس لئے کہ آپ مسلمان اور وہ لوگ ہندو۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟" فرح نے بھولپن سے کہا۔

"اس سے گناہ ہوتا ہے بڑی ماں۔ اب ممی آکر کتنا خفا ہونگی دیکھ لینا۔" روزی نے پورے یقین سے کہا۔

"مگر میں کیا کرتی روزی۔ اُن لوگوں نے اتنے پیار سے روکا اتنا اصرار کیا کہ انکار کرنا اچھا نہیں لگا مجھے۔"

"یہی تو گڑبڑ ہے ساری۔ پیار کی آڑ لے کر لوگ تمام کام کر جاتے ہیں۔"

"مطلب ــــ؟"

"مطلب یہی کہ آپ نے اپنا مذہب میلا کر لیا بڑی ماں۔ آپ کچھ بھی کہہ کر ٹال سکتی تھیں اُنہیں۔ کوئی بھی بہانہ بنا سکتی تھیں۔"

"بہانہ ــــ؟ مگر کیوں۔ کس لئے؟ کیا بہانہ بنانا اچھا لگتا روزی ــــ؟"

"لگے نہ لگے بڑی ماں لیکن آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔"

"چپ کرو روزی، اگر امی خفا ہونگی تو میں منا لونگی انھیں مگر خدا کے لئے اب تم کچھ مت بولو۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" کچھ کہتے کہتے روزی نے اپنا منہ بند کر لیا۔ "میں اپنا کام دیکھوں گی اب، آپ چھوٹی ماں کے ساتھ کھیلئے تب تک۔"

جب روزی جانے لگی تو فرح نے زبان نکال کر اسکی پیٹھ کو چڑھائی اور کھینچ کر بولی: "آپ چھوٹی ماں کے ساتھ کھیلئے ...... اونھ ــــ!"

ادھر کام کرتے کرتے روزی ان تمام سوالات کے جوابات اپنے ذہن میں اکٹھے کرنے لگی جو اس ناگاہ صورتحال پر میم صاحب کی طرف سے متوقع تھے۔ اگر میم صاحب یہ کہیں گی تو وہ یہ کہے گی۔ اگر میم صاحب اس طرح پوچھیں گی تو وہ یوں جواب دیگی، وغیرہ وغیرہ۔ سوال و جواب کی ایک لمبی فہرست اس کے ذہن میں پوری طرح مرتب تھی۔ اس خوف کے ساتھ ساتھ کہ جواب دہ تو وہی ہے۔ اب اگر بڑی ماں نے وہاں کھانا کھایا تو میم صاحب تو اُسی کو پوچھینگی اور کہیں گی۔ فرح تو بچی ہے ابھی۔ تم کیا کرتی رہیں۔ گھر کو ٹھیک آفتر کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اُس کے نتائج و عواقب پر توجہ دی جائے۔ کام کرتے کرتے روزی بظاہر اپنے اگلے بالوں میں گھنگھر پیدا کرنے کے لئے مختلف طریقوں پر غور کرتی جا رہی تھی مگر بہ باطن ایک ہی خوف اسے پریشان کر رہا تھا کہ ہندوؤں کے گھر ان کا بنایا ہوا کھانا کھانے سے مسلمان مذہب کسی نہ کسی حد تک ضرور آلودہ ہو گیا ہوگا اور مذہب کے معاملے میں روزی بڑی کٹر تھی۔

ہر صبح جاگ کر بستر سے اُترے بغیر اپنے دائیں ہاتھ کی پہلی اُنگلی سے اپنے سینے پر صلیب بناتی پھر غسل خانے سے نہا دھو کر یسوع مسیح کی تصویر کے آگے دلی عقیدت سے نئی کینڈل جلاتی۔ ہمہ وقت جلتے ہوئے چراغ کو خوب تیل پلاتی، تب خوشبودار اگر بتیاں سُلگا کر پورے احترام و اعتقاد سے تصویر کے چوکھٹے کو بوسہ دیتی۔ اُس سے اپنا ماتھا چھواتی تب پورے دھیان سے مختلف دُعائیں پڑھتی جن میں نجات کی دعا اور تمام دعاؤں پر حاوی ہوتی۔ اس کے بعد ہی وہ دن بھر کے دوسرے کام شروع کرتی۔

بڑی ماں ــــ!

چھوٹی ماں ــــ!!

جاگئے جاگئے۔

وہ دونوں کو پیار سے جگاتی۔

"چائے تیار ہے۔ اُٹھ جائیے اب۔"

دونوں لڑکیاں ذرا سی آنا کانی کے بعد اُٹھتیں۔

"صبح بخیر روزی!"

"صبح بخیر ــــ"

روزی دونوں کی پیشانی چومتی۔ دونوں کو گرم گرم چائے کے پیالے تھماتی، ساتھ ہی حکم صادر کرتی۔

"چائے ختم ہوتے ہی غسل خانے چلئے۔ سب چیز تیار ہے بالکل۔"

اور جب تک لڑکیاں حمام کرتیں روزی صاحب اور میم صاحب کو چائے پہونچاتی۔ چائے کے ساتھ اخبار اور ڈاک لے جاتی۔

بچیاں نہا دھو کر ناشتے کی میز پر آتیں تو صاحب کے لئے غسل خانہ خالی ہو جاتا تب تک صاحب کا اخبار بھی ختم ہو جاتا اور وہ اپنی تازہ ڈاک بھی دیکھ لیتے۔

نہانے سے پہلے بھی میم صاحب کا چہرہ چڑھتے سورج کی طرح لَو دیتا ہوتا۔ پھر اسی لَو کی چھوٹ روزی کو بڑی ماں اور چھوٹی ماں کے چہروں پر نظر آتی۔ جانے کیسی روشنی تھی یہ ــــ؟

ہر رات اپنے سرونٹ کوارٹر لوٹ کر روزی آنکھیں پھیلا پھیلا کر اپنے چہرے کو تکتی مگر کسی دن، کسی رات، کسی روز کبھی وہ جوت، وہ تیج، وہ نکھار اسے اپنے چہرے پر ہرگز نظر نہ آیا، جب بچیاں اسکول سے لوٹ کر تھوڑے آرام کے بعد ممی پاپا کے ساتھ شام کی سیر کو جاتیں تو روزی جلدی جلدی میم صاحب کا ڈریسنگ کیبنیٹ ٹٹولتی۔ وہاں اسے میک اپ کی ہر چیز مل جاتی مگر کہیں وہ خاص چیز نظر نہ آتی، جو اُس کی دانست میں چہرے پر روشنی پیدا کرنے کی ذمہ دار تھی۔ کاجل، لپ اسٹک، پاوڈر، کریم، پرفیوم، یہ سب چیزیں تو بڑی کامن تھیں۔ اور تقریباً آج کی ہر ماڈرن عورت ان کا استعمال ضرور کرتی تھی مگر ہر ایک کے چہرے پر وہ دلآویز دمک تو نہیں تھی جو خاص طور پر اس کی میم صاحب سے وابستہ تھی۔ لہٰذا شام کے ٹیوشن کے بعد جب ماسٹر صاحب چلے جاتے تو رات کا کھانا کھلاتے کھلاتے روزی بڑی واضح اور ترغیب بھری آواز میں سُناتی۔

"آج شکر قندی کی کھیر بنی ہے بڑی ماں۔ آپ کو بہت پسند ہے نا ــــ؟"

"سچ روزی؟"۔ فرح خوش جاتی۔

"اور چاکلیٹ کیک بھی تو لائے ہیں ممی پاپا۔"

"چھوٹی ماں سُن رہی ہیں آپ ــــ؟"

کھاتے کھاتے ہاتھ روک کر اپنی چمکدار نظریں پلیٹ سے ہٹا کر صباحت دلار سے روزی کو دیکھتی۔

"چاکلیٹ کیک لائے ہیں ممی پاپا ــــ؟ کھانے کے بعد بطور سویٹ ڈش مجھے چاکلیٹ کیک ہی دو گی نا روزی آج ــــ؟"

"دونگی دونگی لیکن ایک بات بتائیے پہلے۔"

"کونسی بات پوچھنا روزی۔ پوچھونا ــــ"

اگرچہ آس پاس کوئی نہ ہوتا تب بھی روزی پوری رازداری سے ممکنہ آہستگی سے پوچھتی۔

"یہ بتائیے آپ دونوں رات میں کیا چیز منھ پر لگا کر سوتی ہیں؟"

"منھ پر ــــ؟ کچھ تو نہیں روزی۔"

"یاد کیجئے۔ اچھی طرح یاد کیجئے ذرا ــــ"

"کچھ بھی تو نہیں روزی۔" دونوں یقین دلاتیں۔

"تب ــــ؟"

"تب کیا روزی؟"

"تو کیا آپ کے چہروں پر روشنی ایسے ہی پھیل جاتی ہے ــــ اپنے آپ ــــ؟"

"روشنی ــــ؟ کیسی روشنی ــــ؟" دونوں بہنیں حیران ہوتیں۔

روزی اُداس ہو جاتی۔ اُسے یہ جواب سراسر جھوٹا لگتا کہ یہ ماں

بیٹیاں اپنے چہروں پر روشنی والا کوئی کریم نہیں لگاتیں۔ پوری بے دلی سے وہ چاکلیٹ کیک کا ایک مناسب ٹکڑا خوبصورت طشتری میں رکھ کر چھوٹی ماں کے آگے رکھ دیتی اور سنہری کنارے والے پیالے میں شکر قندی کی کھیر بڑی ماں کی طرف بڑھا کر گم صم کھڑی ہو جاتی۔

"مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟ تمہیں کریم چاہیئے کیا روزی ۔؟" فرح پوچھتی۔

"ہے آپ کے پاس ۔؟"

میرے پاس تو نہیں ہے مگر ممی والی لا دوں گی جو وہ پارٹی میں جاتے وقت لگاتی ہیں۔" فرح یقین دلاتی۔

"کیا وہی جو ڈریسنگ کیبنٹ پر رکھی ہے؟"

"وہی تو"

روزی کو زبردست مایوسی ہوئی۔ وہ کریم تو اُس نے اکثر اپنے مُنہ پر ملی تھی۔ جب جب موقع ملا تب مگر یہ ہرگز وہ چیز نہیں تھی جس کا روشنی سے رشتہ ہو ـــــ اور جھوٹے برتن سمیٹتے سمیٹتے روزی سوچتی آخر کس طرح اپنے چہرے پر میم صاحب جیسا تبسم پیدا کرے۔ اس کی تو کوئی بھی کوشش بارآور نہیں ہو رہی ہے۔

تو اُس دن بھی جب بڑی ماں چھوٹی ماں کو کھیلتا ہوا چھوڑ کر روزی کام میں لگی ہوئی تھی میم صاحب کے آنے پر گھبرا گھبرا کر چھپنے لگی۔

"روزی ـــ!" میم صاحب نے گھر میں داخل ہوتے ہی حسبِ عادت اُسے پکارا مگر روزی ندارد تھی۔

"کہاں ہو روزی ـــ؟" میم صاحب نے پھر آواز دی۔ اس بار فرح اور صبا دوڑتی ہوئی آئیں۔

"کیا روزی کہیں گئی ہوئی ہے ـــ؟" اس نے ان سے پوچھا۔

"نہیں تو ممی۔ گھر پر ہی ہے"

"پھر آتی کیوں نہیں۔ کیا کر رہی ہے؟"

"روزی!"

"روزی!!"

فرح صبا نے زور زور سے آوازیں دیں۔ سہمی سہمی گھبرائی گھبرائی سی روزی آئی چوروں جیسی ـــــ

"کیا بات ہے روزی کیا آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"ٹھیک تو ہے میم صاحب"

"پھر ـــ؟ کسی نے کچھ کہا تمہیں ـــ؟ فرح یا صبا نے ستایا ہو کیا ـــ؟"

"جی نہیں۔"

"تو ـــــ؟"

اور اس سے قبل کہ میم صاحب آگے کچھ اور پوچھتیں یا کہتیں روزی جھپاک سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

فرح نے سوچا اسے سچ چھپانا نہیں چاہیئے تمام بات صاف صاف ممی کو بتا دینی چاہیئے۔ چنانچہ وہ بولی۔ ممی!....

بڑی کوشش سے جو آواز اس کے گلے سے نکلی تھی پھنس پھنس گئی۔

"کیا بات ہے فرح۔ کیا ہوا ـــ؟ ممی نے غور سے اُسے دیکھا۔

"سوری ممی۔ بھول ہو گئی ہم سے مگر آئندہ کبھی نہیں ہوگی۔" فرح نے شرمندگی سے کہا۔

"ہوا کیا مگر ـــــ؟" ممی نے نرمی سے پوچھا

روزی دروازے کی اوٹ میں کھڑی بار بار اپنے سینے پر صلیب بنا بنا کر بدبداتی رہی۔ مرسی جیزس ـــ مرسی....... (MERCY JESIES ـــ MERCY)۔

"اُن لوگوں نے ہمیں زبردستی روک لیا ممی۔ ہم نے تو بہت منع کیا مگر وہ مانے ہی نہیں۔ اپنے ساتھ ہمیں بھی چاول اور سبزی کھلا دی۔"

"کون لوگ فرح ـــــ؟"

"اپنے بازو والے پڑوسی ممی۔ آنٹی شکلا اور اُن کے بچے۔"

"اچھا ـــ تو پھر کیا ہوا؟"

"کیا، کچھ بھی نہیں ہوا ممی ـــ؟ ہم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی؟"

"نہیں بیٹی۔ تم نے تو دوستی کو مضبوط کیا ہے بلکہ"

"لیکن روزی تو کہتی تھی اُن کا بنایا ہوا کھانا کھا کر اپنا مذہب میلا کر لیا ہے ہم نے۔"

"قطعی نہیں۔ بے وقوف ہے روزی تو۔ اسی لئے گھبرا رہی تھی آج۔ بلاؤ اسے!"

روزی جو دروازے کی اوٹ سے میم صاحب کا کہا سُن رہی تھی دل ہی دل میں بولی ہیلپ جیزس ـــ ہیلپ ـــ (HELP)۔ اور جھٹ پٹ سینے پر صلیب بنا کر میم صاحب کے سامنے حاضر ہوئی۔ ابھی چند منٹ پہلے کی مری مری ڈری ڈری روزی کی جگہ سنبھلی ہوئی روزی۔ وہ اپنی صفائی پیش کرنا ہی چاہتی تھی کہ میم صاحب بولیں۔

"نہیں۔ غلط بات روزی۔ ایسا نہیں سوچتے۔ ایسا نہیں کہتے کسی سے۔ سب سے پیار کرنا، سب کی عزت کرنا، اور بچوں کو بھی یہی سکھلانا۔ مل جل کر رہنے کی بڑی طاقت، بڑی مسرت ہوتی ہے روزی۔ اس طرح رہ کر دیکھ لینا۔ کتنا اچھا لگنے لگا۔ کتنی خوشی محسوس ہوگی خود تمہیں۔"

روزی نے فرماں برداری سے اثبات میں سر ہلایا۔ "جی میم صاحب۔"

اور جیسے ہی میم صاحب اٹھ کر اپنے کمرے میں گئیں، روزی نے فرح اور صباحت سے کہا۔

"جائیے کھیلئے سب کے ساتھ۔"

فرح اور صباحت دوڑتی ہوئی آنٹی شکلا کے گھر چلی گئیں۔ روزی اپنے کام میں مگن ہوگئی۔

ٹھیک چائے کے وقت وہ مسکرائی اور ٹرے میں گرم گرم چائے کے ساتھ کیک پیسٹری اور نمکین سجا کر فوراً بچوں کے درمیان پہونچی۔

"تھینک یو روزی!" صباحت اور فرح نے بیک آواز ہو کر کہا۔

"ارے ارے تم نے کیوں اتنی زحمت کی روزی۔" مسز شکلا بولیں۔

تب فہمائشی انداز میں ہاتھ ہلا کر روزی نے جتلایا۔ "آنٹی جی! آنٹی جی! اس طرح نہیں کہتے اپنوں کو۔ تکلیف ہوتی ہے۔ برا لگتا ہے۔ اس میں زحمت کیسی؟ گھر میں نہ پی سہی، پی لی بچوں نے چائے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ.....!" "چلو بچو آجاؤ سب!"

سارے بچے کھیل چھوڑ کر کیک پیسٹری کی طرف لپکے۔

"دیدی روزی یہ بتلایئے آپ فرح صبا کو بڑی ماں چھوٹی ماں کیوں کہتی ہیں آخر؟"

کیک پیسٹری کھاتے ہوئے بچوں نے مسکرا مسکرا کر پوچھا۔

اس لئے بچو کہ میرے پاپا نے سکھلایا ہے کہ مالکوں کے بچے کتنے بھی چھوٹے سہی اُن کی عزت کرنا بھی ضروری ہے۔ انہیں نام سے بلانا بدتمیزی ہے اسلئے۔ سمجھ گئے نا۔؟"

"اوہو۔" بچوں نے مسکرانا بند کردیا۔

"تھینک یو روزی۔" فرح اور صباحت نے پھر کہا۔

روزی نے سینے پر کراس بنا کر من ہی من میں دعا کی ہم سب پر اپنی مہربانی رکھنا یسوع مسیح۔ ہم سب پر اپنی مہربانی رکھنا—!!!

اس رات گہری پرسکون نیند کے بعد اگلی صبح نہا کر بال بنانے جب روزی آئینے کے سامنے پہونچی تو یکلخت ششدر رہ گئی۔ وہی روشنی، وہی تیج جس کی اُسے ہمیشہ جستجو رہی آج خود اس کے چہرے پر موجود تھا۔

"مائی گاڈ! تو یہ دراصل پیار کی روشنی ہے؟" روزی نے سوچا اور گھٹنے ٹیک کر یسوع مسیح کے آگے جھک گئی۔

اُس دن کی عبادت میں جتنا سکون، جتنی قوت، جتنی گیرائی اسے ملی شاید ہی کبھی پہلے ملی تھی۔

بقیہ صفحہ ۲۳ خواب رو

چہرہ گھوم گیا ہے، اتنا بوڑھا، جتنا بڑھاپا ہو سکتا ہے۔ مائی جنتو کی انگنت جھریاں اس کے چہرے کو برصغیر کا نقشہ بنائے ہوئی تھیں۔ دیوانے مولوی صاحب کو ابھی تک بخوبی یاد ہے کہ اسکول کے دنوں کاغذ پر برصغیر کا نقشہ کھینچتے ہوئے انھیں ہمیشہ مائی جنتو کا خیال آجاتا تھا۔ مائی جنتو ان کے یہاں مالن کا کام کرتی تھی اور وہ بیشتر اوقات سب کی نظریں بچا کر اس کے گھاس پھوس کے جھونپڑے میں آنکلتے تھے اور پھر مائی جنتو اور وہ کپڑوں کے سوراخوں پر سوکھا آٹا اور شکر ڈالا کرتے تھے۔ مائی کا جھونپڑا یہیں کہیں تو تھا۔ انہوں نے رک کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی ہے اور پھر کچھ سمجھ میں نہ آنے پر سر ہلا کر آگے ہو لیے ہیں۔ مائی کو تو مرے ہوئے اب نصف صدی سے بھی ایک دہا اوپر ہونے کو آرہا ہے۔ میری پیدائش سے ہی ہمارے ساتھ تھی۔ مجھ سے کتنا لاڈ پیار کیا کرتی تھی!۔ دیوانے مولوی صاحب شیر خوار بچے کے مانند آپ ہی آپ ہنسے جا رہے ہیں، شاید اپنے ذہن میں ننھے منے سے بن کر مائی کی گود میں ہاتھ پیر مار رہے ہوں۔ بڑی دھرم کرم کی عورت تھی وہ متعجب ہیں کہ آخر سارے ہندو کدھر غائب ہوگئے، مگر یہ سوچ کر وہ بڑے خوش ہوتے ہیں کہ ہوتے ہوتے مشرف بہ اسلام ہوگئے ہونگے وہ یہ دعا مانگنے کے لیے پھر رک گئے ہیں کہ اللہ ساری دنیا کے لوگوں کو ایمان کی دولت سے مالا مال کردے۔ دعا کے بعد انہوں نے آنکھیں کھولی ہیں تو ایک گلہری کو گردن کھڑی کیے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا ہے، گویا وہ بھی ان کی دعا میں شامل ہو۔ ادھر آؤ بی بی!۔ نہیں، دم ہے تو آپ آئیے!۔ وہ تیز تیز ان کے آگے دوڑنے لگی ہے اور دیوانے مولوی صاحب بھی تھوڑی دور اس وقت تک اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے چلے گئے ہیں جب تک بے خبر رہے ہیں کہ کیا کر رہے ہیں۔ اب چند ہی قدم پہلان کی بائڑھ ہے جسے پھلانگ کر تھوڑا سا چل کے وہ تالاب کے کنارے آگئے ہیں۔ (باقی آئندہ)

رُباعیات

فرحت قادری

تقریر کی آوازِ دمادم ہے کچھ اور
تحریر کا انداز بھی برہم ہے کچھ اور
گم رشتۂ الفاظ میں سارا عالم
اور رشتۂ الفاظ کا عالم ہے کچھ اور

O

بن بن کے لہو اشک ہمارے ٹپکے
ان آنکھوں سے ارمانوں کے تارے ٹپکے
نیچا کیا تاروں کو تو سورج نکلا
سورج کو نچوڑا تو شرارے ٹپکے

O

ادراک نے اوقات پہ ڈالی ہے کمند
ہیں فکر کے دروازے مہ و سال پہ بند
وہ اور رہتے جو وقت کے پابند رہے
ہم وہ ہیں کہ ہے وقت ہمارا پابند

O

پتھر کی نگاہوں میں چمک ہوتی ہے
کانٹوں میں بھی پھولوں کی مہک ہوتی ہے
ہر شے میں ہے جذبوں کی حرارت پنہاں
شبنم میں بھی شعلوں کی لپک ہوتی ہے

O

سورج کی نہ کچھ یادہ سپاری کی ہے
ہر ایک ادا فریب کاری کی ہے
نزدیک سے دیکھا تو بھرم ٹوٹ گیا
سورج کی شعاعوں میں بھی تاریکی ہے

● ۱۴- بیسوا نگر، گیا - ۸۲۳۰۰۱

ثلاثی

انور ضیائی

ہر طرف اڑتی ہے سرگشتہ دھول
جسم لرزیدہ ہراساں چہرے
کوچے کوچے میں ہیں بارود کے پھول

O

کبھی اس حقیقت کو گمبھیر کر دو
مری چاہتوں کی کتھاؤں کو اک دن
ہوا اور پانی پہ تحریر کر دو

O

اگنی بان چلائے گا
جلتا سورج دھرتی پر
قحط عذاب اگائے گا

O

خوف اتنا حیات کا کیوں ہے
بند کمرے میں رہ کے بھی محفوظ
لحظہ لحظہ گمانِ شب خوں ہے

O

گھنے بادل جو ٹوٹ کر برسے
نیلے نیلے سے سارے منظر ہیں
رابطہ ہو گیا سمندر سے

● الامین ایجوکیشنل کامپلیکس، کولار (کرناٹک)

دوہے

مناظر عاشق

بھائی چندا روپ ہے، سورج اس کے پاس
میں ہوں چڑیا دھوپ کی آنکھوں میں ہے آس

O

چندا سے کم میں نہ لوں عیدی کی سوغات
مانا چندا دور ہے، اونچے تیرے ہاتھ

O

دیکھوں تجھ کو خواب میں دیکھوں ماں کا پیار
جی لیتی ہوں ایسے ہی، بن جیتی بن تار

O

جتنے دوہے گیت ہیں، رکھنا ان کا مول
سچے سچے بول ہیں، موتی ان کا تول

O

چھوٹی موٹی بیٹیاں، ان کے گورے گال
تا کے چندا رات کو، سکھ پاؤ ڈھے شال

O

چہرہ چہرہ یاد ہے، آنکھوں آنکھوں پیاس
صدیاں صدیاں بیت گئیں لمحہ لمحہ آس

O

سوکھا ایسا آ پڑا، پل پل برسی آگ
بادل برسے ٹوٹ کے، ساری بستی جھاگ

O

آزادی کے ساتھ ہی، دھرتی دھوتی اچل
نگری نگری خون ہے، سننے کی ہے بھول

● عالم بلڈنگ، شاہ بازار، مظفرپور



ہندا فاضلی

۱۰۳ - امر اپارٹمنٹ، ڈانڈپاڑہ - ۱، کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲

دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۲

مرتضیٰ حسن اور زبین کے تعلقات میں جو دراڑ پڑی تھی وہ اب زیادہ پھیل چکی ہے۔ زبین نے کچھ دن اس دراڑ کو پاٹنے کی کوشش کی لیکن دوریاں نزدیکیوں میں بدل نہیں پائیں۔ انتقاماً وہ ایک سیّد نامی شخص سے نکاح کر کے گرہستھ جیون اپنا لیتی ہے۔ اس کی موروثی جائیداد کا بٹوارہ ہو چکا ہے۔ اپنا حصّہ لے کر بھائی تھرا میں اپنی لڑکیوں کے جہیزوں کی دکانیں سجا لیتے ہیں۔ چھوٹی بہن نغمی شروع سے خاندان والوں سے الگ ہے۔ زبین کی دنیا سیّد کے گھر تک محدود ہے۔ اس کے چار لڑکے اب اس کا خواب ہیں۔ اس خواب کی تعبیر میں وہ اپنے اکیلے پن کو بہلا رہی ہے لیکن لڑکے اسے پسند نہیں کرتے وہ ہر دم ان کے لعن طعن کا شکار بنی رہتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر اختلاف پیدا ہوتے ہیں۔ وہ سیّد سے شادی کرنے کے بعد سیّد کے بچّوں کی ماں بننے پر بضد ہے اور لڑکے اسے ترجیح دینے کو ہرگز تیار نہیں ہیں لیکن وہ اپنی ذمّہ داری یوں ہی نبھاتی رہتی ہے۔ مسلسل شراب نوشی نے سیّد کی صحت خراب کر دی ہے۔ گھر کی دیکھ بھال کے ساتھ اب شوہر کی تیمارداری بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ حالت زیادہ بگڑتی ہے تو سیّد کو اسپتال میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ چند دن کے بعد اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ ہسپتال کا سارا خرچہ زبین ہی اٹھاتی ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد وہ ایک وفادار بیوہ کی طرح رنگین ساڑیاں ترک کر کے سفید لباس میں عدت کے دن پورے کرتی ہے اور مرحوم کی ساری رسوم ادا کرتی ہے۔ چالیسویں میں شہر کے مشہور باورچی بلائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ کئی دیگوں سے سوگواروں کی شکم پری کرتی ہیں۔

بیوی اور ماں بننے کی اس کی برسوں کی دبی گھٹی خواہش پوری تو ہو جاتی ہے مگر اس کی زندگی کا سکھ اس کی قسمت سے کوسوں دور رہتا ہے۔ مرتضیٰ حسن کا عشق، ان کے بچّوں کی عمروں کے ساتھ بالغ ہو جاتا ہے۔ وہ اس کو وفاداری پر شک کر کے اپنی کنارہ کشی کا جواز ڈھونڈ لیتے ہیں۔ شیام لعل پانڈوی ہندو میرج ایکٹ کی مجبوری سے اپنے سیاسی کردار کو پاک صاف رکھتے ہیں۔ وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر چار بچّوں کے اکیلے باپ سے رشتہ جوڑ لیتی ہے۔ اس کے نکاح نے مرتضیٰ حسن کے شک کی تصدیق کر دی ہے۔ وہ اپنے ضمیر کی تسکین کے لیے ایک نظم لکھتے ہیں جس کا ٹیپ کا مصرع یوں ہے:

جسے میں نیک سمجھا تھا وہ ایک آوارہ عورت تھی

زبین کو اس گھر میں بچّے، خاوند، گرہستی سب ریڈی میڈ مل جاتے ہیں۔ وہ پوری طرح اپنے وجود کو ان میں کھو دیتی ہے۔ بڑے لڑکے کو اپنے پرانے مداحوں سے سفارش کر کے وہی ملازمت دلواتی ہے۔ چھوٹے کا اسکول سے کالج تک کا سفر اسی کی وجہ سے آسان ہوتا ہے۔ سندھیا دیار کی مغنّیہ ہونے کے ناتے شہر میں اس کی جان پہچان کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ سیّد کے بڑے لڑکے کی شادی کی ساری تیاریوں میں وہ ہی شامل رہتی ہے۔ کپڑوں کا انتخاب، زیورات کی خریداری، دعوت ناموں کی تقسیم، ہر کام اسی کی نگرانی میں ہوتا ہے۔ اس تقریب کے مصارف اسی کے سر ہیں۔ کئی دن محلوں کی عورتوں کے ساتھ شادی کے گیت گاتی ہے۔ اس کی آواز کا جادو محلے میں ایک سماں باندھ دیتا ہے لیکن برات میں وہ شامل ہو کر لڑکی والوں کے یہاں نہیں جاتی۔ دولہن کے رشتہ داروں کی نظر میں دولہا اور طوائف کا رشتہ نئے رشتے کے لیے خطرہ ثابت ہوتا ہے۔ دلہن کی رخصتی کا مسئلہ یوں حل ہوتا ہے کہ زبین ہمیشہ کے لیے بھوپیٹے کو دور سے آنسو بھری آنکھوں سے دعائیں دیتی ہوئی، مرحوم شوہر کے گھر سے رخصت ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی چھوٹی بہن منّی کے پاس چلی جاتی ہے۔ منّی اپنے مزاج کے لحاظ سے شروع سے اپنی بڑی بہن سے مختلف ہے اس نے کبھی بھی گجرا لیا اور نہ اپنی بہن کی طرح دل کی داد بانی سے شریعت کو بے دخل کیا۔ وہ جتنی بار گھر چھوڑ کے جن جن کے ساتھ گئی ان کی ساری تاریخیں اور نام مختلف قاضیوں کے رجسٹروں میں سلسلہ وار درج

ہیں۔ ان کئی ناموں میں ایک نام پنجاب کے شاعر الطاف مشہدی کا بھی ہے۔ اس کا پہلا نکاح شہر کے ایک عیاش جاگیردار محمد علی سے ہوتا ہے۔ اس نکاح کی یادگار ایک لڑکے کی صورت میں اس کے ساتھ ہے۔ جس کی عمر اب دس گیارہ سال ہے باقی کی شادیاں اس کے بنجر پن میں کوئی شادابی نہیں لا سکیں۔ اپنے موروثی پیشہ سے مٹی بائی کی نفرت کی وجہ وہ راز ہے جس کا انکشاف اس کی ماں نے کبھی کیا تھا۔ اس انکشاف کے مطابق اس کے بدن میں دوسرے بہن بھائیوں سے مختلف خون ہے۔ وہ کسی شریف پٹھان کی شب گذاری کا ثمر ہے۔ خون کی وراثت اپنا اثر دکھاتی ہے اور وہ اس اطلاع کے ساتھ ہی اس کے تحفظ میں جٹ جاتی ہے۔ مرتضیٰ حسن اس کے منہ بولے بھائی ہیں۔ زیبن سے علاحدگی کے بعد بھی اس رشتہ کی پاکیزگی برقرار ہے۔ وہ زیبن کی بہن ہو کر بھی اپنے آپ کو اس سے مختلف سمجھتی ہے اس رشتہ کو قسمت کا کھیل مانتی ہے۔ اسے اپنی اور اپنے لڑکے کی شرافت ہر رشتہ سے زیادہ عزیز ہے۔ اپنے گھر میں زیبن کی آمد کو وہ پہلے تو برداشت کر لیتی ہے۔ لیکن جلد ہی اسے اپنے گم نام شجرہ کی نجابت پریشان کرنے لگتی ہے۔ زیبن اور اس کا رشتہ تو خیر قسمت کی جبریت ہے لیکن اس کا بیٹا بھی ایک طوائف کو خالہ ماننے پر مجبور ہو، یہ وہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔ زیبن زیادہ دن اس کے ساتھ نہیں رہ پاتی۔ وہ متھرا میں اپنے بھائیوں کے پاس جاتی ہے مگر پھر مایوس ہو کر لوٹ آتی ہے۔ گوالیار سے دور رہنا اسے پسند نہیں ہے۔ گوالیار میں اس کے باپ ماں کی قبریں ہیں۔ وہ اچھے بارونق دن رات ہیں جو اس نے اسی شہر میں گذارے اور جن کے عینی گواہ اب بھی اس شہر میں موجود ہیں۔ جیسے جیسے زندوں سے اس کا تعلق کم ہوتا جارہا ہے مُردوں سے اس کا رشتہ مضبوط ہوتا جارہا ہے۔ خواجہ خانوں کی درگاہ کے باہری حصہ میں اس کے ماں باپ کی دو کچی قبریں ہیں جو اب کافی شکستہ حالت میں ہیں۔ ان قبروں کو وہ خود سر پر جون جولائی کی دھوپ رکھ کر پکا بنواتی ہے۔ ان پر ان کے نام اور مرتضیٰ حسن کی پہلے کی لکھی ہوئی منظوم تاریخیں کندہ کرا کے سنگِ مرمر کے کتبے نصب کرواتی ہے۔ ماہانہ تنخواہ پر ایک مولوی کلام پاک کی تلاوت سے مرحوموں کو ثواب بخشتا رہتا ہے۔ وہ دن میں دو بار وہاں فاتحہ پڑھنے جاتی ہے۔ جمعرات کے دن شام ڈھلے میٹھا تیل لے جا کر مسجد میں ان کے نام کے چراغ بھی روشن کرتی ہے .... اب وہ سب سے الگ تھلگ ایک اکیلے مکان میں اپنی تنہائیوں کے ساتھ رہتی ہے۔ دن کے دوران یا تو عبادت کرتی ہے یا پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے اپنے پرانے ریکارڈ بجا کر سنتی رہتی ہے۔ بھولے بھٹکے کبھی ندا کو راستے میں مل جاتی ہے تو روک کر سر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ اور بجھی ہوئی آنکھوں سے خلاء کو گھورتی ہوئی کہتی ہے۔ بیٹا دلّی والی (جمیل فاطمہ کو وہ دلّی والی کہتی ہے) سے کہنا میرا کہا سنا معاف کرے اور میرے حق میں اللہ سے دعا کرے وہ سیّدانی ہے۔ اس کی دعا ضرور قبول ہوگی۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی سوکھی زیست کی طرح بکھری بکھری لگتی ہے۔

ندا کالج میں کمیونسٹ پارٹی کی اسٹوڈینٹ فیڈریشن کا ممبر ہے۔ پارٹی کے اجلاس اور اشتراکی لٹریچر نے اسے مذہبی روایات کے دائرے سے نکال کر ملحدانہ اعتقادات کے قریب کر دیا ہے۔ نئے پن کے نئے نئے شوق نے ہر پرانی چیز کا احترام کم کر دیا ہے۔ ہر سوال کا طے شدہ جواب پہلے سے موجود ہے۔ ہر مسئلہ کا تجزیہ مارکسوادی بنیادوں پر کرنا اس کا مزاج ہے۔ ندا کی طرح مصطفےٰ حسن بھی وکٹوریہ کالج کے اسٹوڈینٹ ہیں لیکن وہ ندا کے مقابلے میں زندگی کے تعلق سے زیادہ عملی اور پڑھائی کے تعلق سے زیادہ سنجیدہ ہیں۔ دن رات پڑھائی کی کتابوں کے ساتھ سر کھپانے کے علاوہ انھیں کوئی دوسرا شوق نہیں ہے۔ ندا دو تین سال ضائع کرتا ہے اور وہ وقت کا جائز استعمال کر کے جلد ہی کئی ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں۔ بی کام کے بعد وہ ایم اے اقتصادیات میں داخلہ لیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایل ایل بی کا کورس بھی پورا کر جاتے ہیں۔ ان ساری ڈگریوں کو لے کر ایک دن جب وہ کالج کے پرانے پھاٹک سے باہر آتے ہیں تو بےچارہ ہندوستان ان کے شایانِ شان استقبال کے لیے ہار پھول لانا بھول جاتا ہے۔ وہ بھی کیا کرے۔ اس کے سر پر ایک ساتھ کئی کام آ پڑے ہیں۔ پاکستان سے آئے ہوئے شرنارتھیوں کے بسانے، جگہ جگہ دنگے فسادکی روک تھام کرنے، چین سے بگڑتے تعلقات کو سنوارنے، بنگلہ دیش میں مجیب الرحمان کی عوامی تحریک کو ساتھ نبھانے کی دوڑ دھوپ میں اس کے ذہن سے مصطفےٰ حسن کی تکمیل تعلیم کا وقت محو ہو جاتا ہے۔ وہ وقت پر اُدھر آتا نہیں اور یہ پیدل گھر آ جاتے ہیں۔ انھیں ملک کی اس بے توجہی پر غصہ کم اور حیرت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا احساس اس وقت اور شدت اختیار کر لیتا ہے۔ جب کئی مہینوں کی جدوجہد کے بعد انھیں اکاؤنٹ آفس میں ایک معمولی سی کلرکی پیش کی جاتی ہے۔ اس آفس میں ان کے کئی جاننے والے ہیں۔ ان میں اکثر کے پاس ان کی جیسی ڈگریاں بھی ہیں۔ مگر ان میں اور ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان کی پیدائش مسلمان گھر میں ہوئی ہے۔ ان کا مذہب اسلام ہے۔ ان کے والدین نے پاکستان بننے کے بعد پاکستان نہ جا کر ہندوستان کے سیکولر دستور کو نئی رسا کھ عطا کی ہے اور آفس کے دوسرے کلرک اکثر

فرقے سے متعلق ہیں۔ یہ شروع ہی سے شکوہ شکایت کے جواز سے محروم ہیں۔ اسی لیے اور سب تو اپنی اپنی کرسیوں سے چپکے رہتے ہیں مگر مصطفیٰ
حسن کو دو ملکوں میں کسی ایک کے انتخاب کی رعایتی آزادی حاصل ہے۔ یہ آزادی انھیں جلد ہی اس نوکری سے اُکھاڑ دیتی ہے۔ اور وہ ہندوستان
میں اپنے مستقبل سے مایوس ہوکر سرحد پار کرکے پاکستان کی شہریت قبول کر لیتے ہیں۔ ان کے خط آتے رہتے ہیں۔ ان میں نئے ملک کی خوش حالیوں کا ذکر
ہوتا ہے۔ یہ خط ہندوستان آکر، پڑھنے والوں کو اپنے ماحول سے بیزار کرتے ہیں۔ مصطفیٰ احسن کو گئے ہوئے ابھی مشکل سے تین چار مہینے ہی ہوئے
ہیں۔ ان کے جانے سے، مصطفیٰ احسن کے ایک دوست سوشیل قدم کی چھوٹی بہن بری طرح پریشان ہے۔ اس پریشانی کے اظہار کی آزادی سے وہ
محروم ہے۔ وہ تین مہینے کی حاملہ ہے۔ اس کے گھر والوں کو جب ہندو جسم میں اسلام کے غیر قانونی وجود کی اطلاع ملتی ہے، تو اس کے ماں باپ اس
کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ اس کا کالج چھڑا دیا جاتا ہے گھر سے آنے جانے پر پابندی لگ جاتی ہے۔ لیکن عورت کی زندگی میں اپنے پہلے مرد کا وشواس
اتنی جلدی ہار نہیں مانتا۔ اس کے وشواس کی پختگی گھر والوں کی مذہبی عصبیت کو نرم کر دیتی ہے۔ وہ لڑکی کی ضد اور اپنی بدنامی کے ڈر سے، ہونے والے
بچے کے باپ کو قبول کر لیتے ہیں۔ لڑکی کا بڑا بھائی مرتضیٰ حسن سے اس سلسلے میں مشورہ کرتا ہے۔ بات جمیل فاطمہ تک پہونچتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے
کی پاک بازی پر شک کرنے کے بجائے، حسب معمول لڑکی کو ہی دوشی ٹھہراتی ہیں وہ اس رشتہ کو خدا اور رسول کے احکام کے خلاف مانتی ہیں۔
شریعت انھیں مذہبوں میں رشتے کی اجازت دیتی ہے جو صاحب کتاب ہیں۔ کرسچین اور یہودی ہی اس دائرہ میں آتے ہیں۔ عیسیٰ اور موسیٰ ؑ
کی امت نے پہلے ہی اپنی آسمانی کتابوں میں ردّ و بدل کرنے کا گناہ کیا ہو لیکن ان مقدس کتابوں سے ان کا تعلق ہی انھیں دوسروں سے زیادہ اہم
اور اسلام سے زیادہ قریب کرتا ہے۔ خدا نے اپنی الہامی کتب کے لیے زمین کا جو رقبہ مخصوص کیا ہوا ہے اس میں ہندوستان شاید شامل نہیں ہے۔ ان
خود ساختہ سیماؤں کی سزا لڑکی کو بھگتنی پڑتی ہے۔ جمیل فاطمہ کی خاموشی کے بعد وہ دو چار خط مصطفیٰ احسن کو پاکستان کے پتہ پر لکھتی ہے لیکن جواب
نہیں آتا۔ کچھ دن وہ اپنی بھول پر روتی دھوتی ہے اور پھر کسی دن کے ہوسپٹل میں جاکر اپنے وجود کو دوسرے مذہب کی آلودگی سے ہمیشہ کے لیے
پاک کر دیتی ہے۔

مصطفیٰ احسن گھر میں گھر آتے بڑے ہیں مرتضیٰ حسن ان کو بہت چاہتے ہیں۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے اور زمین سے الگ ہونے کے بعد ان کی چاہت
میں شدت پیدا ہو گئی ہے۔ مصطفیٰ کے پاکستان چلے جانے کے بعد ان کے خیالوں میں اچانک تبدیلی آتی ہے لڑکے کی جدائی نے ان کی تنہائی میں اضافہ
کرکے ان کی آزاد خیالی کو پابند کر دیا ہے۔ وہ پوری فیملی کے ساتھ پاکستان جانے کا پلان بنا رہے ہیں۔ ان کے بچپن کے دوست ڈاکٹر کوئلے کر اور رام
نامائن ان کے اس فیصلے سے خفا ہیں لیکن وہ اپنی جذباتی دلیلوں سے اپنے آپ کو مطمئن کیے ہوئے ہیں۔ ملکی تقسیم جو پہلے، ان کے خیال میں تاریخ کا ایک
سانحہ تھی اب تہذیبی تحفظ کی ضرورت بن جاتی ہے۔ "آزادی کے بعد مسلم خاندانوں کی ہجرت سے لڑکے لڑکیوں کی شادی بیاہ مشکل ہو گئے ہیں۔ اردو کے
ساتھ سیاست کا سوتیلا سلوک ہندوستان میں اقلیتی تشخص کے لیے خطرہ پیدا کر رہا ہے۔ ملازمتوں میں تعصب کارفرما ہے۔" اپنے فیصلے کی دفاع
میں یہ ساری کچی پکی دلیلیں ٹھیک ٹھاک کرکے وہ ایک جمعرات کو درگاہ جاتے ہیں اور صاحب مزار کو مطمئن کرکے اجازت لیتے ہیں۔ دوسرے دن
گھر کے سارے افراد کے پاسپورٹ کے فارم جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ ان میں ندا کا نام بھی شامل ہے۔ روانگی کی تیاری زوروں پر ہے۔ موروثی
مکان کا سودا ہو جاتا ہے۔ پرانا سامان اونے پونے فروخت ہوتا ہے۔ نیا سامان خریدا جاتا ہے۔ سب کے لیے نئے کپڑے سلتے ہیں۔ شادی بیاہ کی طرح
گھر میں چہل پہل ہے۔ جمیل فاطمہ اور دیگر بہن بھائی مرتضیٰ حسن کے اس فیصلے سے خوش ہیں۔ لیکن ندا کسی سے کچھ کہے بنا اس کے خلاف ہے۔ گھر کے
کسی ایک فرد کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے، سب کے یہاں سے وہاں منتقل ہونے کی منطق سے وہ مطمئن نہیں ہے۔ وہ ایم۔ اے کا پہلا سال
مکمل کر چکی ہے۔ پڑھائی کو ادھورا چھوڑ کر وہ گھر والوں کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔ روانگی کی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے۔ سب کے پاسپورٹ اور ٹکٹ آ جاتے
ہیں۔ لیکن روانگی کے وقت ندا کے نہ ہونے سے جمیل فاطمہ کو اختلاج کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ شہر میں چاروں طرف اس کی تلاش کی جاتی ہے۔ اس کا کہیں
پتہ نہیں لگتا۔ جمیل فاطمہ ہوش میں لائی جاتی ہیں۔ وہ ندا کے بغیر جانے کے لیے راضی نہیں ہیں۔ مرتضیٰ حسن انھیں سمجھا بجھا کر کسی طرح رخصت کرتے
ہیں اور خود ندا کے انتظار میں رک جاتے ہیں۔ ان کا ٹکٹ واپس ہوتا ہے۔ ویزا کی میعاد بڑھوائی جاتی ہے۔ مگر یہ سب بے سود ہوتا ہے۔ اور آخر کار
وہ بھی ندا کا پاسپورٹ محلے میں کسی کو دے کر مجبوراً روانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ندا راجستھان کے مختلف علاقوں میں وقت گنوا کر واپس

(باقی صفحہ ۳۹ پر دیکھیے)

فکری بدایونی

ہماری جیب میں خنجر کے سوا کچھ اور بھی ہے
کہ ایسی نیّر میں شر کے سوا کچھ اور بھی ہے

تمام تلخیِ دوراں کو پیتا رہتا ہوں
مری دعا میں اثر کے سوا کچھ اور بھی ہے

ہمیشہ ساز پہ مضراب سانس اٹکی ہوئی
حیات خود میں سفر کے سوا کچھ اور بھی ہے

مرا دماغ بھی دانائیوں کا کعبہ ہے
مری خرد میں خبر کے سوا کچھ اور بھی ہے

الٰہی سن لے ذرا اس قلم کی جنبش میں
متاعِ عرضِ ہنر کے سوا کچھ اور بھی ہے

وجود ذنو کی یہاں بت گری بھی ہوتی ہے
یہ تودہ مٹی کا گھر کے سوا کچھ اور بھی ہے

پھنسا ہوا ہوں بڑی چاہ سے یہاں فکری
یہ زیست میری بھنور کے سوا کچھ اور بھی ہے

شبّیر آصف

موسم کا تاوان شجر پر باقی ہے
شاخ پہ اب تک ایک گلِ تر باقی ہے

کیا حاصل ہے بے موسم برساتوں کا
رنگ بدل کر پیاس لبوں پر باقی ہے

کیسے ہوگا ہونے کا احساس ہمیں
ایک نہ اک بت ذہن کے اندر باقی ہے

فیل نشیں کو شاید یہ معلوم نہیں
پورس باقی ہے نہ سکندر باقی ہے

دریا صحرا میں آیا اور سوکھ گیا
لیکن پانی روپ بدل کر باقی ہے

سورج شہرِ شام میں آکر لوٹ گیا
خون کی سرخی روئے افق پر باقی ہے

یہ کاغذ کی ناؤ کہاں تک جائے گی
ابھی تو آصف سارا سمندر باقی ہے

پروین کمار اشک

رات فرشتہ باغ میں آیا کرتا ہے
پھول پھول سے چاند اگایا کرتا ہے

برف مجھے جب آگ دکھانے لگتی ہے
سورج میرے سر پر سایہ کرتا ہے

جانے دریا میں کیا اس کا غرق ہوا؟
خالی کشتی پار لگایا کرتا ہے

اسی لیے زندہ ہوں تیرے ملنے کا
سنا ہے کوئی دن بھی آیا کرتا ہے

پیڑ کے پتے آنسو آنسو گرتے ہیں
جب کوئی شاخِ درد ہلایا کرتا ہے

لہو سمندر میں اس نے دل پھینک دیا
اب وہ سب سے ہاتھ ملایا کرتا ہے

شاید کوئی اس کے آنگن جا اترے
روز کبوتر اشک اڑایا کرتا ہے

● ۵-۶-۱۴۱/۳/۴ نام پلّی، حیدرآباد (اے پی) ● ۸۱/۴، نیا پورہ، مالیگاؤں (مہاراشٹر) ● کرشنا اسٹریٹ، پٹھانکوٹ۔ ۱۴۵۰۰۱

شفیقہ فرحت

ای-۱۸۶/۲، وِدیا وِہار، بھوپال ۴۶۲۰۰۲

خیریت ہی خیریت

شہر آشوب کے محلہ گدھا نخاس میں کل شام جب کہ موسم بہت سہانا اور منظر انتہائی پُرکیف تھا، دو فرقوں کے درمیان، جن کے نام ہم اپنی دیسی پالیسی کی بنا پر لکھ نہیں سکتے جھڑپ ہو گئی۔

ویسے آپ کی سوجھ بوجھ پر ہمیں پورا بھروسہ ہے۔ پھر بھی کوئی دقّت ہو تو کل ہم مرنے والوں کے نام شائع کر دیں گے۔!

ہاں تو دو فرقوں کے درمیان بڑے خوشگوار اور دوستانہ ماحول میں معمولی سی جھڑپ ہوئی جس میں ہر عمر کے مردوں اور بچوں نے حصّہ لیا۔ خواتین پردے کے پیچھے سے ہمت افزائی کرتی رہیں۔

اس کھیل میں بعد کو پولس بھی شامل ہو گئی۔

مرنے والوں کی تعداد ۱۰۱ اور زخمیوں کی ۵۰۱ ہے۔ اگر یہ اعداد و شمار آپ کو پسند نہ آئیں تو اس میں حسبِ مرضی کمی بیشی کی جا سکتی ہے کہ ہمارے خبرناموں میں جمع تفریق، ضرب تقسیم ہر ایک کی گنجائش ہے۔ اس حادثہ میں ایک پولس والے کی شہادت کی انگلی میں ہلکی سی خراش بھی آ گئی ہے۔ سرکاری خبرنامے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ شہادت کی انگلی نہیں بلکہ چھنگلیا ہے اور اس زخمی چھنگلیا سے ایک بوند خون بھی ٹپکا۔

اس کھیل کے دوران آتش بازی کے بھی شاندار مظاہرے ہوئے۔ تقریباً پانچ ہزار جھگی جھونپڑیاں جلائی گئیں۔ لیکن افسوس یہ نظارہ کوئی خاص EXCITING ثابت نہ ہوا۔

کیوں کہ آگ جلد ہی بجھ گئی۔ جی نہیں فائر بریگیڈ بروقت نہیں پہنچے بلکہ وہ تو سرے سے آئے ہی نہیں۔ وہ شہر میں منتریوں اور افسروں کے باغ بغیچوں کے لیے پانی سپلائی کرنے میں مصروف تھے۔ آگ اس لیے فوراً بجھ گئی کہ خس و خاشاک کا جلنا کیا اور جلانا کیا۔ بھلا جھگی جھونپڑیوں میں ہوتا ہی کیا ہے۔ سو تماشہ نہ ہوا۔

ملٹری کے جوان تعینات کر دیے گئے ہیں۔ جو ہر گلی کے نکڑ پر بیٹھ کے تاش کھیل رہے ہیں۔ کس قدر امن و شانتی ہے۔!

ویسے SHOOT AT SIGHT کے آڈرس ہیں۔ لیکن یہ جب کسی کو دیکھیں گے ہی نہیں تو ماریں گے کیوں۔

یوں پریشانی اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ حالات پوری طرح قابو میں ہیں۔ اور سب خیریت ہے۔

مرنے والوں کے بچے کھچے رشتہ داروں کو اکیس اکیس روپیہ اور زخمیوں کو گیارہ گیارہ روپے دے دیے گئے ہیں۔

بظاہر یہ رقم کچھ کم ہے۔ یعنی BELLOW POVERTY LINE غریبی ریکھا کے نیچے لیکن مجبوری ہے کہ حادثوں اور فسادات کی تعداد اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ معاوضہ دیتے دیتے سرکاری خزانے خالی ہو چکے ہیں۔ دوسرے یہ کہ معاوضے کی لالچ میں دانستہ طور پر منظم طریقے سے حادثے اور فسادات کروائے جاتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ اگر کفایت شعاری اور سوجھ بوجھ سے یہ رقم خرچ کی جائے تو کافی ہے۔ گیارہ روپے زخمی کے سفر خرچ کے طور پر دیے گئے ہیں جس سے وہ اور اس کے ساتھی منی بس میں ٹنگ کر یا ٹیمپو آٹو میں گھس کر جسے عرفِ عام میں بھٹ سوۃ کہتے ہیں بہ آسانی سفر کر سکتے ہیں۔

اور اکیس روپے میں نیا نہ سہی سیکنڈ ہینڈ کفن آ ہی جائیگا کہ بزرگ کہہ گئے ہیں کہ کپڑا اچھے تک استعمال کرنا چاہیے اور جو بوند لگ جائیں تو ثواب الگ۔

تو عرض یہ ہے کہ ہر طرح سے خیریت ہی خیریت ہے۔ ✺

قمر سنبھلی

مان، نہ مان لکھ رہا ہوں
لب کی زبان لکھ رہا ہوں
اسلاف کا قرض ہے قلم پہ
ہر لحظہ ہر آن لکھ رہا ہوں
بچپہ ہے کھلی کتاب سا ہے
ب وہم و گمان لکھ رہا ہوں
سڑکوں پہ ہیں دستخط لہو کے
میں امن و امان لکھ رہا ہوں
ب اس کو اجل سمجھ رہے ہیں
ستے کی تکان لکھ رہا ہوں

نائب مدیر ماہنامہ "رہنمائے تعلیم" ۱۵۲۸ نئی سڑک دہلی

جمیل قریشی

کبھی ہوا تو کبھی موج بحر و بر میں رہا
سفر نژاد تھا میں اس لیے نہ گھر میں رہا
وہ تنگ ظرف تھا اپنے ہی بام و در میں رہا
میں بیکراں تھا بیک وقت شہر بھر میں رہا
مجھے نہ روک سکا کوئی ہجر کوئی وصال
میں تیز رو تھا حکایاتِ مختصر میں رہا
تمام رات سلگتا رہا وجود مرا
میں اک چراغ کی مانند رہگذر میں رہا
ترے بدن پہ ہیں خوشبوئیں کیسی شوریدہ
جمیل رات کسِ آسیب کے اثر میں رہا

معرفت: پی۔ ڈبلیو۔ آئی آفس ویسٹرن ریلوے۔ اودے پور

اوم پرکاش لاغر

شجرِ الفت کا سوکھا جاتا ہے لے آتی کچھ کر
غموں کے خار منہ کھولے کھڑے ہیں اسے خوشی کچھ کر
خزاں نے بال و پرِ مرغِ چمن کے نوچ ڈالے ہیں
گل نغمہ سرائی کیلئے اے زندگی کچھ کر
سحر کا نور بھی تاریک تر ہے ظلمتِ شب سے
کبھی ہیں دیر و کعبہ میکدے کی روشنی کچھ کر
اندھیرا شب کا اک لمحہ ہے ہنگامِ سحر لیکن
رفیقِ شب بچھڑنے کی گھڑی ہے بات ہی کچھ کر
فلک کا چاند بھی دھرتی پہ لاغر شعلہ افشاں ہے
فرشتے سو گئے شاید زمیں کے آدمی کچھ کر

۱۸۔ بی نہرو گراؤنڈ، این۔ آر۔ ٹی۔ فریدآباد

حسیب سوز

ب اسے چھوڑ کے جانا بھی نہیں چاہتے ہم
ر گھر اتنا پرانا بھی نہیں چاہتے ہم
کھ جب دی ہے نظارے بھی عطا کر یارب
کمرے میں زمانہ بھی نہیں چاہتے ہم
نیت جاں بھی اسی میں ہے ہماری لیکن
یا کریں سر کو جھکانا بھی نہیں چاہتے ہم
یب خالی ہے یہ احساس مٹا دے مالک
ن اسے زیادہ تو خزانہ بھی نہیں چاہتے ہم
تھ اور پاؤں کسی کے ہیں کسی کا سر ہے
س طرح قد کو بڑھانا بھی نہیں چاہتے ہم

مدیر لمحے لمحے، اللہ پور ۲۴۳۶۳۱ ضلع بدایوں (یوپی)

یعقوب یاور

مری طبعِ نازک پہ بار تھا جو سماج میرا سماج ہے
مگر اب نہ زعم سبک سری نہ وہ اختلاف مزاج ہے
ترا انکسار گراں بہا بھی بنا نہ قربتِ دل نہیں
یہ عجیب شہر ہے لوٹ جا یہاں دوریوں کا رواج ہے
مری دسترس میں وہ حسن ہے جسے آسماں کی نظر لگے
تری عظمتِ دلِ بے طلب مرا جہاں چار سمت نراج ہے
نہ پرندِ نغمہ سرا کوئی نہ ہے روشنی کی کرن کہیں
یہاں اب بھی صبح کے نام پر شبِ تیرہ تیرہ کا راج ہے
یہ ثبوت ہے کہ ترا کرم مری بندگی سے بلند ہے
میرے پاس آج بھی اے خدا وہی آنسوؤں کا خراج ہے

نگار فوٹو اسٹوڈیو، چرچ روڈ جہانگیر آباد بھوپال ۴۶۲۰۰۸ (ایم پی)

پرکاش ناتھ پرویز

نظر کو نغمگی کا باب لکھنا
کبھی نشتر کبھی مضراب لکھنا
نہ لکھنا مرثیہ بیتی رتوں کا
نئے موسم کی آمد کا باب لکھنا
مچلتے پانیوں کی سطح چھو کر
حدیثِ ماہیِ بے آب لکھنا
رگوں کا لوٹنا جاری ہے اب تک
اسے کیا زندگی کا خواب لکھنا
کبھی زہراب کو امرت سمجھنا
کبھی امرت کو بھی زہراب لکھنا

۱۱۶۴۔ ایف، سیکٹر ۷۔ بی چنڈی گڑھ

سلیم آغا قزلباش

۱۱/۱۵/۳، سرور شہید روڈ، لاہور کینٹ (پاکستان)

روگ

شروع شروع میں اسے دور کی چیزیں صاف اور قریب کی چیزیں دھندلی دکھائی دیتی تھیں، پھر جب ہولے ہولے دور کی چیزیں بھی دھندلاہٹ میں ڈوب گئیں تو اس نے دور کی اشیاء کو دیکھنے کی عادت ہی ترک کر دی۔ اور قریب کی اشیاء پر توجہ مبذول کرنے لگا۔ مگر جب قریب کی چیزیں بھی ہیولوں میں بدلنے لگیں تو اس نے ساری توجہ اپنی ذات پر مرکوز کر دی۔ ایک دوپہر جب وہ جالے کی مکڑی کی طرح کمرے میں بے قراری سے گھوم رہا تھا تو اس کے قدم آئینے کی جانب بڑھے اور آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر اس کے اندر کھلبلی مچ گئی، ٹھنڈے پسینے کی ایک دھار تیز نشتر کی طرح اس کے جسم کو کاٹتی چلی گئی، اُسے اپنے چہرے کا دایاں حصہ گڈمڈ ہوتا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس حصے کے نقوش مدغم کر ڈالے ہوں، اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے دائیں رخسار کی جانب بڑھا، چہرے کو ٹٹولا تو گوشت کی حدت کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا شاید اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔ شدید قسم کی غلط فہمی مگر غلط فہمی ہوئی کیسے؟ جتنا وہ اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا، اتنا ہی وہ الجھتی چلی جاتی تنگ آ کر ایک روز وہ قریبی بک سٹال پر چلا گیا اور وہاں سے نفسیاتی گتھیوں کے موضوع پر لکھی ایک کتاب خرید لایا۔ اُسے پورا یقین تھا کہ اس کے اندر اور باہر چھا جانے والے غبار کا کوئی نہ کوئی پائیدار حل اُسے اس کتاب میں ضرور مل جائے گا، لیکن جوں جوں وہ کتاب پڑھتا گیا، اس کے دل و دماغ پر دھند کا غلاف دبیز تر ہوتا چلا گیا اور یہ سوال رہ رہ کر اسے کچوکیں دینے لگا کہ وہ حاضر ہے یا غائب؟ غائب ہے یا حاضر؟ کیونکہ اب اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ جب وہ حاضر ہوتا تو اس کو غائب سمجھا جاتا اور جب وہ غائب ہوتا تو اسے حاضر سمجھ لیا جاتا، بعینہ جیسے لوگ باگ اچھے افراد کو، اچھے نظریات کو ان کی موجودگی میں نظر انداز کر دیتے ہیں، مگر ان کی عدم موجودگی میں انھیں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ وہ سوچتا کہ شاید ہم سب کا المیہ یہی ہے کہ حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر تسلیم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ابتداً جب اسے اپنا دایاں چہرہ کچھ اڑا اڑا سا نظر آنے لگا تو اس نے سوچا کہ یہ سب کچھ اس کی نظر کی خرابی کے باعث ہو رہا ہے لیکن جب اس نے آنکھوں کا معائنہ کرایا تو پتہ چلا کہ ایسی کوئی گڑبڑ نہیں تھی۔ اس کے بعد اُسے شک گزرا کہ کہیں اس کے چہرے میں کوئی سقم تو پیدا نہیں ہو گیا۔ وہ اسی خوف میں گھرا رہنے لگا کہ اُسکے ماند پڑتے چہرے کے نیچے سے کوئی اور شے ابھر کر باہر آ رہی ہے۔ شاید اوروں کے ساتھ بھی ایسا سب کچھ کبھی نہ کبھی پیش آتا ہو۔ غالباً اسی لیے جب لوگ اپنے چہرے میں کسی تبدیلی کو رونما ہوتے دیکھتے ہیں تو پلاسٹک سرجری کے لیے بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ تو اپنی تنخواہ سے بمشکل مہینہ بھر کا خرچ پورا کرتا تھا، وہ باہر جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا — اسکول کے زمانے میں استاد اللہ بخش سیاہ تختے پر چاک سے لکھے ہندسوں کو ڈسٹر سے مٹا دیا کرتے تھے تاکہ کوئی نیا سوال لکھ کر لڑکوں کو امتحان میں ڈال سکیں۔ یہ سوچتے ہوئے اسے اپنے چہرے پر ڈسٹر پھرتا محسوس ہوا۔ وقتی طور پر چہرے پر ماسک چڑھا لینے سے کم از کم یہ فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ آدمی کچھ عرصے کے لیے اپنے اصل چہرے کو باہر کی دنیا سے چھپا سکتا ہے۔ لیکن اس کا چہرہ تو پہلے ہی ایک کھلی کتاب بن چکا تھا جس پر "شرافت" کا لفظ جلی حروف میں کندہ تھا، گویا وہ ماسک چڑھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ایک روز اس نے سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں، آئینے میں کوئی کیمیائی تبدیلی آ گئی ہے جس کی وجہ سے اسے اپنا چہرہ اپنا دکھائی نہیں دے رہا۔ سو وہ بازار گیا اور اچھی قسم کا ایک نیا آئینہ خرید لایا۔ نتیجہ برعکس نکلا۔ اس کا چہرہ مزید پھیکا پڑ گیا۔ پھیکا پن تو ویسے بھی اس کی زندگی میں زنگ کی طرح پھیل رہا تھا — کچھ غائب ہونے کا احساس ہر دم اس کے ساتھ سائے کی طرح چپکا رہتا۔ دفتر کا کام کاج جیسے تیسے نپٹا کر، اور کسی ان دیکھے خطرہ کو محسوس کر کے وہ جلد از جلد گھر لوٹنے کی کوشش کرتا۔ واپسی پر وہ راستہ

پھر اپنی نگاہیں زمین پر گاڑے چلتا رہتا اور جب گھر کے دروازے پر پہنچتا تو سر کو اونچا کر لیتا اور ایک گہری سانس لیتا۔ اسے اب پورا یقین ہو گیا تھا کہ اس کی ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی شرافت کی وجہ سے اس کا وجود دھند کا ایک ایسا مرغولہ بن گیا ہے جو بھیڑ میں کسی دوسرے ذی روح وجود سے ٹکرائے بغیر گزرتا چلا جاتا ہے یا اگر ٹکراتا ہے تو دوسرے کو دھچکا محسوس نہیں ہوتا۔ تب یہ خیال چابک کی طرح اس کے ذہن پر لگا اور وہ یہ سوچ کر بلبلا اٹھا کہ اتنی شرافت بھی کس کام کی کہ آدمی کسی سے ٹکرا بھی نہ سکے۔ اپنے وجود کا احساس نہ دلا سکے۔ پہلے اسے ایسا سب کچھ کبھی محسوس تک نہیں ہوا تھا مگر مسئلہ تو اب آ کھڑا ہوا تھا — اور اس روز تو غضب ہی ہو گیا جب وہ گھر کے صحن میں داخل ہوا تو اس کی بیوی اور بچوں نے اس کی آمد کا سرے سے کوئی نوٹس ہی نہ لیا، گویا اس کا وجود معمولات میں جذب ہو کر اپنا وجود تک کھو چکا تھا۔ جیسے اس کے مختصر سے کنبے کو اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ ٹھیک سہ پہر کی خبریں شروع ہوتے ہی ایک وجود جو بظاہر غائب تھا، حاضر ہو جائے گا اور صبح جب انگریزی کی آٹھ بجے والی خبریں نشر ہو رہی ہوں گی تو یہ ہیولیٰ اپنے بے آواز قدموں سے سائیکل کو دھکیلتا گھر کی دہلیز پار کر جائے گا، صرف کواڑ بند ہونے کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ گھر کے ماحول میں معمولی ارتعاش پیدا کرے گی اور بس۔

گلی میں سے گزرتے ہوئے اس نے متعدد بار اس پہلو پر غور کیا تھا کہ آدمی جب اپنے وجود کی دلدل میں اندر ہی اندر دھنستا چلا جاتا ہے تو آخر کار اس کا سانس عجیب طریقے سے اکھڑ جاتا ہے۔ بچپن میں ایک مرتبہ نہر میں نہاتے ہوئے جب پانی اس کی ٹھوڑی سے اوپر تک آ گیا تھا تو ایک ٹھنڈی سی سنسناہٹ نے اس کے سارے وجود میں کپکپی پیدا کر دی تھی [illegible] شرافت اس کے ناک تک پہنچ [illegible] تھی اور اس کا سانس پھولنے لگا تھا۔

جب سے اس کے چہرے کا دایاں حصہ ماند پڑ گیا تھا اس کے چہرے کا بایاں حصہ نمایاں ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس کے نمایاں ہوتے ہی اس کے اندر بغاوت نے پھن اٹھا لیا تھا اور وہ بیمار کی حد تک بڑھی ہوئی شریفانہ روش کی گرفت کو توڑ کر باہر آنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ وہ حاضر ہوتے ہوئے بھی غائب ہو جانے کے عذاب سے نجات حاصل کر سکے۔ ایک دن اس نے بستر پہ بیٹھے ہی بیٹھے معمول کی اس مکمل بستہ زنجیر کو توڑنے کا ارادہ کر لیا۔ ابھی وہ یہ سے ملی جامہ پہنانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ گلی میں سے منگتے فقیر کی صدا آئی "ربّا اپنے بندیاں نوں ہدایت دے"۔ ہر چند کہ یہ صدا لگانا منگتے فقیر کا روز کا معمول تھا مگر اس صبح اسے لگا کہ یہ صدا اجان بوجھ کر اسے سنانے کی غرض سے بلند کی گئی ہے۔ یہ سوچ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ اسے خیال گزرا کہ اس کے خلاف بڑے پیمانے پر سازش تیار کی جا چکی ہے تاکہ اسے مقررہ راستے سے روگردانی کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ جب وہ با دلِ نخواستہ تیار ہو کر بس اسٹاپ پر پہنچا تو اس نے دفتر جانے والی بس میں سوار ہونے سے گریز کیا تاکہ دفتر والے اس کے دفتر دیر سے پہنچنے کا سبب دریافت کر سکیں۔

چنانچہ جب بس اسٹاپ پر آ کر رکی تو وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس پر کنڈکٹر نے چلا کر کہا "بابو آج جانا نہیں کیا؟" اس نے قہر آلود نظروں سے کنڈکٹر کی طرف دیکھا، اسے لگا جیسے وہ ہونٹوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ سجائے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہا ہے، جیسے کہہ رہا ہو "مجھے تمہاری چالاکی کا پتہ ہے"۔ غصے سے بڑبڑاتا ہوا وہ اچک کر بس میں سوار ہو گیا۔ سہ پہر کو جب وہ بیزار سا ہو کر دفتر سے گھر لوٹا تو برآمدے میں داخل ہوتے ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا جا رہا ہے اس کا چھوٹا بیٹا ایک گردان رٹ رہا تھا — ہتھوڑے کی ضربوں کی طرح گردان کے صیغے اُس کے سر پر پڑنے لگے۔ اُسے لگا کہ ابھی اس کا بھیجا کھوپڑی کو پھاڑ کر فرش پر آن گرے گا اور یہی گردان رٹنے لگے گا، مگر پھر اس کے بیٹے نے یک دم گردان رٹنا بند کر دی اور بستے میں سے سلیٹ نکالنے لگ پڑا۔ جیسے سائیکلون کا رخ مڑ گیا، گردباد اٹھتے اٹھتے تھم گیا۔ نجانے وہ بے قابو ہو کر کیا کچھ کر بیٹھتا۔ اس لیے اسے یہی سمجھ میں آیا تھا کہ اس کے بیٹے کو اس کے گم ہو جانے کا پتہ چل گیا ہے اور اب وہ محلے کے دوسرے لڑکوں بالوں کے ساتھ مل کر اس بات کا اچھل اچھل کر ڈھنڈورا پیٹنے لگے گا۔ بہرحال یہ فوری خطرہ تو ٹل گیا تھا مگر اس کی زندگی کی گردان میں خلل مزید بڑھ گیا اور یہ خطرہ اس پر منڈلانے لگا کہ رشتوں اور رابطوں کے صیغے اپنی اپنی جگہیں بدلنے کے لیے بے قرار ہو رہے ہیں، بلکہ اس کی اپنی شخصیت کا صیغہ اپنا مقررہ مقام بدلنے پر بضد دکھائی دینے لگا ہے۔

اس نے کھانسی کی گرہ کو ڈھیلا کرتے ہوئے آگے قدم بڑھایا اور چلتے چلتے لحظہ بھر کے لیے دیوار پر لگے آئینے میں اپنے چہرے کی ایک جھلک دیکھی، اس کا دایاں چہرہ قریب قریب غائب ہو چکا تھا، اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے چہرے کے اس حصے کو ڈھانپ لیا۔ اس کی بیوی نے رومال سے آدھا چہرہ ڈھانپے ہوئے اسے دیکھا تو پوچھا "اسے کیا ہوا، خیریت تو ہے"۔ اس نے انتہائی برشتگی سے جواب دیا "آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے" اور سیدھا غسل خانے

میں گھس گیا۔

ادھورے چہرے، ادھورے ناطے، ادھورے خواب، اس کو ادھورے پن کا روگ شدید کرب کی صورت سہنا پڑ رہا تھا۔ لیڈی آف شیلٹ کی طرح شاید اسے بھی اب کھوئے ہوئے محبوب کے چہرے کو آئینے میں ہی ڈھونڈنا پڑے، مگر دوسری طرف آئینہ بھی تو دو اکائیوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ شاید آئینہ کا بھی آدھا حصہ مفلوج ہو چکا تھا اور ٹھیک طرح سے انعکاس نہیں کر رہا تھا۔ اس نے کئی بار صابن سے خوب جھاگ بنا کر اپنا چہرہ مل مل کر دھویا لیکن آئینے میں اسے فقط اپنے چہرے کا بایاں حصہ ہی دکھائی دیا جس پر انتقام لینے کی خواہش مچل رہی تھی۔ نجانے یہ کس کا خون بہانا چاہتا تھا۔ کس کو ختم کرنے کے درپے تھا۔ چہرے کا دایاں حصہ اب بالکل نیست و نابود ہو چکا تھا، دایاں حصہ جو ہمیشہ اسے ناک کی سیدھ میں چلنے کی تلقین کرتا تھا، جس پر شک جلالی، تابعداری اور پرہیزگاری کی چھاپ صاف پڑھی جا سکتی تھی، حتیٰ کہ شناختی کارڈ تک جیب میں رکھنے کی اسے ضرورت نہیں پڑتی تھی، کئی مرتبہ اسے ایسی جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا تھا، جہاں شناختی کارڈ دکھانا ضروری تھا، مگر باری آنے پر اس کی شکل صورت دیکھتے ہی یہ کہا جاتا "نہیں نہیں کارڈ رہنے دیں، آپ تو چہرے ہی سے شریف آدمی لگتے ہیں۔" گویا اس کا چہرہ، چہرہ نہیں رہا تھا، شناختی کارڈ بن گیا تھا، تصدیق شدہ ہونا فائیڈ! جس میں کوئی کھوٹ شامل نہ ہو، حالانکہ کھوٹ تو خالص سونے کی ڈلی میں بھی کسی نہ کسی ماترا میں موجود ہوتا ہے، تو کیا وہ سونے سے بھی زیادہ پاک و صاف ہو گیا ہے! یہ سوچ کر اس نے اپنے چہرے کو ہتھیلیوں سے جب بھی مسلا تھا تو سونے کے چھلکے رینے تو انہیں کے اصولوں سے نہیں چھوٹے تھے البتہ پسینے کے قطروں سے اس کی ہتھیلیاں ضرور تر بتر ہو جاتی تھیں۔

باہر کا ہجانا بھی اس سے جو ملا ہوا تھا اور پہلے ایسا بھی ایسا لگتا کہ کوئی چھ سال چھوٹی تھی، دونوں سنگ رہتے وہ حاضر ہوتے ہوئے بھی غائب تھا کیونکہ وہ پیدا ہی ایسے مقام پر ہوا تھا جہاں آگے نہ کوئی راستہ تھا اور نہ پیچھے۔ اسے یاد تھا کہ اس کا بڑا بھائی اسے چھوٹی بہن کے ساتھ کھیلنے کا حکم دیتا تھا اور چھوٹی بہن ہمیشہ بڑے بھائی کے ساتھ کھیلنے کا مشورہ دیتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دونوں کے ساتھ ناطہ توڑ بیٹھا۔ اسے اب بھی یاد تھا کہ اسکول سے آنے کے بعد وہ شام کو اکیلا ہی دیوار کی طرف منہ کر کے سات ربڑ کی گیند کو زور سے دیوار پر مارتا اور پھر خود ہی اسے اچکنے کی کوشش کرتا گویا دیوار ہی اس کی سنگی ساتھی تھی۔ دفتر کی میز پر فائل ورک کرتے ہوئے اسے کئی مرتبہ اس بات کا احساس بھی ہوا تھا کہ سارا قضیہ ہی درمیانی حالت کا ہے۔ چاہے یہ درمیانی کلاس ہو یا ذات، نہ اوپر فٹ بیٹھتی اور نہ نیچے۔ درمیان میں ہی اڑی رہتی ہے اور پھر ایک دن ٹوٹ جاتی ہے اور ٹوٹ کر یا تو نیچے گر پڑتی ہے یا ربڑ بینڈ کی طرح اچھل کر اوپر کہیں چلی جاتی ہے۔ شاید یہی اس کلاس کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ لیکن جب سے اس کے چہرے کا بایاں حصہ اس پر غالب آیا تھا، اس کے رویّے میں بھی ڈرامائی تبدیلی رونما ہو گئی تھی۔ ملنساری، صلح جوئی اور مروّت نام کی شے اس میں گویا گل سڑ کر ختم ہو گئی تھی، اس کی جگہ ہوس، عداوت اور مکّاری نے لے لی تھی۔ وہ بات بات پر بیوی اور بچّوں کو کاٹ کھانے کو دوڑتا، بچّوں کی کئی مرتبہ معمولی معمولی کوتاہیوں پر پٹائی بھی کر ڈالی تھی یہاں تک کہ اس معاملے میں بیوی کو بھی نہیں بخشا تھا۔ پہلے اس کا ضرورت سے زیادہ مرنجاں مرنج ہونے پر گھر والوں سے تعلق معدوم ہو گیا تھا اور اب اس کی غیر معمولی درشتگی کی بنا پر گھر کے مکینوں سے رشتہ ختم ہو گیا۔ دفتر میں بھی وہ اپنے ساتھیوں سے چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ پڑتا۔ غصّے سے فائلوں کو فرش پر پٹخ دیتا۔ ہر وقت ماتھے پر سو سو بل ڈالے رکھتا اور چائے صرف اپنے لیے ہی منگاتا۔ دفتر والے شروع شروع میں تو اس کے اندر آنے والی اس تبدیلی کو دیکھ کر حیران ہوئے پھر رنجیدہ اور بعد میں انھوں نے اس کا نوٹس لینا ہی چھوڑ دیا اور اس کی حالت پھر پہلے جیسی ہو گئی۔ پہلے وہ سب سے ناطہ جوڑ کر بھی غائب تھا اور اب سب سے ناطہ توڑ کر بھی اسی طرح غائب ہو گیا تھا۔

البتہ جب سے چہرے کا بایاں حصّہ اس پر غالب آیا تھا، اس نے "ارب پتی" بن جانے کا منصوبہ سنجیدگی سے بنانا شروع کر دیا تھا، حکومت کے کسی پانچ سالہ ترقیاتی پلان کی طرح۔ اس سلسلے میں اس نے خوب سوچ بچار کی، بڑی زبردست منصوبہ بندی بھی کر ڈالی۔ جمع خرچ کا پورا پورا حساب کتاب بھی بنا ڈالا، مگر سب معاملہ ہی چوپٹ ہو گیا۔ کوئی اس کا سنجیدگی سے نوٹس لیتا تو بات بنتی۔ وہ ہر قسم کا کام ہر قیمت پر کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن اس کا سابقہ ریکارڈ اس کے آڑے آجاتا۔ اس نے متعدد بار روا ضع طور پر ہیرا پھیری کرنے والا چلن بھی اختیار کیا مگر نتیجہ صفر نکلا — اور پھر ایک دن ایسا ہوا کہ اس کے باس نے ایک خاص فائل اس سے طلب کی تو وہ فائل لے کر سیدھا کمرے میں چلا گیا اور فائل اس کے سامنے کھول

دی۔ باس کئی لمحوں تک فائل کی ورق گردانی کرتا رہا اور ہر صفحہ اُلٹنے پر ایک لمبی سی "ہوں" بھرتا۔ پھر اس نے بڑی مکاری سے اپنے باس کو مخاطب کیا "سر آپ حکم دیں تو میں اس پارٹی سے معاملے طے کر لوں" اس کے باس نے یکبارگی نگاہیں اوپر اٹھائیں، ان نگاہوں میں سینکڑوں سوال اور اندیشے، چھتّے سے چھٹی شہد کی مکھیوں کی طرح کلبلا رہے تھے۔ تب ایک عجیب معنی خیز مسکراہٹ اس کے باس کے لبوں پر پھیل گئی اور اس نے بڑے تحمّل سے جواب دیا "شریف صاحب میں آپ کے ریکارڈ سے باخبر ہوں" اتنا کہہ کر وہ ٹیلی فون پر کوئی نمبر ڈائل کرنے لگا۔ کچھ لمحوں تک وہ چپ چاپ میز کے پاس کھڑا رہا، جیسے کوئی اسٹوپا ہو، پھر لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے باہر آگیا۔ اس کے اندر بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ رہا تھا، ڈھیہ رہا تھا، دلدوز چیخیں، کراہیں، قہقہے اس کے اندر گڈمڈ ہو رہے تھے، کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، جیسے دو متحارب قوتیں آپس میں برسرِ پیکار ہوں اور وہ بوٹی بوٹی ان دونوں میں بٹ رہا ہو۔ وہ دفتر سے باہر نکل آیا، اُسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس کا دماغ سن ہو چکا تھا، اردگرد کے ماحول سے اس کا رابطہ یکایک منقطع ہو گیا تھا۔ زندہ لاش کی طرح وہ چلتا رہا۔ فٹ پاتھ، چوراہے، گلیاں، بازار اس کے قدموں تلے سے کھسکتے جا رہے تھے۔ تب اس کے قدم گھر کی دہلیز کو پار کرکے اندر داخل ہوئے اور سیدھے آئینے کے سامنے جا کر رک گئے۔ تادیر وہ خالی خالی نظروں سے آئینہ پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ آئینہ میں اس کا چہرہ مکمل طور پر غائب ہو چکا تھا۔ نہ دایاں حصّہ باقی تھا نہ بایاں! پھر جانے اسے کیا ہوا کہ اس نے آئینہ پر تھوک دیا اور پاگلوں کی طرح اس مقام کو اپنے ناخنوں سے کھرچنے لگا جہاں کسی زمانے میں اس کا پورا چہرہ ہوا کرتا تھا۔ ❋

بقیہ صفحہ ۱۹ — ورودِ مسعود سے نذرِ مسعود تک

خاں صاحب سے عرض ہے کہ وہ حصّے جو اردو کے مشہور مصنّفین اور معروف اساتذہ کی تضحیک اور تکلیف کا سامان بہم پہنچاتے ہیں ان کی مشہور آپ بیتی ورودِ مسعود اور نذرِ مسعود میں نہ ہوتے تو بہت اچھا ہوتا اور اب انھیں نئے ایڈیشن سے خارج کر دیا جائے تو اسے مستحسن قدم قرار دیا جائے گا۔ یہ بات اس لیے ضروری ہے کہ "ورودِ مسعود" کو "وِرد مسعود" ہی رہنا چاہیے "ورودِ نامسعود" نہیں ہونا چاہیے۔ ❋

بقیہ صفحہ ۳۲ — دیواروں کے بیچ

آتا ہے۔ گھر والے جا چکے ہیں۔ گھر بک چکا ہے نہ رہنے کا انتظام ہے نہ کھانے پینے کا بندوبست۔ ایک دو راتیں اِدھر اُدھر گذارنے کے بعد اسے رہنے کے لیے ایک کمرہ مل جاتا ہے۔ سی پی ایم کی مقامی شاخ کے سکریٹری موتی لال اپنے آفس کے نیچے ایک کمرہ خالی کروا کے اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔ کوئی بستر لاتا ہے کوئی صراحی اور گلاس دیتا ہے اور یوں وقت گذرنے لگتا ہے۔ رہنے کا ٹھکانہ تو ہو جاتا ہے مگر بنا کسی ذریعۂ معاش کے تعلیم جاری رکھنا، دو وقت پیٹ بھرنا مشکل ہے۔ دن کا زیادہ وقت رام سنگھ کی کتابوں کی دوکان میں گذرتا ہے۔ دوکان کا نام ساہتیہ سنگم ہے۔ یہاں دن بھر ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ یہاں کتابیں بکتی کم ہیں، پڑھی زیادہ جاتی ہیں۔ یہ دوکان کمیونسٹ پارٹی سے متعلق ہے۔ (باقی آئندہ)

بقیہ صفحہ ۴۲ — ممتا

کے لیے استعمال کر لیا اور ہندو طریقے سے دفنا دیا۔ یہ واقعہ اس نے گھر آکر مجھے سنایا تھا" یہ سنتے ہی کلّو خاں نے گنگا پرشاد کو بازوؤں میں بھینچ لیا "تم تو مجھ سے بھی آگے نکل گئے میرے دوست۔ مجھے تو ممتا نے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا لیکن تم کو انسانیت نے ایسا کرنے کو اکسایا تھا کیوں کہ اس وقت تمہارے پاس کوئی بچہ نہیں تھا۔ انسانیت کا درجہ ممتا سے کہیں آگے ہوتا ہے" کلّو خاں چپ ہوا تو میں نے کہا "میرے بھائی جیسے محبت ہی خدا ہے ویسے ہی ممتا ہی انسانیت ہے" کلّو خاں کا چہرہ بہت خوش تھا ہم نے مڑ مڑ کر بہت دور تک دیکھا کہ وہ ایک ہی جگہ کھڑا ہم کو نظروں سے اوجھل ہونے تک دیکھتا رہا تھا۔

میں کھیت سے ہارا تھکا گھر آنے کے بعد گھنٹوں گڑیا کو مخاطب کر کے اپنی بیٹی سے کی جانے والی باتیں دہراتا رہتا تھا کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گڑیا کے اندر سے بھی میری بیٹی کے منہ سے نکلے تمام توتلے الفاظ نکلتے سنائی دے رہے ہیں۔ کبھی کبھی میں زندگی سے اُوب جاتا تھا اور اس بے مقصد جینے سے ندی میں کود کر مرنا اچھا سمجھنے لگتا تھا مگر یہ گڑیا میرے پیروں میں بیڑی بن کر پہنے لگتی اور مجھے کسی حسین یادگار کے سہارے جیتے رہنے پر ہی راضی کر لیتی تھی۔ میں نے ساری زندگی اسی طرح بتا دی وہ دونوں تو مجھ سے الگ ہو گئے مگر "تو" ابھی تک میرے ساتھ ہے۔ یہی میری حیات دلبا کا زندہ ہے مِل گیا نہ ثبوت اس حقیقت کا۔ ❋

دھنک رنگ

پنہاں

درد بدن کے بھی سب دل میں رہتے ہیں
اب اشکوں کے دریا الٹے بہتے ہیں
سوؤں تو تعبیریں بھی سو جائیں سب
آنکھ کھلے تو خواب ادھورے رہتے ہیں
کچھ وہ جن کو کام ہے اپنی خوشیوں سے
لیکن کچھ اوروں کے دکھ بھی سہتے ہیں
وہ باتیں جو کہنا چاہے دل تم سے
تنہائی میں اپنے آپ سے کہتے ہیں
پنہاں تم ہو لفظوں کی محتاج مگر
اک وہ ہیں جو شعر نظر سے کہتے ہیں

● عبداللہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین، ناظم آباد، کراچی

شمس تبریزی

اپنا گھر بھی ہمیں آسیب کا گھر لگتا ہے
بند دروازہ جو کھل جائے تو ڈر لگتا ہے
بعد مدت کے ملاقات ہوئی ہے اس سے
فرق اتنا ہے کہ اب اہلِ نظر لگتا ہے
اس زمانے میں بھی کچھ لوگ ہیں فن کے استاد
کام کوئی بھی کریں دستِ ہنر لگتا ہے
جس نے جی چاہا اسے لوٹ کے پامال کیا
اپنا دل بھی ہمیں دلی سا نگر لگتا ہے
اپنی کچھ بات ہے احباب میں ورنہ اے شمس
سب دھواں ہے وہ جہاں کوئی شجر لگتا ہے

● ٩٠٣ سیکٹر ٩ پنچکولہ ـــ (ہریانہ)

اظہار سلیم

شب زخمی ابھیاس نیا
شعلہ صفت احساس نیا
صبح گھنی بستی کا شور
شام ڈھلی بن باس نیا
اترے پرندے ساحل پہ
ختم سفر، دشواس نیا
گم شدگی اظہار بنی
اپنی انا کا پاس نیا
سرخ سمندر، آگ بھنور
جلتا ہوا اتہاس نیا

● جامعہ روڈ، مسلم نگر۔ مالیگاؤں ٤٢٣٢٠٣

شارق کیفی

اسے رستہ دکھانا چاہتا ہوں
کہ خود رستے پہ آنا چاہتا ہوں
سبھی سے راز کہہ دیتا ہوں اپنے
نہ جانے کیا چھپانا چاہتا ہوں
بہت خوش ہوں مگر اس جیت پر میں
اکیلے مسکرانا چاہتا ہوں
وہی تو ایک میرا ہے جہاں میں
اسے بھی آزمانا چاہتا ہوں
بہت دن رہ لیا ہم راہ اس کے
اب اس کو یاد آنا چاہتا ہوں

● ١٣٢ گڑھی راؤ بہار سنگھ، بریلی (یوپی)

احمد کمال

کون کس کا درد بانٹے، کربلا ہر شخص ہے
خون میں لت پت حسینی قافلہ ہر شخص ہے
روز اک تازہ قیامت کا وہی ہے سلسلہ
بولتا کوئی نہیں ہے، دیکھتا ہر شخص ہے
کرب، آہیں، ہچکیاں، بیچارگی کے درمیاں
اجنبی ہر شخص ہے اور آشنا ہر شخص ہے
ہر کوئی مصلوب ہے، اپنے بدن کے شہر میں
سنت منصور کا اک آئینہ ہر شخص ہے
زندگی ہے جھیل گہری اور سطح آب پر
ٹوٹتا، بنتا، بکھرتا دائرہ ہر شخص ہے

● نیو مڈل اسکول (ٹسکو) جمشید پور ـــ ١

طارق بن ثاقب

خوشی ہو غم ہو، ہر اک حادثے کا خوگر ہوں
خدا کا فضل ہے، جس حال میں ہوں بہتر ہوں
نہ مجھکو تاج کی حاجت، نہ مملکت درکار
دلوں کو فتح جو کر لوں تو میں سکندر ہوں
تہِ شعور سے ابھروں تو آسماں چھو لوں
غبارِ راہ دیارِ عرش کا میں شہپر ہوں
مرا وجود کسی ایک کی نہیں میراث
میں مثلِ موجِ صبا خوشبوؤں کا لشکر ہوں
سیاہ شب کا مسافر نہیں ہوں میں طارق
نمودِ صبح کے افکار کا پیمبر ہوں

● امیر منزل، محلہ بڑا چھتہ مسجد، دیوبند

اُودھیسن ارمان

یو، ایس، اے، ہوسپٹل گاندھی روڈ، بلاری۔ ضلع مراد آباد۔ ۲۰۲۴۱۱

مُمتا

اس وقت میری عمر لاکھوں سال کی ہے اور پتہ نہیں کہ میں کتنے حال تک اور جیوں۔ جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے میں نے انیکوں تجربے کیے ہیں۔ سچ مچ کوئی کسی کا نہیں ہوا بھائی نے بھائی کا قتل کیا دوست نے دوست کو دھوکا دیا اپنوں نے اپنوں کا ساتھ چھوڑا سبھی رشتے ناطے الیکشن میں کیے گئے وعدوں کی طرح ناقابلِ اطمینان اور بوڑھے کے دانتوں کی طرح بے بھروسے ثابت ہوئے ایک بھی وقت پر کھرا نہیں اترا مگر تو! آدم حوّا کی قسم اتنی لمبی چوڑی زندگی میں بھی ایک پل کو مجھ سے جدا نہیں ہوئی تیرا خلوص و محبت لا جواب ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت دینے سے پہلے تو مجھے ایک بات کہہ لینے دے کہیں میں بڈھا کھوسٹ بھول نہ جاؤں۔

اس رات جب اچانک سیلاب آگیا اور ندی ایک شرابی کی طرح حد سے باہر ہوگئی تھی ہم دونوں دن بھر کھیت میں کام کرنے سے اتنے تھک گئے تھے کہ کھاٹ پر پڑتے ہی نیند آگئی اپنی پانچ سال کی بیٹی کو اس کی گڑیا دے کر جیسے تیسے سلایا تھا۔ باہر بڑی مست ہوا چل رہی تھی ننھی ننھی بوندیں سبزے پر عطر آب کا کام کر رہی تھیں اور ایک مدھر سُر سا پیدا ہو رہا تھا۔ ایسے نشیلے ماحول میں رنگی بھوگی سوگئی جو گئی ان چار کو چھوڑ کر کس کو نیند نہیں آتی۔ سمندر سے جا ملنے کے عشق میں دیوانی ندی نے دھیرے دھیرے گاؤں کے ایک طرف کا حصّہ نیچے ہی نیچے گلا کر خالی کر دیا اور اس کٹان سے دھڑا دھڑ مکان ایسے گرنے لگے جیسے کٹے ہوئے پیڑ۔ ندی کی تیز دھار نے نہ مسجد کو بخشا نہ مندر کو چھوڑا نہ بیوہ کا گھر نہ ظالم و مظلوم کی کٹیا پوری بستی میں ہاہا کار مچا ہوا تھا۔ جب آدھا مکان میرا بھی چھپاک سے تیز رو پانی میں جا گرا تو میں ہڑبڑا کے اُٹھا اور دیکھا تو مکان کا وہ حصّہ پانی میں بہہ گیا تھا جس میں میری بیوی اپنی بیٹی کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ قدرت بھی جب ظلم کرنے کی ٹھانتی ہے تو چور ڈکیتوں کی طرح رات ہی کا وقت چنتی ہے زلزلے اکثر رات ہی کو آتے ہیں سمندر کا پانی رات ہی کو چڑھتا ہے مدوجزر کبھی دن میں نہیں آتا سیلاب بھی رات ہی میں آتے ہیں۔

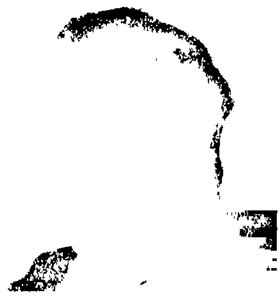
"ہے بھگوان تو نے یہ کیا کیا؟" گھبراہٹ میں میرے منہ سے نکلا اور میں اپنی جان لے کر گاؤں کے اونچے حصّے کی طرف جہاں مجھ سے پہلے بہت سے سیلاب زدہ لوگ پہنچ چکے تھے بھاگ چھوٹا۔ میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا تھا میری سانسیں پھول رہی تھیں میں ایک ٹیلے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دم لیا۔ ابھی بوندیں تھمی نہیں تھیں میں دل ہی دل میں سوچنے لگا "اگر بھگوان مجھے بھی انھیں کے ساتھ بہا دیتا تو کتنا اچھا ہوتا" اسی وقت دل کے ایک کونے سے آواز ابھری "تم بدنصیب ہو اور بدنصیب کو مانگنے سے موت بھی نہیں ملتی ہے" میں نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا۔ اور ادھر اُدھر دیکھا اب میری سانسیں نارمل ہو چکی تھیں۔ میں وہاں سے اٹھا اور دوسرے لوگوں کے قریب پہنچا تاکہ معلوم کروں کہ کس کس کا کیا کیا نقصان ہوا ہے سب کی باتیں سُنیں سب کا دکھڑا سُنا کتنے ہی لوگ مجھ سے بھی زیادہ بدنصیب تھے کسی کو خود سے زیادہ دکھی دیکھ کر اپنا دکھ معمولی لگنے لگتا ہے۔ یہی میرا حال ہوا۔ میں نے اپنے صدمہ کو برداشت تو کر لیا مگر یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے موتیابند کے پانی کی طرح ہر جگہ ہر وقت چھایا ہوا تھا۔ ساری رات لوگوں کے دکھ درد سُننے سنانے میں بیت گئی بڑی بے چینی تھی بُرا حال تھا۔ گھر کے گھر تباہ ہو گئے تھے۔ وہ بڑا کارساز ہے۔ مہربان ہے رحیم ہے کریم ہے۔ آج میرے دل و دماغ میں پرانے کاریہ دار کی طرح بسی ہوئی یہ باتیں نوابوں کی شان میں لکھے گئے قصیدوں کی طرح بے معنی محسوس ہونے لگیں۔ ایک طرف تو لوگ بلک بلک بوس محلّوں میں سکھ سے سو رہے ہیں اور دوسری طرف ندی کنارے کے تمام گاؤں کٹتے بہتے چلے جا رہے ہیں اگر یہ سچ مان لیا جائے کہ یہ لوگ اپنے اپنے کرموں کے پھل بھوگتے ہیں تو کٹے ہوئے گاؤں میں سب گنہگار اور پاپی تھے اور جو نہ کٹ سکا وہ سب پاک صاف تھے، دھرم کے ٹھیکیدار کچھ بھی کہیں مگر میرا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ دنیا والوں کی طرح بھگوان بھی بڑوں پہ کرم اور چھوٹوں پر ستم کرتا ہے اس کے یہاں بھی منہ دیکھا انصاف ہے۔

میں دل جلا اس طرح سوچ دچار رہا تھا کہ پیچھے سے منصور علی میرا پڑوسی آدھمکا اور بولا "کہو بھئی کیا حال ہے" میں نے حقیقت بیان کی تو وہ رونے لگا میرا بہت اچھا پڑوسی تھا دل سنبھال کر اس نے آگے کہا "جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا یہاں سے دس پندرہ کوس پورب میں کوسی ندی کے پل کے آس پاس مچھیروں نے پورے پاٹ پر جال پھیلا رکھے ہیں چلو وہاں چلتے ہیں تمہاری بیٹی اور بیوی کا کچھ پتہ ضرور چل جائے گا۔ کم سے کم اپنے ہاتھوں سے ان کی گت سگت تو کر دو گے"۔ میری سمجھ میں منصور علی کی بات جچ گئی اور دونوں منزل مقصود کی طرف چل دیے۔ برسات کے دن تھے کچ کانڈ کا راستہ تھا پیدل پیدل چلتے چلاتے شام کے پانچ بجے پل پر پہنچ گئے پوچھ تاچھ کی تو ایک ملاح نے کہا "صبح پانچ بجے کے قریب ایک پانچ چھ سال کی لڑکی کی لاش روشن پور کے کلو خاں کو ملی تو تھی۔ ایک گڑیا بھی اس کی بغل میں دبی ہوئی تھی۔ بڑا دردناک منظر تھا۔ بچی نے مرتے دم تک کھلونا نہیں چھوڑا تھا" یہ کہہ کر ملاح چپ ہو گیا۔ ہم روشن پور چلے گئے اور پوچھتے پاچھتے اس کے گھر بھی پہنچ گئے وہ اپنے جانوروں کو کھولنے باندھنے لگا تھا اس کے چہرے پر داڑھی تھی، پچاس سے اوپر کا معلوم ہوتا تھا ہم نے سلام کیا اور اپنا تعارف دیا۔ ساری کتھا سنائی، اس نے بڑی ہمدردی سے برتاؤ کیا خاطر تواضع کی اور بولا "جی ہاں صبح بغل میں کھلونا دبائے ایک بچی کی لاش ملی تو تھی۔ میں نے مسلمانی طریقے سے عزت کے ساتھ اس کو دفنا بھی دیا" "مگر آپ تو ہندو ہیں"۔ "جی ہاں میں ہندو ہوں مگر بچوں کو تو ہمارے یہاں بھی دفنایا ہی جاتا ہے۔ چھوٹے بچوں کو دیکھ کر ہندو مسلمان کی کوئی پہچان نہیں ہوتی ہے وہ تو درزی کے پاس آنے سے پہلے کورے کپڑے کی طرح ہوتے ہیں"۔ "کیا وہ گڑیا آپ کے پاس ہے"؟ "نہیں بھائی جان! پہلے تو ہم نے اس کو نکال لیا تھا مگر بعد میں اس کے عزیز کھلونے کو جس کو اس نے ہر حال میں اپنے ساتھ رکھا اسی کے ساتھ رکھ دیا اس طرح روح کو تسکین ملے گی"۔ "کہاں ہے اس کی قبر؟" میں نے اندھیرے سے ابھر صبح کے اجالے کی طرح غم میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "چلیے میں چل کر بتاتا ہوں" اتنا کہہ کر کلو خان میرے ساتھ ہو لیا اور قبر پر لے گیا میں نے چوہے کی طرح، جلدی جلدی انگلیوں سے مٹی ہٹا کر قبر خالی کی مجھے وہی گڑیا دکھائی دے گئی میں نے اس کو دھویا صاف کیا اور اس کو پیار کیا پھر اپنی بیٹی کا چہرہ صاف کر کے پیار کیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ روز کی طرح مجھ سے کہنے والی ہے "پتا جی تم آگئے" وہ مر چکی تھی مگر مجھ کو یقین نہیں آ رہا تھا ممتا آدمی کو پاگل بنا دیتی ہے پھر میں نے اس کو ہمیشہ کے لیے آنکھوں سے اوجھل کر دیا کمبخت آنسو بھی نظر کو دھندلا کرنے کے لیے تیار ہی بیٹھے تھے۔ دنیا میں اپنوں کو اپنانے کی خوشی گوارہ نہیں ہوتی ہے۔ میں نے گڑیا سنبھال کے رکھ لی یہ اس کی آخری حسین یادگار تھی۔ یادگار ہوتی ہے یہ میرے غموں کو ہلکا کرنے میں مددگار ثابت ہو گی میں نے گھر کو روانہ ہوتے وقت کلو خاں کا شکریہ ادا کیا اور کہا "کلو خاں تم نے یہ کام کسی بھی نظریے سے کیا ہو تعریف کے قابل ہے اور تمہارے بھلے مانس ہونے کا ثبوت ہے تم چاہے کسی بھی صدی کے انسان ہو مگر اس صدی کے انسان نہیں ہو سکتے۔ اس دور میں تو لوگ باگ ایک دوسرے کی مٹی خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں کپڑے اتارنے کی جگت لگا رہے ہیں۔ کیا کبھی عورت کی لاش بھی ملی تھی؟" میں نے آخر کلو خاں سے سوال کیا اس نے اداسی سے انکار کرتے ہوئے سر ہلایا تبھی میرے دل نے مجھ سے کہا "وہ اسی جگہ مکان کے ساتھ دفن ہو گئی ہو گی" کلو خاں کچھ سوچ کر بولا "جس وقت میں کھانا کھانے آ گیا تھا اس وقت کسی کو کسی عورت کی لاش ملی ہو اس کا پتہ نہیں، عام طور سے تیراک لاشوں کو ناؤ پر کھینچ کر وہیں اس کے ناک کان صاف کر کے پانی میں بہا دیتے ہیں۔ اسی لالچ میں تو وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتے ہیں۔ سبھی کا منشا کمانا ہے"۔

"مگر میری لڑکی کے پاس تو ایک چھلا بھی نہیں تھا پھر تم نے اس کے ساتھ اتنا اچھا برتاؤ کیوں کیا" میں نے یہ سوال کیا مگر پھر پچھتایا کہ اتنی گھٹیا بات منہ پر نہیں لانی چاہیے تھی وہ برا مان سکتا تھا لیکن اس کے چہرے پر شکن بھی نہیں آئی اور وہ نرمی سے بولا میرے پاس بھی اتنی ہی بڑی ایک لڑکی تھی جو میری عدم موجودگی میں تیرنے کی مشق کرتے ہوئے ڈوب گئی تھی۔ اس کی لاش بھی کہیں نہیں ملی یا تو اس کو مچھلیاں کھا گئی ہوں گی یا پھر ...." کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔ وہ پھر کچھ دیر چپ رہا پھر سنبھل کر بولا "بے رحم موت ماں باپ سے سب کچھ چھین سکتی ہے لیکن ممتا نہیں چھین سکتی اسی جذبے نے آج مجھے تمہاری بیٹی کے ساتھ یہ سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ کچھ دیر کو تو مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں اپنی ہی بیٹی کو سپرد خاک کر رہا ہوں"۔

اس کے جسم پر سُرخ سوٹ تھا اور پیروں میں چھ چھ انگلیاں تھیں"۔ منصور علی نے فوراً کہا میں چپ رہنا چاہتا تھا مگر دوسرے کے منہ پر چھپن کیسے رکھتا "بالکل صحیح بات ہے مگر تم کو یہ کیسے معلوم ہے" کلو خاں نے پوچھا اس وقت کلو خاں کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔ اولاد کا درد بھی عجیب درد ہوتا ہے منصور علی نے جواب دیا "یہ میرا دوست ہے اس کی سسرال یہاں سے پندرہ سولہ کوس پورب میں اسی ندی کے کنارے پر ہے ایک دن یہ اپنی سسرال میں تھا اور ندی پر نہانے گیا تھا کہ ایک لڑکی کی لاش پانی میں آتی ہوئی دکھائی دی اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور تیر کر اس کو پار لے آیا۔ یہ نہانے کے بعد بدلنے کو جو نئی دھوتی لے گیا تھا اسی کو اس لڑکی پر کفن

(باقی صفحہ ۹۳ پر دیکھیے)



افتخار امام صدیقی

◆

وہ خواب تھا، بکھر گیا، خیال تھا، ملا نہیں
مگر یہ دل کو کیا ہوا! یہ کیوں بُجھا؟ پتہ نہیں

ہر ایک دن، اداس دن، تمام شب اُداسیاں
کسی سے کیا بچھڑ گئے، کہ جیسے کچھ بچا نہیں

وہ ساتھ تھا، تو منزلیں، نظر نظر چراغ تھیں
قدم قدم سفر میں اب کوئی بھی لب دعا نہیں

ہم اپنے اس مزاج میں، کہیں بھی گھر نہ ہو سکے
کسی سے ہم ملے نہیں، کسی سے دل ملا نہیں؎

ہے شور سا طرف طرف کہ سرحدوں کی جنگ میں
زمیں پہ آدمی نہیں، فلک پہ کیا خدا نہیں؟

◆

نہ لفظ ہوں گے نہ کوئی باقی زباں رہے گی
چہار سمتوں میں گونجتی بس فغاں رہے گی

مزاج اپنے بھی موسموں نے بدل دیے ہیں
بہار چاہے جدھر سے گذرے، خزاں رہے گی

تمام چہروں کا رنگ و روغن اتر رہا ہے
نہ جانے کب تک فضائے عالم دھواں رہے گی

بس اک یہی غم تو میری سانسوں کو جی رہا ہے
بچھڑ کے مجھ سے یہ زندگی بھی کہاں رہے گی

افق پہ لکھی ہر اک عبارت میں پڑھ رہا ہوں
ابھی یہ دنیا بہت دنوں تک جواں رہے گی

سفر عذابوں سے اُڑنے والی یہ گرد میری!
یگوں یگوں تک ہر ایک منزل نشاں رہے گی

◆

وہ نہ ہو گا تو کیا کمی ہو گی
بس! ادھوری سی زندگی ہو گی

غم ہی چاندی ہے، غم ہی سونا ہے
غم نہ ہو گا تو کیا خوشی ہو گی

اس کو سوچوں، اسی کو چاہوں میں
مجھ سے ایسی نہ بندگی ہو گی

بات ہونٹوں پہ جسم گئی ان کے
چپ یہ ٹوٹے تو ان کہی ہو گی

ڈوب جائے گی شور میں دنیا
لفظ ہوں گے نہ خامشی ہو گی

؎ بہ ظاہر ہیں یہی اسباب دنیا سے نہ ملنے کے!
کسی سے ہم نہیں ملتے، کسی سے دل نہیں ملتا [سیمابؔ]

مکتوبات

مسعود تحسین خاں ۔ جاوید منزل ، جامعہ اردو روڈ ، علی گڑھ (یوپی)

آپ کا شاعر بلا کرم "اس ناحق شناس" پر مسلسل رہتا ہے ۔ چنانچہ شاعر کے دو تازہ شمارے موصول ہوئے ۔ یوں تو بہت سی چیزیں ان دونوں میں بہت اچھی ہیں لیکن خاص طور پر اپنے "حسن و قبح" کی وجہ شاہین مفتی (گجرات (پاکستان)) کی نظم "آدھی لڑکی" میں بہت کشش پائی ۔ اس کا حسن تو اس کی بے پناہ صداقت اور پیرایہ اظہار میں ہے جو پہلی قرأت میں بہا لے گیا ۔ لیکن جب تنقیدی و لسانی شعور ابھرا تو قواعد کی بوالعجبی نظر آئی ۔

اس پوری نظم کا حاصل "آدھی لڑکی" ہے ۔ تو پھر "آدھا چھتر" ، "آدھا صحرا" ، "آدھا سیا" ، "آدھا آنگن" ، "آدھا جیون" ، "آدھا سپنا" کیوں کر ہو سکتی ہے ۔ یہاں بھی "آدھی" ہونا چاہیے ۔ آنے والے اسمائی تذکیر کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیے ۔ یہ سب میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ دو دو میں آپ نے مجھ سے تذکرہ کیا تھا کہ شاعر میں شائع ہونے والی چیزوں پر ہم کڑی نظر رکھتے ہیں اور اس لیے اکثر اوقات دوسروں کے ملال کا باعث ہوتے ہیں ۔

حامدی کاشمیری ـــــ شالیمار ، سری نگر (کشمیر)

شاعر کے تین شمارے ملے ، آپ نے ہر شمارے میں کم صفحات میں کافی مواد سمو لیا ہے ۔ تینوں شماروں کے سرورق خوبصورت ہیں ، آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے ۔

آپ کو یہ خبر سن کر رنج ہوگا کہ تلمیذ سیماب اکبرآبادی کے نامور الاعکا شاعر جناب شہ زور کاشمیری کا گزشتہ ماہ انتقال ہو گیا ۔ مرحوم کچھ عرصے سے صاحب فراش تھے ۔ شہ زور صاحب کے مرحوم اعجاز صدیقی صاحب سے برادرانہ مراسم تھے ، شہ زور صاحب نے وادی کشمیر میں اس زمانے میں اپنی شعر گوئی سے اردو زبان کی شمع فروزاں رکھی جب اردو کے چند ہی اہل قلم موجود تھے ، ان کی رحلت سے کشمیری ادب و تہذیب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے ، چند ماہ قبل شعبۂ اردو سے منسلک ڈاکٹر برج پریمی کا بھی انتقال ہوا ، پریمی صاحب نے مسلسل محنت اور کاوش سے چند برسوں کے اندر ہی مضامین کے کئی مجموعے شائع کیے ، اور ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کی ۔

میجر مغل حماد عباسی ـ ۲۲۰ ، باز بہادر ، اعظم گڑھ (یو-پی)

"شاعر" کے دو شمارے ملے ۔ یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ اس شمارے کے ساتھ شاعر نے اپنی عمر کے ۶۰ سال پورے کر لیے ۔

شاعر میں چھپنے والے تحسین و آفرین کے مراسلے پڑھ کر آپ کے حلقۂ احباب کی وسعت کا احساس تو ہوتا ہے لیکن ساتھ یہ بھی خیال آتا ہے کہ وہ سب کے سب زبانی جمع خرچ کرتے ہیں ۔ کیا ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو شاعر کے لیے دو چار خریدار مہیا کر سکے حالاں کہ مکتوب نگاروں میں کچھ ایسے نام بھی ہیں جو بہت ہی بااثر اور صاحب اقتدار ہیں ۔ اگر وہ چاہیں تو ڈھیر سارے لائف ممبر بنا سکتے ہیں لیکن ادھر دھیان دینے کی فرصت کسے ہے ۔ سب کے سب نام آوری کے خواہاں ہیں ۔ شاعر کی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے تحسین و آفرین حق بجانب ہے لیکن یہ سب کچھ صرف LIP SERVICE کے علاوہ کچھ نہیں ہے جب تک ہم شاعر کی خدمت اصل معنوں میں ادا نہیں کرتے یعنی اس کے خریدار مہیا کر کے یا اس کے لیے وقف ممبر فراہم کر کے ۔

اگر مکتوب نگار حضرات بھارت میں اُردو اکیڈمیوں کو ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر درخواست کریں کہ وہ اردو کے ادبی پرچوں کی مالی معاونت کریں تو اس سے بھی شاعر کا بھلا ہوگا ۔

اندر پرتاپ نیر ـ ۵-لے ، میجر شیودیو سنگھ مارگ ، المحیانہ (پنجاب) دمحانیاں ، ـ شاعر کا ۶۰ ویں برس کا آخری شمارہ ملا ۔ اس بلاشبہ ٹیل خوب صورت اور نیا انداز سے کر طلوع ہوا ہے ۔ شاعر کو پچھلے ۲۰ سال سے بڑے اشتیاق سے پڑھتا چلا آ رہا ہوں ۔ اس دور میں ادبی رسائل کی اشاعت تو نفی کے برابر جاری رہی اور معیار بھی گرتا جا رہا ہے مگر شاعر کو آپ کی طرف سے صاحب فکر حضرات کی تخلیقات سے سجایا جانا قابل صد تحسین ہے ۔ اللہ کرے اس کی قبولیت اور مقبولیت میں مزید اضافہ ہو ۔

میں تو ندا فاضلی کو آج تک شاعر ہی سمجھتا رہا مگر وہ تو نثر کے میدان میں بھی تیس مار خاں نکلے ۔ بڑی شستہ و برجستہ بامحاورہ زبان استعمال کر رہے ہیں قاری کی دلچسپی آخر تک بنی رہتی ہے ۔ شاعر میں نظم اور غزل لکھنے والے نئے نئے فن کار میرے لیے کبھی بھی باعث کشش نہیں ہوتے ۔ لفظ و معنیٰ دونوں حیثیت سے بہت پختگی و خوش سلیقگی ہونی چاہیے جو ان میں نہیں ہوتی ۔ ان کا کوئی شعر دل کو نہیں چھوتا اس اعتبار سے شاعر کا یہ حصہ کافی عرصہ سے کمزور چلا آ رہا ہے مگر شاہین مفتی کی نظم "آدھی لڑکی" نے مجھے چونکا دیا ۔ میرا خیال تھا کہ پاکستان میں خواتین کی شاعری پروین شاکر ہی سے زندہ ہے مگر یہ تو اس کی بھی استاد نکلیں ۔ خوب طبع آزمائی کی ہے ۔ اس بچی کی تخلیقات کو ضرور چھاپا کریں اور نمایاں جگہ دیا کریں ۔ میں نے اسے بھی توصیفی خط دیا ہے ۔

خمار قریشی ـــــ قریشی چوک ، گلبرگہ (کرناٹک)

شاعر کے دونوں شمارے زیر مطالعہ ہیں ۔ شمارہ نمبر (۱۱-۱۲) جلد نمبر ۶۰ میں چیدہ چیدہ تخلیقات ہی نظر سے گذریں ۔

عصرِ حاضر کے نقاد کے آئینۂ پندار کی مت پوچھیے ۔ غالب سے کم تر شاعر و ادیب پر قلم اٹھانا کسر شان سمجھتا ہے ۔ حالاں کہ کسر نفسی ادیب کی عظمت کی علامت ہونی چاہیے ۔

برجرن چاؤلہ کی افسانہ نگاری پر فضیل جعفری صاحب کا مبسوط مقالہ پڑھ کر ان کی تنقیدی بصیرت ، ایماندارانہ ادب نوازی اور نقادانہ معروضیت پسندی کا اعتراف کیے بنا نہیں رہ سکا ۔ افسانے کے باب میں اس دور میں جن نقادوں نے عصری افسانہ نگاری پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے ۔ اور گاہے گاہے اپنی فہرست سازی کا مظاہرہ بھی کرتے رہے ہیں ۔ مجھے کبھی ان طول طویل فہرستوں میں برجرن چاؤلہ کا نام تو نظر نہیں آیا ، مگر فضیل صاحب نے نہ صرف ان کی افسانہ نگاری پر محیط جائزہ سپرد قلم کیا ہے بلکہ ان کے افسانوں کے کردار ، پلاٹ ، موضوع ، اور اسلوب سے لے کر جزئیات نگاری تک کو حیطۂ تحریر میں لایا ہے ۔ حقیقتاً فضیل صاحب اس سلسلے میں ہم سب کی مبارکباد کے مستحق ٹھہرتے ہیں ۔

حسب روایت ندا فاضلی کی خود نوشت ۔ پڑھی اور پسند کی جا رہی ہے ۔ چنانچہ واقعات نگاری میں سچائی کا عنصر کتنا ہی صد PATTERN کے اعتبار سے یہ جوش صاحب کی خود نوشت "یادوں کی بارات" سے میل کھاتی ہے ۔

بلقیس ظفر الحسن ـ ۲۷ ، شاستری اپارٹمنٹس ، بلڈنگ نمبر ۲ ، مولہ نیا مینڈھیا

زیر نظر دونوں شمارے خوب ہیں ۔ آپ کی پُر خلوص محنت کھل کر رنگ لا رہی ہے ۔ خدا کرے ان پھولوں کی خوشبو دور دور تک پھیلے یہی دعا ہے ہماری ۔ شاعر کے صفحات پر کہنہ مشق اور بلند پایہ حضرت کے ساتھ ساتھ ابھرتے ہوئے قلم کاروں کی کاوشیں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے ۔ ان ننھی کلیوں کو کھلنے کے لیے مناسب ماحول تو ملنا ہی چاہیے ۔ لیکن جیسا کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے لکھا ہے ۔ اس سلسلے میں احتیاط بہت ہی ضروری ہے ورنہ کبھی کبھی تو یہ کام لیے ۔ ہاں کبھی کبھی تہذیب و تنقید کا یہ عدم توازن کھل جاتا ہے ـــــ

شمارہ نمبر ۱۰-۹ میں حلیم شہزاد صاحب کا انشائیہ خوبصورت ہے ۔ نصر قریشی صاحب کی طویل بحر والی غزل بھی اچھی لگی ۔ ان کی طویل بحر کو نبھانا بچوں کا کھیل نہیں ہے ۔ حسن نعیم صاحب کی غزلیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھنی شروع کیں ۔ لیکن اب کی بار کیا بات ہے حسن نعیم غزل بھی حسن نعیم نہیں لگے ۔ جوگندر پال صاحب کے سلسلہ وار کی اٹھان غضب کی ہے ۔ خدا کرے اس کا اختتام "نادید" کی طرح بے ڈھب نہ ہو ۔ کتنا اچھا شروع کیا تھا جوگندر پال صاحب نے "نادید" کو اور کیسے اس کو انجام تک پہنچایا ... سوچتی ہوں کو قلق ہوتا ہے ... خیر یہ تو باتوں میں بات نکل آئی تھی ۔ بہرحال ان کا یہ ناول بہت اچھا لگ رہا ہے ۔ ندا فاضلی صاحب کی خود نوشت بھی دلچسپ ہوتی جا رہی ہے ۔ البتہ ان دونوں شماروں میں ایک بھی قابل ذکر مضمون نظر نہیں آیا ۔

وامق جونپوری ـ لال کوٹھی ، پوسٹ کارگاؤں ، ضلع جونپور ۲۲۲۱۴۰

شاعر بڑی پابندی سے مل رہا ہے اور میں ہر شمارہ شروع سے آخر تک بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں اس کے عوض میں ہمارے پاس غزل کے سوا تو کچھ بھی نہیں ۔

بشر نواز ـ مسکن گھاٹی ، اورنگ آباد ـ (مہاراشٹرا)

شاعر بہتر ہوتا جا رہا ہے ۔ دونوں تازہ شمارے اچھے ہیں ۔ تنقیدی مضامین کی طرف اور توجہ کیجیے ۔ شاعر کے شماروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اب نئی نظم اور افسانہ مصنوعی طرز اظہار سے آزاد ہوتا جا رہا ہے اور "فطری اظہار" غالب رجحان بنتا جا رہا ہے ۔ یہ میرے لیے تعجب کی بات تو نہیں ہے کہ ایسا ہونا ضروری تھا البتہ خوشی اس کی ہے کہ ہمارے ساتھیوں کو جلد ہی سادہ بیانی اور تہہ داری کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ہو گیا اور ادب پڑھنے والوں کو لغات اور اصطلاحات کی کتابوں سے نجات ملی ۔

محمود ایاز ـ ۲۰۸ ، سیکنڈ کراس ، فرسٹ مین ، ڈیفنس کالونی ، اندرا نگر بنگلور ۵۶۰۰۳۸

رسالہ آپ اچھا نکال رہے ہیں لیکن بڑی ناہمواری کا احساس ہوتا ہے ۔

مظہر الزماں خاں ـ ہاؤس نمبر ۲-۲-۱۰۵ ، کاچی گوڑا ، حیدرآباد ۔

شاعر کو آپ نے خوب سے خوب تر کر دیا ہے ۔ بلاشبہ یہ آپ کی سخت محنت اور مسلسل کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ شاعر اس قدر خوبصورت اور مکمل شکل میں سامنے آ رہا ہے ۔ ہر شمارہ معیاری اور دیدہ زیب ہوتا جا رہا ہے ۔ نئے شمارے میں ندا فاضلی کے تراجم بہت عمدہ ہیں اور خود نوشت کا جواب نہیں ۔

فاروق شفق ـ جی-۱۰۵ ، دھان کھیتی ہاؤسنگ اسٹیٹ ، کلکتہ

شاعر کے دونوں تازہ شمارے تقریباً پڑھ لیے ہیں ۔ برجرن چاؤلہ کی افسانہ نگاری پر فضیل جعفری نے اچھی محنت کی ہے ۔ انھوں نے بعض دلچسپ اور کھری باتیں کہی ہیں لیکن حقیقت پر مبنی ہیں ۔ نثار احمد فاروقی صاحب کا مضمون اہم اور قابل مطالعہ ہے ۔ چینی نظموں کا ندا فاضلی نے بہت ہی خوبصورت ترجمہ کیا ہے ۔ دونوں شماروں میں بہت ساری نظمیں

اور غزلیں شائع ہوئی ہیں۔ ان تمام پر اظہار خیال تو ممکن نہیں البتہ بالکل سامنے کی غزلوں میں حسن نعیم اور عالم تاب تشنہ کی غزلیں پسند آئیں۔ دیگر غزلوں میں بھی بعض شعر بہت اچھے اور دل کو چھونے والے ہیں۔

کمار پاشی ۔ ۵/۲۷ ، ایم آئی جی۔ [illegible]

یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ شاعر نے اپنی عمر کے ساٹھ سال بہت ہی کامیابی کے ساتھ مکمل کر لیے ہیں۔ آج دنیا میں آخر کتنے ایسے رسالے ہوں گے جو شاعر کی طرح زبان و ادب کی غیر جانب داری کے ساتھ خدمت انجام دے رہے ہیں! یہ آپ ہی کی لگن اور انتھک محنت کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اس ادبی رسالے پر ہر طرح سے بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ اس کی تہذیب و ترتیب، اس کا مواد، اس کی کتابت، اس کا رنگ روپ، آخر کس کس چیز کا ذکر کریں۔ اور کس کس بات کی تعریف کریں۔ شاعر ہر لحاظ سے شاعر ہے۔ یعنی اپنی مثال آپ۔ خدا کرے کہ آپ کو اپنے دوستوں، عزیزوں اور عاشقوں کا اسی طرح تعاون ملتا رہے اور آپ اسی ہمت اور لگن کے ساتھ گلستان ادب کو سدا بہار پھولوں سے آراستہ کرتے رہیں
(آمین۔)

ملکہ نسیم ۔ الیف۔۴۴، فوریسٹ کالونی، چار املی، بھوپال

شاعر کے دو خوبصورت شمارے موصول ہوئے۔ یہ حقیقت ہے کہ آپ کی کاوشوں نے رسالے کے معیار میں کبھی کوئی کمی نہیں آنے دی۔ ان تازہ شماروں میں فضیل جعفری صاحب کا مقالہ ہرچرن چاؤلہ کی افسانہ نگاری کے متعلق بہت خوب ہے۔ ہرچرن چاؤلہ کسی بھی سطح کے افسانہ نگار ہوں، جعفری صاحب نے اپنی بے لاگ تنقیدی آراء سے فن کار اور اس کے فن کی پرکھ کو ایک معیار عطا کیا ہے۔ نقد و نظر اسی کو کہتے ہیں۔ ندا فاضلی کے "دیواروں کے بیچ" کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ خوش حال زیدی صاحب کا مقالہ "بچوں کا ادب اور کہانی کی تکنیک" ایک اچھی کوشش ہے مگر تشنہ۔ ان شماروں کی ایک چیز بطور خاص پسند آئی اور وہ ہے چین کی شاعرہ "یانگ لیو یانگ" کی نظموں کا ترجمہ۔

ممتاز صنم ۔ ۲/۳۲۔ اقبال پور لین۔ کلکتہ ۔ ۲۳

شاعر شمارہ ۱۱-۱۲ پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ بلاشبہ شاعر ایک خالص معیاری ادبی جریدہ ہے۔ اس میں شامل شعری و نثری تخلیقات خاصے کی چیز ہوتی ہے۔ اس میں دو رائے نہیں۔ لیکن ہمارے قلم کار [illegible] پتہ نہیں کیوں اپنی تحریروں کے ذریعہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے میں فخر کیوں محسوس کرتے ہیں۔

شیخ سلیم احمد نے انشائیہ کے تحت "ادب نامہ" کے عنوان سے جو کچھ بھی تحریر کیا ہے اس میں کسی حد تک صداقت تو ضرور ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون کے آخر میں اپنے پروفیسر دوست یا دوست پروفیسر کے بارے میں جو لکھا ہے وہ آج کل کے معتبر شاعر اور ادیب شخصیت کی تنقیص کے سوا کچھ نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ موصوف نے ایسا لکھ کر اپنا کوئی پرانا حساب چکایا ہو۔ لیکن میری نظر میں ان کی گھٹیا ذہنیت اچھی طرح آشکارا ہو گئی ہے۔ دوسروں کی پگڑی اچھالنے والا کبھی بھی اچھا ادیب نہیں ہو سکتا۔

ندا فاضلی کی خود نوشت "دیواروں کے بیچ" کی قسط [illegible] میں انھوں نے [illegible] کے بارے میں جس انداز سے لکھا ہے اس سے عورت ذات کی تضحیک کا پہلو [illegible] خود ستائی اور خود پسندی [illegible]

میں کیا مزہ ملتا ہے۔ شاید عورتوں کی تضحیک کر کے مردوں کی [illegible] میں شامل ہے۔ حق گوئی اور صاف گوئی کے لیے معاف فرمائیں۔ خدا آپ کے شاعر کو دائم و قائم رکھے۔

سید معز الرب رضوی ۔ نائب مترجم، [illegible] راج بھاشا بہار، [illegible]

شمارہ نمبر ۱۱-۱۲ نظر نواز ہوا۔ "بساط سخن" میں ہرچرن چاؤلہ کا تعارف بائیو ڈیٹا خوب رہا۔ میرے وطن عظیم آباد کے ایک مجذوب شاعر سید حسن رضا ثاقب عظیم آبادی کے عکس تحریر میں ان کی غزل مجھے کافی پسند آئی۔ میرے حلقہ احباب میں بھی اس نادر غزل کی پذیرائی ہوئی۔ جوگندر پال کا "خواب رو" اکبر حیدر آبادی کی تخلیق "ماں" شیخ سلیم احمد کا "ادب نامہ" قابل مطالعہ تخلیقات ہیں۔ آپ لوگوں کی کاوشوں سے شاعر دن بدن معیاری ہوتا جا رہا ہے۔

محفوظ الحسن ۔ پروفیسر و صدر شعبۂ اردو، ایس۔ این [illegible] کالج [illegible]

شاعر کا شمارہ نمبر ۱۰-۹ مطالعے میں آیا۔ کیا بھرپور رسالہ ہے۔ مضامین معیاری، فکر انگیز و فکر خیز۔ نظمیں یوں تو سب منتخب ہیں لیکن شاہین مفتی کی "ادھی لڑکی" اور سلیم شہزاد کا "فنطاسیہ" کا جواب نہیں۔ سلطان سبحانی نے غضب کی کہانی لکھی ہے۔ مدیر و مصنف دونوں کو مبارکباد۔ جوگندر پال کا "خواب رو" اپنے چہرے سے نقاب کب اٹھائے گا؟ "دیواروں کے بیچ" کی نرم و گرم چاشنی ہے کہ بار بار پڑھتا رہتا ہوں۔

البیلے شاعر کی نثر بھی البیلی ہے۔ کیا زبان استعمال کی ہے ظالم نے! غزلیں بھی اچھی ہیں۔ بساط سخن اور آئینۂ لفظ لفظ کی اپنی ایک خاص علمی و ادبی اہمیت ہے۔ "تجربات" ایک بار پھر جھنجھوڑ گئے۔

نفیس تقی ————— ململیا، سرونج (ایم۔ پی)

مدت مدید سے شاعر زیر مطالعہ ہے۔ آپ نے اس پر آشوب دور میں رسالے کو جس مقام و معیار پر برقرار رکھا ہے وہ لائق تحسین ہے۔

—— **پریم چند کوشک** ۔ انڈسٹریل ایریا "تلے" لدھیانہ (پنجاب)

شاعر کا ہر شمارہ معیاری و وقیع ہوتا ہے۔ اس میں شامل کہانیاں متاثر کرتی ہیں۔ ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی کہانی دل کو چھو جاتی ہے۔ شاعر شمارہ نمبر ۹ میں م ناگ کی کہانی "گھر زندہ" کی جس قدر بھی داد دی جائے کم ہے۔ اردو افسانوی ادب کے خزانے میں جدید موضوعات پر لکھی گئی کہانیوں میں یہ ایک منفرد اور نمایاں خصوصیت والی کہانی ہے۔ نئی اور پرانی پیڑھی کے ایسے پیچیدہ مسائل پر سماجی حقیقت نگاری کی یہ ایک عمدہ [illegible]

مصطفیٰ مومن ۔ رحمت گنج، پالی ٹیکنک، دربھنگہ (بہار)

شاعر کے دو تازہ شمارے میرے زیر مطالعہ ہیں۔ تجربات کے تحت آپ نے جو باتیں لکھی ہیں وہ مفید اور دل کو لگتی ہوئی ہیں۔ شاعر کے ہر شمارے کو دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ اتنی کم قیمت میں ایسا اور اتنا معیاری رسالہ آپ کس طرح پیش کرتے ہیں۔ [illegible] کے اس دور میں اردو کے لیے آپ کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔ خدا اس کا صلہ دے۔

سلیم انصاری ۔ ۵۵۹، موتی نالہ، جبلپور (ایم۔ پی)

شاعر کے دونوں شمارے پیش نظر ہیں۔ "دیواروں کے بیچ" ندا فاضلی کو اپنے سحر سے آزاد نہیں ہونے دیتا۔ میں شاعر کا مطالعہ دیواروں کے بیچ ہی سے شروع کرتا ہوں۔ ہرچرن چاؤلہ کی افسانہ نگاری پر فضیل جعفری نے بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ ندا فاضلی نے چینی نظموں کا ترجمہ اصل تخلیقی نظموں کی طرح کیا ہے۔ نئی نسل کی ذہنی اور فکری شاعری کی سمت و رفتار کی آگہی کی [illegible] کوشش ہے۔ اس [illegible]

قبل بھی ان کی ترجمہ شدہ نظمیں رسالہ "قلم" (بمبئی) میں [illegible] ہوا ہے۔ اس طرح کے سلسلوں کو جاری رکھیے۔ مجموعی طور پر شاعر کے دونوں مذکورہ شمارے اردو کے اس بحرانی دور میں خوبصورت چشمے کا حکم رکھتے ہیں۔ مگر شاعر تاخیر کے ساتھ شائع ہوتا ہے اور یہ دو شمارے ایک ساتھ شائع کرنے کی کیا منطق ہے؟ اس سے قبل بھی شاعر کے دو شمارے ایک ساتھ ملے تھے۔ بہر حال! وجہ کچھ بھی ہو، شاعر کا اجرا اردو ادب کی تابناکی کی علامت ہے۔

عالم خورشید ۔ معرفت اڈی۔ اے (پی) پٹنہ ۴ (بہار)

شاعر کے دونوں تازہ شمارے زیر مطالعہ ہیں۔ شاعر اب [illegible] سال میں قدم رکھ رہا ہے، مبارکباد۔ ادھر نئی دہائی بھی اختتام کے قریب ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ گزشتہ دس برسوں میں تخلیق کیے گئے ادب کا محاسبہ کیا جائے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ ادب سے نقد و نگاہ سے ہم نے اس دہائی میں کیا کچھ کھویا اور کیا پایا؟ اردو ادب نے کتنے معرکے سر کیے اور کتنا زوال پذیر ہوا؟ کون کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور وہ ادب کے لیے کس قدر مفید و معاون ثابت ہوئیں۔ خامیوں اور خوبیوں کا ذکر کیا جائے۔ ہمیں اپنے احتساب کی ضرورت ہے۔ ان امور پر بحث و مباحثہ اور مکالمہ ہونا چاہیے۔ آپ کو یہ سب اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آپ اس ضمن میں کچھ کر سکتے ہیں اور ایسا کرنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔

آپ "نئی شاعری نئے نام" کے سلسلے کا ایک عرصہ سے ترتیب دے رہے تھے اس کا کیا ہوا؟ اسے جاری رکھیے۔ نئی نظم، منی افسانہ اور تنقید پر بھی اس نوع کے خصوصی شمارے ترتیب دیجیے۔

خورشید سمیع ۔ ایم۔ آئی۔ جی۔ مظفر پور [illegible] (بہار)

شمارہ ۱۲-۱۱ میں صفحہ نمبر ۳۸ پر شوکت حیات کا مکتوب شائع ہوا ہے۔ انہوں نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے کہ میں نے جان بوجھ کر خلیل الرحمان اعظمی کو بھی بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ [illegible] کہ میرے مضمون "نئی شاعری کے پیچ و خم" میں صفحہ ۳۲ پر یہ شعر [illegible]

ہم نے لوگوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا ہے
کیسا بہانہ ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

(جمال نشاط [illegible])

اسی طرح اسی مضمون میں صفحہ ۳۴ پر یہ شعر ہو ہے

یہ تسلی ہے کہ ہیں اب مرے ہمدرد ہے کوئی
مجھ کو آکر مرے مرنے کی خبر دے کوئی

(خلیل الرحمان اعظمی)

یہ بات صاف ہو گئی کہ شوکت حیات نے مضمون پڑھا ہی نہیں ہے۔ تنقیدی مضامین میں صرف مضمون پڑھنے سے بھی کام نہیں چلتا اس لیے کہ غور کرنا ہوتا ہے۔ اس موضوع پر بہت کچھ دیکھنا ہے۔ مضمون کی روح تک [illegible] سوال تو ایسے [illegible] سکتا؟ اب سوال یہ ہے کہ مضمون پڑھے بغیر تبصرہ کرنے والوں کی [illegible]

اب جب کہ شوکت حیات کی اپنی ہی فہرست پر بات نکلی ہے تو عرض ہے کہ

مجھے ان کے خط سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ جلدی میں تیار کی گئی ہے۔ اس فہرست میں خورشید سمیع صاحب کی طرح مجھ سے بھی کئی اہم نام چھوٹ گئے ہوں گے اور کچھ غیر اہم نام شامل ہو گئے ہوں گے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ جلد نمبر ۱ نام گنوانا اور کچھ فہرست کے ساتھ مکتوبات کے کالم میں شامل ہونا شوکت حیات صاحب کو مبارک ہو۔ میرا نام خواہ مخواہ ایسی غلط باتوں میں کیوں کر گھسیٹا جا سکتا ہے؟ کیوں کہ میں نے اپنے مضمون میں شعرائے کرام کے ناموں کی کوئی فہرست تو نہیں بنائی ہے اور ایسا غیر محتاط رویہ کہ جن ناموں کا ذکر ہو ان کے بابت یہ کہا جائے کہ ان کا ذکر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیشہ بہت پہلے نئی شاعری پر لکھتے وقت ناصر کاظمی اور ظفر حنفی پر بھی لکھ چکا ہوں۔ ثبوت کے طور پر نئی نسل کے نام" دیکھئے میرا یہ مضمون بھی شاعر میں ہی شائع ہوا تھا۔ اب ایک اور بات جان لیجئے کہ غلط الزام لگانا اور خواہ مخواہ کی بحث کرنا، تنقید نگاری نہیں ہے۔ غالب کے اشعار کی صحیح تعداد اور اسی طرح سے اقبال کے اشعار کی تعداد اور یہ بھی کہ اقبال نے اصناف نظم میں کس صنف میں کتنے اشعار کہے ہیں۔ یہ میں ابھی پڑھتا ہوں اور اللہ کے فضل سے اس پر بھی لکھ سکتا ہوں لیکن غالب شناسی یا اقبال شناسی کی دوسری شکلیں کیا ایسی ہی ہوا کرتی ہیں جیسے آپ نے تحریر کی ہیں؟ یہ اپنا اپنا مزاج ہے کہ کوئی کس سے اکتساب فیض کرے۔ شعرا کی صحیح تعداد کا علم شوکت حیات کو نہیں ہے اس لیے کہ انھوں نے ستاسی (۸۷) نام گنوائے ہیں یعنی تیرہ (۱۳) کم سو (۱۰۰) شعرا کے نام اور حیرت ہے لطف الرحمٰن، اعجاز علی ارشد اور مناظر عاشق ہرگانوی کے اسمائے گرامی یہاں نہیں ہیں۔ یہ تینوں نام شوکت حیات کی فہرست میں کیسے چھوٹے؟ کیا یہ غیر اہم ایسے نام ہیں اور چھوٹ گئے۔ بالخصوص فکر انگیز ہے کہ وہ ناموں کی فہرست بنانے کو ہی تنقید نگاری سمجھتے ہیں اور جہاں کوئی نام چھوٹا کہ مضمون ناقص۔ اچھا ہے کہ شوکت حیات خود ایک فہرست تیار کریں جو جلد بازی میں نہ ہو اور اسے تمام نقادوں سے قبول کروالیں پھر یہ حکم صادر کیا جائے کہ جسے بھی لکھنا ہے نئی شاعری پر وہ اس فہرست پر ہی لکھے کیوں کہ

FINALLY APPROVED

۔ ایک بات مگر انھوں نے صحیح لکھی ہے کہ شاعری مرا میدان نہیں اس کے بارے میں اظہار رائے کا مجھے حق نہیں۔ شکر ہے کہ وہ عمل کرنے اور یہ بھی کہ تنقید بھی لکھنے کی پابندی نہیں۔

امین شخصی

۔ صفیہ منزل، سلطان گنج، پٹنہ ۶

شمارہ ۱۱۔۱۲ میں شوکت حیات صاحب کا طویل خط پڑھ کر کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ ڈاکٹر خورشید سمیع صاحب نے اپنے مضمون میں صرف چند اہم شاعروں (جو یقیناً بہت کے حامل ہیں) تک ہی اپنے آپ کو محدود رکھ کر تنگ نظری یا تنگ دلی کا ثبوت دیا ہے تو شوکت حیات صاحب نے بھی اپنی لمبی چوڑی فہرست میں کچھ بالکل ہی غیر اہم شاعروں کے نام شامل کر کے پوری طرح جانب داری کو تقویت پہنچائی ہے۔ جیسا قمر رئیس، شمس الرحمٰن فاروقی، حمید سہروردی، ابو الکلام قاسمی، انیس اشفاق، حسن اختر وغیرہ وغیرہ۔ میں کہتا ہوں یہ لوگ بنیادی طور پر شاعر تو نہیں ہیں، اہم شاعر ہونا تو دور کی بات ہے۔ اس طویل فہرست میں شوکت حیات صاحب کچھ اور نام شامل کر لیتے مثلاً شمیم فاروقی، حسن جمال، مظہر سیّد ملک، ظہیر غازی پوری، نسیم قاسمی، خورشید اکبر

سونو، مرغوب علیم آبادی، تو مس صدیقی، منیر سیفی تو پڑھنے والے کو مزہ آجاتا۔ ویسے مجھے اس فہرست کی سنجیدگی پر کچھ شک ہے۔

رام لعل

۔ شانتی نکیتن، ڈی ۱۰۔ ۲۲۹، اندرا نگر، لکھنؤ

شاعر کے شمارہ ۳ (جلد ۶۷) میں ڈاکٹر خورشید سمیع کا مضمون نئی شاعری کے پیچ و خم اس قابل ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔ اردو ادب کی تنقید میں ایسے غیر جانب دار رویّہ کی مثال بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے ترقی پسند اور جدید شاعری کے جمالیاتی اور فکری پہلوؤں پر بڑی باریک بینی کر کے روشنی ڈالی ہے۔ اسی ضمن میں انھوں نے مذہبی میلان رکھنے والے اردو شاعروں کے نئے رویوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اردو شاعری میں ابہام اور مہملیت کے جو عناصر گزشتہ پچاس برسوں میں در آئے ہیں ان کی نشان دہی بھی ڈاکٹر خورشید سمیع نے کر دی ہے۔ وہ حقیقتاً شاعری کے بنیادی تخلیقی محرکات کو سامنے رکھنے والے نقاد ہیں اور انہیں نہ تو ترقی پسندوں کا مبلغ نہ ہی جدیدیت پسندوں کا اندھا معتقد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، معین احسن جذبی، مخدوم محی الدین، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، مجروح سلطانپوری، اعجاز صدیقی، غلام ربانی تاباں، وحید اختر، اور شہاب جعفری کے ساتھ ساتھ سلیم احمد، افتخار جالب، باقر مہدی، شہریار، خلیل الرحمان اعظمی، ندا فاضلی، یوسف ظفر، عمیق حنفی، فارغ بخاری، حبیب جالب، منیر نیازی، احمد فراز، عبید اللہ علیم، ساقی فاروقی، کمار پاشی، بشیر بدر، مظہر امام اور بانی کی مثالیں ہرگز نہیں دیتے۔

انہوں نے اپنے اس تنقیدی مقالے کے لیے کلیدی نکتے کے طور پر نئی شاعری کے بارے میں فیض کا جو تاثر پیش نظر رکھا ہے کہ اس کا ابھی کوئی مجموعی نقشہ ہی نہیں بنا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اندھی کمٹمنٹ اور غیر ضروری جانب داری کے اس دور میں ڈاکٹر خورشید سمیع جیسے نقاد کی موجودگی غنیمت ہے۔

نثار احمد فاروقی

۔ ۸۳۷، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی!

"اُردو املا اور لسانیات" پر میں نے اپنے ملاحظات بھیجے تھے جو آپ نے "شاعر" میں چھاپے۔ گوپی چند نارنگ نے پڑھنے والوں کو بھکائی دے کر لطیف الزّماں خاں کے مضمون کی طرف دوڑا دیا وہ کہتے ہیں "نثار احمد فاروقی صاحب آج کل مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہیں" حالاں کہ میں تو ان پر اس وقت سے مہربان ہوں: "کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر" یعنی جب وہ ادیب فاضل (بفتح ضاد) کر رہے تھے (۱۹۵۵ء) مگر اب وہ وارد وکی بڑی توپ بنے ہوئے ہیں تو انھیں اپنے سارے مہربان تیغ و تبر نظر آتے ہیں۔ مجھے یہی کہنا تھا کہ "ایاز قدر خود بشناس"۔

انھوں نے پڑھنے والوں کو یہ تاثر دینا چاہا ہے کہ میں ان سے اس لیے برہم ہوں کہ میرے خلاف لطیف الزماں کے مضمون انھوں نے لکھوایا ہے۔ مجھے نہ یہ غلط فہمی تھی نہ میں نے ایسا کہا، نہ سوچا۔ ۵ رجون ۱۹۹۰ء سے پہلے میں نے وہ مضمون دیکھا بھی نہیں تھا۔ نارنگ نے مشورہ دیا کہ مجھے ان الزامات کا جواب دینا چاہیے۔ میں نے ان کی فرمائش پوری کر دی ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ میرا جواب پڑھ کر لطیف الزّماں ان سے ناراض ہوں گے اور میرے حاسدوں کو جو ذرا سی خوشی نصیب ہو گئی تھی وہ ملیا میٹ ہو جائے گی۔

اپنی صفائی میں نارنگ لکھتے ہیں کہ "میں یہ بھی جانتا ہوں کہ لطیف الزّماں خاں کون ہیں" ان کے جاننے کی قیمت تو یہ ہے کہ وہ لطیف

صاحب کا مرتبہ کتاب "شیواہ میر تقی کے خطوط کی سفارش کی بات کے لیے کر چکے ہیں، حالاں کہ اسی موضوع پر تین اور اہم کتابیں مرتب ہو چکی ہیں۔

لطیف صاحب بھی نارنگ کو جانتے ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسی کتاب کے ایک حاشیہ میں انھوں نے گوپی چند نارنگ عرف جمیل آتش" لکھا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ نارنگ سے اتنے قریب ہیں کہ انھیں یہ راز درونِ خانہ" بھی معلوم ہے کہ نارنگ کسی زمانے میں مذہب اسلام کو بھی مشرف فرما چکے ہیں۔ (حیرت ہے اس کے بعد بھی مزاج المومنین کو نہیں سمجھتے!)

وہ کہتے ہیں کہ مجھے "لسانیات سے کچھ لینا دینا نہیں" میں نے کبھی کسی لین دین کا دعویٰ نہیں کیا، نہ ہلدی کی گانٹھ لے کر پنساری بنا ہوں، مگر لسانیات کے متعدد اساتذہ سے پوچھا تو یہی بات انھوں نے نارنگ کے بارے میں کہی۔

نارنگ اُردو کے کہن سال پروفیسر ہیں ساختیات و اسلوبیات و لسانیات کے علاوہ اور بھی کئی وادیات میدانوں میں کوس لمن الملکی بجا رہے ہیں، "تیر ستم کشتہ" کا خیر بھی اٹھا چکے ہیں، وہ مجھے بتائیں کہ میر کے کس شعر میں جامہ و چھینٹ استعمال ہوا ہے؟ میر کی شاعری پر تو اس لفظ کا چھینٹا بھی نہیں پڑا۔

جامہ و چھینٹ کو ساختیات کی سند میں لانا قیاس مع الفارق ہے۔ چھینٹ کپڑے کی ایک قسم ہے، گویا اسم جنس ہوا، اس کا کوئی مرادف فارسی یا عربی میں موجود نہیں انگریزی میں بھی اس لفظ کو CHINTZ اختیار کر لیا گیا ہے۔ اس پر فارسی اضافت کا اطلاق کیوں ہو؟ مگر ساختیات کی ترکیب کو درست مانا جائے تو پھر آمریات، رضیات، گفتیات، شہادات خرمیات وغیرہ نے کیا قصور کیا ہے کہ ان کا چلن نہ ہو! STRUCTURE کے لیے تین سامنے کے لفظ موجود ہیں: ہیکل، ترکیب اور بنیان۔ آخری لفظ مفہوم سے اقرب ہے مگر اردو کے لیے نامانوس ہے البتہ ترکیب کا چلن تو خوب ہے، بس دشواری یہ ہے کہ اردو میں ترکیب ان حرکتوں کو بھی کہتے ہیں جو کوئی خطاب یا انعام لینے یا چودھری بننے کے لیے کی جاتی ہیں، اس مفہوم سے تو نارنگ خوب واقف ہیں۔ STRUCTURAL METHOD کے لیے ترکیبی طریقہ "سیدھا سادہ ترجمہ ہے اس سے ترکیبیات" بنانے میں بھی کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔

اسی خط میں نارنگ نے عربی میں بھی ٹانگ ڈالی ہے، اعراب اور اعرابی کے تلازموں سے کھلواڑ کر کے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے، میں نے تو یہی لکھا تھا کہ وہ اعراب کے مفہوم سے واقف نہیں ہیں انھوں نے ثابت کر دیا کہ اعرابی کے معنی بھی نہیں جانتے (ملاحظہ ہو "اُردو کی نئی کتاب" دسویں جماعت کے لیے صفحہ ۲۰۵)

حرکت مذبوحی میں انھوں نے "وہ دن یاد ہیں گے" کہہ کر مجھ پر اپنے جگری دوست رشید حسن خاں سے بھی بھڑانا چاہا ہے، میں بھی ان کا دشمن نہیں ہوں۔

یمن صاحب کا نیز مقلد ڈاکٹری لحاظ سے کے مطابق تعمیر پانچ گیا۔

تصحیح

شاعر کا گزشتہ شمارہ ۷ دیں جلد کا شمارہ نمبر ۱ تھا۔ سہواً جلد نمبر ۶۰ شائع ہو گیا ہے۔ حبیب احمد کی کہانی کا مشہور کہانی "بھری قوت" سر ورق کا شعر غلطی سے اپنی جگہ شائع ہو گیا۔ قارئین ان دونوں غلطیوں کی تصحیح کر لیں۔ ادارہ

نقد و نظر

جائزے

ڈاکٹر شوکت حسن نفسیاتی دبستانِ تنقید کے ایک اہم نام ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں اور مضامین کے ذریعہ عملی نفسیاتی تنقید کے بنیادی نقوش طریقۂ کار، تعریف، اصول وغیرہ کی معیار بندی کی کامیاب سعی کی ہے۔ جائزے سے قبل ان کے مضامین کا ایک اور مجموعہ "نفسیاتی زاویے" [مطبوعہ ۱۹۸۰ء] شائع ہوا تھا۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۵ء کے دوران تحریر کیے گئے ۱۹ مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف ادبی رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ مضامین طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔

کتاب میں شامل ۱۹ مضامین، ادبی، نفسیاتی اور شخصیتی نوعیت کے ہیں۔ خالص نفسیاتی مضامین کے ساتھ ادبی اور شخصیتی مضامین میں بھی نفسیاتی طریقِ نقد، تاثراتی، زیریں یا ہیراوپری سطح پر موجود ہے۔ نفسیاتی اسکول کے افسانے، "ادبی تنقید اور نفسیات"، "ادب میں جدیدیت، ایک نفسیاتی جائزہ"، "ہنسی اور مزاح کا نفسیاتی مطالعہ" قابلِ ذکر مضامین ہیں۔ ان میں موضوع و مواد کی سمائی، مسائل و مباحث، نفسیاتی اصطلاحات اور تشریح و تجزیوں میں ایک طرح کا گٹھاؤ ہے، علم ہے، گہرائی ہے — استدلال ہے۔

شخصیات میں اکبر الٰہ آبادی، حسرت موہانی، جمیل مظہری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی اور سید حسن پر مختلف جہتوں سے لکھے گئے مضامین شامل ہیں اور محنت سے لکھے گئے ہیں۔

"قرگیت، ایک نفسیاتی مطالعہ" کلیم الدین احمد مرحوم کے متعلق ایک بے حد تخلیقی مضمون ہے جس میں نام لیے بغیر مرحوم کی پوری شخصیت کو خارجی و داخلی دونوں سطحوں پر تصویر کر دیا گیا ہے۔ اس نوع کے مضامین اردو میں لکھے گئے ہیں مگر کم ہیں۔

عمل اور ردِ عمل سے فن اور فن کار دونوں ہی اپنی انتہاؤں کا سفر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت حسن کے ساتھ ایسا نہیں ہوا ورنہ تو ایک عالم کی قدر شناسی ضرور حاصل ہونی چاہیے تھی اور ہمارے کمتر ناقدین کے مقابلے میں ڈاکٹر حسن جیسے سنجیدہ ناقدانِ ادب کو بہت آگے آنا چاہیے تھا۔

○ ضخامت: ۱۵۱ صفحات ○ قیمت: تیس روپے —

○ مطبوعہ: ۱۹۸۷ء ○ پتہ: "دارالامان" بسنت پور کھرا، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ [بہار]

کفرِ تمنا

بزرگ استاد، ادیب اور شاعر جناب مغیث الدین فریدی کا دوسرا شعری مجموعہ "کفرِ تمنا" جس میں ۲۸ غزلیں [۲۹۰ اشعار] مشاہیر شعراء کی غزلوں پر تضمینیں [۱۲۰ اشعار] شامل ہیں۔

مغیث صاحب [پ: ۱۹۲۰ء فتح پور سیکری یوپی] کی شعری شخصیت کی تشکیل میں ایک خاص تہذیب، زبان، فن اور شاعری کے اثرات شامل ہیں جنہوں نے ان کی غزل کا اسلوب کلاسیکی رچاؤ لیے ہوئے نہایت ہی سجا سنورا ہے۔ سیدھا سادہ حسنِ تغزل ان کے تغزل نے ہر سطح پر کس خوبی سے آراستہ کر دیا ہے کہ ان کی غزلوں کا داخلی منطقی آہنگ متاثر کرتا ہے۔ روایت کا اسلوب شعری تحریک پر سے کے بے کراں ہمہ تن ان کا حسن ہے جو آپ میں ایک مکمل ہماری تجربہ ہے، اسکی کائی میں پورا معاصر عصری حسیت، روایت کا شعور، مطالعہ و مشاہدہ بھی کچھ شامل ہوتا ہے۔ مغیث صاحب کی شاعری میں ان تمام رنگوں کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش نمایاں ہے۔

غزل، ان کے شعری مزاج کی نمائندگی کرتی ہے لیکن مغیث صاحب کو نظم کی دیگر اصناف پر بھی قدرت حاصل ہے۔ طویل و مختصر نظمیں اور قطعات کے ساتھ تاریخ گوئی بھی ان کا ایک وصف ہے اور بہت نمایاں۔ ان کے تاریخی قطعات کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ تاریخی قطعات کا ایک انتخاب بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔

"کفرِ تمنا" میں شامل تضمینیں اپنے آپ میں نہایت ہی بھرپور ہیں۔ میر، غالب، فانی، فیض اور خورشید الاسلام کے شعروں پر ان کے تین مصرعے کسی بھی طرح کم نہیں معلوم ہوتے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے یہ مصرعے بھی متذکرہ شعراء ہی نے کہے ہیں یا شاعر نے خود تخلیق کیے ہیں۔

نہایت ہی پرگو مگر خاموش فن کار مغیث الدین فریدی کی شاعری کا جائزہ کئی اعتبار سے دلچسپ ہو سکتا ہے کہ یہ شاعری کیا ہے؟ اس نوع کی شاعری اور شعراء کو ہم ادب کے کس خانے میں رکھیں گے؟ یہ شعراء کس طرح کی شعری کائنات خلق کر رہے ہیں؟ اس نوع کی شاعری کا حاصل کیا ہے؟ ضخامت: ۱۲۸ صفحات ○ قیمت: تیس روپے

○ مطبوعہ: ۱۹۸۷ء ○ رابطہ: آر دو گھر، راؤز ایونیو، دہلی۔ مکتبہ جامعہ اردو بازار دہلی۔

نئے موسم کی تلاش

تازہ کار شاعر عالم خورشید کا اولین شعری مجموعہ جس میں پچاس غزلیں [۴۰۲ شعر] اور ۲۶ آزاد و نثری نظمیں شامل ہیں۔ ۳۲ سالہ نوجوان شاعر [پ: ۱۱ رجولائی ۱۹۵۹ء] نے شعوری سطح پر کسی رجحان، نظریے اور تحریک کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے وہ نہیں چاہتا کہ اس کی شاعری کو روایت، ترقی پسندی یا جدیدیت کے نام سے منسوب کیا جائے۔ اس شاعر نے شاعری کو صرف شاعری سمجھا ہے۔ ادب کے خالص اور بنیادی میلانات تخلیقی سطح پر بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں اس کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

عالم خورشید نے کوشش کی ہے کہ جو کچھ اس نے شاعری کے بارے میں کہا ہے اسے اپنی شاعری میں برتے۔ ایسا کرنے میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوا ہے اور بعض اچھے شعر تخلیق بھی ہوئے ہیں۔

اچھے شعر کی تعریف یہ بھی ہے کہ اسے پڑھنے یا سننے پر ذہن میں صرف اسی شعر کی بازگشت باقی رہے، کوئی دوسرا شعر یا آس پاس کے شعر اور مصرعے اس شعور میں شامل ہونے کی کوشش نہ کریں۔ کوئی یاد اپنی انفرادی سطح اسی وقت بناتے ہیں جب وہ خالص فن پارہ ہو اور خالص فن پارے کا وجود تمام عناصر اور تخلیقی عمل سے مختلف کوئی اور چیز ہوتا ہے۔ زندگی کے تجربے زندگی کا معمول بنتے رہتے ہیں۔ شاعر بہرحال کی شاعری میں بازیافت اور اس کی تازگی کو ابھارنے، محسوس کرنے اور جاننے کے فن اور اس کی مختصر بیانیہ کا تخلیقی عمل ہی ہے جو کسی شاعر کی انفرادیت بناتا ہے۔ عالم خورشید کے یہاں زندگی کے عام اور کچھ نئی تجربے شاعری کا موضوع بنے ہیں۔ ذاتی تجربے اور ان کی شدت اور پھر چند کی نظمیں ان کے یہاں کوئی منفرد آہنگ پیدا نہیں کرتی ہیں۔

اس نوجوان شاعر کی شعری کائنات بہت مختصر ہے۔ شاعری میں جس تیسری آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے اور جو خود وا ہوتی ہے اور بہت سے قلم کار ایک عمر گنوا دینے پر بھی اس کے منتظر یا محروم رہتے ہیں اس تیسری آنکھ کے آثار بہرحال ان کے یہاں دھندلے دھندلے سے ہیں۔ یہ آثار اگر وہ اپنے آپ میں محسوس کر لیں تو اچھی شاعری تخلیق کی جا سکتی ہے۔ نظمیں مختصر ہیں۔

○ ضخامت: ۱۱۲ صفحات ○ قیمت: تیس روپے۔

○ مطبوعہ: ۱۹۸۸ء ○ پتہ: ثروت پبلی کیشن، چھجو باغ کوٹھی، دریاپور، پٹنہ

دوسرا کمرہ

[طبع زاد ڈرامے]

اس مجموعے میں زاہدہ زیدی کے پانچ طبع زاد ڈرامے شامل ہیں۔ ان ڈراموں کا سرچشمہ مصنفہ کے ذاتی احساسات، داخلی تجربات، مختلف واردات، گوناگوں مشاہدات، خواب، خیال اور تصورات ہی ہیں لیکن مغربی ادب کے وسیع مطالعے اور جدید مغربی ڈرامے سے گہری وابستگی نے زاہدہ زیدی کی ڈرامہ نگاری کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے، اور فارم اور تکنیک کے اعتبار سے یہ ڈرامے مغربی ڈرامے کی جدید ترین تحریکوں سے قریب تر ہیں۔ ان میں مغربی ڈرامے کے عظیم فنکاروں کا پرتو جلوہ فگن ہے۔ لیکن مغربی اثرات کے باوجود مصنفہ کی تخلیقی فکر میں اس قدر رچ بس گئے ہیں کہ ہر ڈرامہ ایک منفرد پیکر اور نئی شناخت کا مظہر بن گیا ہے۔

ان ڈراموں میں مصنفہ نے پیچیدہ حقیقتوں کے اور تہہ در تہہ معنوں کی پرتوں کو کھولنے کے لیے علامتوں کے ہمہ جہت وسائل کا بھرپور اور تخیل آفرین استعمال کیا ہے۔

امید ہے کہ زاہدہ زیدی کا یہ مجموعہ جدید اردو ڈرامے کے ارتقا میں ایک سنگِ میل قرار دیا جائے گا۔

○ ضخامت: دو سو پچاس صفحات ○ قیمت: ستر روپے

○ مطبوعہ: ۱۹۸۹ء ○ ایجوکیشنل بک ہاؤس، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار دہلی۔

بیانِ ملکیت اور دیگر تفصیلات شاعر بمبئی

(مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸)

مقامِ اشاعت	بمبئی
پرنٹر و پبلشر	ناظر نعمان صدیقی
پتہ	دیناناتھ بلڈنگ تیسرا اسٹریٹ نانا چوک
ایڈیٹر	افتخار امام صدیقی
پتہ	دیناناتھ بلڈنگ تیسرا اسٹریٹ نانا چوک
وقفۂ اشاعت	ماہنامہ
قومیت	ہندوستانی
ملکیت	ناظر نعمان صدیقی
قومیت	ہندوستانی

میں ناظر نعمان صدیقی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط ناظر نعمان صدیقی ... ناشر

وزیرِ اعلیٰ شری شرد پوار کی فعال قیادت میں

مہاراشٹر آگے کی طرف گامزن ہے

مہاراشٹر کی متوازن زرعی اور صنعتی ترقی جس میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ سماج کے کمزور سے کمزور تر طبقات ادیباسیوں، دلتوں، بشمول غریبوں اور عورتوں کو پورا معاشی اور سماجی انصاف ملے، بلاشبہ ریاستی پالیسی کا لازمی اور اہم ترین جزو ہے۔ اس سمت میں حکومت کی جانب سے شروع کئے گئے منصوبے گذشتہ دو برسوں میں وزیرِ اعلیٰ شری شرد پوار کی لائق و فائق قیادت میں اپنی معنویت اور نتیجہ کے اعتبار سے انتہائی حوصلہ افزا ثابت ہوئے ہیں۔ آیئے ہماری آزادی کے اس ۴۳ ویں مُبارک موقع پر ہم سب مِل جُل کر ان منصوبوں کی کامیابی کے لئے اپنے آپ کو دوبارہ وقف کر دیں۔

منصوبے ایک نظر میں

★ باغبانی کی ترقی کیلئے ۱۰۰ کروڑ روپے کا پرجوش منصوبہ تاکہ غیر مزروعہ، بنجر اور بارش سے سیراب قطعات زمین کو نفع بخش پیداوار کی صلاحیت کے قابل بنایا جاسکے۔

★ حکومت کے علاقائی اداروں کو مزید خود مختاری عطا کر کے تمام خطّوں کی متوازن صنعتی ترقی کی طرف ۶۵ افزائشی مراکز قائم کرنے کا قطعی فیصلہ اور پوری ریاست کے تعلقوں میں چھوٹے صنعتی علاقے قائم کرنے کی غرض سے ۹۴ محل وقوع کی شناخت۔

★ ۴۷۰ صنعتی یونٹس قائم کرنے کیلئے غیر رہائش پذیر ہندوستانیوں کی شرکت حاصل کر لی گئی ہے تاکہ اُن کی اقتصادی خوشحالی اور مہارت کا رُخ سُود مند نتائج کی طرف موڑا جاسکے۔

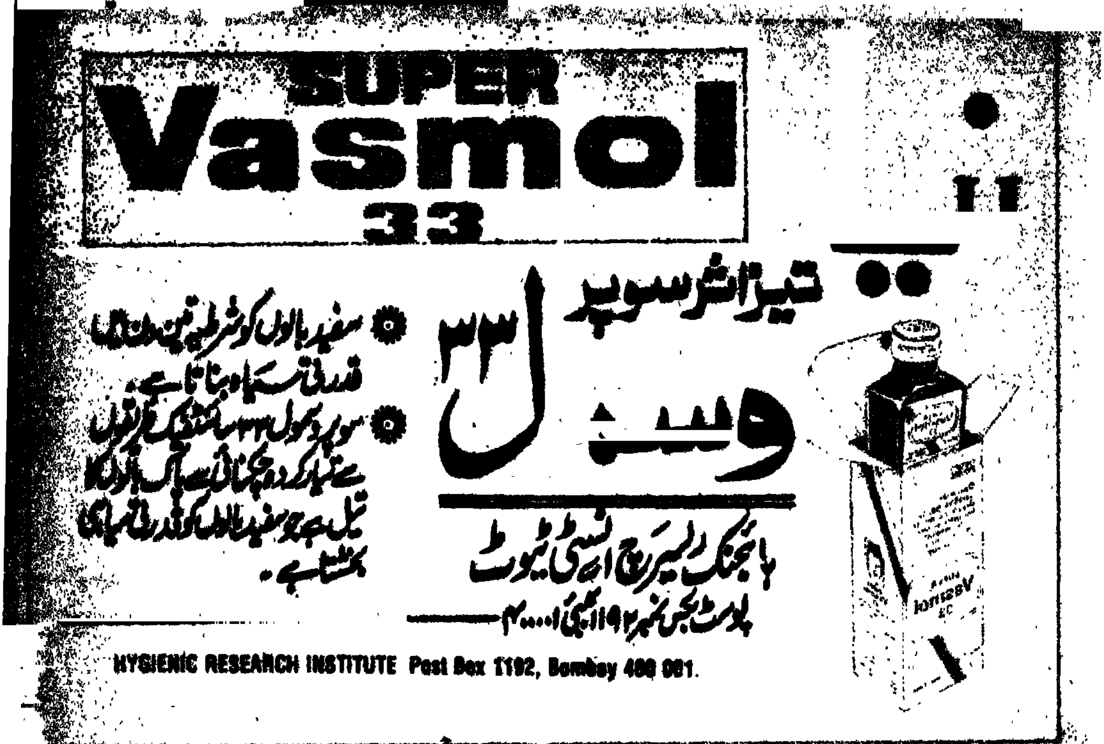
★ آٹھویں پنج سالہ منصوبہ کے دوران دیہاتوں میں گھریلو صنعتوں کے ذریعہ چھ لاکھ لوگوں کو روزگار مہیا کرنے کا پروگرام مکمل ہونے کے لئے مہاراشٹر اسٹیٹ کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز بورڈ ہمارا معاون و مددگار رہے گا۔

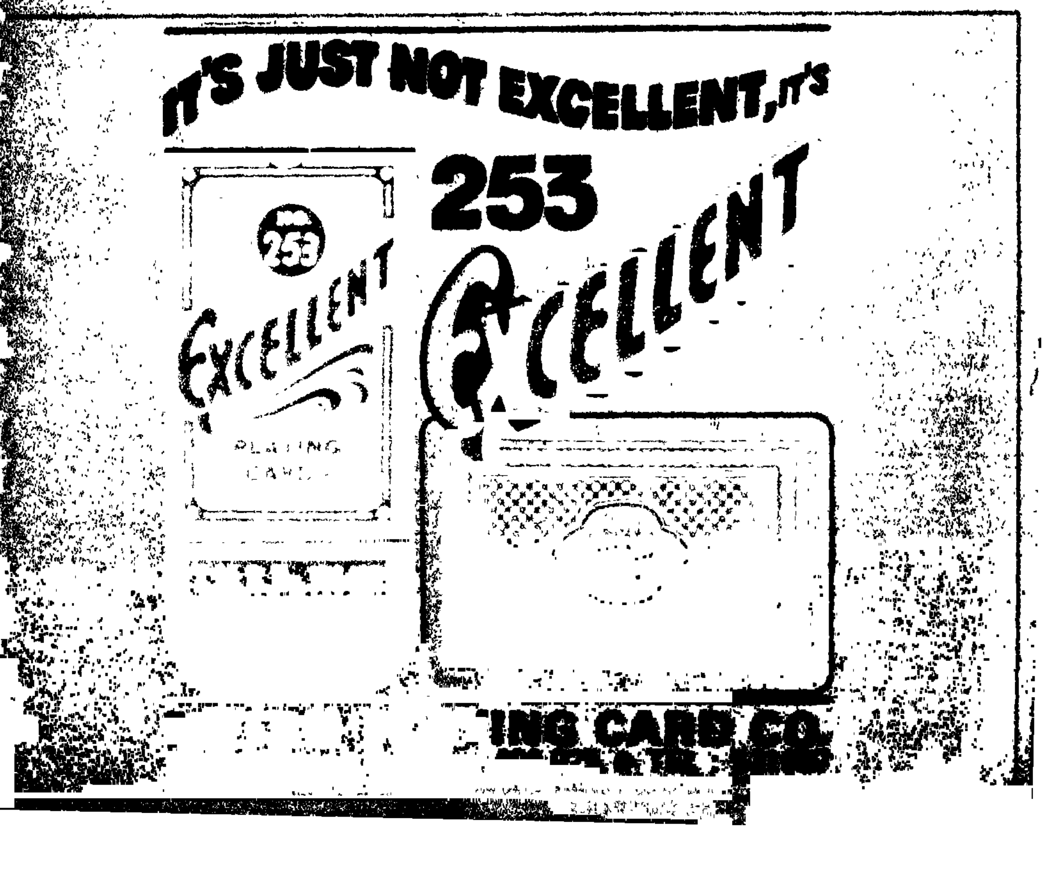
★ چھوٹے، معمولی اور ادیباسی کسانوں کو ۲۰۰ کروڑ روپئے سے زائد قرضہ جات کی ادائیگی سے نجات کی منظوری۔

★ مہاراشٹر کی محققانہ اور باوقار روزگار ضمانت اسکیم جس میں ہر شخص کیلئے کام کا حق تسلیم کیا گیا ہے اور ترقی پسندانہ پالیسی کے ذریعہ اسے نفری طاقت کے صحیح استعمال کے قابل بنایا گیا ہے تاکہ ایک پائیدار دیہی ترقی کا خواب پورا کیا جاسکے۔

★ متعینہ مدّتی خصوصی عملی منصوبہ پر عمل درآمد کی ابتدا، تاکہ گڈچرولی، چندرپور اور دھولے اضلاع کے ادیباسیوں کی ہمہ جہتی ترقی کے عمل کو تیز سے تیز تر کیا جاسکے۔

★ کوکن ریلوے پروجیکٹ میں مہاراشٹر اپنے واجبی حصّہ کا حق پوری طرح ادا کر رہا ہے جو کہ ریاست کے ۷۲۰ کلومیٹر طویل ساحلی علاقہ کی ہمہ جہتی ترقی کے لئے ایک نعمت ہے۔


SUPER
Vasmol
33
تیز اثر سوپر
ہائجنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۲ بمبئی ۴۰۰۰۰۱
HYGIENIC RESEARCH INSTITUTE Post Box 1192, Bombay 400 001.

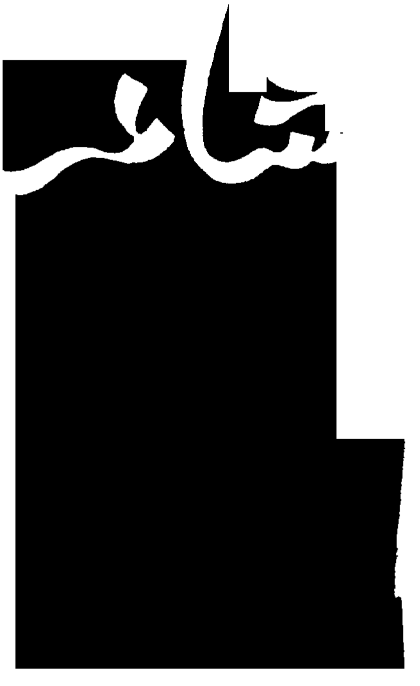

IT'S JUST NOT EXCELLENT, IT'S
253
EXCELLENT
253
EXCELLENT
PLAYING
CARDS
ING CARD CO.

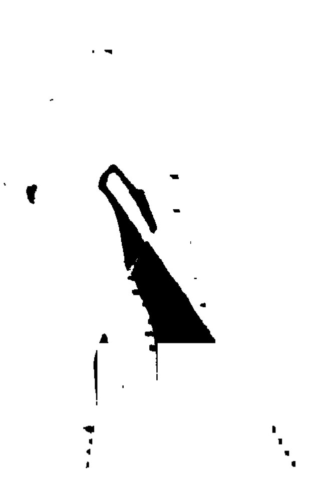
Regd. No. MH-B.Y.W. 311 — شاعر — Price: Rs. 5

THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

61 Years of Publication ✱ *(Publishing Date: 27-28)* ✱ Issue No 2 1990 ✱ Telephone No. 359904.

Registered with the Registrar of Newspapers at R N No 14482/57





پ: ۱۰ جولائی ۱۹۰۹ء ● روشؔ صدیقی ● م: ۲۳ جنوری ۱۹۷۱ء

تو اپنے وقت کا ہے، کامیاب نظم نگار
نگاہِ اہلِ ادب میں نہ کیوں ہو تیرا وقار
ترا کلام ہے شعر و ادب کا گنجینہ
تری روش پہ ہے مستقبلِ سخن کا مدار

●

نام: شاہد عزیز، تخلص: روشؔ، کنیت: صدیقی۔ مشہور نام روشؔ صدیقی۔ جوالا پور۔ [ضلع سہارنپور] میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد شاہد بھی شاعر تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر حاصل کی۔ ہندی سے بھی واقفیت حاصل کی، انگریزی اور سنسکرت بھی سیکھی۔ جوالا پور ہی میں بانس کا کاروبار کرتے تھے۔ ملک کی آزادی کے بعد فسادات نے روشؔ صدیقی کے مکان کو نذرِ آتش کیا اور وہ جان بچا کر جوالا پور چھوڑنے پر مجبور ہوئے، مراد آباد آ گئے اور مولوی مظہر جمیل کے مکان میں پناہ لی۔ روشؔ صاحب ۱۹۴۸ء سے ... تک مراد آباد میں رہے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد عقدِ ثانی بھی یہیں مولوی مظہر جمیل کی صاحب زادی سعیدہ سے ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں وہ میرٹھ منتقل ہو گئے۔ ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۳ء آل انڈیا ریڈیو کے شعبۂ اردو میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازمت کی۔ ملازمت کے دوران یورپ کے بعض شہروں کا سفر بھی کیا۔ روشؔ صدیقی بہت کم عمری ہی میں شعر کہنے لگے تھے۔ ابتدا میں کلام پر اپنے والد سے اصلاح لی، پھر کسی کے شاگرد نہیں ہوئے۔ بہاولپور کے سید مبارک شاہ جیلانی [م: ۲۱ نومبر ۱۹۶۹ء] کے ساتھ ایک پرچہ "لالۂ صحرا" جاری کیا، مگر ایک شمارے سے آگے بات نہیں بڑھی۔ روشؔ صدیقی نے غزل بھی کہی لیکن نظم گوئی میں ان کو ملکہ حاصل تھا۔ نظم نگار کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کی۔ ۲۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو شاہجہاں پور کے ایک مشاعرے میں شرکت کی، مشاعرے میں کلام سنانے کے دوران دل کا شدید دورہ پڑا اور ۲۳ جنوری کی صبح ساڑھے چار بجے انتقال کیا۔ میت کو میرٹھ لایا گیا اور درگاہ شاہ ولایت میں [عبد السمیع بیدل تلمیذ غالب کی قبر کے پاس] سپردِ خاک کیا گیا۔

مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ صرف ایک کتابچہ نظم "کاروان" مطبوعہ ۱۹۵۰ء بمبئی۔ اور شعری مجموعہ "محرابِ غزل" مطبوعہ ... شائع ہو سکے۔

فکر امروز



شاعر اگر مفکر نہیں تو میں اسے شاعر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ فکر سے نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور بغیر فکر جو اشعار کہے جاتے ہیں وہ مفکر شعرائے قدیم و جدید کے افکار کا سرقہ یا عکس ہوتے ہیں، ان میں ذاتی سرمایۂ فکر کچھ نہیں ہوتا ایسے اشعار کو توارد کہنا کسی طرح صحیح نہیں۔ ایک مفکر شاعر کے کلام میں سرقہ، توارد یا نقل کا شائبہ بھی نہیں ہوتا، اس کی قوتِ فکر خود ہی بے بہا اچھوتے موتی طبیعت کے سمندر سے نکال لاتی ہے۔

سخنوری کی یہ معراج اصلاحِ خیال سے حاصل ہوتی ہے ایک حقیقی شاعر کا فرض ہے کہ وہ عام سطح سے اپنے خیالات کو بلند رکھے، ان کے خیالات محدود نہ ہوں بلکہ عالمگیر ہوں جب خیالات عام سطح سے بلند ہوں گے تو ظاہر ہے کہ شعر بھی ضرور بلند ہوگا اور جب شعر بلند ہوگا تو شاعر کا رتبہ بھی ضرور بلند مانا جائے گا۔

[دستور الاصلاح۔ صفحہ نمبر ۱۸، مطبوعہ جولائی ۱۹۴۰ء۔ بارِ اول (آگرہ)]

سیماب اکبر آبادی

شاعر

ماہنامہ
۶۱ واں سال

جلد — ۶۱
شمارہ — ۳

۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

●

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے ◆ لائبریریوں سے ۶۰ روپے

شاعر خریداری ۱۰۰۰ روپے ◆ معاونین سے ۱۰۰ روپے ◆ ممالکِ غیر سے ۳۵۰ روپے

کریں ارمان پورے سبھی کے جلائیں دیپ چلو خوشی کے
اندھیروں کو دور کر کے منائیں تہوار روشنی کے

دیوالی یعنی انسانی سماج کی یکجہتی کی درخشندہ علامت۔ اس یکجہتی کو برقرار رکھنے کے لئے مہاراشٹر ۴۰ سال سے ترقی کی شمع جلاکر لاکھوں انسانوں کا چراغ حیات روشن کر رہا ہے۔ غریب، دلت اور ادیباسی جیسے سماج کے پس ماندہ طبقات کی زندگی میں اجالا لانے کے لئے دو سال سے زائد عرصہ میں مہاراشٹر نے وزیر اعلیٰ شری **شرد پوار** کی عمدہ اور فعال قیادت میں فیصلہ کن قدم اٹھائے ہیں۔

دو سال قبل دیوالی کی مہورت پر، بہت کم زمین رکھنے والے لاکھوں کسانوں کو ۲۰۰ کروڑ روپئے کے قرض کے بوجھ سے نجات دلانے کا مبارک فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کے بعد گاؤں ہی کو ترقی کا مستحق سمجھ کر روزگار ضمانت اسکیم کا افرادی قوت پر مبنی لیا گیا جائزہ، لاکھوں ایکڑ بنجر زمین کو قابل کاشت بنا کر کھیتی کا بوجھ کم کرنے کے لئے پھلوں کی کاشت کا اہم پروگرام، آٹھویں پنج سالہ منصوبہ میں، دیہی صنعتوں میں ۶ لاکھ افراد کو روزگار فراہم کرنے کا فیصلہ، روزگار میں خواتین اور درج فہرست ذاتوں، قبائل کو ترجیح دیہی علاقوں میں غریبی دور کرنے کے لئے، پچھڑے ہوئے علاقوں میں ۶۵ ترقیاتی مراکز کا انتخاب اور چھوٹی گھریلو صنعتوں کے ۹۴ مراکز کے قیام کے لئے اٹھائے گئے قدم، پس ماندہ علاقوں میں کاروبار شروع کرنے والے لوگوں کو مخصوص سہولتوں کے ساتھ ہی غیر رہائشی ہندوستانیوں کے متوقع ۷۰۴ کاروباری گروہوں کی منظوری، گڑھ چرولی چندر پور اور دھولیہ ضلع کے ادیباسیوں کی جلد ترقی کے لئے مخصوص قسم کے کاموں کے پروگرام کا عزم، کوکن کی ترقی کے لئے کوکن ریلوے پروجیکٹ کے خرچ کا زیادہ تر بوجھ برداشت کرتے ہوئے اس میں پیش رفت لانے کا ارادہ، ودربھ، مراٹھواڑہ، کوکن اور مہاراشٹر کے بقیہ حصوں میں سائنس کے ترقیاتی ادارے کے قیام کا مرکز سے مطالبہ وغیرہ ایسے فیصلے ہیں جو مہاراشٹر کے عوام کے مستقبل کو یقیناً سنوار دیں گے۔

فعال حکومت۔ حکومت مہاراشٹر

سرورق
سفرِ حیات
عمل
سلطان سبحانی

شمارہ ۳ [۱۹۹۰] جلد ۶۱

دلوں کے مسجد و مندر کی حفاظت

کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں؟

کیا آج شعر و ادب کی ضرورت ہے؟ اگر ہے تو کس کے لیے؟ اگر ضرورت نہیں ہے تو پھر کیوں بے جان و بے روح لفظوں اور جملوں کی کاریگری کا بازار گرم ہے؟ قلم کاروں کا کام اپنے عصر کو نئی معنویت سے روشناس کروانا، نئے سماج کی تعمیر و تشکیل میں نمایاں کردار ادا کرنا۔ مساوات، محبت اور اخوت کی راہیں روشن کرنا ہوتا ہے۔ نئے نئے خواب اور خوابوں کے نئے نئے جہان تراشنا ہوتا ہے۔ اپنے ضمیر کی آواز کو سننا اور اسے مسلسل واضح اور صاف کرنا ہوتا ہے تاکہ کسی معیار و میزان کے تعین میں غیر جانب دارانہ رویّوں کی مثالیں قائم ہو سکیں۔ ایک مثبت موقف، سیاسی، سماجی اور معاشی سطحوں کو بلند سے بلند تر کر سکے۔ مگر کیا آج کے قلم کار، خواہ وہ اردو والے ہوں یا پھر ہندوستان کی دیگر زبانوں کے قلم کار، کیا وہ اپنی انھیں ذمہ داریوں کو پورا کر رہے ہیں؟ ہمارے خیال میں نہیں۔ شعر و ادب کی تخلیق کا سلسلہ تو جاری ہے تاہم یہ شعر و ادب اپنے عصر کی آواز نہ ہوتے ہوئے بہت سی غیر ضروری اور بے ہنگم آوازوں میں گم ہو گیا ہے یا گم کر دیا گیا ہے ورنہ تو موجودہ صورتِ حال میں ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادبا و شعرا اور دانشور بہ یک زبان ان لوگوں کے خلاف آواز بلند کرتے جنھوں نے عالمی مسائل سے چشم پوشی کرتے ہوئے اپنے ذاتی عناد، تعصبات اور مقامی مسائل کو سیاسی رنگ دیتے ہوئے انھیں ملکی اور عوامی مسائل میں تبدیل کرنے کی کوششوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے ذہنوں کی بن آئی ہے اور غیر ضروری کاموں اور غیر ضروری مسائل ہی کو اپنے لئے اہم سمجھے ہوئے ہیں اور مصروف کار ہیں۔ وجوہ چاہے جو بھی ہوں اور مقاصد چاہے کچھ بھی ہوں، ہندوستان اپنے ہی لوگوں کی سازشوں کا شکار ہے۔ خونی درندے جنھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ لاحاصل کاموں سے اپنا ناقابلِ تلافی نقصان آپ کر رہے ہیں۔ صدیاں گزر جائیں گی اور نتیجہ صفر ہی رہے گا۔ مگر جب کسی ملک پر سیاست داں حاوی ہو جائیں اور عوام کٹھ پتلی بن جائے اور ہر طرف سیاسی بونے نظر آنے لگیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس ملک کے دانشور، ادبا و شعرا اور قلم کار اپنے اعلیٰ منصب سے یا تو محروم کر دیئے گئے ہیں یا انھوں نے اعلیٰ ادب تخلیق کرنا بند کر دیا ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ہندوستانی دانشور کہاں ہیں، قلم کار اور تخلیق کار کہاں ہیں؟ وہ سیاست دانوں سے آگے کیوں نہیں ہیں؟ ملک کے موجودہ انتشار اور تباہیوں کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کر رہے ہیں؟

ہم اِشاعر کے ذریعہ سخت احتجاج کرتے ہیں ان لوگوں کے خلاف جنھیں ہندوستان کی صحیح تاریخ کا علم نہیں، جو یہ نہیں جانتے کہ آزاد ہندوستان کا آئین کیا ہے؟ جنھیں یہ نہیں معلوم کہ وہ خود کیا ہیں۔ قتل غارت گری اور مسلسل فسادات کے خلاف ہمارا سخت ترین احتجاج ہے۔

ہندوستانی زبانوں کے تمام قلم کاروں کو ہمارا پیغام ہے کہ وہ ملک کی موجودہ صورتِ حال اور ناپسندیدہ سیاست دانوں کے خلاف اپنی احتجاجی آواز بلند کریں۔ اپنے رسائل و اخبارات کے ذریعہ عوام کو محبت و آشتی اور قومی یکجہتی کا درس دیں اور اپنی اہمیت و حیثیت کا بھرپور اظہار کریں۔

آج ملک کو ہماری سب سے زیادہ ضرورت ہے کہ فنونِ لطیفہ ہی کے ذریعہ انسانیت کی معراج کا تصور ممکن ہے۔ شعر و ادب ہی کے ذریعہ چھوٹے چھوٹے سیاست دانوں اور بونوں کو سبق سکھایا جا سکتا ہے۔ ایک مثالی معاشرے کی تعمیر و تشکیل کی ذمہ داری ہم پر دوسروں سے زیادہ ہے۔ ہمیں دلوں کے مندر و مسجد ہیں، ان کے محافظ ہیں۔ آج کی سیاست، شعر و ادب پر حاوی ہو گئی ہے۔ دلوں کے مسجد و مندر کی حفاظت کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں؟

بستی بستی خون کے دریا دیکھیں گی
اب یہ آنکھیں اور کیا کیا دیکھیں گی؟

شاہد احمد دہلوی بنام اعجاز صدیقی

ساقی کراچی

SAQI KARACHI. 5

6. 11. 62.

برادرم سلام مسنون۔

افکار کا جوش نمبر آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ اس میں جوش صاحب کی شخصیت پر میرا ایک مضمون ہے۔ اس مضمون کا جواب جوش صاحب نے جوش نمبر کے دوسرے ایڈیشن میں دیا ہے جس میں میرے باپ دادا تک کو برا بھلا کہا ہے۔ جواب الجواب کے لیے میں نے ساقی کے جوش نمبر کا اعلان اکتوبر کے ساقی میں کر دیا ہے۔ اس خاص نمبر میں جوش صاحب کا صرف دوسرا رخ پیش کیا جائے گا۔ ایک رخ افکار پیش کر چکا ہے۔ بعض احباب سے درخواست ہے کہ اس سلسلے میں قلمی اعانت فرمائیں۔

جوش صاحب نے نظم میں جو جیت کے سالے اور ... تو کیا آپ جوش صاحب کی مشغولیات زندگی پر مضمون لکھنے کی عنایت کریں گے؟

آپ چونکہ ۳۳ سال سے ... جوش صاحب کی شخصیت اور ان کی ... Ex ... کو دیکھا ہے۔

مضمون ۲۰ نومبر تک آ جانا چاہیے۔

شاہد

شاہد احمد دہلوی [پ: ۲۲ مئی ۱۹۰۶ء دہلی - م: ۲۷ مئی ۱۹۶۷ء کراچی] رسالہ ساقی [اجراء: جنوری ۱۹۳۰ء دہلی، دورِ ثانی ستمبر ۱۹۴۸ء کراچی] کے مدیر، شمس العلماء مولوی نذیر احمد [م: ۱۹۱۲ء] کے پوتے مولوی بشیر الدین احمد [م: ۱۹۲۷ء] کے صاحبزادے۔ صاحبِ طرز ادیب، صحافی، مترجم، افسانہ، ڈرامہ اور ناولٹ نگار، موسیقار۔ ایک ہمہ جہت و ہمہ صفت شخصیت۔ افکار (کراچی) نے اکتوبر، نومبر ۱۹۶۲ء میں ضخیم جوش نمبر [۶۷۲ صفحات] شائع کیا تھا۔ اس نمبر میں شاہد احمد دہلوی کا ایک مضمون بعنوان: جوش ملیح آبادی۔ دیدہ و شنیدہ، شامل تھا۔ اس مضمون میں جوش کی تمام خامیاں اور خوبیاں نمودار کی گئی تھیں۔ مدیر افکار صہبا لکھنوی نے مضمون کے وہ حصے حذف کر دیے جن میں جوش کی جنسی کجروی اور بیان کی کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ جوش صاحب کو مذکورہ مضمون ناگوار گزرا۔ شاہد صاحب کو اس کا افسوس تھا، وہ جوش صاحب سے مل کر انھیں منانے والے تھے کہ معلوم ہوا جوش صاحب اس کا جواب لکھ رہے ہیں، عندیہ ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ شاہد صاحب نے اپنا مضمون مکمل طور پر نقش (ادبی ڈائجسٹ کراچی) میں شائع کروا دیا۔ جوش صاحب کا مقالہ ضرب شاہد الغرق، شاہد باز کے عنوان سے جوش نمبر [دوسرا ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۶۳ء] میں شائع ہو گیا۔ یہ مضمون شاہد احمد دہلوی مرحوم اور ان کے اب و جد کے خلاف تھا۔ شاہد صاحب نے نہ صرف یہ کہ اس مضمون کا جواب "جنس و ڈھول بجے" کے عنوان سے تحریر کیا بلکہ اپنے تاریخ ساز ادبی رسالے ساقی کا ضخیم جوش نمبر [۳۹۰ صفحات، مطبوعہ ۱۹۶۳ء کراچی] بھی شائع کیا جو جوش صاحب کی شخصیت اور فن کے خلاف تھا۔ زیرِ نظر خط ساقی کے جوش نمبر کے سلسلے میں تحریر کیا گیا تھا۔ قبلہ اعجاز صدیقی نے شاہد صاحب کے خط کا کیا جواب دیا اور ساقی کے جوش نمبر کے لیے کیا

طرزِ نگارش ـــــ زبان و طرزِ بیان کی خامیاں اور انکی اصلاح

اُردو زبان کے تمام مصنفین اور ادبا کو دعوتِ غور و فکر (پندرھویں قسط)

زبان و بیان کی خامیوں کی اصلاح کے لئے کنول کی زندگی کے روزِ اول سے کوشاں ہوں۔ یہ تو کہنا مشکل ہوں کہ میری یہ کوشش کامیاب ثابت نہیں ہوئیں لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے مجھے بڑی کاوش اور محنت کرنی پڑی ہے۔ یہ اول کل مطالعہ میرا سب سے محبوب شغل ہے مگر طرزِ نگارش کے لئے جس احتیاط اور غور و فکر سے مطالعہ کرنا پڑتا ہے اُسے میں ہی جانتا ہوں۔ کچھ تو اصلاحِ زبان کا یہ خبط ہی ہے اور کچھ اس سلسلے کی اہمیت نے ہمت بڑھا رکھی ہے۔ کنول کو دوسرے ادبی اور معیاری ماہناموں سے ممتاز رکھنے والا صرف یہی ایک موضوع ہے پھر اس کی پسندیدگی بھی بہت زیادہ حوصلہ افزا ہے ہر چند کہ میری یہ جسارت بہت سے حضرات کو ناگوار ہے اور اکثر تو مجھ سے مستقلاً ناراض ہیں مگر مجھے اس کا کوئی ملال نہیں کیونکہ اس طرح تھوڑی یا بہت زبان کی خدمت تو ہو ہی رہی ہے اور یہی ایک چیز ہے جو اب تک اس سلسلے کو جاری رکھنے کی ضامن ہے تاہم معاصرین کی عدم توجہی میرے لئے سببِ ملال ضرور ہے۔

اُردو کی ترقی اور اُردو زبان کی ترویج کے لئے بہت کچھ ہو رہا ہے اور بہت کچھ ہوتا رہے گا لیکن رونا یہ ہے کہ اصلاحِ زبان کا کوئی معقول انتظام نہیں، اور نہ حالات ہی ایسے نظر آتے ہیں جو اس طرف سے مطمئن کر سکیں۔ اس وقت سب سے اہم سوال نئی پود کی تربیت و تہذیب کا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں اُردو کی جو رسمی تعلیم جاری ہے اُس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اور اگر یہی رفتار رہی تو اُردو ادب کے مستقبل کو وہ تابانی نصیب نہیں ہو سکتی جو حقیقتاً ہونی چاہیے کیا آج ہندوستان میں کچھ ایسے ادارے ہیں جو ہمارے نوجوانوں کو صحیح طور پر اُردو ادب سے بہرہ مند کر سکیں۔ محض تجویزیں پیش کرنے یا انجمنیں اور سوسائٹیاں بنانے سے تو یہ مقصد پورا ہو نہیں سکتا۔ اس کے لئے عملی طور پر کچھ کرنے کی ضرورت ہے اور "عمل" شاید اس دور میں ہمارے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا۔

میری طرح دوسرے معاصرین بھی اس حقیقت سے ناواقف نہیں کہ رسالوں کا مطالعہ کرنے والے طلبا ہندوستان کے ہر حصے میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ ان رسالوں کے مطالعہ سے اُن کے ذہن جو اثرات قبول کرتے ہیں وہ رفتہ رفتہ مستقل ہو جاتے ہیں اور یہ بھی مسلّم ہے کہ ہندوستان کے بیشتر رسائل زبان و بیان کی خامیوں سے لبریز نظر آتے ہیں تو کیا ایسی صورت میں آپ اس کا اعتراف نہ کریں گے کہ ہم خود اپنی نوجوان جماعت کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اور کیا یہ ناممکن ہے کہ اگر رسالوں کے تمام مضامین نظرِ ثانی کے بعد شائع کئے جائیں تو بڑی حد تک اصلاحِ زبان کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ سب کچھ ممکن ہے اور سب کچھ ناممکن، سوال تو عملاً کچھ کرنے کا ہے: مگر ایسا کون کرے اور کیوں کرے۔ زبان بگڑتی ہے، بگڑے۔ طلبا گمراہ ہوتے ہیں ہوں۔ تو پھر ایسی صورت میں اصلاحِ زبان کا دعویٰ کرنا ہی مہمل ہے اور اگر نہیں ہے تو للہ کچھ کر کے دکھائیے۔

میرا فیصلہ یہ ہے کہ اگر ہم سب متحد ہو کر اصلاحِ زبان کا تہیہ کر لیں اور زبان و بیان کی خامیوں کی اصلاح کی طرف توجہ کرنے کی طرح توجہ کریں تو ایک قلیل عرصے میں اُردو کی اتنی خدمت کر سکتے ہیں جو بحالتِ موجودہ سالہا سال تک نہیں ہو سکتی۔ صورت تو یہ ہے کہ ہم زبان کے سوال پر فوراً بگڑ جاتے ہیں مگر حالت یہ ہے کہ اصلاح کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھاتے۔ یہ ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے کہ آگ لگی ہوئی دیکھ رہے ہیں مگر اُسے بجھانے کی کوشش نہیں کرتے! اگر آپ کو اُردو سے محبت ہے اور اگر آپ واقعی طور پر اُردو کے پرستار ہیں تو یقیناً آپ کو میدان میں آنا پڑے گا۔ ورنہ پھر اپنی شکست کا اعلان کیجئے اور اپنی آنکھوں سے اُردو کی تباہی کا تماشہ دیکھئے۔



منظر صدیقی مرحوم

میں طرزِ نگارش کے تحت جو کچھ پیش کرتا ہوں وہ تازہ ترین رسائل کا حاصل ہوتا ہے اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم غلط روی کے کس درجہ عادی ہو چکے ہیں۔ کیا اب بھی آپ اس کا اعتراف نہ کریں گے کہ اردو زبان کو اور اردو ادب کو دانستہ نقصان پہونچانے والے ہم خود ہی ہیں۔ اگر ہر ادبی ماہنامے میں صرف ایک یا دو صفحے اصلاحِ زبان کے لئے وقف کردیئے جائیں تو کیا یہ مشکل ہے اور کیا اسطرح ہم ادبِ اردو کی سب سے بڑی خدمت نہ کرسکیں گے۔ میں اپنے محترم معاصرین کو بار بار توجہ دلانے کے بعد بھی مایوس نہیں ہوا ہوں اور آج پھر انہیں اس تحریک پر لبیک کہنے کی دعوت دیتا ہوں۔

زبان و بیان کی خامیاں	تصحیح	تفریح
اپنی ضرورت اُسکے آگے کہی	اپنی ضرورت اُس سے بیان کی	۱؎ سبحان اللہ
جہاز کو غرق کردینے کا ڈراوا دیتی تھی	جہاز کو غرق کردینے کی دھمکی دیتی تھی	۲؎ کس قدر حسین اندازِ بیان ہے
ضعفی سے عذر نہیں دیتے	انصاف سے عذر نہیں دیتے	
بہت کچھ ڈھلکی ہوئی نظر آتی تھیں	بہت کچھ مائل نظر آتی تھیں	
لیکن درحقیقت یہ ہے کہ	لیکن حقیقت یہ ہے کہ	۳؎ کیا اسی کا نام ترقی ہے؟
اُسے قیدخانہ میں باندھ رکھا	اُسے قیدخانے میں ڈال دیا	۴؎ لیجئے اب انسان بھی حیوان سمجھے جانے لگے
طبیعت بالکل برقرار تھی	طبیعت بالکل مطمئن تھی	۵؎ مطمئن کے لئے برقرار لکھنا واقعی اجتہاد ہے۔
غار بہت بڑی اور محفوظ ہے	غار بہت بڑا اور محفوظ ہے	۶؎ غار مذکر ہے۔
جھوٹی تعزیت کرگیا	رسمی تعزیت کرنے گیا	۷؎ کیا خوب۔
گال پچکے ہوئے	گال پچکے ہوئے	
اپنا زور بکھار رہی تھیں	اپنا نور بکھیر رہی تھیں	
نازک تار کو اتفاقیہ چھو دیا ہو	نازک تار کو اتفاقیہ چھیڑ دیا ہو	
اسے کس طرح برتنا ہوگا	اُسے کس طرح پیش آنا چاہیے	۸؎ ملاحظہ کیجئے ہماری اردو
اُس کی ذہانت کے جھنڈے گڑے تھے	اس کی ذہانت کی شہرت تھی	۹؎ اس فقرے کی داد دینا کفر ہے۔
چوکیدار نے زبانِ برق سے کہا	چوکیدار نے ٹیلیفون سے کہا	۱۰؎ ٹیلیفون کا ترجمہ "زبانِ برق" واقعی کارنامہ ہے۔
پیش از وقت بوڑھے ہوجانا	قبل از وقت بوڑھا ہوجانا	
تمہارے دماغ سے کیسے اُتر سکتے ہیں	تمہارے دماغ سے کیونکر محو ہوسکتے ہیں	
بہت مفید اور بکارآمد ثابت ہوئی	بہت مفید اور کارآمد ثابت ہوئی	
اپنا ہم رائے بنالیا	اپنا ہم خیال بنالیا	
بے فکرانہ انداز میں	بے فکری کے انداز میں	
اور مباحثت پر چل کھڑا ہوا	اور مباحثت کے لئے روانہ ہوگیا	
میرا ضمیر بالکل پاک اور صاف ہے	میرا ضمیر بالکل پاک ہے	۱۱؎ ضمیر مذکر ہے
دونوں کی ناکامی پر	دونوں کی شکست پر	
پردۂ گیتی پر اپنے ہیجانی جلوات کو آشکار کرنے کے	پردۂ گیتی پر اپنے نوراتی جلووں کو آشکار کرنے کی غرض سے	۱۲؎ اس عمل نویسی کی داد دیجئے۔
منظر خوش کے لحاظ سے	خوشنما ہونے کے لحاظ سے	
اس کو ناگواری ہوئی	اُسے ناگوار ہوا	۱۳؎ ماشاء اللہ کیا اردو ہے
خلائق کے سلاموں کا جواب	خلائق کے سلام کا جواب	
تھکاوٹ کے مارے	تھکان کی وجہ سے	
حسرت بالفروش نگاہوں سے	حسرتناک نگاہوں سے	
ہاتھ میں شمعدان پکڑا ہوا تھا	اُس کے ہاتھ میں شمعدان تھا	
جنتِ فردوس بھی	جنت بھی	۱۴؎ جنت اور فردوس کیا ایک ہی معنی نہیں رکھتے۔
سوگند اٹھائی	قسم کھائی	

منظر

مکتبہ قصر الادب سے شائع ہونے والے ادبی رسائل میں زبان و بیان کی اصلاح تحقیق و تصحیح لسانی مباحث املا اور قواعد و عروض کے بارے میں بطورِ خاص مضامین و مباحث دیے جاتے رہے ہیں۔ ماہنامہ "تحویل" آگرہ [مدیر منظر صدیقی ف ۲ اکتوبر ۱۹۷۰ء] میں طرزِ نگارش کے عنوان سے ایک سلسلہ شروع کیا گیا تھا جو بے حد مقبول رہا۔ آج کے ادبی رسائل اس نوع کے افادی سلسلوں اور کالموں سے یکسر خالی ہیں۔



راشد آذر

غزل

کیا جانیے کب میری دعاؤں میں اثر ہو
ہو میرا خدا کوئی تو کچھ اس کو خبر ہو

آنکھوں ہی میں رہنے دو کہ دامن نہ جلا دے
پلکوں سے ٹپک جائے تو ہر قطرہ شرر ہو

ہاتھوں سے ترے رنگِ حنا چھوٹے تو، لیکن
اس ڈھنگ سے چھوٹے کہ کسی کو نہ خبر ہو

تم بند کواڑوں سے پلٹ جاتے ہو شاید
اب گھر ہو تو ایسا ہو کہ دیوار نہ در ہو

تب جانوں کہ غم سہتے ہوئے میری طرح سے
اک عمر کسی کی اگر اس طور بسر ہو

یہ کیا، کہ ہو برسوں سے یہ ذرّوں کا رویّہ
جس نقطے پہ میں ہوں وہیں مائل بہ سفر ہو

ہے اپنے وطن میں بھی غریب الوطن آذر
وہ شخص کہ جو شہر ہی میں شہر بدر ہو

سوغاتِ جاں

میں نے مانگا تھا بچوں کی خاطر سکوں
مجھ سے امن و اماں کی ہر اک آرزو
چھین کر مجھ کو بے خوابیاں سونپ دیں
اتنی پھیلائی دہشت کہ اب گاؤں بھی
شہر کی طرح وحشت کدہ ہو گیا
اپنے بچوں کو لے کر کہاں جاؤں میں
کس سے پوچھوں کہ یہ زندگی کس لئے
مرگِ انبوہ بے خانماں ہو گئی
اپنے اشکوں کے دریا بہائے گئے
سارے اخبار کی سرخیاں بہہ گئیں
میری آنکھوں میں اب ہر خبر کے لئے
ایک آنسو کا قطرہ بچا ہے فقط
اس قدر بے سبب خونِ ناحق ہوا
میں تو حیران تصویر سا ہو گیا
مجھ کو کمرے کی دیوار پر ٹانگ دو
تاکہ تم میری نظروں کی زد میں رہو
میں خموشی کو اپنی زباں دے سکوں
اپنے بچوں کو سوغاتِ جاں دے سکوں



علی جواد زیدی

۱۵/۵۔ اے، گرین فیلڈ، مہاکالی کیوس روڈ، اندھیری (ایسٹ) بمبئی۔ ۹۳

معیاری زبان کا سوال

اردو میں یہ سوال نیا نہیں ہے۔ شاید سب سے پہلے دلّی میں اٹھایا گیا، دلّی اور لکھنؤ کی رقابت کے زمانے میں ذرا تیز لہجے میں بات ہوئی، پھر پنجاب کی ادبی سرگرمیوں کو دیکھ کر، قدیم مراکز دلّی و لکھنؤ کے مقابلے میں ابھرتے ہوئے مرکز کے سلسلے میں ہلکی ہی نوک جھونک چلی، ادھر حیدرآباد میں لہجے کا کچھ فرق محسوس کیا گیا، بعض محاوروں میں اختلاف نظر آیا، تو ادبی زبان میں اس پر چھیڑ چھاڑ ہوئی۔ یہ گفتگوئیں یک طرفہ بھی نہیں تھیں، لیکن اصولی دائرے کی بیرونی لکیر کو چھو کر گزر جاتی تھیں اور اب تک کسی نے کھل کر اس موضوع پر لکھنے یا سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ آخر ہم معیاری زبان کسے کہتے ہیں اور اردو کے معاملے میں جہاں لہجوں، محاوروں وغیرہ کے اختلافات رونما ہوں وہاں کن اصولوں پر معیار کو پرکھا جائے۔ ابھی حال میں سفرِ پاکستان میں جناب شان الحق حقی کے مضامین کا تازہ مجموعہ "نقد و نگارش" تحفے میں ملا۔ اس میں حقی صاحب نے زبان کے معیار کا مسئلہ" اٹھایا ہے۔ یہ مضمون خیال انگیز ہے اور اس کی ضرورت ہے کہ اس موضوع پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔

سب سے پہلے تو یہ مان کر آگے بڑھنا چاہیے کہ ہر زندہ زبان کی قوتِ نامیہ کسی ایسے معیار کی متحمل نہیں ہو سکتی جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہو اور جسے کبھی بدلا نہ جا سکے۔ سچ تو یہ ہے کہ ترقی پذیر معاشروں میں زبان بھی برابر معرضِ تغیر و ارتقا میں ہے۔ زندگی نئی کروٹیں لیتی ہے، نئی ایجادیں سامنے آتی ہیں، آج زبانیں الگ تھلگ نہیں رہ سکتیں۔ ان کے باہمی میل جول سے الفاظ ہی نہیں، طرزِ اظہار اور بنیادی خیالات اور معیار بھی متاثر ہوتے رہتے ہیں اور غیر محسوس طریقے پر بدل جاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ تبدیلی اتنی سست رفتار ہوتی ہے کہ اس کا احساس بھی بہت دیر میں ہوتا ہے۔ کچھ علاقائی اختلافات ہوتے ہیں، جو تلفظ اور لہجے پر اثر انداز ہوتے ہیں، کچھ مقامی لوگ ادب سے، کچھ دوسرے خاندان کی زبانوں کے ربط و ضبط سے، کچھ اپنے دور کے اختراعی صلاحیتوں کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں۔ ان میں بعض تبدیلیاں تسلیم کر لی جاتی ہیں، بعض مسترد ہو جاتی ہیں اور بعض میں جزوی ترمیم ہوتی ہے۔ اس ہر آن بدلتے ہوئے پس منظر میں معیار کیسے بنے، کون بنائے اور بنانے کے بعد اسے تسلیم کون کرے؟ اس طرح کے بعض ضمنی سوال حقی صاحب نے اٹھائے ہیں، اور خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے ایک ترقی پذیر نقطۂ نظر اپنایا ہے۔

وہ اس حقیقت کو مان کر چلے ہیں کہ زبان کے لیے معیار کا ہونا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں وہ "قواعد، لغات اور محاورات کا معیاری ہونا" ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ابہام و تفہیم میں اشتباہ پیدا نہ ہو۔ انہوں نے تلفظ کو بھی ان لوازم میں شامل کیا ہے۔ ایک جگہ روا روی میں "فصاحت کے معیار" کی بات بھی آئی ہے لیکن بات آگے بڑھائی نہیں گئی ہے۔ پھر یہ ذکر چلا ہے کہ نوجوانوں اور بوڑھوں کی زبان اور مردوں اور عورتوں کی زبان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ شاعری کی زبان اور بول چال کی زبان، برسرِ اقتدار طبقے اور محنت کش طبقات کی زبانیں بھی بعض حیثیتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ پھر معیار کس کو مانا جائے؟ حقی نے یہ درست استنباط کیا ہے کہ ماضی میں لال قلعے والوں کی زبان عوام الناس کے لیے معیاری تھی، لیکن لکھنؤ والے بعض جزوی معاملات میں اپنی رائے سے کچھ ردّ و بدل بھی کرتے رہے، مثلاً بعض محاورات کے سلسلے میں یا تذکیر و تانیث کے بارے میں لکھنؤ میں ناسخ نے اصلاحیں کیں۔ اس کے پہلے دلّی میں شاہ حاتم بھی اصلاحیں کر چکے تھے۔ اس وقت شاہ حاتم کا طوطی بولتا تھا تو ان کی بات سب نے مان لی اور جب ناسخ نے یہ نعرہ بلند کیا تب بھی سب نے ان کی ہم نوائی کی۔ حاتم جس وقت متروکات کے حدود متعین کر رہے تھے تو وہ دلّی ہی نہیں، دکن کی بھی نمائندگی کر رہے تھے۔ ان کی اصلاحوں کو علی العموم قبول کیا گیا۔ یہی حال ناسخ کا تھا کہ ان کے متروکات کے نظام میں

لکھنؤ ہی کی طرح دلی بھی شامل تھا۔ حقی نے صحیح لکھا ہے کہ!

"وہ (ناسخ) اپنے دور کے مذاق کے ترجمان اور پورے اردو معاشرے، یعنی لکھنؤ، دلی دونوں کے نمائندے تھے۔ زبان کی صفائی اور ترقی کا عمل پورے اردو معاشرے میں ہو رہا تھا، کچھ ایسا نہیں کہ لکھنؤ میں ناسخ و آتش کی اور دلی میں میر و سودا کی زبان چل رہی تھی، جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ کسی بھی جگہ زبان کا قدم اتنی مدت تک ٹھہرا نہیں رہتا۔"[1]

حاتم زبان کو محاورۂ دلی سے قریب تر لانے کی کوشش کر رہے تھے اور یہ وہ عمل تھا جو دکن میں سراج اور ولی شروع کر چکے تھے۔ حاتم نے کچھ تو تدوین کا کام کیا اور کچھ نئے اصول قائم کیے جو رفتہ رفتہ عام طور پر قبول کر لیے گئے۔ معیار یوں ہی مدارج ترقی طے کرتے ہیں۔

غالباً انشا نے "دریائے لطافت" میں اس سوال کو پہلے پہل اٹھایا تھا۔ وہ ایک طرف دہلوی روایات کے امین تھے اور دوسری طرف لکھنؤ میں نئی روایات ابھرتے ہوئے دیکھ رہے تھے ۔ انھوں نے پہلے پہل یہ بھی وضاحت کی کہ دلی کے ہر علاقے کی زبان سند نہیں ہے۔ دہلوی زبان کے معیاری قرار دیے جانے کا سبب انھوں نے یہ بتایا کہ:

"شاہ جہاں آباد چوں کہ اکثر سلاطین مغلیہ کا دارالخلافہ اور جائے قیام رہا ہے اور چونکہ فریقین کے فصیح و بلیغ اور جید عالم اور فنون لطیفہ اور علوم شریفہ کے ماہر اس خوبصورت شہر میں رہنے لگے، اس کے لیے اس شہر کو امتیاز حاصل ہے۔ اگرچہ لاہور، ملتان، اکبرآباد اور الٰہ آباد بھی ذی شوکت بادشاہوں کا مسکن رہے ہیں، لیکن ان کو دہلی کے برابر نہیں کہہ سکتے کیوں یہاں اور مقاموں کے مقابلے میں بادشاہوں کا قیام زیادہ رہا ہے۔ یہاں کے خوش بیانوں نے متفق ہو کر متعدد زبانوں سے اچھے اچھے الفاظ نکالے اور بعض عبارتوں اور الفاظ میں تصرف کر کے اور زبانوں سے الگ ایک نئی زبان پیدا کی، جس کا نام اردو رکھا... زمانہ سابق (قبل شاہ جہاں) میں ہر شہر کے آدمی اس شہر میں آتے اور تہذیب و شائستگی حاصل کرتے، وہاں کے باشندے دوسرے شہر میں نہیں جاتے تھے اور اگر کسی ضرورت سے باہر جاتے تو اس مقام کے شرفا ان کی زیارت کے لیے آتے اور گفتگو کے طور طریق اور آدابِ مجلس اور باتیں سیکھتے۔"[2]

دلی کی خرابی کے بعد دلی والے مختلف حصہ ہائے ملک میں جا بسے۔ ان کے بارے میں انشا کی روایت ہے کہ "ان کی اولاد جو وہیں پیدا ہوئی اس کا روزمرہ بعینہٖ دارالخلافہ کا ہے۔ مگر بعض ایسے بھی ہیں کہ بیرونجات کے لوگوں کی صحبت اور میل جول سے چند الفاظ ایسے بھی استعمال کرنے لگے ہیں جو اردو کے خلاف ہیں"[3] باہر والوں نے "بڑی کوششوں سے اپنے روزمرے کو اہلِ دہلی کی صحبت میں صحیح کیا لیکن لب و لہجہ سے مجبور ہیں۔ زبان کھولی اور پہچانے گئے"[4] دلی کے مختلف محلوں کی بات کرتے ہوئے انشا نے لکھا ہے کہ "مغل پورہ والوں کی زبان میں اردو اور پنجاب کے روزمرے گڈمڈ ہیں"[5] "جس محلے میں سادات بارہہ رہتے ہیں اور بیاہے گئے ہیں وہاں بے چاری اردو کے سر پر ہمیشہ بلا نازل ہوتی رہتی ہے"[6] بعض محلوں میں جہاں دارالخلافہ کے قریب کے قصبوں سے لوگ آ گئے ہیں ان کی اولاد عجیب و غریب زبان بولتی ہے[7] اس کے بعد انہوں نے ان پنجابیوں اور پوربیوں کا ذکر کیا ہے جو مختصر مدت کے لیے دلی آتے ہیں اور اپنی زبان کو دہلوی سمجھنے لگتے ہیں حالاں کہ وہ زبان معیاری نہیں۔ یہ ساری گفتگو کر لینے کے بعد فرماتے ہیں:

---

1. نقد و نگارش : ۱۷۶
2. دریائے لطافت: انشا مترجمہ کیفی : ۳-۴ زبان کی پیدائش کے حصے میں انشا کا بیان محلِ نظر ہے ۔ ع۔ ج۔ ز
3. ایضاً : ۴
4. ″ : ۵
5. ″ : ۱۴
6. دریائے لطافت : ۳۱
7. ایضاً : ۳۲

"لہٰذا ثابت ہوا کہ دہلی میں بھی فصاحت اور بلاغت ہر کسی کا حصہ نہیں بلکہ محدود اشخاص پر منحصر ہے۔ راقم کی تحقیق یہ ہے کہ ہر محلے میں ایک نہ ایک فصیح موجود ہے، بعضے جگہ دو اور بعضے جگہ تین اور بعضے جگہ چار اور اسی طرح سے فصیح رہتے ہیں۔ شاید کوئی محلہ اہلِ فصاحت سے خالی نہیں ... لیکن وہ مقامات جہاں فصیحوں کا مجمع ہے یہ ہیں:۔ قلعہ مبارک شاہی، اور دو محلے، ایک بنگلہ سید فیروز یعنی میرزا اکم مرثیہ خواں متوفی کے گھر سے اسمٰعیل خاں صفدر جنگی کی حویلی تک اور وہاں سے ملکۂ آفاق حضرت ملکہ زمانیہ بنت فرخ سیر بادشاہ کی حویلی تک، جیسے ایک ضلع سمجھنا چاہیے ... جس میں شک نہیں وہ یہ مقام ہیں یعنی ملکہ آفاق کی حویلی تک فصاحت در و دیوار سے برستی ہے اور چتلی قبر سے ترکمان دروازے تک ایک طرف اور دلی دروازے تک [جسے دہلی دروازہ کہتے ہیں] دوسری طرف اور پھر چوک سعد اللہ خاں تک اور نواب امیر خاں مرحوم کا بازار اور سر راہ بیرم خاں جو "ترا ہہ" کے نام سے مشہور ہے اور محلہ فولاد خاں اور کوچہ چیلاں جو دلی دروازے کا ایک حصہ ہے [یہ مقامات فصحا کا مجمع ہونے کا امتیاز رکھتے ہیں"[1]

پھر انہوں نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کرتے ہوئے تصریح کی ہے:

"یہ امر بھی احباب کے ذہن نشین رہے کہ دہلوی ہونا ایک شخص کے دہلی میں پیدا ہونے پر منحصر نہیں ہے اور بار ہا کہ سید جو شاہ جہاں آباد میں پیدا ہوئے دہلوی ہونے چاہئیں، لیکن ایسا نہیں ہے کیوں کہ دہلوی وہ ہے جس کا روزمرہ وہ ہو جو دہلی والوں کا ہے اور جگہ والوں کا سا نہ ہو"۔[2]

انشا اگر یہ گوشہ پیدا نہ کرتے تو لکھنؤ والوں کی فصاحت پر لب کشائی کی گنجائش پیدا نہ ہوتی۔ لیکن انشا کے زمانے تک آتے آتے لکھنؤ میں اہلِ کمال کا اتنا بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا کہ اب لوگ انھیں سے سند لینے لگے تھے اور انشا کے لیے ناممکن تھا کہ وہ اس حقیقت سے آنکھیں پھیر لیتے۔ اس لیے انہوں نے لکھنؤ والوں کی فصاحت کے لیے یہ دلیل دی:

"اگرچہ ان کی زبان ایک دو لفظوں میں دہلویوں سے مغایرت رکھتی ہے لیکن وہ اور او صاف اور قابلیت میں دہلی والوں کے برابر ہیں ... اس شہر کا ہر محلہ فصیحوں کا محلہ ہے بخلاف شاہ جہاں آباد کے۔ اس سے انکار کرنا دانائی نہیں، کیوں کہ یہاں والے اس کا بہت خیال رکھتے ہیں کہ ہم پورب میں ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں کے آدمیوں کی زبان کی عادت پڑ جائے اسی وجہ سے اپنے ماں باپ اور دوسرے بزرگوں سے جو شاہ جہاں آباد سے آئے ہوئے ہیں الفاظ کی تحقیق کرتے رہتے ہیں ... اس شہر میں فصیح دہلویوں کی اتنی کثرت ہے کہ ان کا شمار نہیں اور جو دہلوی کہ اس وقت شاہ جہاں آباد میں ہیں ان میں فصیح کم ہیں اور غیر فصیح زیادہ۔ جو خاص لکھنؤ کے ہیں انھیں کو فصیح سمجھنا چاہیے اور غیر فصیح وہ لوگ ہیں جو کہ ان کے والدین نے غیر مقاموں سے آکر اس شہر میں سکونت اختیار کر لی"۔[3]

ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ:

"یہ شہر لکھنؤ نہیں رہا، شاہ جہاں آباد ہو گیا ہے"۔[4]

لکھنؤ اور دلی کے اختلافات کی پتلی سی خلیج کو اس طرح پُر کرنے کے بعد انشا نے اردو کی سند یا معیار پر اپنی آخری رائے یوں دی:

"مختصر یہ کہ بادشاہوں اور امرا اور ان کے درباریوں اور حاضر باشوں سے اردو کی سند لینی چاہیے، کیوں کہ فقیہ اور شاعر، ریاضی داں اور محاسب، منجّم اور طبیب، صوفی اور خوبصورت عورتیں، ان کی مجلس میں حاضر رہتے ہیں اور فرقے فرقے کی اصطلاحیں سننے میں آتی ہیں اور وہ جس لفظ کو اصطلاح بنا دیں اس کے قبول کرنے سے چھوٹے بڑے کو اختلاف نہیں ہو سکتا ... ہر فصیح اور بلیغ شخص ان کی صحبت میں سوچ سمجھ کر منہ سے بات نکالتا ہے ... بولنے کے وقت ہر صاحبِ کمال کو اس کا خیال لگا رہتا ہے کہ مبادا کوئی ایسا لفظ زبان سے نکل جائے کہ میری اس بھری محفل میں ہنسی اڑے"۔

[1-2] دریائے لطافت: ۳۷-۴۴-۴۳۔ [3] ایضاً: ۶۴-۶۵۔ [4] ایضاً: ۱۲۲۔ [5] ایضاً: ۶۶۔

آج ہر بڑے مرکز میں فصحاء کی خاصی تعداد موجود ہے۔ پھر لکھنؤ اور دلی کی قید کیوں، پٹنہ، بمبئی، حیدرآباد، لاہور اور کراچی کے فصحاء کو بھی دیکھا جائے اور ان سب کے اجتماعی رجحانات کو رہبر بنایا جائے۔

انشاء کے مقرر کردہ معیار کے مطابق شعراء سے سند لینے سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ خود بادشاہ، امیر یا ان کا درباری اور حاضر باش ہیں یا نہیں۔ اس طرح سودا، میر، غالب، ذوق، احسان، مومن، نصیر، کی طرح انشا اور داغ سے سند لی جا سکتی ہے، لیکن مصحفی قابلِ اعتنا نہیں، حاتم و امیر درگذر کرنے کے قابل ہیں! لیکن یہ طریقِ کار درست نہ ہوگا۔ اگر بزرگ اور صاحب تصانیف شعرا اور ادیبوں سے سند نہیں لی جا سکتی، تو شعر و ادب کا کاروبار ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ ہاں ہر شاعر سے سند نہیں لی جائے گی بلکہ یہ پرکھنا ہوگا کہ خود اس کی نظر ادبیات، لغات اور علوم و فنون پر کتنی وسیع ہے اور اس نے تحقیقِ الفاظ و محاورہ و روزمرّہ و مصطلحات میں کتنی جگر کاوی کی ہے۔ آج کل خود اپنے ادبیات سے جو عام طور پر بے توجہی برتی جا رہی ہے، مطالعے کا ذوق محدود ہوتا جا رہا ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے سند لینے کے معاملے میں محتاط ہونے کی ضرورت زیادہ ہے۔

آج کے لکھنؤ اور دلی کی زبانیں، انشاء کے زمانے کی طرح دھلی دھلائی اور غیر مخلوط نہیں رہ گئی ہیں۔ ان میں بہت کچھ آمیزش ہو گئی ہے اور نئے سانچے میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ کیا ان کو سند مانا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو پھر حیدرآباد، لاہور اور کراچی جیسے شاندار اور ادبی مراکز کو کیسے نظرانداز کیا جائے گا جہاں کافی مدّت سے شعر و ادب کی بڑے پیمانے پر تخلیق ہو رہی ہے۔ سند کی بات آئے گی تو اساتذۂ قدیم ہی کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ ان میں بھی چوں کہ لکھنؤ تازہ تر مرکز رہا ہے، لہٰذا عام طور سے اسی کو سند مان لیا جائے گا۔[1]

عام طور سے سند کا دائرہ محدود ہے۔ تذکیر و تانیث، تلفظ، محاورہ اور روزمرہ کی صحیح شکل کے سوال سامنے آتے ہیں۔ لکھنؤ میں بھی اور باہر بھی ان مسائل پر کام ہوا ہے۔ کچھ قواعد کے عام سوال ہیں، کچھ روایات ہیں مثلاً اعلانِ نون، مختلف زبانوں کے الفاظ کے مابین اضافت، متروکات کے مسئلے۔ ان کے لیے سندیں قدما ہی سے لی جاتی ہیں پھر بھی اختلافات باقی ہیں مثلاً لکھنؤ اور دلی میں "سانس" کی تذکیر و تانیث کے بارے میں اختلاف ہے۔ جہاں اختلاف باقی ہے وہاں حکم کون بنے؟ اسی طرح مصادر کی تذکیر و تانیث کے بارے میں آرزو لکھنوی کا خیال یہ تھا کہ مصدر کی شکل بدستور قائم رہنا چاہیے۔ اصولاً ٹھیک بھی ہے کہ جنس کا اطلاق مشتقّات پر ہو نہ کہ مصدر پہ۔ لیکن کافی بڑے پیمانے پر مصادر کی تذکیر و تانیث بدلتی رہتی ہے۔ "یہ بات آپ کو سننی ہوگی یا یہ بات آپ کو سننا ہوگی"۔ اس میں اجتماعی فیصلہ تو تبدیلی کے حق میں ہے لیکن اسے حتمی کون بنائے؟ کیا تواترِ روایت کی بنا پر اس مسئلے کا فیصلہ صحیح ہے؟ اگر یہ ہے تو کن لوگوں کے یہاں تواتر کی تلاش ہوگی۔ غیر ثقہ کے یہاں تواتر بھی ہو تو ناقابلِ اعتنا ہے۔

پچھلی صدی کے اواخر سے مغربی ادب کے اثرات دخیل ہونے لگے ہیں۔ جملوں کی ساختیں بدل گئی ہیں یا بدلتی جا رہی ہیں۔ نئے نئے لفظ داخلِ لغت ہو رہے ہیں ان الفاظ کی تذکیر و تانیث کا بھی سوال ہے۔ مثلاً سگریٹ اور ناول مؤنث اور مذکر دونوں طرح مستعمل ہیں۔ کچھ نئے محاورے اختیار کر لیے گئے ہیں۔ تراش خراش اخذ و تحریف کا عمل بھی جاری ہے۔ نئی اصطلاحیں بن اور بگڑ رہی ہیں DIALECTICAL MATERIALISM کا ترجمہ سجاد ظہیر نے پہلے "فلسفۂ ارتقائے مادیت بالضدین" کیا تھا بعد میں اور کافی بعد میں "جدلیات" پر صلح ہو گئی۔ لیکن اب بھی بعض لوگ اپنے طور پر ترجمہ کر رہے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں ترقی اردو بورڈ نے اردو لغت کی تدوین اور تراجم کے سلسلے میں وضع اصطلاحات کا کام بھی ہاتھ میں لیا۔ ان میں بھی باہمی رابطہ نہیں ہے۔ جو لوگ انفرادی طور پر کام کر رہے ہیں کہ وہ اپنی مرضی سے اصطلاحیں ڈھال رہے ہیں۔ یہ افراط و تفریط مناسب نہیں ہے اور یہ کام یقیناً منظم طور پر کرنے کا ہے۔

اطلاعاتِ عامہ کے وسائل اتنے وسیع ہو چکے ہیں کہ علاقوں ہی کی نہیں ملکوں کی حدیں بھی راہ میں حائل نہیں ہوتیں۔ آج پاکستان ہی میں اردو ادب کی تخلیق بڑے پیمانے پر ہو رہی ہے بلکہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ملکوں میں اردو والے فعّال ہو گئے ہیں۔ ان سب کے

---

[1] یہ طریقِ کار غیر تشفی بخش ہے۔ اگر معیار ایسا ہو جو حالاتِ حاضرہ پر منطبق ہو سکے تو اساتذۂ قدیم سے ہر امر میں رہنمائی نہیں مل سکتی۔

سامنے کبھی نہ کبھی حد تک معیار کا سوال اٹھتا ہے بلکہ جو بڑے مراکز ادب سے جتنا دور ہیں، معیار کا سوال ان کے لیے اتنا ہی اہم ہے۔

اب نہ بادشاہ و امیر ہیں، نہ دربارِ سرکار، جن کی زبان مستند مان لی جاتی تھی، لیکن اگر غور کیجیے تو شاہی دربار ادارے تھے۔ مغل بادشاہوں کی زبان سے استناد اس لیے کیا جاتا تھا کہ ان کے گرد و پیش علماء اور شعراء کا ایک مجمع رہتا تھا جو ایک ایک نکتے پر نظر رکھتا تھا۔ بچپن سے انھیں معقول تعلیم ملتی تھی اور مستند اور ثقہ صحبت۔ اس کے لیے ان کی زبان سے استناد ایک مستند ادارے سے استناد کے مرادف تھا۔ آج کی دنیا میں یہ کام اکادمیوں سے لیا جانا چاہیے اور ان کی تشکیل بہت سوچ سمجھ کے اور جان بوجھ کے، علماء ادبار اور شعراء کے استصواب سے ہونا چاہیے تاکہ یہ اکادمیاں استنادی ادارے بن سکیں۔ اس وقت تو یہ بالکل چوں چوں کا مربہ ہیں۔

پھر یہ اکادمیاں لغات کی تدوین کریں، وضع اصطلاحات کا کام ہاتھ میں لیں اور انھیں سائنسی طریقوں پر انجام دیں۔ یہ کام کرنے کا ہے۔ لیکن یہاں ایک تنبیہ ضروری ہے۔ اب تک زبان کے معاملے میں عوامی زبان سے جو بے اعتنائی برتی گئی ہے وہ درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادبی زبان اور عوامی زبان میں ہمیشہ ایک خطِ فاصل رہے گا، لیکن عام بول چال کی زبان کو سوقیانہ اور بازاری کہہ کر ٹالنا مناسب نہیں ہے کیوں کہ زبانیں بازاروں، میلوں ٹھیلوں، چوپالوں میں بھی اسی طرح بنتی ہیں جس طرح امیرانہ محفلوں، خانقاہوں اور عام گھروں میں۔ ان میں ادبی روح کی تلاش ثقہ ادیبوں کا کام ہے اور اکادمیوں کے لیے یہ لازم ہے کہ ثقہ ادیبوں سے ایسے کام لیں۔

محاورے اور روز مرے کونے کونے میں بکھرے پڑے ہیں۔ ان کو باضابطگی سے اکٹھا کرانا ہوگا اور جانچ پرکھ کے انھیں شاملِ لغت کرنا ہوگا۔ مقامی اور علاقائی محاوروں اور تلفظوں پر بھی نظر رکھنا ہوگی۔ یہ کام بھی ادارے ہی کے کرنے کا ہے۔ دیہاتوں اور شہروں کی زبان میں، عورتوں اور مردوں کی زبان میں جو فرق ہے اس کی نشان دہی بھی لغات سے لازم ہے۔ ایک شخص رنگین نے لغاتِ زبان کی تدوین کر دی۔ اس کے بعد کوئی بنیادی کام نہیں ہوا۔ خواتین کے لیے یہ کام آسان ہے مگر تنظیم کے بغیر زیادہ مفید نہ ہوگا۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ معیاری زبان کا سوال اٹھایا ہی کیوں جاتا ہے؟ سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ یہ سوال آج اٹھایا نہیں جا رہا ہے بلکہ صدیوں پہلے سے اٹھا ہوا ہے۔ ادھر زبان سے تعلق بعض بے ڈھنگے رویاں اور رنگ رویاں دیکھنے میں آ رہی ہیں بلکہ بے ہنری کو ہنر قرار دیا جا رہا ہے۔ ڈر ہے کہ کثرتِ تعبیر پراگندگی کا سبب نہ بنے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کے لیے اردو کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہا ہے۔ علاقائی بولیوں سے اس نے ہمیشہ اپنی سگی بہنوں جیسا سلوک کیا ہے لیکن الفاظ اور محاوروں کے اخذ میں محتاط بھی رہی ہے۔ یہ احتیاط اس حد تک تو ضروری ہے کہ زبان کا مزاج ہی نہ بدل جائے لیکن کشادہ آغوش رہنا بھی تو اس کی خصوصیت تھی۔ اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ احتیاط عصبیت کا رخ نہ اختیار کرے۔ ہماری ادبی تنقید کو آج کل لسانی جانچ پرکھ سے سروکار نہیں رہ گیا ہے، لیکن میرے خیال میں بدلتے ہوئے لہجوں اور نئے تجربوں کے پیشِ نظر اس پہلو کو پیشِ نظر رکھا جائے تو برا نہ ہوگا۔

انشاء نے دلّی کے محلے تک میں فصحاء کی حد بندی کر دی تھی۔ اس دور میں کہ تعلیم عام نہ تھی تو یہ حد بندی ایک جواز رکھتی تھی اگرچہ کبھی یہ گمان گذرتا ہے کہ اس میں کسی کو فصاحت سے محروم کرنے اور کسی کی فصاحت کو فروغ دینے کا جذبہ تو کام نہیں کر رہا ہے؟ انھیں لکھنؤ کی فصاحت کے لیے پرجوش اور تفصیلی استدلال کی ضرورت پڑی لیکن بہت جلد لکھنؤ نے اور یہاں کے بعض اساتذہ نے وہ حیثیت اختیار کر لی کہ دلّی تک میں ان کی زبان اور ان کے اندازِ بیان کی تاسّی کی جانے لگی۔ اب یہ دونوں قافلۂ اردو کے لیے سنگِ میل رہ گئے ہیں۔ آج کون ہے جو جگر و اصغر و حسرت کی زبان کی سند کو یوں ہی رد کر سکے گا۔ فراق، فانی، مخدوم، وجد، فیض، حفیظ سے کل سند پیش کی جائے گی۔ ماضی میں اعتراض بھی ہوئے ہیں۔ لیکن ان سب پر گفتگو کرتے رہنے کی ضرورت ہے کہ ارتقا پذیر زبانوں کے اثرات دیر میں مرتب ہوتے ہیں اور دیر تک جاری و ساری رہتے ہیں۔ جب کوئی زبان وسیع علاقوں اور مختلف بولیوں کے دائرۂ سرکار میں بولی جانے لگتی ہے تو معیار بندی کے بغیر لسانی شیرازے کے بکھر جانے کا بھی ڈر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی بین الاقوامی زبان انگریزی میں بھی معیار بندی پر آج بھی بڑا زور دیا جا رہا ہے اور انگلینڈ اور امریکہ اور بعض دوسرے ممالک میں بھی زبان انگریزی کے معیار کو بنائے رکھنے کی کوششیں جاری ہیں۔ اردو اس مسئلے کی اہمیت سے کیسے منکر ہو سکتی ہے؟

مٹھی بھر غزلیں



فضا ابن فیضی

◆

رنگ تو انمٹ نہ تھا، خوشبو اٹھا کر لے گئے
یہ کہاں مجھ کو مرے آہو اٹھا کر لے گئے

خال و خط تو تھے اسے جوشِ فروغِ فرات سے
آئینے کو جب بھی تازانو اٹھا کر لے گئے

پانو، محوِ خواب سی زنداں میں پی تو کیا ہوا
لوگ، زنجیرِ خمِ گیسو اٹھا کر لے گئے

ہماری نم ہے یہ فصلِ کشتِ امکاں سبز سبز
چھوڑ دی لب کی ہنسی، آنسو اٹھا کر لے گئے

آپ اپنے کو ہیں تھا ذرہ ذرہ بانٹنا
خرمن کونین سے بالو اٹھا کر لے گئے

ہم سمندر تھے، جگر کی تہ میں تھی اندر کی پیاس
کرتے کیا خیمہ کنارِ جو اٹھا کر لے گئے

رہ گئی محفوظ کتنی انگلیوں کی آبرو
ہم تھے یوسف آشنا، چاقو اٹھا کر لے گئے

یہ سزا کس جرم کی ہے، تم سے نازک شیوہ لوگ
خود صلیبِ قامت و گیسو اٹھا کر لے گئے

ساز ہیں خاموش، رقصِ زندگی بھی تھم گیا
سب مرے سانسوں کے ترنم گھنگرو اٹھا کر لے گئے

زندگی کا فلسفہ تھا، شہر میں رسوا بہت
مجھ کو بسمل کی طرح سادھو اٹھا کر لے گئے

جز خراشِ حرفِ تیرا، اب کچھ بھی نہیں
پھول یادوں کی تراش ابرو، اٹھا کر لے گئے

◆

جو تو نہیں کوئی تدبیر کر کے دیکھوں میں
ترے خیال کو زنجیر کر کے دیکھوں میں

نئی امیدوں کی راتیں تو بے قمر نکلیں
پرانے خوابوں کو تعبیر کر کے دیکھوں میں

قدیم ہے، مرے اجداد کی تو یہ بنیاد
اسی پہ گھر نیا تعمیر کر کے دیکھوں میں

یہ زندگی بھی ہے اک صیدگاہ، سانسوں کو
کبھی کمان، کبھی تیر کر کے دیکھوں میں

کسی دیار سے، وہ گمنامیوں سے نکلے تو
کچھ اپنی ذات کی تشہیر کر کے دیکھوں میں

ارادہ ہے، نئی تاریخِ کربلا لکھوں
کبھی یزید کو شبیر کر کے دیکھوں میں

یہی کتاب و قلم، اور کیا متاعِ فقیر
انھیں کو اب زر و جاگیر کر کے دیکھوں میں

بیان مفسرِ آیاتِ تازہ، کوئی نہیں
خود اپنے حرفوں کی تفسیر کر کے دیکھوں میں

انھیں کے پاس نہ ہو نازِ کمال مرا
کسی غزال کو نخچیر کر کے دیکھوں میں

چکھوں تو ذائقۂ اندوہِ بے دماغی کا
اب آج پیرویِ میر کر کے دیکھوں میں

فضا وہ دھوپ ڈھلی خود کو اب شفق کی طرح
جبینِ شام پہ تحریر کر کے دیکھوں میں

◆

کہاں کا توشہ، یاس اپنے سفر میں کچھ نہیں رکھا
بجز سرمایۂ جاں، ہم نے گھر میں کچھ نہیں رکھا

خنک سائے جھکتی دھوپ کے وہ دن جو نئے رخصت
نئے موسم نے تحویلِ شجر میں کچھ نہیں رکھا

مبارک تم کو سودِ عشق بھی، سودائے دانش بھی
ہم آشفتہ دماغ ایسے کہ سر میں کچھ نہیں رکھا

وہ حیراں ہے مری تصویر کو کیا خال و خط بخشے
کہ پس منظر ہو یا منظر، نظر میں کچھ نہیں رکھا

نہیں آساں یوں بے رختِ و مایہ زندگی کرنا
گرہ میں کچھ نہیں باندھا، کمر میں کچھ نہیں رکھا

دعا مجھ سے، مرے حرفِ دعا کو بھی گلہ کیا کیا
میں وہ بے حوصلہ، اپنے اثر میں کچھ نہیں رکھا

غلط کیا، جو قناعت پیشگی کو رزقِ جاں سمجھے
دعا گوؤں کے علاوہ، چشمِ تر میں کچھ نہیں رکھا

نہ ہی گرد بھی ہاتھ آئی، ہم آوارہ بختوں کو
وہ منزل سامنے تھی، رہ گزر میں کچھ نہیں رکھا

نہ جانے ہم نے بھی کن تلخیوں میں پرورش پائی
بنامِ ذائقہ، نخل و ثمر میں کچھ نہیں رکھا

مرا ابہام بھی ہے گرمیِ ابلاغ سے روشن
چھپا کر پردۂ حرفِ دگر میں کچھ نہیں رکھا

یہی معنی بیگانہ ہے جنھیں صد ہنر اس کو
فضا نے اور میزانِ ہنر میں کچھ نہیں رکھا

◆

خود اپنے دشتِ جاں کی تحصیل تک پھیلا ہوا
ہوں میں اظہار سے ترسیل تک پھیلا ہوا

مری ہستی کہ کنجِ تنگ میں سمٹا ہوا ہے
جو صحرا تھا ہزاروں میل تک پھیلا ہوا ہے

زمیں پر ہوں مگر پرواز میری عرش والا کا
مرا بازو، پرِ جبریل تک پھیلا ہوا ہے

سفر پر پھر کوئی موسیٰ صفت نکلا ہے شاید
عصا کا سایہ، رودِ نیل تک پھیلا ہوا

اکیلا میں، مقابل میرے بازی گر بڑا ہے
پیادہ ہے بساطِ فیل تک پھیلا ہوا

غبارِ لو سے نا آسودگی ہوں پھر بھی ہوں
تمھاری منزلِ تکمیل تک پھیلا ہوا ہے

اسی قندیل کی ہوں روشنی، تجھ کو خبر کب
ہے وہ دو قدم تا جس قندیل تک پھیلا ہوا

ہر آئینہ، اسی چہرے کے پرتو سے فروزاں
وہی اک منظر ہے، تمثیل تک پھیلا ہوا

ازل کا میں وہ حرفِ سبز ہوں ہے جو ابھی
خطِ توریت سے انجیل تک پھیلا ہوا

مرا طرزِ تفکر دوسروں سے مختلف
ہوں کس اجمال سے تفصیل تک پھیلا ہوا

ہوا ایں قدر گہرا ہے نظر بھی ہوں فضا
نظامِ فکر کی تشکیل تک پھیلا ہوا ہے

● مئوناتھ بھنجن - ۲۷۵۱۰۱ (یوپی)



حسین الحق

شعبۂ اردو مگدھ یونیورسٹی، بودھ گیا (بہار)

کُہاسے میں خواب

"یار ! اب تو محسوس ہو رہا ہے کہ ذہن پر بھی برف جمنے لگی ہے"۔ نولیش نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں کانوں کو رگڑتے ہوئے کہا ۔

"ہاں اس سال کا جاڑا کڑاکے کا ہے"۔ معصور اپنے چاروں طرف پھیلا کمبل اپنے جسم کے گرد لپیٹتا ہوا بولا ۔

"ارے نہیں یار"۔ گجران والا کی آواز سے جھلاہٹ ٹپک رہی تھی۔ "جاڑا واڑا کیا کڑاکے کا پڑے گا' ہم ہی لوگ اب کمزور ہوتے جا رہے ہیں"۔

"اوے سردارا ! تو ذرا سی بات میں طعنے کیوں دینے لگتا ہے ؟

نولیش منمنایا

"تو اور کیا کروں بادشاہو ! جاڑا تو پچھلے سال بھی آیا تھا اور پچھلے سال کے پچھلے سال بھی، پر تب تو ہم یوں چیخ و پکار نہ کرتے تھے"۔

"پر سردار جی ! پچھلے سال اور پچھلے سال کے پچھلے سال تو ہم ایسی مصیبت میں نہ گرفتار ہوئے تھے"۔

"ہاں سو تو ہے معصور !"

گجران والا آہستہ سے بولا اور ٹھنڈک سے پُر آپ ہوتی آنکھوں کی نمی رومال میں جذب کی اور اپنے چاروں اور دیکھا .... دور دور تک کہاسہ گر رہا تھا' جیسے دھند کی دبیز چادر تلے سب چھپتا جا رہا ہو' اُسے یاد آیا اس موسم میں پھول کھلتے ہیں' جیون تیرے رنگ نیارے کہیں پھول کہیں انگارے ...."

"اور یہاں ؟" گجران والا کے اندر اندر جانے کس جذبے سے شرابور ہنسی کا فوارہ چھوٹا ...."

پھر اندر ہی اندر ہنسی کی ایک اور لہر نے سر اٹھایا ... سنجیدہ رہو تو مشکوک' ہنسو تو ...."

"یار جب میں گجران والا میں تھا تو ...." اچانک گجران والا کو اپنا گھر یاد آ گیا ۔

اوئے سردارا ! تو گجران والا کی بات چھوڑ ... یہاں کی بات کر"۔ نولیش نے تیزی سے اس کی بات کاٹی ۔

گجران والا نے ادبدا کر معصور کی طرف دیکھا

پھر معصور نے شاید سُنا ہی نہیں' وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا

پھر کچھ دیر یاروں کے درمیان سناٹا براجمان رہا اور دسمبر کی آخری تاریخوں کی رات جنکشن پر سے ترل ترل گزرتی رہی ۔

"لیکن یار .... وہ ٹرین کا کیا ہوگا ؟" معصور نولیش کی طرف دیکھ کر بولا

نولیش نے کوئی جواب نہیں دیا' وہ سامنے ٹی وی دیکھ رہا تھا .. پُرانی فلم "پاکیزہ" دکھائی جا رہی تھی ...."

"ہیروئن ٹرین میں سوئی ہوئی ہے' ٹرین اپنی پوری رفتار سے بھاگتی چلی جا رہی ہے ... ٹرین کے باہر چاروں طرف پھیلی گہری سیاہ اندھیری رات ...."

"اور یہاں جنکشن پر" ؟ معصور نے سوچا ... رات ایسی روشن جیسے دن ... مگر وہ ٹرین ... کیسی مصیبت میں پھنسے ہیں ؟ چھ ماہ بعد گھر جانا نصیب ہو رہا ہے' یونیورسٹی سے روانہ ہوئے بائیس گھنٹے گزر چکے .... چھ گھنٹے تو اسی اسٹیشن پر بیت گئے ! اگر اوقات کے مطابق ٹرین چلتی رہتی تو اب تک گھر پر آرام کر رہے ہوتے ... معصور کے اندر بہت شدید قسم کی اکتاہٹ اور تھکن نے انگڑائی لی ....

IT IS NONSENCE دہلی کی ٹرین یہاں تین بجے دن میں پہنچتی ہے اور چار بجے پسنجر ٹرین کھلتی ہے جس سے سات بجے بہ آسانی گھر پہنچا جا سکتا تھا لیکن یہاں تو دس بج گیا اور ابھی تک ٹرین کا انجن وہاں

سے آیا ہی نہیں، پوچھنے جاؤ تو ایک ہی جواب.... یہاں چونکہ "یارڈ" نہیں ہے اس لئے انجن وہاں سے آتا ہے اور وہاں سے انجن کب آئے گا اس کی کوئی خبر نہیں....!"

منظر سے پرے ایک گوریّا اڑنا چاہتی ہے مگر وہ جس شاخ پہ بیٹھی ہے وہاں "لاسا" لگا دیا گیا ہے.... چڑیا بار بار پر پھڑپھڑاتی ہے اور جہاں ہے اس سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ پاتی۔

"پرانی فلموں کا جادو ہی عجیب ہے.... دیکھ یار مصوّر! کیا منظر پیش کیا ہے کمال نے"۔ نولیش لذت کی مدہوشالا میں پیالے پر پیالہ خالی کئے جا رہا ہے....!"

.... جب کائنات اپنی پلکیں جھکانے لگتی ہے جیسے کوئی شریر لڑکی کسی پاگل لڑکے سے آدھے سچّے آدھے جھوٹے لہجے میں من کی بات بہت دھیرے سے کہہ کر ہولے سے اپنی پلکیں بس ذرا سی اوپر اٹھائے پھر سیکنڈ کے ننانوے حصّے میں ہی سہم جھکائے.... کہیں دور شہنائی کی آواز میں رُلی ملی مانجھیوں کی الاپ، ندیوں کا جل ترنگ، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، کسی پہاڑی کا دامن، دامن میں پھولوں کی بہار، آسمان پر ڈوبتے سورج کی دُھند.... اور ست رنگی دھنک کی چھوٹ....!"

"یار! اتنی خوبصورتی تو بس فلموں ہی میں ہوتی ہے" گجران والا مضحکہ خیز انداز میں بولا

"نہیں یار۔ اب ایسا بھی نہیں، اپنے اوٹی، شملہ، دارجلنگ اور گلمرگ کا حسن بھی تو ہے؟"

"اوئے مصوّر حسین خان خیال! تو دارجلنگ اور گلمرگ کو تو ننگ ہی کر دے پیارے"

"اوئے تیری گجران والا"۔ مصوّر ہنسا.... تو ذرا اپنا ٹینشن کم کر۔ ہر وقت کڑواہٹ!

"کیا کروں خیالے؟ مجھے تو ابھی تک کسی دوکان پر بیٹھا سیج نا ہی نہیں"۔ گجران والا عجیب سی ہنسی ہنسا

پھر قریب آتے نوجوان سے ہنس کر مخاطب ہوا.... کہو پیارے شاعر.... رہبر بھارتی.... کیا خبر ہے؟

"خیریت ہے"۔ نوجوان بنچ پر بیٹھتا ہوا بولا.... "کہ جب ٹریک خالی ہوگا تو انجن آئے گا!"

"تو گاڑی جانے گی"۔ گجران والا اگا کر بولا۔ پھر مصوّر کی طرف جھکا...." تو میٹھا پیچ کھالو!"

مصوّر کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور چلا گیا.... مہینے کی آخری تاریخوں میں دیر سے طلوع ہوتے چاند پر سے بادلوں کا پرا لپ چھپ کرتا آ رہا تھا اور جا رہا تھا اور فضا میں چاروں طرف دھند چھائی ہوئی تھی.... گمان کی دھند!

اسٹیشن پر لوگوں کا اژدہام، سب اپنی اپنی منزلوں تک پہنچنے کے لئے بے چین اور ٹرین کا حال یہ کہ...."

"اٹینشن پلیز! ہوڑہ دہلی کالکا میل اپنے نردھارت سمئے سے چار گھنٹہ ولمبھ سے آئے گی...."

"تو اور بھی ستم زدۂ روزگار ہیں"۔ گجران والا منمنایا

"پر یہ نہیں ہے"۔ مصوّر نے نولیش کی طرف اشارہ کیا

"اس کو کیا فکر ہوگی؟ یہ تو ہر جگہ کو اپنے باپ کی جائداد سمجھ کر جم جاتا ہے، دیکھو کتنے اطمینان سے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے ٹی وی دیکھ رہا ہے"۔ گجران والا ہنسا مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا۔ "اور یہی کیا؟ یہاں سے وہاں تک سب تو مست ہی نظر آ رہے ہیں!"

"گیارہ بج رہے ہیں، انجن ابھی تک نہیں آیا"۔ ذرا دور پر بیٹھے ایک آدمی نے بے چین ہو کر گھڑی دیکھی.... اور پھر چونک کر سامنے دیکھنے لگا...." یہ چراغ بجھ رہے ہیں میرے ساتھ جلتے جلتے"۔... اسے یاد آیا... جانے وہ لڑکی اب کہاں ہوگی؟ کتنا انتظار.... صدیوں پر محیط.... ایک کبھی نہ ختم ہونے والا انتظار.... رات باقی تھی جب وہ بچھڑے تھے.... یہ چراغ بجھ رہے ہیں...!"

جلتے سلگتے انگارے پر پانی کا ایک چھپاکا.... انتہائی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں آنسو کا ایک قطرہ... کہیں دور ٹھنڈی ہوا کا کوئی ٹھنڈا جھونکا... جلتے صحرا میں ننگے پاؤں چلتا ایک مسافر... اور ٹھنڈی چھاگل میں ٹھنڈا ٹھنڈا پانی... پل بھر کا سکھ آگے پیچھے کے کتنے دکھ بھلا دیتا ہے.... میری شام ڈھل رہی ہے تم سے ساتھ چلتے چلتے".... زندگی جب اپنی ابتدا کرتی ہے تو اس کے ساتھ کچھ نہیں ہوتا، صرف جئے جانے کا ایک بے معنی عمل، پھر نہ جانے دھند اور اندھیروں میں کھوئی کن راہوں سے آرزوئیں تمنائیں اور خواب، چپکے چپکے سرکتے کھسکتے اس ایک مجرّد زندگی کے ساتھ چلنے لگتے ہیں پھر موسم رنگ بدلتا ہے، بہار جانے کس گلی میں کس شیام کے دوار سے ڈیرہ ڈالتی ہے،

پت جھڑ کا موسم آتا ہے' خوابوں کی گردا سلگنے لگتی ہے' چار سو آگ ہی آگ' تباہی' ہونا کی سناٹا' اندھیرا..... یہ چراغ بجھ رہے ہیں مرے ساتھ جلتے جلتے....."

گجران والا اور مسعود دونوں بڑا عجب سا محسوس کر رہے تھے' کہیں کچھ ایسا ہے جو ہاتھوں سے چھوٹ رہا ہے.... کیا ہے؟ کیا نہیں ہے؟ یا پھر کیا ہے جو نہیں ہونا چاہئے؟ دونوں کی نگاہیں بیک وقت ایک منظر پر ٹھہر گئیں:

"ایک عورت اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی' دودھ پیتے پیتے اس بچے نے ماں کے سینے ہی پر قے کر دی' اور ماں نے ساری کے آنچل سے اپنا بلاؤز اور سینہ پونچھا اور شال سے ڈھک لیا....."

بس؟؟

"اچانک گجران والا تیزی سے اٹھا اور اپنی پاس والی بنچ کی طرف بڑھا....."

بھائی صاحب!" اس نے اُس بنچ پر بیٹھے سب سے معمر آدمی کو مخاطب کیا.... آپ بھی ۲۰۴۳ ڈاؤن سے جانے والے ہیں نا؟"

"جی؟" معمر آدمی نے ٹی وی اسکرین پر سے نگاہ ہٹا کر اس کی جانب دیکھا

"آپ بھی تو ۲۰۴۳ نمبر والی ڈاؤن پسنجر سے ہی جانے والے ہیں نا؟"

گجران والا نے اپنا سوال دہرایا

"جی.... تو؟"

"تو یہ جناب کہ سات گھنٹے گزر چکے اور ایک انجن وہاں سے یہاں نہیں پہنچ سکا.... آخر کیا ہوگا؟"

"ارے کمال ہے صاحب.... جہاں آپ وہاں میں.... میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

"آپ پوچھ تو سکتے ہیں؟"

"آپ ہی کیوں نہیں پوچھ لیتے؟" معمر آدمی نے ٹی وی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"میں تو پوچھ چکا حضرت!"

"کیا جواب ملا؟"

"ٹریک خالی نہیں ہے"

"تو پھر میرے پوچھنے سے ٹریک خالی ہو جائے گا؟.... ہونہہ!"

اب وہ دوبارہ پوری طرح ٹی وی کی طرف متوجہ ہو چکے تھے

گجران والا جھلا کر اپنی بنچ پر واپس لوٹ آیا

"کیوں ٹھنڈے میں اپنی جان دے رہے ہو؟ نولیش نے کہا' سنا نہیں؟"

"ہاں یار.... شاید میں ہی افیون کی جھونک میں ہوں"

گجران والا تھکے تھکے انداز میں اپنی جگہ جیسے ڈھ گیا... شاید اس کی ہمت جواب دے رہی تھی.... "پر سبھوں کو کیا ہوا؟" من میں ایک سوال نے سر اٹھایا... مگر رسوائی جواب کی تقدیر.... جواب کون دے گا؟ اور کیوں دے گا؟ اور کہاں دے گا؟ مان لیا ٹرین لیٹ ہے' تسلیم کر وہاں سے انجن آنے میں اتنی دیر نہیں ہونی چاہئے' مگر پھر بھی تو یہ مشین کا معاملہ ہے' آدمی کے اپنے بس میں نہیں ہے.... اور پھر محکمے کے بس میں جو کچھ ہے وہ تو محکمے نے کیا ہی' گدے دار کرسیاں' ٹھنڈ سے بچنے کے لئے شیڈس' لیٹ رننگ ٹرین کی بوریت سے نجات پانے کے لئے ٹی وی....."

"یہ چاند یہ نظارے"...

گجران والا نے اپنے چاروں طرف دیکھا' جاڑے کی چاندنی کا مصرف کیا ہے؟ گجران والا میں جب گرمیاں آتیں..... اُسے اپنا دیہات یاد آ گیا.... گرمیوں کی راتوں میں جیسے جیسے چاند اوپر آتا جاتا' اور رات گہری جاتی' کھیتوں کا حسن بڑھتا جاتا..... دور دور تک پھیلے کھیت' جن میں فصلیں کٹ چکی ہوتیں' یا نئی بوائی شروع ہو چکی ہوتی' مینڈھ پر غریب کسان اپنی محنت کے لیکھا جوکھا میں گم رہتے یا مستقبل کا خواب بنتے اور گاؤں کے سائیں (زمیندار) چارپائیوں پر بچھی سوزنی اور اس پر بچھی جھک سفید چادروں پر بیٹھے لسی یا حقہ پیتے اور دنیا جہان کی باتیں کرتے..... اور کہیں دور سے ندی کے بہنے کی آواز آتی' اور جب جب ہوا ندی کو چھو کر ان تک پہنچتی تو محنتی کسانوں کے تپتے چہروں پر سورج کی چھوٹ پڑنے لگتی.... پھر کہیں دور کسی سڑک پر دھیرے دھیرے چلتی کسی بیل گاڑی کی آواز آتی.... چرچوں' چرچوں.... پھر بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی موسیقی گونجتی.... ٹن ٹنا ٹن.... ٹن ٹنا ٹن... اور کچے پکے مکانوں کی دیواروں اور چھپروں پر' ممٹیوں اور بجوکاؤں پہ.... کھیتوں اور کھلیانوں پر.... چاروں طرف چاند طلوع ہوتا رہتا.... اور چاندنی بکھرتی رہتی..."

نظارہ درمیاں تھا.... گجران والا ناسٹیلجک ہو رہا تھا۔

"یہ چاند.... یہ نظارے....."

ٹی وی پر فلم جاری تھی ..... معتوّر بھی نغمے کا اسیر ہو چکا تھا
نگران والا بھی ذرا ذرا ٹی وی کی طرف متوجہ ہو رہا تھا کہ اچانک
اسے خیال آیا...." ٹرین"!
" نگران والا نے کچکپا کر معتوّر کو جھنجھوڑ ڈالا ...."
" ابے او پُتّر دی پھپھوند زادے.... ہم پر تو الزام لگاتا ہے کہ
ہمیں گھڑی گذر جانے کے بعد ہوش آتا ہے.... پر تجھے کیا ہو گیا
ہے؟"
یار ... ہمارے جاگنے کی تو ابھی باری ہی نہیں آئی ہے" معتوّر
آہستہ سے بولا
" سالے .... فراری ... قنوطی .... سوئے رہنے کے لئے بہانے
تراشتا ہے!
" نہیں یار .... وہ تو خیر میں نے مذاقاً کہا تھا.... یا کون ثبت
ہے؟ ہم تو جاگتے رہتے ہیں اور دیکھتے رہتے ہیں"
" صرف دیکھ مت .... کچھ کر بھی پیارے"!
" یار ہم کیا کریں؟ دیکھتے رہنا تو ہماری تقدیر ہے .... اور
پھر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں؟ جنھیں جو کرنا ہے وہ تو وہ کر ہی رہے
ہیں"!
" صاف صاف بات کر .... علامت اور استعارہ شاعری کے
لئے چھوڑ دے" ۔
" یار! کم از کم استعارے کی جان تو بخش دے"
" اچھا اچھا بخش دیا .... تو بتا تو .... کیسے کیا کرنا ہے؟
اور کون کیا کر رہا ہے؟
" ارے یہی .... نولیش کمار ٹی وی دیکھ رہا ہے .... اور اپنا
رہبر بھارتی سو رہا ہے .... کہ خواب دیکھنے کے لئے سونا ضروری ہے"
" اور تم بھی تو پیارے وہی کر رہے ہو .... جو کرتے رہے
ہو"!
" یعنی؟"
تجزیہ .... اتنے دنوں میں تجزیے کے سوا اور کیا کیا تم
نے؟"
نگران والا کی اس بات پر معتوّر کچھ نہ بولا .... وہ کہہ بھی کیا
سکتا تھا؟
کچھ دیر سب چپ رہے .... پھر اچانک نگران والا اٹھ

کھڑا ہوا .... اپنی بنچ سے آگے بڑھا .... کچھ آگے بڑھ کر
ہو گیا .... اور بلند آواز میں چیخا ...."
" ۲۲۴۳ نمبر والی ڈاؤن پسنجر سے جانے والے بھا
طرف متوجہ ہوں"
فلم بہت دلچسپ موڑ پر پہنچی ہوئی تھی .... اِنہی
لے لینا دوپٹہ میرا
زیادہ تر لوگوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی ....
منٹ کے لئے اس کی طرف دیکھا پھر ٹی وی کی طرف متوجہ
.... کچھ ایسے بھی تھے جن کی توجہ ٹی وی کی طرف بھی تھی
طرف بھی تھی .... دو چار آدمی اس کی جانب ہمہ تن گوش
" یار! یہ کیا کھڑاگ پھیلا رہا ہے"؟ اس سے کیا ہو
نولیش نے اکتا کر معتوّر سے کہا
" یہ کھڑاگ کھڑا کرنے سے پہلے سوچنا کہاں ہے"؟ معتوّر
دیا مگر تب تک نولیش دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو چکا
اُسے جواب سننے کی فرصت کہاں تھی!
" رہبر بھارتی خراٹے لے رہا تھا .... اور نگران وا
تھا ...."

.... یارڈ یہاں سے صرف چھ میل دوری پر ہے ا
یہ چھ میل کی دوری ۹ گھنٹے میں طے نہ ہو سکی اور آ
لوگوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگ رہی ہے۔
آپ اپنے آپ کو اتنا کمزور کیوں سمجھتے ہیں؟ اگر
سب لوگ ایک ساتھ آواز بلند کریں تو محکمے کا منہ
بند ہو جائے گا .... ہمارے دستور میں شہریوں کو بنیادی
سہولتیں فراہم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے .... اور یہ
محکمہ عہد شکنی کر رہا ہے ...."
"بہت بور کر رہا ہے یار"!
" اب سلاحیت نکالے گا"!
" نہیں بات تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے"
" مگر سنتا کون ہے"؟
" تم ہی سن لو"
" میرے تنہا سننے سے کیا ہوگا .... سب تو اپنی
بیٹھے ہیں"!

"تم ہی کیوں نہیں اٹھ جاتے؟"

"میں پہل نہیں کروں گا.... کوئی اٹھے تو میں بھی اٹھوں گا"

"تم پہل کرنے سے ڈرتے کیوں ہو؟"

"اور تم"؟

"تم کیوں نہیں؟"

"اور تم کیوں نہیں؟"

"تھارے رہیو اے بانکے یار...."

ٹی وی پر فلم جاری ہے.... گجران والا چیخ رہا ہے....... ذلیش فلم دیکھنے میں مست ہے.... رہبر بھاری خراٹے لے رہا ہے.... معتور ایک عجیب سے اٹ پٹے پن کے حصار میں محصور اندر ہی اندر چھٹپٹا رہا ہے.... اور سننے والے ٹی وی پر سے اپنی نظر تو نہیں ہٹاتے مگر آپس میں گجران والا کے بارے میں اتنی دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے ہیں جیسے مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں.... گجران والا کی بلند آواز.... بھنبھناتی مکھیاں.... اور ٹی وی پر جاری فلم......"

"تھارے رہیو اے بانکے یار...."

"ربا: سارے بندے ٹھہرے ہی ہوئے تو ہیں!" گجران والا کا جی چھوٹا ہو گیا۔

چار پانچ آدمی گجران والا کے پاس آئے

"دیکھئے ایسا ہے کہ فلم اب ختم ہونے والی ہے آپ کچھ دیر ٹھہریے.... اس کے بعد ہم لوگ آپ کے ساتھ چلیں گے!"

گجران والا نے بوکھلا کر انہیں دیکھا...." انہیں ابھی تک اس کا احساس نہیں کہ پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی!"

اس نے ایسا محسوس کیا جیسے اندر ہی اندر کوئی عمارت اپنے جوڑوں سے اکھڑ کر ملبہ بننے کے آخری مراحل طے کر رہی ہو.... وہ آہستہ سے پیچھے ہٹا، اپنی بنچ کی طرف آیا.... اور معتوز کے پاس بیٹھ گیا—

"کیا ہوا؟" معتور نے پوچھا

"پتہ نہیں یار.... ابھی کس کی جاگنے کی باری ہے!" گجران والا نے بہت بوجھل آواز میں جواب دیا اور شاید ٹھنڈک سے پُرآب ہوتی آنکھوں کی نمی رومال میں جذب کی.... اور اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی.... دور دور تک کہاسہ گر رہا تھا، جیسے دھند کی دبیز چادر تلے سب چھپتا چلا جا رہا ہو.... اسے یاد آیا، اس موسم میں پھول کھلتے ہیں.... جیون تیرے رنگ نیارے.... کہیں پھول کہیں انگارے...."

"مگر یہاں؟" گجران والا کو ذلیش کی بات یاد آئی.... اب تو محسوس ہو رہا ہے کہ ذہن پر بھی برف گرنے لگی ہے!"

بقیہ صفحہ ۴۱ دیواروں کے بیچ

اب بھی اپنے فوجی دوست کے ساتھ آتی ہے اور دونوں کے خطروں کو ادھر سے ادھر پہنچاتی ہے۔ اور اس طرح کبھی پکچر ہاؤس میں، کبھی دیپک کے گھر میں چوری چھپے کی ملاقاتیں جاری رہتی ہیں۔ بات اب ندرا کے گھر اور لڑکی کے گھر سے نکل کر ہر طرف پھیل جاتی ہے۔ لڑکی کے والدین اس کے آنے جانے پر نظر رکھنے لگتے ہیں۔ جب کالج جاتے چھوٹا بھائی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور وا پسی پر ایک رشتہ کا ماموں، جو کبھی سبھاش چندر بوس کی آزاد ہند فوج میں شامل رہا ہے۔ اپنی بڑی بڑی مونچھوں اور چوڑی کول آنکھوں پر پھیلی ہوئی گھنی بھنووں سے راستے کو ادھر ادھر دیکھنے سے باندھ کرتا ہے۔ ان کا نام مقبول ہے۔ آج کل سوشلسٹ پارٹی کے کارکن ہیں۔ راستے میں ہر ملنے جلنے والے کو سیاسی سوجھ بوجھ دینا ان کی عادت ہے۔ باتوں کی جھونک میں لڑکی ذہن سے گم ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد سائیکل دوڑا کر اسے پکڑتے ہیں۔ سارے راستہ اسی طرح رک کے سائیکل دوڑاتے دکھائی دیتے ہیں جیسے وہ عورت کے محافظ بنے ہیں۔ ندرا کی بھی چوری کی نظر بچا دینے سے محفوظ ہے۔

یہ ساری احتیاطیں لڑکی کا ذہن بدلنے میں ناکام ثابت ہوتی ہیں۔ وہ ندرا کے ساتھ شہر سے کہیں دور بھاگنے کا پلان بنا رہی ہے۔ اس پلان میں دیپک کا تجربہ بھی شریک ہے۔ کہاں جانا ہے اور کب جانا ہے۔ اس کا فیصلہ ندرا کے ہاتھ ہے۔ لیکن اس کے انتشاری حالات، لڑکی کی بغاوت کا ساتھ نہیں دے پاتے۔ وہ وعدہ تو کر لیتا ہے۔ سفر کی تیاری بھی کرتا ہے۔ لیکن عین وقت پر وہ وہاں نہیں پہنچتا جہاں رات کے اندھیرے میں، وہ منتظر آنکھیں، آسمان کے سارے ستاروں کو کئی بار گن کر تھکنے لگی ہیں۔ بالآخر صبح ہوتی ہے۔ اور صبح پھر شام میں ڈھل جاتی ہے۔

رات کے بدنے دن کی سحر آئے گی، دن نہیں بدلے گا تاریخ بدل جائے گی

[باقی آئندہ]

زاھدہ زیدی

ایک داخلی منظر

رفتہ رفتہ
رگِ جاں میں جمتا ہوا
زخم خوردہ تصوّر کا رِستا لہو
سوختہ فِکر کی راکھ اڑتی ہوئی ـــــ کو بکو
ہر طرف سونی راہوں میں بکھری ہوئی
خشک وماندہ احساس کی پتیاں
سرنگوں بسترِ خاک پر
گرمیٔ شوق کا طائرِ نیم جاں
سامنے ـــــ دائیں ـــ بائیں ـــ کئی اور اطراف
لپٹے ہوئے سرمئی دھند میں
سب کے سب راستے
اور ان پیچ در پیچ راہوں میں الجھی ہوئی
پاشکستہ ـــــ ہراساں ـــــ تھکی زندگی
دور ـــــ حدِ نظر تک
خلا ـــــ در خلا ـــــ در خلا ـــــ
اور پھر
آسمانوں کے ایوانِ بالا سے
زینہ بہ زینہ اترتا ہوا
موت کا کارواں
خندہ زن ـــــ کامراں ■

◆

زوقِ نومیدیٔ دیدار ضروری ہوگا
اعتبارِ غمِ دلدار ضروری ہوگا

ظلم و بیداد پہ ہو جن کی خدائی ا...
ان خداؤں سے تو انکار ضرو...

ہم نہ عیسیٰ ہیں نہ منصور ہیں لیکن پھر بھی
حق کا اظہار سرِ دار ضروری ہوگا

جب بھی مقتل میں حسینؓ ابنِ علیؑ آئیں
لشکرِ کفر سے تکرار، ضرور...

ظلم اور جور جہاں صبر سے ٹکرائیں گے
مسلکِ عابدِ بیمار ضروری ہوگا

تیز تر روشنیٔ طبع کہ تاریک ہے
اس اندھیرے پہ تو یلغار، ضر...

جب کہ الفاظ لٹا بیٹھے ہوں معنی کی متاع
ہم کو چپ رہنے پہ اصرار ضروری ہوگا

● ۳- ایچ آئی جی، فلیٹس، سرسید نگر، سول لائنز، علی گڑھ ۲۰۰۲-



ایم ـــ منوجہ
۱۹/۹، ساؤتھ ٹی ٹی نگر، بھوپال ۴۶۲۰۰۳

افسانہ بنانے کی کوشش

کہتے ہیں، واسکوڈی گاما پرتگالی جہاں ران جس نے یورپ والوں کے لیے ہندوستان کی کھوج کی تھی، وہ ہندوستان ہی میں مرگیا تھا۔ اور اسے ہندوستان کے مغربی ساحل کی سرسبز و شاداب بندرگاہ کوچین کے خوبصورت بڑے بڑے پھل دار درختوں اور رنگ برنگی خوشبودار پھولوں والی جھاڑیوں اور پودوں کے بیچ ایک ہری گھاس والے قطعہ ارضی میں دفن کر دیا گیا تھا۔ اور وہاں ایک خوبصورت گرجا گھر بنا دیا گیا۔

کہتے ہیں قریب ایک سو سال بعد اس کے مردہ جسم کو قبر سے نکال کر ہزاروں میل دور اس کے وطن پرتگال اس کے گاؤں میں جہاں وہ پیدا ہوا تھا وہاں کی پتھریلی ریتیلی زمین میں دوبارہ دفن کر دیا گیا۔ کیا یہ ایک حماقت تھی؟

ایسی سیکڑوں مثالیں ہیں جن میں دنیا کے خوبصورت علاقوں میں مرنے والے لوگوں کی لاشیں ان کے غریب ریگستانی موضعوں میں لے جاکر دوبارہ دفن کی گئیں۔ گوالیار کے انگریزی قبرستان میں دفن ایک انگریز کیپٹن کی لاش اس کی موت کے بعد اس کے دفن کے ۲۷ برس بعد اس کی پوتی انگلینڈ سے آکر اس کی لاش انگلینڈ لے گئی اور اسے اپنے گاؤں کے موروثی قبرستان میں دفنایا۔

شہید اودھم سنگھ کی لاش کو ہندوستانیوں نے لندن کے جیل کے باہر قیدیوں کے قبرستان سے کھدوا کر ہندوستان لاکر اس کو پھر سے اس کے گاؤں میں دفنایا۔

ایسی سیکڑوں مثالیں اس کے ذہن میں ہیں۔

لوگ کیوں مرنے کے بعد اپنے وطن میں جاکر دفن ہونا چاہتے ہیں؟ لوگ کیوں اپنے دور دراز ملکوں میں مرنے والے عزیز و اقارب کو جو وہاں دفن کر دیے جاتے ہیں تو بھی ان کی قبروں کو کھود کر یا ان کی راکھ والے کلش کو لاکر پھر سے اپنے چھوٹے چھوٹے گاؤں یا قصبوں میں دفن کرتے ہیں۔

لیک اطالوی جو ہمیشہ سے عزیز ہے سسلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ اور جو اپنے گاؤں کے غریب کاشتکاری ماحول میں تنگدستی سے ستائے گئے بچپن سے تنگ آکر کم عمری ہی میں اپنے گاؤں سے بھاگ کر مزدوری کر کے پیٹ بھرنے کے لیے امریکہ چلا گیا تھا۔ اور جو اپنی محنت اور دلیری سے مافیا کا سرغنہ بن کر امریکہ کے طاقت اور دولت مندوں میں شامل ہو گیا تھا۔ جب وہ نیویارک کے سب سے بڑے اسپتال میں مرنے لگا تو اس نے اپنی لڑکی کے نام وصیت کی کہ اس کی لاش کو سسلی لے جاکر اس کے پیدائش والے گاؤں میں دفن کرے۔

ابھی کچھ دن ہی پہلے ہندوستان کا مشہور رنگ کار جس کا بمبئی جیسے بڑے شہر میں انتقال ہوا تو اس کی لاش اس کے چھوٹے سے موروثی قصبے کھانڈوا میں لاکر جلائی گئی۔ کھانڈوا میں کیا تھا؟ ایک معمولی سا دھول دھویں والا قصبہ جس میں بمبئی جیسی کوئی خوبی نہیں تھی۔ چوڑی شاندار سڑکیں۔ اونچی عمارتیں۔ خوبصورت عورتیں۔ شاندار ہوٹل اور رستوراں۔ جوئے خانے۔ جلوہ سینما۔ دنیا کی بہترین شراب۔ ہر قوم اور رنگ کی عورتیں۔ دنیا کی ہر نعمت بمبئی میں موجود ہوتے ہوئے بھی جہاں اس نے دولت کے ڈھیر کمائے۔ خوبصورت عورتوں سے شادی کی۔ عالیشان بنگلہ میں رہا۔ اس عالیشان شہر کو چھوڑ کر ایک انجان غریب سے قصبے کھنڈوا میں جاکر لوگوں اپنے جسم کو ختم کرنے کی بات سوچی۔ کھنڈوا نے اسے سوائے پیدائش کے کیا دیا تھا۔

کیا یہ بڑے، دولت مند لوگوں کے چونچلے تھے۔ یا نہیں؟

نہیں! انگلینڈ کی اس عورت نے گوالیار سے اپنے دادا کی لاش انگلینڈ لانے کے لیے کئی سال دولت جمع کرنے میں لگائے تھے۔ وہ دولت مند تھی نہ بہت قدر رکھتی تھی۔ اس کا دوست عبدالباقی پاکستان جانے کے بعد ہر خط میں لکھتا تھا۔ کہ میرا ہندوستان چھوڑ کر پاکستان جانا ایک مجبوری تھی میری مجبوری نہیں وقت کی سیاسی مجبوری جو تاریخ کی غذا ہے۔ تاریخ انسانوں کا خون پی کر اپنی لا انتہا بھوک مٹا کر آگے بڑھتی ہے۔ مگر میں تاریخ کے اس ناپاک گندے باب کو اپنے خون سے سینچنا نہیں چاہتا۔ اس لئے یہاں کسی کے ہاتھوں مرنے

کی بجائے میں زندہ پاکستان چلا آیا۔ زندہ رہنا میری مجبوری تھی۔ چونکہ میں بحالت مجبوری تم اپنے کسی ارادے یا جذبہ کے تحت ہندوستان کو چھوڑ کر یہاں آیا ہوں۔ اس لئے ہندوستان کی سمت زندگی بھر دیکھتا رہوں گا جس طرح ایک خانہ بدوش اس قیام کی طرف دیکھتا رہتا ہے، جو اس کی زندگی کا سب سے خوش گوار قیام ہوتا ہے۔

ایک خط میں اس نے لکھا تھا ”ہندوستان میں کیرانہ ہے۔ کیرانہ میں وہ گھر ہے جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ کیرانہ میں وہ قبرستان ہے جہاں میرے بزرگ دفن ہیں۔ اس لئے میں صبح اٹھ کر اور شام کو سونے سے پہلے کیرانہ کو یاد کرتا ہوں اور اسی کے ساتھ تم یاد آجاتے ہو جیسے زندگی اور موت کے بیچ کی ایک خوش گوار کڑی تم ہو۔ میرے عزیز دوست۔ میرے ہم جلیس، کیا یہ ایک دانشور غریب کا جذباتی پاگل پن ہے؟ پاکستان کی مٹی اور ہندوستان کی مٹی کیا الگ الگ ہے۔ کوئی سمندر۔ کوئی دریا۔ کوئی سنگلاخ پہاڑ۔ کچھ بھی تو نہیں ہے دونوں کے بیچ جو مٹی کو تقسیم کرتا ہو۔ ایک مسلسل زمین ایک مسلسل مٹی۔ صرف ایک جگہ پر کانٹے دار تار اور کچھ سپاہی یا جغرافیہ کی کتابوں میں دکھائے گئے برصغیر ہندوستان کے نقشے میں ہندوستان اور پاکستان دونوں کو الگ الگ بناتی ہوئی قلم کی ایک موٹی سی لکیر۔ جو کسی نقشہ نویس میں اپنے فانی ہاتھوں میں ایک انسان کے بنائے قلم سے کھینچ دی ہے۔

تو مٹی، مٹی میں فرق ہوگا۔ ورنہ پاکستانی نوجوان ......

شام کا دھندلکا تھا۔ اس نے ابھی گھر کے باہر کا بلب نہیں جلایا تھا۔ باہر دروازے پر دستک ہوئی اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ باہر دو نوجوان کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے ”انکل نمستے“ کہہ کر پوچھا ”تپیش گھر میں ہے؟“ تپیش اس کا منجھلا لڑکا گھر پر نہیں تھا۔ وہ اس نوجوان کو پہچانتا تھا۔ ہاں وہ وسیم تھا۔ اس کے بیٹے تپیش کا دوست جو کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔

”تپیش تو گھر پر نہیں ہے“ اس نے سیدھا سادا جواب دیا۔

”انکل یہ میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔“ وسیم نے اپنے ساتھ آئے خوش رو اجنبی نوجوان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ہم لوگ یونیورسٹی گھومنے آئے تھے سوچا تھا جلدی گھر پہنچ جائیں گے اور ”چترہار“ دیکھیں گے۔ یہ میرے ماموں زاد بھائی پاکستان سے آئے ہیں۔ ان کو ہندوستانی فلمی گانوں پر مبنی چترہار دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں نے سوچا تپیش کے گھر چل کر چترہار دیکھ لیں۔“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو آؤ، بیٹھو۔ چترہار آنے ہی والا ہے۔“ اس نے وسیم اور اس کے چچا زاد بھائی کو اندر بٹھایا۔ ٹی وی آن کیا اور کچھ چائے ناشتہ وغیرہ کے انتظام کے لئے اندر چلا گیا۔ واپس آکر وہ ان کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

عجیب بات ہے اس کو ملتان چھوڑے سینتیس سال ہو چکے تھے۔ اس کے بچے جوان ہو کر خود ماں باپ بن چکے تھے۔ سبھی ہندوستانی اور انگریزی میں شدھ بھوپالی زبان بولتے تھے۔ ماں باپ کی زبان نہیں سمجھتے تھے۔ گھر میں ملتانی تو صرف وہ اور اس کی بیوی ہی بولتے تھے۔ مگر کبھی کوئی پاکستانی مل جائے تو اس سے اس کے شہر کے بارے میں ضرور پوچھتے تھے۔ وہ خود اردو جانتا تھا۔ شعر و شاعری میں دل چسپی تھی۔ جذباتی تھا۔ اس لئے اختر شیرانی کی ایک نظم کے مصرعے ”او دیس سے آنے والے بتا“ کا درد محسوس کرتا تھا۔

”پاکستان میں کہاں رہتے ہیں آپ؟“ اس نے اس پاکستانی اجنبی سے پوچھ ہی لیا۔ جی، ”ہم لوگ ملتان میں رہتے ہیں۔ وہاں حرم گیٹ میں میرے والد کی کیمسٹ کی دکان ہے۔“ نوجوان نے نفیس اردو میں جواب دیا۔ ملتان کا نام سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

”تو آپ ملتانی بولتے ہوں گے،“ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔“

”جی ہاں، میں ملتان میں پیدا ہوا تو ملتانی کیوں نہ بولوں گا،“ نوجوان نے مسکرا کر جواب دیا۔ چائے ناشتہ آ گیا۔ اس نے ملتانی میں نوجوان سے کہا۔

”آئیے تھوڑا نمک پانی لے لیں......“

نوجوان نے اس کی طرف مسکرا کر حیرت سے دیکھا۔ اور والہانہ کہا۔

”آپ تو ملتانی بول رہے ہیں۔“

”ہاں میں بھی وہیں پیدا ہوا تھا۔“ اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ دو گھنٹے بیت گئے۔ دونوں ملتانی میں باتیں کرتے رہے۔ وسیم خاموش بیٹھا رہا۔ چترہار کب کا ختم ہو چکا تھا۔ کب دوسرا پروگرام ختم ہو گیا تھا اور تیسرا شروع ہو گیا تھا۔ کسی کو احساس تک نہیں ہوا۔ دس بجے تو وسیم بولا ”انکل اب اجازت دیجئے۔ دس بج گئے ہیں۔“

”اس نے گھڑی دیکھی ارے دس بج گئے۔ اسے ندامت کا احساس ہوا ارے میں نے آپ کو باتوں میں لگا دیا۔ آپ چترہار بھی نہیں دیکھ پائے۔ مگر مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ ہم دونوں کی عمر کے لحاظ سے جنریشن الگ الگ ہیں۔ مگر مجھے آپ سے بات کر کے بڑا مزا آیا۔“

”وہ خوشی سے بولا ”انکل مجھے بھی آپ سے بات کر کے بڑا مزہ آیا۔ ہم دونوں کی جنریشن الگ الگ ہے تو کیا ہوا۔ ہم دونوں تو ایک ہی مٹی ......“

پاکستانی نوجوان نے بڑی مسرت اور عزت سے اپنا جملہ دونوں ہاتھ جوڑ کر

خوشی خوشی چلے گئے۔ مگر......

وہ بے چین ہوگیا۔ وہ پاکستانی نوجوان یہ کیا کہہ گیا تھا۔ ہم دونوں ہیں تو ایک ہی مٹی "۔ وہ اس سے ایک رشتہ قائم کرگیا تھا۔ مٹی کا رشتہ۔ اس کے لئے اس کا پھوپھی زاد بھائی وسیم جو بھوپال میں پیدا ہوا تھا۔ اس سے اس کا مٹی کا رشتہ نہیں تھا۔ مگر اس سے جو اس کے لئے بالکل اجنبی تھا اور پہلی بار ملا تھا۔ اس سے اس نے ایک بہت گہرا مٹی کا رشتہ طے کرلیا تھا۔ وہ اجنبی نوجوان اس کے ذہن کو جھنجوڑ کر چلا گیا تھا۔ اور تب اس کو وہ سب وقت یاد آگئے جس میں اپنے گاؤں سے دور مرنے والوں کو اپنے گاؤں کی مٹی میں دفن کرنے کے لئے لایا گیا تھا۔ یاد آگئے وہ حماقت نہیں تھی۔ دولت مندوں کے چونچلے نہیں تھے۔ کوئی بہت بڑی اور گہری حقیقت تھی جس کا اشارہ وہ پاکستانی نوجوان دے گیا تھا۔

"جب آپ کو اپنے شہر کی یاد آتی ہے تو آپ وہاں ہو کیوں نہیں آتے ہو۔"

"بیگم کوثر نے اس کے ناول "میرا شہر" کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"پاسپورٹ کے بغیر کیسے جاسکتا ہوں؟" اس نے سادگی سے جواب دیا"

"کیا آپ نے پاسپورٹ نہیں بنوایا؟" بیگم کوثر نے حیرت سے پوچھا۔

میرا مطلب ہے اپنے جنم ستھان پر جانے کے لئے پاسپورٹ لینا ایسا ہی ہوگا جیسے اپنی ماں سے ملنے کے لئے کوئی پروانہ لینا پڑے۔ پاور لفنگ کارڈ دکھانا پڑے۔

بیگم کوثر نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے پر گڑھا دیں اور خاموش رہیں۔ تھوڑی دیر اور خاموش رہ کر وہ پھر بولیں۔ " اگر آپ چاہیں تو مجھ سے میرے رشتہ داروں کے نام اور پتے لے جائیے گا انہیں کے یہاں رہیے گا۔ وہاں ہمارے بہت رشتہ دار ہیں۔"

اسے اچھا نہیں لگا۔ اپنے ہی شہر میں وہ یہاں سے گئے لوگوں کا مہمان بنا کر رہے۔ وہ کیسے گوارہ کرے گا۔ اس نے جواب نہیں دیا۔

تھوڑی دیر پھر خاموش رہی۔

"تو آپ انتظار کیجئے۔ برلن کی دیوار ٹوٹ گئی ہے۔ مشرقی اور مغربی برلن کے لوگ ادھر ادھر اپنے بزرگوں کے مکانوں، قبرستانوں اور دوسری جگہیں دیکھنے جارہے ہیں۔ مشرقی جرمنی نے مغربی جرمنی والی سرحد کھول دی ہے۔ لوگ بنا پاسپورٹ اور ویزا کے ادھر جا رہے ہیں۔ آپ بھی انتظار کیجئے.... شاید.... " بیگم کوثر نے کہا اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ وہ قہقہہ بیگم کوثر کی زبان تھی جس طرح اس کی اپنی زبان اس کے افسانوں یا ناولوں کی سطور میں چلتی ہے۔ بیگم کوثر کا قہقہہ بھی ان کی زبان تھا۔

ہو.... یہاں کیا جھوٹی امیدیں باندھ رہے ہو۔ برلن کی دیوار اور دو جرمنوں کے بیچ کی سرحد جدید سیاست اور فوجی سٹریٹجی پر بنی تھی ـــــ جو ٹوٹ سکتی ہیں۔

مگر ہندو پاک کی سرحد مذہب کے قدیم تعصب پر بنی ہے۔ نہ تعصب ختم ہوگا نہ سرحد ٹوٹے گی۔ اور تم کبھی بنا پاسپورٹ اور ویزا کے اپنے شہر کی زیارت کرنے نہیں جاسکو گے۔ ✺

بقیہ صفحہ ۳۳ خواب رو

"اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے بڑی بی بی سائیں۔"

"اپنے کپڑے وپڑے لیکر آجاؤ۔"

"میرے پاس یہی تین کپڑے ہیں بڑی بی بی سائیں، جو پہنے ہوئے ہاں باقی صرف اللہ کا نام ہے۔"

"ارے تم تو واقعی مہاجر ہو سائیں بابا۔"

"یہی تو آپ کو بتایا تھا چھوٹی بی بی سائیں" اور پھر انتہائے شوق سے اس کا لہجہ آپ ہی آپ وسیع تر ہوگیا ہے۔ "عجیب بات ہے کہ ہم بھوکے ننگے آئیں کیا پتہ اللہ تعالیٰ سب ہی کو آخری دماں باد کدھر پہنچا دیتا ہے!؟"

ابھی بیگم کی نگاہ اچانک گیٹ کی جانب اٹھی ہے جہاں سے دیوانے مولوی صاحب اتنی تیزی سے داخل ہوئے ہیں گویا پیٹ لگے آگے قدم اٹھاتے ہوں۔ وہ سائیکل کو چھوڑ کر برآمدے کے کنارے ان کی طرف منہ کرکے اکڑوں کھڑی ہے۔

دیوانے مولوی صاحب نے دور سے ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنا تھیلا ہلایا ہے۔ اور اپنی رفتار کو اور تیز کرلیا ہے جس سے ان کی سانس پھول گئی ہے۔

"پیڑے، اچھی بیگم الٰہ آباد کے پیڑے لایا ہوں۔ دیکھو!" انہوں نے اپنا تھیلا اپنی بیگم کی ناک کے نیچے کھول دیا ہے۔

"مشک تو بہت پیاری ہے دیوانے مولوی صاحب۔"

"پیاری کیوں نہ ہوگی بیگم، الٰہ آباد کے امرود ہیں۔ ایسا بیج جو الٰہ آباد سے دو کوس پر بھی لگا کر تو اماں دے دے۔" دیوانے مولوی صاحب نے فخر سے کہا ہے۔ "ہاتھ میں لیا اور پکڑا انگلیوں سے کیوں کر پھسل جاتے ہیں۔ آخ میرکی ڈیوڑھی کے پاس نذر سوا الٰہ آبادی ڈھیر کا ڈھیر لے بیٹھا تھا۔ اور صدا لگا رہا تھا لے تقاب بیٹھے ہیں، بے حساب لے جاؤ۔ سو اچھی بیگم، حساب مت پوچھو بس کھا کے دیکھو۔" پھر وہ سائیکل کو ٹیک کر چڑھتے ہیں۔ "کون ہو، میاں؟"

[باقی آئندہ]

عین رشید

سمندر کا خیال

اپنی دہلیز پہ کھڑا تنہا
اپنا گھر اجنبی سا لگتا تھا
اُس کی رخصت تھی مانند پرواز
ہر طرف اجڑا ہوا منظر تھا
ایک نکہت زدہ سی ویرانی
در و دیوار پہ تھی حیرانی
لرزتے آنسو اور دُکھتا ہوا سر
روکتے تھے اسے پیاسِ ویرانی سے
وہ کہ سویا ہے یا کہ جاگا ہے ؟
مجھ سے کیوں یہ سمندر کا خیال ذہن میں آج تھپیڑے مارے؟

گہرا آلود بند دریچوں میں
جب وسیع کائنات چھپتی ہے
ناامیدی کی نیلگوں چادر ایک سمندر سی پھیل جاتی ہے
سونا یہ رہ رہ کے سمندر کا خیال ذہن میں آج تھپیڑے مارے؟

میں مانوس تھی، قریب تھی وہ
جیسے ساحل ہو ایک سمندر سے
جیسے موج جیسے ساحل کی گود میں آ کے ہی دم لیتی ہے
اس کی صورت کے لچکتے لب
سارے منظر جب قریب تھے کہیں
اک تلاطم کے بعد سمندر سے
جیسے پاتال میں چھپ جاتے ہیں

سارے دور اجاڑ دھندلکوں میں
تنہا تنہا اداس پھرتا ہے
رات جب سیکڑوں میں ڈھلتی ہے
پھر سمندر کی یاد آتی ہے
سب حسیں وادیاں اس سے مانوس تھیں، اس کی جاگیر تھیں
• ایک طوفان پیہم ہوا میں خروش
سب حسیں وادیاں یک بیک سو گئیں۔

تنہا تماپوری

ٹوٹا ہوا آسمان

آسماں ٹوٹ کے بکھرا ہے زمیں پر کب سے
میں نے چاہا تھا کہ دامن میں سمیٹوں، بھر لوں
وہ مگر ریت کی چادر میں ابھی جذب ہُوا
ریت کو کون نچوڑے گا ؟
سوال اچھا ہے
پہلے یہ دیکھ تو لو
ریت کہاں پھیلی ہے !؟
ایک بچّے نے کہا :
ریت کی پوری چادر
میں نے آنکھوں میں بچھا رکھی ہے
اِک دن اُس پر
لیٹ کر سب کو سناؤں گا کہانی میری
آسماں ٹوٹ کے بکھرا ہے میری ٹھوکر سے

جڑیں کٹ رہی ہیں

تمنا بے کی دُرِ دآشامی چکھنے کا دعویٰ کرتے ہو
ننھی مُنی آرزوؤں کے ہیرے موتی
چھُو کر دیکھ نہیں پائے ہو
تم کتنے کڑوے لگتے ہو نئے جڑ کے پودے لگتے ہو
خود اپنے پیروں سے چلنا بھول کے تم نے
اپنے بوجھ کو بیساکھی پر لاد دیا ہے
اونچے آدرشوں کی باتیں
مُردہ لفظوں کے افسانے
چاٹ کے کب تک جی پاؤ گے
چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹو
ریزہ ریزہ بکھری ان معصوم تمناؤں کو سمیٹو
جینے کے انداز کو اوپر سے مت لادو
اپنی جڑ کے ساتھ جیو گے تو پھیلو گے

کڑوے گھونٹ

میں نے سب ناراض ارادے ڈھونڈ نکالے
تم نے اپنے ہی کرتوت غبن کر ڈالے
اُس نے فرصت کی گھڑیوں میں
اپنے بدن کا جھوٹ ہی دیکھا
سب اپنی اپنی پہچان کا
کھوٹا سکّہ چلا رہے ہیں
گِھسے ہوئے ہونٹوں سے اب
معذور جوابوں کی تسکین کا
اندھا چہرہ دکھا رہے ہیں
یہ اپنی گندی تاویلوں سے
اُجلے بُت نصب کریں گے
ریت کے ساگر خوابوں میں تو بہہ سکتے ہیں
کھُلی کھلی آنکھوں سے جینا سیکھنے والو
برف کا موسم آگ نہیں برسائے گا
ٹھنڈے دھوکے سانس کی آنچ نہیں بن سکتے
کھوٹے سکّوں کو پہچانو
ورنہ گھر بازار بنیں گے
دروازہ پر لٹکی یہ تہذیب پگھل کر بہہ جائے گی

رات

مجھ میں نیند کو اندھا کر کے
سپنوں کے سُندر چہروں کو کاٹ رہی ہے
برسوں سے یہ کالی ناگن
میری آنکھیں چاٹ رہی ہے
صرف سیاہی بانٹ رہی ہے

● فلیٹ ۴، ۴۔ بلاک ۵، اے ۱/۲۸، گاریاہٹ روڈ، کلکتہ ۔ ۲۹۰۰۰۰
● پوسٹ آفس زخم پیٹ، ضلع گلبرگہ ۔ ۵۸۵۲۲۰



شان الحق حقی

۱۷-اے خیابان تنظیم ڈیفنس ہاؤزنگ سوسائٹی کراچی (پاکستان)

زبان کے معیار کا مسئلہ

جناب شان الحق حقی کا یہ مضمون ان کی کتاب نقد و نگارش [مطبوعہ ۱۹۸۵ء کراچی] سے لیا گیا ہے۔ چوں کہ علی جواد زیدی صاحب کے مقالے میں مذکورہ مضمون کے حوالے موجود ہیں، طبع شدہ مضمون کی شمولیت ناگزیر ہوگئی۔ [ادارہ]

زبان انسان کا وسیلۂ اظہار ہے جس کے بغیر متمدن زندگی کا تصور ممکن نہیں ہم اسے ہر قسم کے نازک مطالب کے اظہار کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے قواعد، لغات اور محاورات کا معیاری ہونا شرط ہے تاکہ افہام و تفہیم میں اشتباہ پیدا نہ ہو۔ سائنس، ادب اور قانون ہی نہیں، زندگی کے ہر شعبے میں صحت الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف و نحو کے قواعد سے انحراف، الفاظ کے معنی میں غلط ملط محاورے سے روگردانی یا تلفظ کی بے احتیاطی عام اس سے کہ مذاقِ سلیم کو گراں گزرے، مفہوم کو خبط بھی کر دیتی ہے اور اظہار کو نامعتبر بنا دیتی ہے۔ بعض اوقات ہم کسی انگریز کی یا وہ ہماری بات اس لئے نہیں سمجھنے پاتا کہ ہم انگریزی کے ایکسنٹ (رفع یا جبر) کو نظرانداز کر دیتے ہیں، کیونکہ ہمارے ہاں لفظ کے کسی حصے پر بھی زور آ سکتا ہے، برخلاف اس کے انگریزی الفاظ کا ایکسنٹ معین ہوتا ہے، ورنہ تلفظ غیر معیاری ہوگا اور بات کے سمجھنے میں حارج ہوگا۔ چنانچہ یہ بات ایک سکے کے طور پر بالکل درست ہے کہ ہر شائستہ زبان کے لئے ایک معیار کا ہونا ضروری ہے اور حتی الامکان اس کی پابندی شرط ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان کوئی جامد یا پتھرائی ہوئی شے نہیں۔ ہر جیتی جاگتی، پھلتی پھولتی شے کی طرح اس میں بھی افزائش و نمو کا عمل ہوتا رہتا ہے زبان جتنی چلتی ہے اتنی بدلتی بھی ہے۔ ہر دور میں نوخیز نسل کی زبان بڑے بوڑھوں کی زبان سے تھوڑی بہت مختلف ہوتی ہے۔ پھر زندگی کا قدم جتنا تیز ہوگا یہ تغیر بھی اتنا ہی نمایاں ہوگا۔ کوئی بچہ اپنی مادری زبان کے سہارے زندگی نہیں گزارتا یعنی اگر مادری زبان سے صرف اتنی ہی زبان، لغات یا محاورات مراد لئے جائیں جو اس نے اپنی ماں یا گھر والوں سے سیکھے۔ وہ بچہ اگر علم و فن کے بہت مدارج طے نہ کرے، گھر سے بہت دور نہ جائے تب بھی بیشتر الفاظ گھر سے باہر کے ماحول سے حاصل کرتا ہے۔ ہمارے ہاں لڑکوں کی بولی تو عین طفلی ہی میں ماں کی بولی سے مختلف ہو جاتی تھی۔ زنانہ اور مردانہ بولی میں واضح امتیاز تھا، اور یہ صرف واحد متکلم کے لئے مونث یا مذکر صیغوں کا اختلاف نہ تھا، پورے طرز کلام پر حاوی تھا۔ اب بھی یہ امتیاز کسی حد تک باقی ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں میں عورتیں جس قدر مردوں کے دوش بدوش آتی جائیں گی یہ امتیاز کم سے کم ہوتا جائے گا۔

اگرچہ ہمارے بڑوں کو معیار اور ٹکسال پر بڑا اصرار رہا اور سند کے لئے اگلوں ہی کی طرف دیکھا جاتا رہا، پھر بھی فصاحت کا معیار دور بدور بدلتا رہا ہے۔ اصولاً شاعری کی زبان بول چال کی نسبت سست رَو اور قدامت پسند ہوتی ہے۔ اس کے باوجود پیچھے پلٹ کر دیکھئے تو میر و مرزا کی زبان وہ نہیں جو ذوق و غالب کی زبان تھی، اور پھر حالی، شبلی، اقبال اور ان کے ہم عصروں کی زبان اور بھی مختلف ہو گئی۔ اس سے آگے تو اتنے اثرات پڑے کہ اگلے لوگ ہماری باتیں شاید بالکل ہی نہ سمجھ پائیں، اور شیخ امام بخش ناسخ تو صبح محشر کی طرح گریباں چاک کر کے رہ جائیں۔ ناسخ نے متروکات کو چھانٹا تو انہیں کیا معلوم تھا کہ زمانہ ایک دن خود ان کے معیارِ فصاحت

پر بھی خطِ تنسیخ پھیر دے گا۔ آن کا یہ اقدام اس لحاظ سے مستحسن تھا کہ انہوں نے تعین معیار STANDARDIZATION کی ضرورت کو محسوس کیا، وہ اپنے دور کے مذاق کے ترجمان، اور پورے اردو معاشرے، یعنی دلّی، لکھنؤ، دونوں کے نمائندہ تھے۔ زبان کی صفائی اور ترقی کا عمل پورے اردو معاشرے میں جاری تھا، کچھ ایسا نہیں کہ لکھنؤ میں ناسخ و آتش کی اور دلّی میں میر و سودا کی زبان چل رہی تھی، جیسا کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں۔ کسی جگہ بھی زبان کا قدم اتنی مدت تک ٹھہرا نہیں رہتا۔ چند مقامی اختلافات سے قطع نظر وہ ایک ہی دور اور ایک ہی لسانی معاشرہ تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ معیار کیونکر متعین ہوتا ہے۔ شہنشاہی یا جاگیرداری معاشرے میں کلامُ الملوک کو اَفصحُ الکلام سمجھا گیا ہے۔ یہ سچ بھی ہے کہ دربار ہی ثقافت کا مرکز ہوتا تھا، بادشاہ اپنے عہد کے علماء شعراء اور اہلِ کمال کی صحبت بھی اُٹھاتے تھے اور اَلنَّاسُ عَلٰی دِیۡنِ مُلُوۡکِھِمۡ کے مصداق سب اُنہی کی طرف دیکھتے تھے، جیسے کہ پچھلے دور میں گورا شاہی اردو کا بھی ایک رعب رہا ہے۔ انگریزی میں بھی فصیح زبان کے لئے "کنگز انگلش" کی اصطلاح مقرر ہے۔ دلّی میں واقعۃً لال قلعے والوں کی زبان عوام الناس کے لئے قابلِ سند تھی۔ میں نے اُن کی خراب خستہ آل اولاد میں سے بھی جن کو دیکھا ان کی بول چال کو کھرا پایا۔ خود ذوق کی زبان فصاحت میں بہادر شاہ کی زبان کو نہیں پہنچتی۔ ذوق کے ہاں محاورہ بندی قدم قدم پر چونکاتی بلکہ کھٹکتی ہے۔ شعر میں محاورے باندھنا اور زبان دانی کی دھاک بٹھانا، ظفر کا مذاقِ فصاحت نہیں تھا۔ بس ایک بے ساختگی اور مخصوص لہجہ ہے۔ دیکھئے ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کی پیش گوئی کس طرح کرتے ہیں کہ ترغیب اقدام نہیں تو ایک وجدانی پیش گوئی ضرور تھی:

کشتۂ قامت جتنے ہیں اُس کے، آپس میں سب مل جل کر
کردیں اگر اِک حشر بپا، کیا اچھا ہو، کیا اچھا ہوا

دیگر:

یہ جو پڑا ہے پردۂ غفلت اپنے دیدہ و دل پہ ظفر
کوئی اگر دے اِس کو اٹھا، کیا اچھا ہو، کیا اچھا ہوا

عقدۂ مقصود اپنے آج، کل کھل جائیں گے
وہ جو گِل کرتے ہیں ہم سے اُن کے گِل کھل جائیں گے

ہے ایک ایک سے لینا جہان کا بدلا
جنہوں نے رنگ مری عزّ و شان کا بدلا

نہ بدخواہوں سے ہوگا کچھ نہ ہوگا خیر خواہوں سے
جو کچھ تقدیر کی اپنی ہے گردش، ہونے والی ہے

بہا گر آنسوؤں کا آنکھ سے دریا تو کیا حاصل
فرو کب اِس سے میرے دل کی سوزش ہونے والی ہے

خدا کے ہو تو ہر دم عزت رہے گو اہلِ دنیا نے
مری تعظیم کم کردی، مری توقیر کم کردی

کیا رنگ دکھاتی ہے یہ چشمِ تر ادھر ہو
خونِ جگر آہا! لختِ جگر ادھر ہوا

اُن کے جدِّ امجد شاہ عالم آفتاب کی داستان "عجائب القصص" اور دیوان "نادراتِ شاہی" میں بھی اسی طرح کی بے کھوٹ فصاحت ملتی ہے جس میں زباں دانی کی نمائش نہیں۔ بقول منشی ذکاء اللہ ان کی زبان میر امن کی زبان سے کم تر نہیں۔

کچھ بدگماں ہی پایا، کچھ سرگراں ہی دیکھا
ہم نے تو تجھ کو جب تب نامہرباں ہی دیکھا

چند شعر مثالاً درج کئے۔ میں نے ظفر کی شاعری کا تفصیلی جائزہ اپنے ایک اور مضمون میں لیا ہے جو میرے مجموعۂ مضامین "نکتۂ راز" میں شامل ہے۔

ایک جے جمائے معاشرے میں ہر زبان کی ایک معیاری بولی ہوتی ہے اور کئی فروعی یا تحتی بولیاں جو اُس کے اِرد گرد بستی ہیں۔ ایک انگریزی مصنف (Erntwistle) نے اِن کا نقشہ یوں پیش کیا ہے کہ زبانوں کی ایک کھڑی تقسیم ہوتی ہے اور ایک پڑی تقسیم۔ ڈایلیکٹ اُفقی یا پڑی تقسیم میں آتے ہیں، اِن کا اِختلاف جغرافیائی یا مقامی ہوتا ہے، کھڑی یا عمودی تقسیم طبقہ واری ہوتی ہے۔

ایک اور مصنف ERIC PARTRIDGE نے اپنی کتاب SLANG AND STANDARD ENGLISH میں انگریزی زبان کی حسبِ ذیل تحتی بولیاں گنوائی ہیں:

STANDARD CANT SLANG COLLOQUIAL
VULGARISM

اور اسٹینڈرڈ انگلش کے تین مدارج قرار دیے ہیں:

FAMILIAR ENGLISH ORDINARY ENGLISH
LITERARY ENGLISH

میں اس تقسیم سے متفق نہیں۔ ادبی زبان کو اِس طرح عام بول چال اور روزمرہ سے الگ کرنا ایک بے تکی اور فرسودہ سی بات ہے۔ لیکن دراصل معیار کا پورا مسئلہ ہی نئے سرے سے غور و فکر کا محتاج ہے۔ اتنی بات تو درست ہے کہ ہر بڑی زبان میں کچھ علاقائی تنوع ہوتا ہے علاوہ ازیں مختلف اِنسانی گروہ اپنے اپنے پیشے، تربیت، ماحول، مذاق کے لحاظ سے کسی قدر مختلف لسانی رجحانات رکھتے ہیں۔ حساس کان نہ صرف مقامی لہجے اور محاورے کو پہچان جاتے ہیں بلکہ مختلف پیشوں، گروہوں، طبقوں

گھرانوں تک کی بولی کو تاڑ لیتے ہیں دلّی میں لوگوں کے کان بتا دیتے
یہ جامع مسجد کے آس پاس کا نہیں حویلی حسام الدین حیدر کا ہے،
ا تو مسلمانوں کے منہ کا نہیں، نیل کے کٹڑے میں کسی ہندو لالہ کی
ے سنا جاسکتا ہے۔

خیر وہ بساط اُلٹ چکی، جاگیرداری دور بھی ختم ہو رہا ہے۔ اب ایک
ہے اور نیا ملک۔ ہم پاکستان میں اُردو کے معیار کا ذکر کر رہے
یہاں یہ قومی زبان تسلیم کی جاتی ہے اور ابھی تک ایک زندہ سلامت
رابطے کی زبان بولی ہے۔ پاکستان کو آئندہ بھی اس کی ضرورت رہے گی۔ خواہ
ساری آبادی کو بی اے پاس کرادیں، لوگ اِس طرح گِٹ پِٹ پر
ہونے لگے جیسے کہ اردو پر آپ سے آپ ہو جاتے ہیں کہ یہ مقامی زبانوں
بنتا ہے۔ ان میں معنوی و قواعدی مماثلتیں اور بڑا اشتراک موجود
کستان کے لئے یہ بڑی غنیمت بات ہے کہ اِسے ایک بنی بنائی چلتی
رابطے کی زبان حاصل ہے جو بالکل غیر نہیں، نہ اسپرانٹو کی طرح علم و
سے عاری ہے، اور کسی ایک علاقے سے بھی مخصوص نہیں کہ لسانی جبرو
بیت کا خطرہ لاحق ہو۔ جہاں تک گِنے چُنے اہلِ زبان کا تعلق ہے (جنہیں
ں پر بھی گننے کی ضرورت نہیں) اُن کی اولاد اُردو سے اتنی ہی دور
ہے جتنے کہ مقامی لوگ یا ان کے بچے۔ حق یہ ہے کہ اِس دور میں مقامی
نے اردو کا جتنا دامن بھرا ہے، اتنا اہلِ زبان کا مقدور نہ تھا۔
معیار کی ضرورت تسلیم، لیکن تلفظ کے اُن اختلافات کو اہمیت دینا
ہوگا، جو فطری مخارج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ش، ق
نہیں جتنا کہ املاء و انشاء۔ ش، ق میں نے محاورۃً کہا، تفصیلاً
ئے تو نے "ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق" کہنا چاہیئے۔ بہرحال املاو انشا
ہم ہیں۔ تو املا میں اُس ستم ظریفی کے علاوہ بھی جو آجکل روا رکھی جا رہی

دیسے بھی کچھ انتشار ہمیشہ سے چلا آرہا ہے، اور یہ نہایت تفصیل
مسئلہ ہے جس سے میں اِس وقت صرف نظر کرتا ہوں۔ کیا معنی (معنے)
و موقع (موقعہ) ہے، گنجائش (گنجایش)، تو اس سلسلے (سلسلہ) میں
علاوہ (علیحدہ، علٰحدہ) مضمون آئندہ (آیندہ) لکھا (لکہا) جانا چاہیئے
تھا۔

جب اُردو کی ایک جامع لغت کی تدوین کا آغاز ہوا تو ترقیِ اردو
کے سامنے لازماً معیار کا مسئلہ بھی آیا۔ اس لغت کو جدید سائنسی اصول
آکسفورڈ کی کلاں ڈکشنری کے نمونے پر مرتب کرنا تھا جس میں تاریخی
اصول کی پابندی کی گئی ہے۔ یعنی ہر لفظ کے اصل و اشتقاق کے علاوہ
امکان ہر تاریخی دور سے اس کے استعمال کی سند پیش کرنا، تاکہ معلوم
لفظ زبان میں کب سے داخل ہے، کس کس دور میں کس کس معنی

میں استعمال ہوا ہے، رائج ہے یا متروک ہوگیا۔ سندیں مع حوالہ پیش کی
جاتی تھیں۔ اِس التزام کے ساتھ لغت کی تدوین کوئی ہنسی کھیل نہیں، اس
کے لئے پہلے تو اُردو کے تمام علمی، ادبی، فنی سرمائے یعنی ہر قسم کی کتابوں
تک رسائی ضروری تھی۔ پھر اِس تمام ذخیرے کی چھان بین اور اس میں سے
الفاظ و اسناد مع حوالہ اخذ کرنا: اُن کے سنین متعین کرنا جو اکثر صورتوں
میں نادر یافت تھے۔ یہ سب ابتدائی اور ذیلی کام تھے جو اپنی اپنی جگہ
ایک مہم کی حیثیت رکھتے تھے۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ خود
آکسفورڈ ڈکشنری جس کی تیاری میں بے شمار لوگ شریک رہے، پچھتر برس
میں منصۂ شہود پر آئی تھی۔ اُس کے بعد کچھ دوسری زبانوں میں اس قسم
کی تاریخی لغات بننی شروع ہوئیں (مثلاً جرمن یا سنگھالی میں) وہ اب
تک مکمل نہیں ہونے پائیں[1]۔ اتفاقاً اُس وقت وزارت تعلیم اور وزارت مالیات
دونوں اس پر متفق ہوگئے تھے کہ اُردو کی لغت بنے تو اسی پیمانے پر بنے۔ یہ
ڈاکٹر عترت حسین زبیری مرحوم کا منصوبہ تھا جسے جناب ممتاز حسن مرحوم کی
تائید حاصل ہوئی۔ یہ بات اہلِ اردو کی طمانیت کا باعث ہونی چاہیئے کہ
ادارے نے اپنی تمام مشکلات خصوصاً ناکافی وسائل اور اہل افراد کی کمی کے
باوجود (کہ لسانیات اور سنسکرت وغیرہ کے ماہرین جم ہی جم میسر تھے)
اِس مہم میں خاص کامیابی حاصل کی۔

کیا یہ لغت اُردو کا معیار متعین کرتی ہے؟ کیا یہی وہ "ٹکسال"
ہوگی جس کی معیار کے سلسلے میں تلاش ہے؟ اِس کا جواب اثبات میں بھی
ہے اور نفی میں بھی۔ یہ اِن معنی میں کوئی دستور الفصاحت مہیا نہیں کرتی
کہ معنی، تلفظ یا محاورے پر حقیت کی مہر لگائے۔ یہ اُردو زبان کے ارتقا
کا زمانۂ حال تک ایک تاریخی جائزہ اور عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں
کا ایک ریکارڈ یا دستاویز ہے۔ آپ دکھنی زبان بولنا چاہیں تو یہ اس کی
سندیں بھی مہیا کر دے گی اور آج کی زبان بولنا چاہیں تو اس کی مثالیں
بھی اس میں مل جائیں گی۔ مرتبین کے سامنے خود یہ مسئلہ تھا کہ معیار
کیا ٹھہرایا جائے۔ انہوں نے اِس اصول کو پیشِ نظر رکھا کہ مرتبینِ لغات
واضعینِ لغات نہیں ہوتے، نہ انہیں اپنی طرف سے یہ حکم لگانے کا حق ہے
کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ وہ زبان کے بولنے والوں کی روش کے پابند
ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ ہم سندات کے لئے کون سے مآخذ سے رجوع
کریں۔ ان مآخذ کا دائرہ کتنا وسیع یا کتنا محدود ہو۔ خالص پسندوں کا ایک
گروہ وہ بھی تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ سند صرف مستند اساتذہ یا اہلِ زبان کی
تحریروں سے لینی چاہیئے۔ لیکن ظاہر ہے کہ لغت اِس طرح نہایت محدود ہو
کر رہ جاتی۔ ایک رائے یہ تھی کہ مانے ہوئے ادیبوں کے ہاں سے لینی چاہیئے

---

[1] جرمن ڈکشنری اب شائع ہوگئی ہے۔

خواہ اہلِ زبان نہ سہی، لیکن ہمیں تو علمی، ادبی، فنی ہر طرح کے الفاظ لینے تھے، اور یہ سب ادبی کتابوں میں نہیں مل سکتے۔ لہٰذا یہ صلاح بھی مناسب نہ تھی۔ پھر ایک رائے یہ تھی کہ خیر یہ دیکھ لیا جائے کہ لکھنے والا خواہ کسی حرفے پیشے میدان اور موضوع سے تعلق رکھتا ہو، لیکن زبان صحیح لکھتا ہو۔ یہ بھی اپنے موقف سے گریز ہوتا۔ صحیح چہ معنی دارد؟ لطف کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ جو سند کو اہلِ زبان تک محدود رکھنا چاہتے تھے خود اہلِ زبان نہیں تھے وہ بڑے انکسار سے کہتے تھے کہ تم نے ہماری ہی زبان سے سند لی تو کیا لی، ہم تو خود یہ جاننا چاہتے ہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔

بالآخر ہم نے دائرۂ استناد کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ کوئی لفظ جو تواتر کے ساتھ ملے، خواہ اساتذۂ کرام کے ہاں اُس کی سند ہو یا نہ ہو لائقِ اندراج ہے۔ تواتر کے لئے بھی صرف دو مثالوں کو کافی سمجھا گیا، اور کوئی بہت کام کا اور ہونہار لفظ معلوم ہوا تو ایک ہی مثال پر اکتفا کی۔ حوالہ بہر صورت درج کیا جاتا ہے۔ اِس طرح اِدارۂ لغت نے تو معیار کا مسئلہ اپنے لئے آسان کر لیا: یعنی یہ لفظ فلاں مصنف کے ہاں ملتا ہے جو فلاں مقام سے تعلق رکھتا ہے، اب آپ اس پر جتنا بھی اعتبار کریں (ویسے بعض لوگ تو حضرت جوش ملیح آبادی اور مولانا ماہر القادری کو بھی لائقِ استناد نہیں سمجھتے یا جب تک جیے نہیں سمجھتے تھے) بہر حال معیار کا مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے۔

عموماً طبقۂ اعلیٰ کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک عجیب حقیقت ہے کہ معیار ہمیشہ اوپر سے مسلط نہیں ہوتا بلکہ نیچے سے اُبھر کر آتا ہے، البتہ اوپر کا طبقہ معیار کا پاسبان بن جاتا ہے۔ جو کچھ عوام بولتے ہیں وہ رفتہ رفتہ خواص بھی قبول کر لیتے ہیں۔ خصوصاً ایک ترقی پذیر معاشرے میں جہاں نچلا طبقہ اُوپر اُبھر کر آ رہا ہے، یہ عمل اور بھی تیزی سے ہوگا۔ روما کی عوامی زبان جسے LOW LATIN کہتے تھے بالآخر ٹکسالی زبان بن گئی جس کی آج تک دنیا میں دھوم ہے۔ جنوبی ایشیا میں پراکرتیں سنسکرت پر غالب آ گئیں، عربی فارسی، سنسکرت الفاظ کے معنی اور تلفظ وغیرہ میں جو تصرفات ہوئے ان کے بانی علما یا پنڈت نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ عوام ہی تھے جنہوں نے سؔوال کو سوال اور اکال کو کال بنایا۔ ایسے تصرفات کی تعداد سینکڑوں (صحیح سیکڑوں) سے گزر کر ہزاروں تک ہے۔ لیکن بالآخر انہیں خواص نے بھی قبول کر لیا۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے غَلَطُ العَامِ فَصِیحٌ۔ چنانچہ زبان کی تشکیل میں خواص کی نسبت عوام کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ پھر بھی کسی ایک وقت میں معیار وہی ٹھہرتا ہے جو خواص کا چلن ہو۔ ہاں، خواص میں صرف دولت مند شمار نہیں ہوتے ورنہ بنیوں اور سیٹھوں کی بولی معیاری ٹھہرتی۔ اہلِ اقتدار جو دربار سے منسلک ہوتے وہی کچھ زیادہ گاؤ کھپتے تھے۔ ادیبوں، عالموں کی صحبت اٹھاتے تھے، اور ادیبوں، عالموں سے زیادہ ذی اثر ہوتے تھے۔ جہاں کہیں دو حصہ اقتدار، ایک حصہ دولت اور ایک حصہ علمیت جمع ہو جائے وہیں ٹکسال کے لئے فضا سازگار ہو جاتی ہے۔

ہم ایک جمہوری نظام میں رہتے ہیں مگر یہ طبقاتی تقسیم سے خالی نہیں۔ ہمارا ذی اثر طبقۂ اعلیٰ کئی طرح کی زبانیں بولتا ہے اور اردو کی نسبت انگریزی سے زیادہ مانوس ہے۔ بُری اردو کی نسبت بُری انگریزی زیادہ شرم کی بات سمجھی جاتی ہے۔ یہ صورت ایک عرصۂ دراز سے قائم ہے۔ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد جیسے خطیب کو عام سیاسی جلسوں میں ایسے اکھڑے اکھڑے اور شستم پشتم انداز میں بولتے سنا ہے کہ ہرگز اُن جیسے عالم، ادیب اور خطیب اردو کے شایانِ شان نہ تھا۔ کسی ادبی صحبت میں ایسی تقریر کرتے تو مضحکہ خیز ٹھہرتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ کچھ تھکے تھکے ہوتے تھے، اور مجمع بھی زیادہ تر نیم خواندہ۔ مگر بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، (قائداعظم) محمد علی جناح اور دوسرے بڑے لیڈروں نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں تقریر کرنے کا ایک ایسا انداز قائم کر دیا تھا کہ اس کے بعد سے ایسی تقریر کھٹکنے نہیں پائی۔ یہی لوگ جب انگریزی بولنے کھڑے ہوتے تھے تو فصاحت کا معیار اور خطابت کی شان کچھ اور ہوتی تھی۔ یہ اُن کا اپنا جوہر تھا جو انگریزی میں رنگ دکھاتا تھا، عین اسی طرح جیسے ہمارے بے شمار ریسرچ سکالروں کے علمی کارنامے انگریزی کے پلّے میں گئے کیونکہ اردو تعلیمی زبان نہ تھی۔ ان مجبوریوں کے باوجود جس قدر بھی علمی سرمایہ اردو نے پیدا کیا سراسر حیرت انگیز ہے۔ اِس کا اندازہ جب ہوا کہ ہم نے فراہمیِ لغات کے لئے مآخذ کا کھوج لگایا۔ اس سلسلے میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ جس طرح مسلمان علماء نے عربی و فارسی لغات کو بلا تکلف اپنایا ہے، اسی طرح بعض بعض ہندو مصنفین نے بھی ہندو مذہب، فلسفے یا علوم کی کتابوں میں، جو ویسے تو سراسر اردو زبان میں ہیں، ٹھیٹھ ہندی شبد اور سنسکرت کی اصطلاحیں دل کھول کر برتی ہیں۔ چنانچہ اردو زبان ایک مجمع البحور ہے جس کے الفاظ و اسالیب کی فراوانی سے کم ہی زبانیں مقابلہ کر سکتی ہیں۔ علاوہ دوسری گوناگوں سہولتوں کے اس میں تین بڑی خصوصیات ہیں جن کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

اول یہ کہ اس کی صوتیات PHONETIC RANGE عربی، فارسی انگریزی ہر زبان سے بڑھ کر ہیں اور زیادہ جامع۔ چنانچہ یہ اکثر دوسری زبانوں کے الفاظ کو جوں کا توں اپنا سکتی ہے، تعریب تفریس کی طرح توریہ چنداں ضروری نہیں ہوتی۔ اب تو پڑھے لکھے لوگ مکوز واؤل پر بھی قادر ہوتے جاتے ہیں جو ایک نئی تبدیلی ہے (جیسے سپیشل، سپیرٹنگ وغیرہ)۔

دوسرے اس میں نئے مصدر ڈھالنے کی بڑی صلاحیت موجود ہے جو عربی، فارسی اور انگریزی میں نہیں۔ اُن زبانوں کے مادّے اور مصادر لگے بندھے ہیں اور ان کے معنی بہر حال محدود۔ اردو میں کرنا، ہونا وغیرہ لگا کر تو خیر جا ہے جتنے مصادر بنا لیجیے، نا، آنا، وانا، یانا لاحقوں کے ساتھ

بھی بہتیرے نئے مصدر بنائے جا سکتے ہیں جیسے برقانا، فلمانا، قلمانا، دھوانا، فولانا، بخشنا، فولادنا، انگیزنا وغیرہ جو سب وضعی صورتیں ہیں۔ اس سے پہلے اردو نے اس طرح کے اور بھی ڈھیروں مصادر وضع کئے تھے، بدلنا، بخشنا، شرمانا، گرمانا، خریدنا، تراشنا، ورغلانا، گزرنا، گزارنا، گردانا ۔۔۔ مگر پھر یہ سلسلہ سست پڑ گیا۔ عربی، فارسی، ہندی کو ملا کر بہت سے گنگا جمنی مرکبات و محاورات بھی بنائے گئے۔ کھٹکے دار، منہ در منہ، دھینگا مشتی، کٹھ حجتی، غل غپاڑہ، دھڑے بندی، گرانڈیل، لاپتہ، فوق البھڑک، بے فکرا، دیدارو، چال باز، میل خورا، نیک چلنی، دماغ چٹ شاپن، مختلف طرح کی صرف چند مثالیں ہیں۔ اردو لغات کا بہت بڑا حصہ ایسے ہی الفاظ و محاورات پر مشتمل ہے اور یہ اردو کا خاص سرمایہ ہے۔ اسی طرح انگریزی کو اردوانا بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ سینکڑوں یورپی لفظ ہیں کہ بالکل اردو ہو گئے ہیں۔ بکس، دراز، الماری، بم، کارتوس، بالٹی، چابی، فراش بین، گھاس لیٹ، کف، کالر، چمینٹ، رفل، لیس، لنکلاٹ، کنستر، گیٹس، بکلوس، بٹن، مسمریزم، افسر، اردلی! ۔۔۔ حتیٰ کہ بوریت اور جاہلزم جیسی جدید اختراعات بھی ہیں۔

تیسرے یہ کہ اس میں سابقوں لاحقوں کی تعداد غالباً ہر زبان سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اس نے کئی شائستہ زبانوں کے اسالیب کو اپنا لیا ہے۔ انگریزی میں گنے چنے سابقے اور لاحقے مستعمل ہیں جو اس نے یونانی اور لاطینی سے لئے ہیں۔ برخلاف اس کے اردو میں ان کی گنتی آسان نہیں۔ یہ موضوع ایک علیحدہ تالیف کا محتاج ہے مثلاً ایک نسبۃً غریب ترکی لاحقے "چی" سے بنے کتنے ہی الفاظ اردو میں رائج ہیں۔ یہ لاحقہ نسبت و فاعلیت بھی ہے اور لاحقہ تصغیر بھی، باورچی، توپچی، بندوقچی، مشعلچی، نقلچی، طبلچی، طنبورچی، نقارچی، خزانچی، ڈفالچی، ڈھونڈرچی، نشانچی اور سلفچی، ڈولچی، صحنچی، وغیرہ بلکہ اس کی تانیث "چن" بھی بنائی گئی، جیسے بورچن، سنورچن ۔ جب تک زبان کی اختراعی صلاحیتیں کام کرتی رہیں، یہ اپنی ضروریات کے مطابق الفاظ کے ڈھیر لگاتی رہی اور برابر جولانیاں دکھاتی رہی۔ پھر اس کے پر باندھ دیئے گئے۔ اگر اس کو اس بندھن سے رستگاری نصیب ہوئی تو یہ پھر اپنے تمام آزمودہ اسالیب سے کام لے گی، اور پاکستان کے نئے ماحول میں یہاں کی مقامی بولیوں سے بہت کچھ اکتساب کرے گی جہاں جہاں لوگ اسے برتیں گے۔ اس میں اپنی بولیوں کے اچھے اچھے کارآمد الفاظ بھی آپ سے آپ ملاتے جائیں گے۔ یہ عمل کچھ تو نادانستہ ہوگا اور کچھ دانستہ بھی کہ کوئی موزوں لفظ زبان پر چڑھا ہوگا تو کیوں نہ برتا جائے گا جب ہندوستان میں اپنی بھوئی اور وہ بھی۔

اس کی چوتھی خصوصیت اس کی ترکیب نحوی ہے جو ایک آغوش کشادہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور ہر بیرونی لفظ کو آسانی سے سما لیتی ہے:

"میں جنرلی سپیکنگ آپ سے ایگری کرتا ہوں مگر پلیز آپ
ایک دو پوائنٹس پر مائنر سے ڈفرینس آف اوپی نین
کو مائنڈ نہ کریں"

آپ انگریزی یا عربی میں اس طرح اردو ملا کر نہیں بول سکتے کہ اسم، فعل، حرف، متعلق فعل حکایۃً مجازیہ سب کلمے اور فقرے اور امثال بلا تکلف کھپتے چلے جائیں۔ چونکہ اردو علمی، فنی اور انتظامی شعبوں سے بے دخل رہی ہے اس لئے زبان پر انگریزی الفاظ ہی رواں ہو گئے ہیں۔ لوگ دو جملے بھی بغیر انگریزی کی آمیزش کے نہیں بول سکتے۔ اگرچہ اکثر موقعوں پر اردو کے بہتر مترادفات سامنے ہی دھرے ہوتے ہیں۔ اگر یہی ہمارا طرزِ سخن ٹھہرا تو انگریزی لفظوں کو اگلتے بنے گی نہ نگلتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ساری نہیں تو آدھی انگریزی لغت اردو میں در آئے جو اس کے خد و خال ہی بدل دے۔ یا اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو جائے اور یہ سچ مچ ایک عالمی زبان بن جائے۔ ایک نئی اسپرانٹو۔ سر عبدالقادر مرحوم اسے یہی کہتے تھے۔ "ہماری اسپرانٹو" (مضمون مطبوعہ مخزن)

زبان کی عہد بعہد تبدیلی اور ترقی ایک فطری و اندرونی عمل تو ہے ہی، یہ بیرونی اثرات کا تابع بھی ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اپنے الفاظ و اسالیب کی ساری لطافتوں اور رنگا رنگی کے باوجود ہماری زبان ہمارے عجزِ کلام اور تہذیبی بے مائیگی کی کھلی دستاویز بن کر رہ جائے، حالانکہ اس کے دامن میں بہت کچھ ہے جس پر دوسری زبانیں رشک کریں:

سمائی نہ اس پریم بانی کی پوچھو
بھرے تب یہاں چار سمتوں سے دریا

ہم سب سمتیں کھلی رکھنا چاہتے ہیں، مگر ایسا نہ ہو کہ ایک سمت کا ریلا اس کے خد و خال ہی پر پانی پھیر دے۔ ابھی تک انگریزی کے خال خال الفاظ ہی نے اردو کے متداول لغات میں بار پایا ہے جو اصطلاحاً دخیل الفاظ کی تعریف میں آتے ہیں۔ عملاً ان کا سلسلہ بہت دراز ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں۔ علامہ اقبال نے جو بات ۱۹۰۳ء میں کہی تھی وہ آج بھی درست ہے کہ اردو ابھی دورِ تشکیل میں ہے۔ ویسے تو ہر زبان ہر وقت دورِ تشکیل میں رہتی ہے مگر اردو بڑے غیر معمولی حالات سے دوچار ہے۔ اس سلسلے میں اس اندرونی تفریق کا بھی ذکر لازم آتا ہے جو یہ زبان اپنے ہی اندر مختلف عناصر کے درمیان روا رکھتی ہے۔ ہندی نژاد لفظوں کو عربی، فارسی سے ملنے نہیں دیتی۔ آپ ان کے درمیان کسرۂ اضافت یا واوِ عطف نہیں لا سکتے اگرچہ اب سے پہلے ایسے بہت سے مرکبات بن چکے تھے۔ آئندہ عام لوگوں کے لئے یہ شناخت کرنا مشکل ہوگا کہ کونسا لفظ دیسی ہے کونسا ولایتی



محسن زیدی

جہاں پہ قبضہ قریب و بعید اُس کا ہے
کوئی بھی ملک سہی زر خرید اُس کا ہے

جسے بھی سنئے اسی کا ہے نام وردِ زباں
جسے بھی دیکھئے مشتاقِ دید اُس کا ہے

ملی ہے عالمِ امکاں سے خاک مٹھی بھر
بس اتنا میرا ہے جو ہے مزید اُس کا ہے

میں کیا کروں جو مری بات وہ نہیں سنتا
کہ نطق میرا ہے گوشِ شنید اُس کا ہے

کہاں کے ہم ہیں مصور کہاں کے صورت گر
یہ سحرِ حسن یہ افسونِ دید اُس کا ہے

کھلے گی ہاتھوں پہ اُس کے مرے لہو کی حنا
کہ روزِ قتل مرا روزِ عید اُس کا ہے

مری کہانی تو اس موڑ پر تمام ہوئی
کہ اب جو قصہ ہے اس کے بعد اُس کا ہے

مرا کلام بھی محسنؔ اسی سے ہے معکوس
کہ سب کلامِ قدیم و جدید اُس کا ہے

● ۷۷۱، راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲.



کرشن ادیب

جس جگہ تھا حسنِ فطرت بے حجابانہ کھلا
خوشبوؤں کا وہ تھا جنگل اور ویرانہ کھلا

جب سے چکھا ہے مری جاں حسن کا آبِ نشاط
خود ہماری ذات میں رہتا ہے مے خانہ کھلا

شعر لکھتا جا رہا ہوں میں بیاضِ عشق پر
ہائے کن یادوں کا دل میں آج بتخانہ کھلا

جس کو تا حدِ جنوں چاہا تھا ہم نے ایکدن
اب تعلق اس سے اپنا ہے حریفانہ، کھلا

ہاں! یقیناً ختم ہم پر ہو گئی رسمِ جنوں
پھر نہ آیا بستیوں میں کوئی دیوانہ کھلا

پی ہی لوں سقراط بن کر زندگی کا زہر آب
سامنے رکھا ہے میرے ایک پیمانہ کھلا

دل کی دلّی کیسے اجڑی کیا کہیں تجھ سے ادیبؔ
منہدم دیوار و در میں، ایک افسانہ کھلا

● ۱۲/۱۴، پی-اے-یو کیمپس، لدھیانہ (پنجاب)



شاھد کبیر

زمانے بھر میں افسانے بہت ہیں
مگر ہم گھر میں انجانے بہت ہیں

پرندے بد گماں ہیں اس چمن سے
یہاں ہر شاخ پر دانے بہت ہیں

نظر آتی نہیں بچنے کی صورت
کریں کیا؟ آئینہ خانے بہت ہیں

سبھی آنکھوں میں کچھ باتیں ہیں لیکن
تری آنکھوں میں افسانے بہت ہیں

تجھے پہچاننا مشکل نہیں تھا
مگر ہم لوگ دیوانے بہت ہیں

جنھیں تجھکو سمجھنے کا تھا دعوٰی
وہی اب خود سے بیگانے بہت ہیں

تری دنیا تو اب دیکھی ہے شاہدؔ
سنا کرتے تھے ویرانے بہت ہیں

● محمد علی روڈ، مومن پورہ، ناگپور (مہاراشٹر)



جوگندر پال
۲۴ منداکنی انکلیو، کالکاجی نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۹

خواب رَو

قسط نمبر ۷

تالاب کے پانی میں اپنی پرچھائیں دیکھتے ہوئے وہ گویا عدم آباد جا پہنچے ہوں اور جہاں وہ کھڑے ہیں وہاں گویا کوئی نہ ہو، بس اتنا ہی ہونے کا خیال، کہ وہ نہیں ہیں، یعنی سرے سے ہیں ہی نہیں۔ انہیں اپنا یہ احساس نہایت راہ پیدا لگا ہے مگر ایک لمحے کے مکمل چین کی اس کیفیت میں جھٹ اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی ہے۔ میرے بعد اچھی بیگم کا کیا بنے گا؟ وہ تو رو رو کر ہلکان ہوتی رہے گی، جیتے جی مر جائے گی۔ وہ بہت بے چین ہو گئے ہیں۔ نہیں، اللہ پاک! میرے جیتے جی ہی اچھی بیگم کو سنبھال لے میرے بغیر ہر پل اسے کاٹنے کو دوڑے گا۔ میں؟ نہیں، اللہ پاک، تو میری مکرمت کر۔ وہ مر بھی جائے گی تو مجھے یقین نہیں آئے گا کہ وہ مر گئی ہے، مگر میری اچھی بیگم بڑی سمجھدار ہے۔ وہ اپنے آپ کو نہیں سمجھا سکے گی۔ جتنے دن بھی ہم میں سے کسی کا اگلا پا نمرود کا ہے۔ وہ سزا مجھے دے اللہ پاک! میری اچھی بیگم کو بخش دے۔ بخش دے۔ یہ فکر دراصل انہیں کئی ماہ سے کھائے جا رہی تھی۔ کہ اب روانگی میں دن ہی کتنے بچے ہیں۔ اپنے اللہ پاک کو مخاطب کر کے دیوانے مولوی صاحب کو چین سا محسوس ہونے لگا ہے۔

تالاب کی دوسری جانب دیوانے مولوی صاحب کو غیر مقامی سفید پرندوں کا ایک جھنڈ دکھائی دیا ہے۔ جو موسم سرما کے اوائل کے انہی دنوں نامعلوم کس دنیا سے یہاں چلے آتے ہیں۔ اور اس قدر یکساں معلوم ہوتے ہیں کہ جسے بھی دیکھو، یہی لگتا ہے اسی ایک کو دیکھے جا رہے ہیں۔ تالاب کے چاروں طرف چار بڑے قد آور گھنے درخت ہیں جو شاید صدیوں سے اسی مقام پر اپنی ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں۔ اور چہار درویشوں کے با تمہ عبادت میں اس قدر مگن ہیں کہ مقام کے داخل میں رچ بس کر مقام ہی ہو گئے ہیں، اس طرح مقامی نہیں لگتے کہ انہوں نے یہاں خارجی طور پر سکونت اختیار کر رکھی ہو۔ یہ درویش کہیں سے آئے ہیں، نہ انہیں کہیں جانا ہے اور لگتا ہے کہ یہی وجہ ہے پرندے ہر سال عشر عشر کرنا کیلئے یہاں پہنچے ہیں وہ بے تاکی ان کے سروں اور داڑھیوں کی صورت میں اپنے گھونسلے بنا لیتے ہیں، ان درویشوں کی طلسمی چھاؤں میں پاؤں پسار کر چپ چاپ بیٹھے دیوانے مولوی صاحب کو یہ محسوس کر کے بہت بھلا معلوم ہوا ہے کہ ان کے سر میں بھی گھونسلوں کا شہر آباد ہے۔ انہوں نے سر کی طرف ہاتھ لے جاتے ہوئے روک لیا ہے۔ اور گھونسلوں کے مکینوں کی چوں چیں پر کان دھر لئے ہیں۔ یہ متحیر کن کیفیت دیوانے مولوی صاحب کے لئے اتنی خوش کن ہے کہ وہ تادیر اس سے حظ اٹھاتے رہے ہیں مگر یکبارگی انہیں کوئی ریموٹ کنٹرول سے اپنی طرف کھینچنے لگا ہے۔ اور وہ بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور بڑی تیزی سے واپس چلتے ہوئے برآمدے کے سامنے گلابوں کے پہلو میں آ گئے ہیں، جہاں اچھی بیگم دو کرسیاں بچھائے ایک میں بیٹھی ان کا انتظار کر رہی ہے۔ "ننگے پاؤں آپ کہاں بھٹک رہے تھے۔؟" اچھی بیگم انہیں دیکھتے ہی گویا ہوئی ہے۔ مجھے یہی خوف لاحق رہتا ہے، کیا معلوم آپ کب کدھر نکل جائیں۔؟"

"بھٹکنے کا کیا سوال، اچھی بیگم؟" دیوانے مولوی صاحب نے جھولے سے جوتے نکال کر پہن لئے ہیں۔ "جہاں بھی جاؤں گا، اپنے جالے سے باہر تھوڑا ہی جا پہنچوں گا"

"یہ جھولا کیا جوتوں کے لئے لٹکائے رکھتے ہیں۔؟"

اچھی بیگم ہنسنے لگی ہے۔

"اچھی بیگم!" انہوں نے دوسری کرسی اچھی بیگم کی کرسی سے جوڑ لی ہے اور بیٹھ گئے ہیں۔ "میرے سر میں دیکھو۔ گھونسلوں کا ایک پورا شہر پاؤ گی۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں، دیوانے مولوی صاحب؟ "یقین نہیں آتا ---؟" انہوں نے اپنی ٹوپی اتار دی ہے۔ "دیکھو!"

"ارے ہاں، مجھے یاد آیا" اچھی بیگم نے کہا ہے۔ "کل رات میں نے آپ کی ٹوپی میں ایک جوں پکڑی تھی۔ "ادھر آئیے۔" اس نے دیوانے مولوی صاحب کو اپنے قریب کیا ہے۔ "میرے آگے بیٹھ جائیے، دیکھوں۔"

"ہاں اچھی بیگم کبھی تو جوں ہی رہتی ہے۔" وہ جھٹ اٹھ کر اس کے آگے

گی سر پر چڑھ گئی ہو۔ اور نیم سرما کی دھوپ میں سر اپنی پوتی شری کے مانند اچھی بیگم کی گود میں ڈال لیا ہے۔ اور سے دیر ہنسنے لگے ہیں۔

— ۴ —

سائیں بابا نے نواب محل کے بیرونی گیٹ پر کسی کو نہ پا کر ادھر ادھر دیکھا ہے۔ اور اندر داخل ہو گیا ہے، اور لان کے کنارے کنارے چلتے ہوئے محل کی عمارت کے سامنے آ رکا ہے۔ برآمدے میں اسے گھنٹی دکھائی دی ہے اور اس نے آگے بڑھ کر بے دھڑک گھنٹی کا بٹن دبا دیا ہے۔ مانو گھر کے لوگ اس وقت اسی کے منتظر ہوں۔

کافی دیر تک گھر کے اندر سے کوئی جواب نہ آنے پر اس نے دوبارہ بٹن دبایا ہے۔ اب کے شیشے کے دروازے کے پیچھے پردہ ہلنے لگا ہے۔ اچھی بیگم نے اندر سے پوچھا ہے۔ "کون ہے؟"

"میں ہاں"

اچھی بیگم نے پردہ ہٹا کر دیکھنا چاہا ہے۔

"میں ہاں، بی بی سائیں، سائیں بابا۔"

"سائیں بابا کون؟" اچھی بیگم نے گھبرا کر پردہ پھر گرا دیا ہے۔

"میں باورچی ہوں بی بی سائیں۔" تجربہ کار سائیں بابا بخوبی جانتا ہے کہ جس گھر سے باورچی بھاگ نکلا ہو، وہاں گھر کی عورتیں کتنی بے چینی سے نئے باورچی کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ "اسحاق بابو سائیں نے بھیجا ہے۔"

اچھی بیگم نے کھٹ سے دروازہ کھول دیا ہے۔ اور سر کی چادر سنبھالتے ہوئے باہر برآمدے میں آگئی ہے۔ "اسحاق نے کہا تھا وہ تمہیں اپنے ساتھ لے کر آئیگا۔"

سائیں بابا پر تنقیدی نظر ڈال کر وہ قریب ہی ایک آرام کرسی میں بیٹھ گئی ہے۔

"اب مجھے کیا پتہ بی بی سائیں، وہ کیوں نہیں آئے؟"

"یہ اتنا بڑا اللوہا تو میں کیوں لئے ہوئے ہو؟" اچھی بیگم نے متفکر ہو کر شاید کرسی سے لٹکتی سر کی چپ سے مگر بیٹھی رہی ہے۔ "کھانا و انا اسی لٹھ سے بناتے ہو یا تمہارا لٹھ سے؟"

"لاٹھی سے چلنا پھرنا ساؤں کا تو وتیرہ ہے بی بی سائیں۔" اتنے میں چاند بی بی بھی برآمدے میں آگئی ہے۔

"کون آیا ہے اچھی اماں؟"

"اسحاق نے نیا باورچی بھیجا ہے"

اچھی بیگم کی بہو بھی پہلے تو جگمگا اٹھی ہے۔ مگر سائیں بابا کا معائنہ کرکے ذہن کی پیٹ میں آگئی ہے۔ "یہ تو کوئی سائیں ہے۔"

"میرا نام سائیں بابا ہے، بی بی سائیں۔"

"تو پھر تم کھانا وانا کیسے بناؤ گے؟" چاند بی بی بھی اپنی ساس کے پہلو میں ایک کرسی میں بیٹھ گئی ہے۔

"مجھے کھانا بنانے کے سوا اور کچھ آتا ہی نہ ہے، بی بی سائیں۔" سائیں بابا نے بھی ان کے قدموں میں بیٹھ کر اپنی لاٹھی پہلو میں ڈال لی ہے۔ "مرغ مسلم کباب، قورمہ، مچھلی، ڈبل کا میٹھا، کھٹا، نمکین، آپ جو بھی چاہو بی بی سائیں۔ میں کھلاتے پلاتے ہی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ ساری عمر کھلاتا پلاتا رہا۔"

"ہم ویسا نہیں کھاتے جیسا تم لوگ کھاتے ہو۔"

"کھر ہے بی بی سائیں۔ کبھی نہ ہوتی تو جن بڑے بڑے کھان سائیں لوگوں کی خدمت کی ہے، وہ میرا کھانا کھانے کی بجائے مجھے کھا جاتے ہے۔" سائیں بابا انہیں یقین دلانے کے لئے تیار ہے۔ "بڑے نفاست لوگ تھے پر جو پرانے گوشت کے میں مکھیاں پڑ جاتا تو کسی دوسرے کا ہاتھ کا کھانا نہ کھاتے تھے۔"

"تم باتیں بہت بناتے ہو سائیں بابا!" اچھی بیگم کو ان کو سننے کی بجائے سنانے کا شوق تھا۔ "کھانا بھی بنالو گے تو جانیں گے۔" اس نے گویا جی میں سائیں بابا کو رکھ لینے کی ٹھان لی ہے۔ سائیں ہے تو کیا؟ اگر اپنے مطلب کا باورچی ہے تو ہم اسے اپنے مطلب کا آدمی بھی بنا لیں گے۔

"جو باورچی باتیں نہیں بنا سکتا، بڑی بی بی سائیں۔" سائیں بابا نے اپنے آپ کو سمجھایا تو یہی ہے کہ صرف "جی ہاں" کہہ کے چپ ہو جائے، تاہم اس کے علم و تجربہ کا نچوڑ موقع پاتے ہی اس کے دانتوں میں سے اچھل کر باہر آگیا ہے۔ "اس کا کھانا بڑا پھیکا ہوتا ہے! میں تو ہمیشہ باورچی کو پہلا سبق یہی دیتا ہوں، مزے کا کھانا آتا ہے، تو باتیں بنانا سیکھو، مگر آپ کو تو یہ سب کچھ معلوم ہی ہے۔ بڑی بی بی سائیں۔"

"ہاں، ہمیں سب معلوم ہے زیادہ باتیں نہیں چلیں گی۔"

"آپ کہتی ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں دل ہی دل میں اپنی ساری باتیں کر لیا کروں گا۔"

اس اثنا میں اچھی بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں چاند بی بی کی رائے بھی معلوم کر لی ہے۔

"بس اب اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینگے اچھی اماں۔"

"ہاں، کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے، مگر سائیں سے ہے، سوچو تو۔"

"نہیں، اچھی اماں، مجھے ہر وقت اپنے آپ کو چولہے میں جھونکا جانا۔ آپ اسی سے طے کر لیجئے گا۔"

"ہاں بھئی، کر لیں گے۔ اتنی عجلت سے کام کیوں لیتی ہو۔" اچھی بیگم پھر سائیں بابا کی طرف متوجہ ہو گئی ہے، جو اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا ہے۔

"غور سے سنو سائیں بابا! اتنے بڑے گھر کا معاملہ ہے۔ ہم یہاں صرف اپنے لوگوں ہی کو رکھتے ہیں۔"

"آپ مجھے رکھ لیں گی بڑی بی بی سائیں، تو آپ کا نمک کھا کر میں کوئی غیر تھوڑا ہی رہوں گا۔"

"بھگوڑے کے نمک میں بھی ایک برکت تو نہیں۔" چاندنی بی نے کہا ہے۔ "مگر یہ نہیں چھوٹی بی بی سائیں۔ ساری دنیا میں اللہ سائیں نے اتنا نمک کہیں اور آٹا نہیں کیا۔"

"میں دوسری بات کر رہی ہوں۔" چاندنی بی اسے سمجھانے لگی ہے۔ "وفا داری کی بات۔ اسی لئے ہم مہاجروں کے سوا کسی کو نوکر نہیں رکھتے۔"

"اوہو، چھوٹی بی بی سائیں، میں بھی مہاجر ہاں۔"

"تم بھی مہاجر ہو؟" ساس اور بہو دونوں کی باچھیں کھل گئی ہیں، مگر پھر جھٹ ان کے چہرے آپ ہی آپ اتر بھی گئے ہیں۔ "تمہاری بول چال سے تو لگتا ہے تم یہیں کے ہو۔"

"کراچی میں کوئی بھی کراچی کا نہیں، سائیں بیبیو!"

"تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا تم مہاجر ہو۔"

"آپ نے پوچھا کب تھا؟" سائیں بابا کے منہ میں اپنی ساری کہانی پنی زندگی اچھل آئی ہے۔ اب وہ اسے الٹنے سے کیوں کر روک سکتا ہے؟ "میں بارہ تیرہ سال کا تھا جب گاؤں سے سکھر بھی آیا۔ کیا کرتا؟ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہ تھا۔"

"مگر تم تو کہتے تھے سائیں، تم مہاجر ہو۔"

"ہاں، چھوٹی بی بی سائیں، مہاجر ہی تھیوں۔ آپ پہلے میری پوری بات تو سن لیو۔ سکھر سے ایک خان زادے کا منشی مجھے اس کی ریاست میں لے گیا اور اس کے باورچی خانے میں جوت دیا۔ اسی میں نے پورے دس برس کم کیو۔ پھر بغیر کسی کسور کے اس نے جو نیاں کھا کر حیدر آباد آن پہنچا۔ اور اوتھے آجا دی تک کئی برس اک ہندو ڈاکٹر کا باورچی بن کر رہا۔ ڈاکٹر تے بھارت بھج گیا۔ اور میں اپنے سندھ ہو دیس میں دو بار نوکریاں کھاتا پھرا اور آ کر کراچی آ گیا۔"

"اپنا ہی دیس چھوڑا کہاں ہے؟ لوگوں سے سننے لگے ہو؟" اچھی بیگم نے چڑ کر کہا ہے "نہ کوئی تاؤ، تم مہاجر نہیں ہو۔"

"کیسے کیسا وقت کریو بڑی بی بی سائیں۔ میں مہاجر ہی تھیوں۔ یہاں کراچی کے بیسیوں نوکروں میں سے میں نے بہارے سال اتنی بریانی بنائی ہے کہ سارے کراچی کو ایک ایک ٹکڑا کہ آپ باشی جل جائیے، بریانی کھتم نہ تھیندی۔"

"چاندنی پھر سمجھا گئی ہے سائیں بابا۔ تم مہاجر نہیں ہو۔" "نہیں چھوٹی بی بی سائیں، آپ کی سمجھ میں نہیں آیا جب میں کسی گھر میں چند مہینے ٹکی ذرہکاں ہتے بڑا خوش تھیواں، کہ اب میرا اجنا جا اِدھر سے کبھے گا۔ پر وہ ایک سال میں ہی میری اِدھر سے چھٹی ہو جاتی آہے۔"

"مگر وہ تمہیں نکالتے کیوں ہیں؟" اچھی بیگم کے کان ہو گئے۔

"کبر ملے۔ میرا پہلا مالک آپ ہی کی تراں تکلاڑ کا تھا۔ ڈیڑھ ماہ پہلے اس نے مجھے اس لئے نکال دیا کہ آج کل شہر میں تکلاڑ والوں اور سندھیوں میں پھساد بہت پھل آہے۔"

اچھی بیگم اور چاندنی بی نے ایک بار پھر آنکھوں آنکھوں ایک دوسرے پر اپنا خوف ظاہر کیا ہے۔ کہ یہی فکر تو ہمیں بھی ہے۔

"آپ ہی بتائیں جو آدمی سارا سارا دن چائے اور ناشتہ تیار کرنے میں لگا رہتا آہے۔ وہ دھندے کی طرف دھیان دیندا یا ابل ابل کر ہانڈی سے اچھلتا پانی پر میرا دھیان تو باورچی خانے میں ہی پڑا رہتا آہے۔ مجھے انہی دنوں بندوکوں کی آواز سنائی دیتی آہے۔ جب مجھے سڑکوں پر آتار دیا جاتا آہے۔"

"صحیح تو ہم نے بھی یہی رکھا ہے سائیں بابا، کہ گھر کی ذمہ داری ہے، کوئی دفتر دکان کی بات نہیں۔ ہمیں بھی اصل میں کسی مہاجر باورچی کی تلاش ہے۔"

"میرا گھر نہ باہر، آگا نہ پیچھا۔ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے گھر گھر پناہ لینے کے لئے دھکے دے رہا ہاں، مہاجر ہاں، اسی لئے نا۔"

سائیں بابا کو مایوسی سے اٹھنے کے پر میں پا کر چاندنی بی چونک پڑی ہے۔ اور اب کے اپنی ساس کو آنکھوں میں سمجھانے کی بجائے بول پڑی ہے "تو اب مرزا نے بھی کہا تھا اچھی اماں، اپنے مہاجروں کے دماغ ساتویں آسمان تک پہنچے ہوئے ہیں۔ وہ روٹیاں پکانے کھلانے کا کام کیوں کریں گے؟"

اچھی بیگم نے اپنی بہو کو اشارے سے چپ ہونے کی تلقین کی ہے۔ اور سائیں بابا کو مخاطب کر کے کہا ہے۔ "بیٹھے رہو سائیں بابا۔ تمہیں ہمارے اسحٰق میاں نے بھیجا ہے تو ظاہر ہے تمہارے بارے میں پوچھ تاچھ کر کے ہی بھیجا ہو گا۔"

خوشی سے سائیں بابا کے ہاتھ پاؤں اس قدر پھول گئے ہیں کہ اس سے اٹھا ہی نہیں جو پا رہا۔ "چھوٹو کو چھوڑو، ہم بہت ٹھیک آدمی آہیں۔ اور اسحٰق بابو سائیں تو اتنے نیک کسمت لوگ ہیں کہ کسے لئے پہلے آدمی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ انہوں نے مجھے اسی دن ملتے کو کہا تھا جب میرے پچھلے سائیں نے مجھے کام سے نکالا۔ مجھ ہی سے ان کا گھر کا پتہ گم تھیو تا، کل ہی ملا اور میں بھاگا بھاگا ان کے پاس جا پہنچا۔"

"ٹھیک ہے تم آج ہی کام شروع کر دو۔" اچھی بیگم نے اسے اپنا فیصلہ سنایا ہے "اور ہاں شام کو کام سے لوٹے گا تو تمہاری تنخواہ کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔"

[باقی صفحہ ... پر]



غضنفر

سراب

سمندر خشک
یا پانیوں پر کسی یزیدی جرنیل کا پہرہ
کچھ مزدور
کہ اسّی فیصد سے بھی زائد جانیں تشنہ
پیاسوں کے صبر کے پیالے کا لبریز ہو جانے کا خوف
جگہ جگہ، بڑے بڑے اونچے اونچے ریت کے ٹیلوں کا انتظام
کائنات کی اشرف ترین مخلوق

سرابوں کے تعاقب میں
سرگرداں
بے تکاں و بے اماں

رواں دواں
کبھی کبھی، کہیں کہیں، کسی کسی جسم میں تکان

سوچ بیدار
ذہن آمادۂ فکرِ تلاشِ آبِ نو
کہ کانوں میں صحیفانہ کلمات کا نزول
کنوؤں کی کھدائی کا کام جاری
پانیوں کی تہہ تک ہماری رسائی عنقریب
کوہِ بے ستوں پر ایک چشمے کی دریافت
جنگل اگانے کے کام کی رفتار تیز سے تیز تر
بارشوں پہ ہماری گرفت کا قوی امکان
بلکہ یقین
بیدار ذہن میں خواب آور کیفیت کا حلول
صحرا نما وجود میں کسی چشمے کے پھوٹنے کی آہٹ کا احساس
صبر کا پیالہ خالی
سرابوں کے تعاقب کا سلسلہ پھر جاری
بے تکان و بے اماں

● اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، سولن ۱۷۳۲۱۱ [ہماچل پردیش]



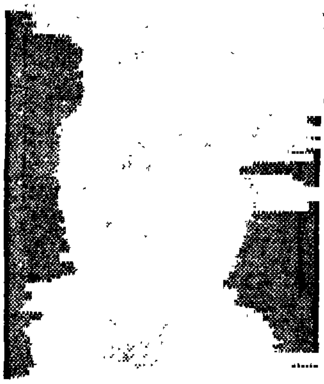
ابرار احمد

دیر لگا دی تم نے

اس سے ملنا تھا
بہت دیر لگا دی تم نے
اے مری عمر — !
بہت دیر لگا دی تم نے
میں نے سوچا تھا
کہ اس کارگہِ ہستی میں
چند سانس
اپنی فراغت کے گھنے سائے میں
کھینچ پاؤں
تو کسی سمت چلا جاؤں گا
اور کھیلوں گا میں ان الجھے ہوئے بالوں سے
میں نے سوچا تھا
کہ اس موڑ تلک جاؤں گا
جس سے رستے،
ابدیت کی طرف مڑتے ہیں
اور موجود کی ذلت سے پرے
دشتِ امکاں میں
درختوں سے لپٹ جاؤں گا
اپنے دل رات کے لفظوں کی کھلی بارش میں
بھیگ جاؤں گا
اسی نام کے سائے سائے
چلتا جاؤں گا بہت دور تلک

وقت،
روٹھا ہوا بچہ ہے منا لاؤں گا
تو نے اے عمر
سنبھلنے نہ دیا
اپنی غفلت کی تھکاوٹ سے
نکلنے نہ دیا
خواب کے بیچ
جو اک اسم کا دروازہ تھا
کھولتے کھولتے
ہر سانس گنوا دی میں نے
دیر لگا دی تم نے
اے مری عمر
بہت دیر لگا دی تم نے

● سول اسپتال، راجا بازار، راولپنڈی [پاکستان]



(ترجمہ) جاوید اقبال
لوک مت سماچار، لوک مت بھون جواہر لال نہرو مارگ، ناگپور۔ ۱۲

(ہندی) نوین جوشی
۲/۴۸، پترکار پورم، گومتی نگر، لکھنؤ (یوپی)

کورس

سردار کو اس بات کا بہت دکھ ہے کہ محلے کے بچے اب اسے چڑھاتے نہیں۔ ہندو۔ سکو تناؤ کا یہ انجام اسے سب سے زیادہ المناک لگتا ہے۔

اسکول سے لوٹتے ہوئے بچے اب اس کی دکان کے سامنے سے چپ چاپ گذر جاتے ہیں۔ ایک بار نظر اٹھا کر دکان کی جانب دیکھتے ہیں۔ پہلے سے جاری ان کی گفتگو رک جاتی ہے۔ اور قدم تیز ہو جاتے ہیں۔ سردار کے دل میں روز اس وقت ٹیس اٹھتی ہے۔ وہ کافی دیر تک، جب تک کوئی گاہک اسے متوجہ نہیں کرتا، سوخیال رہتا ہے۔

محلے میں داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ پر دکان ہے سردار کی۔ دوپہر بارہ۔ ایک بجے کے درمیان بچے اسکول سے لوٹتے۔ سردار کی دکان سے پہلے ہی ان کی تالیاں شروع ہو جاتیں اور وہ شرارت سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے گانے لگتے۔

سردار جی کی پگڑی میں بارہ انڈے تھے
ایک انڈا ٹوٹ گیا ہائے رام رے

تین چار بچے یہ کورس دہراتے اور تب سردار جھٹکے سے اٹھ کر دکان سے کودتا ہوا ان کے پیچھے دوڑتا۔ بچے سر پر پیر رکھ کر بھاگتے۔ سردار دو چار قدم دوڑ کر رک کر صرف جوتے پٹکتا۔ او ئے سردار جی دے پتر۔ بچے ہانپتے، کھلکھلاتے اپنے اپنے گھر میں گھس جاتے۔

یہ کورس اس محلے کی بہت پرانی چیز ہے۔ جب ہم بچے تھے اور یہ سردار بھی، جو آج دکان پر بیٹھتا ہے۔ اسکول کے آخری دنوں میں خود اس کورس سے چڑھنے لگا تھا۔ اس نے کورس میں حصہ لینا تو چھوڑ دیا تھا، اکثر وہ دوسرے ساتھیوں سے مار پیٹ کے لئے آمادہ ہو جاتا۔ سردار کا باپ دکان سے اٹھ کر آتا۔ سارے بچوں کو ایک ایک ٹافی بانٹتا اور اپنے سامنے کورس گواتا۔ اپنے ناراض بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر وہ خود بھی گانے لگتا۔ اور گاتے گاتے بچوں کو دوڑا دیتا۔

ادھر جب سے کورس بند ہوا ہے سردار کی اداسی دیکھ کر میں سوچتا ہوں کہ یہ اتنا احساس کیسے ہو گیا! بچپن ہی سے میں اس کا قریبی رہا ہوں اور اچھی طرح جانتا ہوں کہ کتنا روکھا اور سخت رہا کرتا تھا۔ کالج کے دنوں میں ہم نے اپنے محلے کی کرکٹ ٹیم بنائی تھی جس کا کپتان سردار تھا۔ سردار کی قیادت میں کھیل کم جیتا، دادا گیری زیادہ ہوتی۔ ہارتے میچ کو بے ایمانی اور مار پیٹ سے وہ نہ صرف جیت میں بدل دیتا بلکہ دوسری ٹیم کا بلا وغیرہ بھی چھین لاتا۔ اگر ہم کبھی اس کی مخالفت کرتے تو وہ ہمارا مذاق اڑاتا۔ کہتا او ئے: "اے زمانہ ایمانداری دا نئیں : طاقت دا، زور زبردستی دا ہے گا۔" وہ بیچارے پڑے ہوئے بھکاری کو دھکا دیتا۔ میلے میں آئے خوانچے والوں سے من مانی قیمت پر چیزیں خریدتا ہم نام کا وہ لفظ نہیں جانتا تھا۔

بی۔ اے کے بعد سردار نے پڑھائی چھوڑ دی۔ اور دکان میں باپ کا ہاتھ بٹانے لگا۔ شام کو وہ فارغ ہوتا۔ اس نے ہم سب کو لے کر کناٹ پلیس جانا شروع کیا۔ یاد ہے، ہم بے وجہ چلتے، کافی پیتے اور لڑکیوں کو گھورتے۔

ایک دن سردار نے اعلان کیا کہ کوئی لڑکی سچ مچ ہی جانے ہم لڑکیوں کے پیچھے پیچھے گھومنے اور ان پر فقرے کسنے لگے۔ ایک شام سردار نے کناٹ پلیس کی بھیڑ میں ایک لڑکی کے بالکل پیچھے سے کوئی بہت چلتا ہوا جملہ کسا تو لڑکی تنک کر پلٹ گئی۔ لڑکی کا چہرہ دیکھ کر ہم ہی نہیں سردار بھی فق رہ گیا۔ وہ ہمارے محلے کی مہرو تھی۔ اور سردار کے گھر کے ٹھیک سامنے پارک کے پار رہتی تھی۔ مہرو فوراً آگے بڑھ گئی اور ہم پیلے چہرے لئے ایک کونے میں دبک گئے۔ اپنے محلے کی لڑکی کو بھی بھلا کوئی چھیڑتا ہے بھلا

سردار کی حالت ہم نے پہلی بار پتلی دیکھی۔ وہ پسینے سے تر تھا اور بار بار زبان باہر نکال کر دانتوں سے کاٹ رہا تھا جیسے طوفان پیدا ہونے کے خدشے سے کافی دیر گئے ہم لوٹے۔ ——— اس رات

ہم میں سے شاید ہی کوئی ٹھیک سے سویا ہو۔ مگر دو دن تک کچھ نہیں ہوا۔ تو ہم سمجھ گئے کہ مدھو نے ہماری شکایت نہیں کی۔

کچھ دن بعد ایک شام سردار نے ہم لوگوں کو بتایا۔ "ارے کاکو، سویرے مدھو دکان آئی تھی۔" "اچھا کچھ کہا اس نے؟"

"نا مسکرا دی سی۔ چاندے چاندے پچھ گئی۔ تساں روز کناٹ پلیس دا چکر لگاندے ہو؟" اس پوری شام ہم مدھو کی بات کا اشارہ سمجھنے کی کوشش کرتے رہے۔ آہستہ آہستہ مدھو کی دکان میں آمد بڑھنے لگی۔ انڈرا۔ بمیڈ سے لے کر ساڑی کے فال خریدتے خریدتے اس نے سردار کا دل اپنے قبضے میں کر لیا۔ اب سردار مدھو کی باتیں صرف مجھے بتاتا۔ اکثر شام کو ہم دوسرے دوستوں سے الگ ہو کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتے۔ بیئر گلے سے اترتی جاتی اور سردار اپنے پیار میں کھوتا جاتا۔ بعد میں ان دونوں کو باہر ملانے سینما گھر یا ریستراں میں بٹھا کر چوکیداری کرنے تک کا کام سردار نے مجھ سے کروایا۔ پیار کے معاملے میں وہ کچھ ڈرپوک ہی نکلا۔

ان کی شادی نہیں ہوئی، یہی تعجب کی بات ہے۔ سردار بھی نہیں جانتا کہ ایسا کیسے ہو گیا۔ سردار کی ماں نے میری ماں کی معرفت بات بھی چلائی تھی۔ اور مدھو کے گھر والوں نے انکار بھی نہیں کیا تھا۔ دونوں کھلے عام بھی ملنے لگے تھے۔

اچانک ایک دن محلے میں مدھو کی شادی کے کارڈ تقسیم ہو گئے۔ تیسرے دن شامیانے لگے۔ شام کو بہت چھوٹی سی برات آئی اور دوسری صبح مدھو رخصت ہو گئی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سردار سکتے میں تھا۔ وہ میرے پاس آیا میں نے سوچا وہ روئے گا لیکن نہیں رویا صرف ایک بات بولا۔ "میں نو دس دیتا، تو دی ہو یا!"

مدھو کی شادی کی رات میں نے اور سردار نے پہلی بار بیئر میں جن ملا کر پی۔ نشے میں میں اور اداس ہوا۔ لیکن سردار بالکل نارمل ہو گیا۔ رومال سے منہ پونچھتے ہوئے اس نے نجات کے احساس کے ساتھ کہا۔ "چل یار، محلے دی کڑی چھڈن دی سزا مل گئی۔"

سردار نے پھر کبھی مدھو کا ذکر نہیں کیا۔ نہ کبھی اس کے چہرے پر غم کا سایہ نظر آیا۔ مگر میں کئی دنوں تک ٹوٹا دل لئے بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں تب سردار کا دل کیسا تھا۔

ایسا نہیں کہ بچوں کا یہ کورس پہلی بار بند ہوا ہے۔ لیکن پہلی بار سردار بہت دکھی اور متفکر۔ وہ اس بات سے بھی ہے کہ محلے کے کئی ہنس مکھ لوگ آجکل اس کے سامنے سرداروں کے قصے نہیں سناتے۔ لوگ دکان پہ آتے ہیں دعا سلام بھی ہوتی ہے۔ حال چال پوچھا جاتا ہے۔ مگر پہلی جیسی غیر متصادم اپنائیت نہیں ہے۔ ایک ہوشیاری ہے۔ لیکن سردار اس کی بہت فکر نہیں کرتا۔

لیکن بچوں کے اندر یہ ہوشیاری کہاں سے آ گئی؟ سردار کو یہی بات بہت درد دیتی ہے۔ بچوں کے معصوم ذہنوں میں سردار کو نہ چڑھانے کی یہ ہوا کیوں کر آئی؟ کیا وہ اب اس کو چڑھانے میں ڈرتے ہیں؟

پہلی بار بچوں کا یہ کورس ۱۹۸۴ء کے فسادات میں بند ہوا تھا۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد پھیلے تشدد میں بھیڑ نے سردار کے باپ اور زندہ جلا دیا تھا۔ ماں یہ حادثہ نہیں دیکھ سکی اور وہیں ڈھیر ہو گئی۔ ہم نے کسی نہ کسی طرح بچایا۔

غضب کا کلیجہ کر لیا تھا سردار نے ماں، باپ اور بھائی کی تین لا سامنے پڑی دیکھ کر بھی اس نے ایک بوند آنسو نہیں گرایا۔ محلے کی عو رہیں سردار خاموش، ساکت کھڑا رہا۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے کہا "اسے کسی طرح رلا دے" ہلکا ہو جائے گا۔"

میں نے سردار کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا: "سردار! رو لے۔"

سردار اسی طرح کھڑا رہا۔ لاشیں اٹھیں تو سردار بھی اور کاٹھ کی طرح چل پڑا اور آخر تک نہیں رویا۔ کئی دنوں تک اس کے منہ سے آواز نہیں۔ وہ زیادہ تر گھر ہی میں پڑا رہتا۔ کبھی کبھی لان میں دکھائی دیتا۔ میں اس کے کھانا لے جاتا لاکھ کوشش کے بعد بھی وہ منہ نہ کھولتا۔

ماں کہتی۔ "وہاں نہ جایا کر۔ اس کی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں کیا کر بیٹھے؟"

تب مجھے خیال آیا کہ ہمدردی کے باوجود سردار کی خاموشی سے سا ڈرنے لگا ہے۔ میں نے سردار سے کہا تو کئی دن کے بعد اس کی پتلیوں بدلا اور ہونٹوں میں لرزش ہوئی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پتہ نہیں مسکرا گیا۔ سردار کی وہ مسکراہٹ میرے اندر تک ریت کر گئی۔ میں اس سے لگ کر پھوٹ پڑا۔ سردار ہلکا ہو گیا۔ اس نے مجھے چپ کرایا۔

کوئی پندرہ دن بعد سردار نے دکان کھولی۔ اسکول سے لوٹتے ہوئے دکان کے سامنے چپ چاپ رک گئے۔ بچے دکان کی جانب دیکھ رہے اور سردار کی آنکھیں ان پر ٹکی تھیں۔

سردار اٹھا اور باہر برآمدے میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں کے بہت کم فاصلہ تھا۔

کسی ویل ریہرسڈ سین کی طرح سردار نے منہ کھولا۔ "میرے سردار جی کی پگڑی میں بارہ اٹھنے تھے۔"

"ایک انڈا پھوٹ گیا ہائے رام رے۔" دوسری لائن بچوں نے طرح پوری کر دی۔ پھر اچانک ان میں چابی بھرے کھلونوں کی طرح حرکت اچھل اچھل کر گانے لگے۔ "ایک انڈا اٹھ گیا ہائے رے رام رے۔"

"اوے سردار جی دے پتر۔" چیختا ہوا سردار بچوں کے پیچھے دوڑا۔ بچے گھنے، کھلکھلاتے بھاگے اور ہمیشہ کی طرح گھروں میں گھس گئے۔ دکان میں لوٹ کر سردار رو دیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ چھتیس سال کی عمر میں بچپن کو چھوڑ کر اس دن وہ پہلی بار اس طرح رو دیا۔ آنسوؤں سے اس کی داڑھی بھیگ گئی۔ پھر ٹپکنے لگی۔ ٹپکتی رہی.....

رو چکنے کے بعد سردار کھل گیا۔ آنکھوں کا سونا پن، چہرے کی اداسی، دل کا درد سب بہہ گئے۔ جتنے تھے سب! پھر وہ مجھے دیکھ کر ہنسا! بولا۔ "کاکا! بچوں تو بڑا اکوئی انسان نہیں ہوندا" سردار جب بہت پیار میں آتا ہے تو کاکا کہتا ہے یہ نام اس کی ماں نے مجھے دیا تھا۔

میں کافی دیر سے خاموش تھا۔ خاموش ہی رہا۔ سردار کو دیکھتا رہا۔ اور آدمی نام کی مخلوق کے بارے میں سوچتا رہا۔ نظیر اکبر آبادی کا آدمی نامہ یاد آگیا۔

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی
اور آدمی پہ تیغ کو مارے ہے آدمی

لیکن اس بار کورس کا بند ہونا سردار کو اندر تک کر ید گیا ہے۔ مکتسر (پنجاب) کے پاس دہشت گردوں نے ایک بس میں پندرہ غیر سکھ مسافروں کو گولیوں سے بھون دیا۔ دہلی کے کچھ علاقے سکھوں کے خلاف اشتعال سے سلگ اٹھے۔ تلک نگر سے شروع ہوئے فساد کی خبر پا کر میں سیدھا سردار کی دکان گیا سردار اخبار سامنے رکھے افسوس میں ڈوبا تھا۔

"کاکو، اے مارکاٹ کدوں تک چلے گی۔" سردار دکان بند کر دے"

"کیوں؟"

"بس بند کر دے اور گھر چل۔"

"ہویا کی؟"

سردار سمجھ گیا اس نے اخبار کی جانب اشارہ کیا۔ "ایسے جواب بیچ؟" میں نے گردن ہلا دی۔ "چل گھر۔" سردار تن گیا۔ سارے پاگل نئیں... پاگل ہو گئے نئیں سارے۔" غصے سے اس کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ اس نے دوکان کے ایک کونے میں رکھی پرانی ہاکی نکالی۔ پھر وہ موٹی زنجیر نکالی جس سے رات میں دوکان کے پلے باندھے جاتے ہیں۔

"سب نوں مار دانگا۔" وہ چیخا۔ آپے سے باہر تھا وہ۔ صاف صاف دل بھی نہیں پا رہا تھا۔ "مار دکون مارے گا میں نو!"

"سردار" میں نے پوری طاقت سے اسے جھنجھوڑا "تو کیا کر رہا ہے تو؟ کہتا ہے سب پاگل ہیں۔ اور خود پاگل ہو رہا ہے!"

سردار سر دبوچ گیا۔ اس نے ہاکی اور زنجیر زمین پر پٹک دی۔ "کاکو

"اسے کی ہو ریا ہے؟ میں کی کراں؟ کی کر سکدا ں؟ ساڈے بس دا کجھ نی رہے گیا کی؟ کجھ کر کاکو، کجھ کر۔"

"نی اسحال اتنا کر کہ گھر چل۔" میں اسے گھر لے آیا۔ وہ بہت دکھی تھا ماں کو بہت نا امید نظروں سے دیکھ کر اس نے کہا "ممی جی، سارے پاگل ہو گئے نئیں۔"

ماں فکر کا اظہار کر کے اندر چلی گئی۔ سردار کی بے چینی شام تک نہیں گئی وہ کچھ کرنا چاہ رہا تھا جس سے یہ مارکاٹ بند ہو۔ مگر کیا کرے، یہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھتا میں کیا جواب دیتا۔؟ کوئی کیا جواب دے سکتا ہے؟ سارا ملک بے چین ہے؟

غنیمت کہ اس بار فساد زیادہ نہیں پھیلا۔ اور جلد ہی امن قائم ہو گیا۔ پتہ نہیں کیسے محلے میں یہ خبر پھیل گئی کہ کاکو نہیں ہوتا تو سردار سب کو مارنے کیلئے تیار تھا۔ ہو سکتا ہے، اس دن سردار کی بات کسی کے کان میں پڑی ہو۔ مگر وہ سچ نہیں تھا۔ سچ اس کے الفاظ میں نہیں، اس کی تکلیف اور اشتعال میں تھا۔ لیکن محلے والے سردار سے کھنچ گئے۔ خود میری ماں کہتی ہے۔ "کوئی بھروسہ نہیں کاکو! سنا نہیں اس بار سکھ بھی ہتھیار لے کر نکل آئے تھے۔"

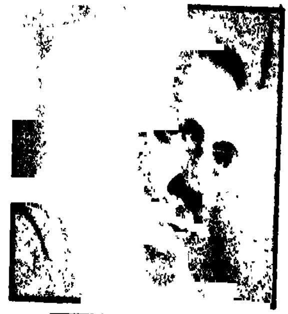
ماں میری کوئی دلیل سننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اور ادھر ادھر سے سنے کئی سوال اٹھانے لگتی ہے۔ اس کے یہ سوال اور باتیں مجھے فکر مند کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ میں جانتا ہوں کہ ان کی کوئی بنیاد نہیں۔ میں سردار سے کچھ نہیں کہتا۔ جانتا ہوں۔ سن کر اس کا دل ڈوب ہی جائے گا۔ مگر ماحول سے وہ سب کچھ سمجھتا ہے بہت حساس ہو گیا ہے وہ۔

اس واقعے کے بعد اسکول سے لوٹتے بچے اس کی دکان کے سامنے قدم تیز کر لیتے ہیں۔ وہ چاہتا ہے بچے اسے پھر چڑھائیں۔ پہلے کی طرح گائیں۔ وہ انہیں دوڑائے اور کھلکھلاتے ہوئے بھاگیں۔ سردار جانتا ہے کہ بچے گھر والوں کے ڈرائے ہوئے ہیں۔ انہیں کے کہنے پر ان لوگوں نے کورس بند کیا ہے۔ وہ دکھی ہے لیکن جانتا ہے کہ بچوں سے اچھا کوئی انسان نہیں ہوتا۔ بھلا وہ اس سے کیوں ڈریں گے

سردار روز صبح شام میرے گھر آتا ہے۔ اور میرے دو سال کے بچے کے ساتھ پانچ دس منٹ کھیلتا ہے۔ ماں کو یہ سب پسند نہیں، مگر وہ کچھ کہتی بھی نہیں۔ مجھ سے مذعور و الاقصہ جانے کے بعد میری بیوی سردار سے بہت محبت سے پیش آتی ہے۔ اور اب تو بیٹے کو بھی سردار کا انتظار رہنے لگا ہے صبح شام پھاٹک کھلنے کی چوں چاں سن کر وہ تالی بجا کر تتلاتا ہے۔ "چھلواں انکل آ۔"

دو سال کے بچے کو دو سطریں سکھانے میں سردار کو بڑی محنت کرنی پڑی۔ مگر اب وہ سیکھ گیا ہے۔ سردار کی گودیں چڑھ کر داڑھی اور پگڑی سے کھیلتے ہوئے

[بقیہ صفحہ ۴۵ پر پڑھیے]



عبدالرحیم نشتر

دیدہ و دل کو فرشِ راہ کروں
یعنی پھر سے وہی گناہ کروں

زخم ہی زخم ہو رہوں لیکن
فصلِ گل سے گلہ، نہ آہ کروں

ہاں چکا جاؤں قرض مٹی کا
قبر بن جائے تو نباہ کروں

خون جب ہو گیا سفید اس کا
کتنے کاغذ لکھوں سیاہ کروں

کان کھولوں تو اس کا ذکر سنوں
لب ہلاؤں تو صرف واہ کروں

دیدۂ اشکبار و قلبِ حزیں
پتھروں پہ کیسے گواہ کروں۔!

خواب دیکھوں، امید باندھ رکھوں
روز و شب زندگی تباہ کروں

● ساوتری ودیا مندر، امبیٹھ-۲۱۰۰۱ ، ارائے نگر



چندربھان خیال

میں جہاں جاؤں مرے ساتھ چلے سناٹا
میری آنکھوں میں لگاتار جلے سناٹا

صبح آتی ہے، دبے پاؤں چلی جاتی ہے
گھیر لیتا ہے مجھے شام ڈھلے سناٹا

بھاگتی بھیڑ کے قدموں سے لپٹ کر رو لے
ورنہ ہر سُست مسافر کو چھلے سناٹا

تم خیالات کے خیموں میں سمٹ مت جانا
جب سرِ راہ کبھی ہاتھ ملے سناٹا

اب مکانوں کی چھتوں کا بھی نظارہ کر لو
گنگناتا ہے ستاروں کے تلے سناٹا

پھر مرے شہر میں لوٹ آئی ہے دہشت گردی
پھر ہر اک جسم کے سائے میں پلے سناٹا

آجکل اس کے ٹھکانوں میں بڑی ہلچل ہے
کاش! میرے بھی شبستاں سے ٹلے سناٹا

● روزنامہ "قومی آواز"، ہیرالڈ ہاؤس، نئی دہلی ۔۲



رشید امکان

زخموں کے اندر سو جاؤں
کاش تصوّر بھر سو جاؤں

میں اور، تیری نیند کا د
کہ ہو دردِ سر سو ج

میں پھولوں پر سونے والا
خاک پہ کیا پتھر سو جاؤں

میں اک بوند اور میری
تپتے صحرا پر سو

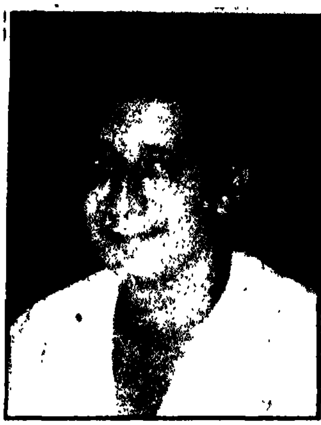
نیند جو میرے بس میں ہو تو
چیخوں کے اندر سو جاؤں

اُس کی چھاؤں سے ہو
اِن انگاروں پر سو ج

آئینے میں خود کو دیکھوں
اور خود سے ڈر کر سو جاؤں

● بے توپ خانہ روڈ، اوجین ۔۱

قسط نمبر ۱۳



ندا فاضلی

۱۰۳ - امرا پارٹمینٹ، ڈانڈپاڑہ - ۱، کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲

دیواروں کے بیچ

ندا پہلی بار اپنے گھر سے الگ ہو کر، کمیونسٹ پارٹی کے دفتر کے نیچے، ایک اکیلے کمرے میں رہ رہا ہے۔ اس اکیلے پن نے ایک شہر میں ایک ساتھ کئی شہر پیدا کر دئے ہیں۔ ہنستا گاتا شہر، رات کے گیارہ بجے تک ہوٹلوں کے علاقے میں فلمی گانوں اور سستی غزلوں پر پیسہ لٹاتا شہر، فرقہ وارانہ تقریروں کا شہر، [illegible] کی دہلیز پر ہاتھ پھیلائے فقیروں کا شہر اور نہ جانے کتنے شہر ایک ہی شہر میں بسے ہوئے اتنے سارے شہروں میں ایک اس کا بھی شہر ہے۔ اس شہر میں رات دیر سے ہوتی ہے اور دن دھوپ چڑھے جاگتا ہے ..... مذہب، سیاست، جنگ اور ادب سے الجھتے ہوئے دن۔ اور اکیلے کمرہ میں تھوڑی دیر بعد اٹھ کر، لیمپ کی مدھم روشنی، بند دروازہ۔ اور کھڑکی کی کنڈی اور چٹخنی کو ٹٹولتی ہوئی رات، دن میں پڑھے ہوئے اخبارات میں فسادات کی سرخیاں۔ رات کے سناٹوں میں چلتے پھرتے کردار بن جاتے ہیں۔ ان میں کسی کے ہاتھ میں چاقو کسی کے ہاتھ میں بندوق ہوتی ہے۔ کمرے کے قریب پیلا دو ٹاکیز کے سیکنڈ شو کے ختم ہوتے ہی یہ کسی خفیہ فوج کی طرح چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ بار بار دروازہ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کھڑکی کی درازوں سے جھانکتے ہیں۔ باہر سے نقب لگا کر اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذرا سی آہٹ پر اس کی نیند اُچٹ جاتی ہے۔ وہ گھبرا کر لیمپ کی روشنی تیز کر کے بند کمرہ میں ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ اور تسلی کر کے پھر سے بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔ اس کے اٹھتے ہی قاتلوں کے ہاتھ جہاں ہوتے ہیں وہیں تھم جاتے ہیں۔ اور جیسے ہی آنکھوں میں نیند بھرتی ہے یہ پھر سے اپنے کام میں لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح آدھا جاگتے آدھا سوتے، اندھیرا اجالے میں بدلتا رہتا ہے۔ اور اجالا اندھیرے میں ڈھلتا رہتا ہے۔ تاریخیں بدلتی ہیں لیکن دن رات نہیں بدلتے۔ دن کے اجالوں کی دہریت، رات ہوتے ہی مسلمان بن کر، قرآنی آیات کے ورد سے خود کو بلاؤں سے محفوظ کرتی رہتی ہے۔

وہ ایک رات دوستوں کے ساتھ کافی شراب پی کر لوٹتا ہے۔ دیسی شراب سر سے دماغ اور جسم سے ہاتھ پاؤں چھین لیتی ہے۔ وہ کب کمرہ میں آتا ہے کون اسے وہاں تک لاتا ہے اسے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ اچانک سوتے میں اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ تو وہ دیکھتا ہے کہ دروازہ اور کھڑکی کھلے ہوئے ہیں۔ وہ اٹھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اٹھ نہیں پاتا۔ چھت دیواروں کو چھوڑ کر نیچے اتر رہی ہوتی ہے۔ اور زمین پلنگ کے ساتھ گھوم رہی ہوتی ہے۔ لیمپ سے ہاتھ کا فاصلہ میلوں دور ہو جاتا ہے وہ بے بسی سے دیکھتا ہے۔ اسے ایسی حالت میں دیکھ، ماتھے پر تلک لگائے ہاتھوں میں ترشول لئے بہت سارے لوگ ایک ساتھ اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ وہ اپنی حفاظت کے لئے کلمہ پڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن مقدس الفاظ، ہونٹوں تک آکر شراب کی بو پاکے رخصت ہو جاتے ہیں۔ وہ تنہا زد و کوب ہوتا ہے۔ سارے کمرے میں خون ہی خون پھیل جاتا ہے۔ کھلی آنکھیں اور زخم خوردہ جسم۔ اس کی لاش دھوپ چڑھے تک یونہی فرش پر پڑی رہتی ہے۔ ساہتیہ سنگم (کتابوں کی دوکان) اس کے بنا حسب معمول بحث و مباحثہ میں الجھی رہتی ہے۔ بجلی کے تاروں میں الجھی ہوئی پتنگیں اس کے دیکھے بنا روز کی طرح ہواؤں سے سرگوشیاں کرتی رہتی ہیں بچے اسی طرح اسکول جاتے ہیں۔ سڑکوں سے گزرتی ہوئی دھلی دھلائی لڑکیوں کے جسموں کے اتار چڑھاؤ کو دوسری آنکھیں دیکھتی ہیں۔ شہر ہمیشہ کی طرح اپنے کاروبار میں مصروف رہتا ہے۔ تین چار روز بعد مرے گوشت کی بدبو پولیس والوں کو متوجہ کرتی ہے۔ اور پتہ تلاش کیا جاتا ہے۔ گھر والے پاکستان میں ہیں۔ ان سے رابطہ مشکل ہے۔ یوں بھی تو وہ کچھ ہی دن پہلے گئے ہیں۔ ابھی تو نئی زمین میں جمنے جمانے کی تگ و دو سے گزر رہے ہوں گے۔ اتنی جلدی ان کا پھر سے (واپس) آنا کیسے ممکن ہے اور آنے جانے میں تین چار دن تو لگیں گے ہی۔ تب تک...... یار دوست۔ مجبوراً چندہ کر کے مٹی کو ملا دیتے ہیں۔ کفن دفن سے جو چندہ کے پیسے بچتے ہیں اس سے شراب خرید کر جشن اڑاتے ہیں۔ اور دن بھر کی ساری پریشانی کو بھلا دیتے ہیں۔

یار دوست، اسکول جاتے بچے، سڑکوں سے گزرتی لڑکیاں، تاروں میں الجھی ہوئی پتنگوں کی بے رخی پر اسے غصہ آتا ہے یہ غصہ [illegible] خبر سے والد

بستر پر لے آتا ہے۔ وہ آنکھیں کھول کر اپنے ہاتھ پیروں کو چھو کر دیکھتا ہے۔ کمرہ کے باہر دھوپ اپنے پنکھ پھیلائے سستا رہی ہے۔ ہوا کھڑکی کے سامنے کھلی چھت پر سیٹی بجاتی گذر رہی ہے۔ وہ بستر سے اٹھ کر، بھاری سر لئے، سامنے ہوٹل پر چائے پینے چلا جاتا ہے۔ اور دن کی پہلی چائے کو پہلی سگریٹ کے کش سے دو آتشہ بنا کر اپنے زندہ ہونے کا خود کو یقین دلاتا ہے۔ زندہ ہونے کے ساتھ ہی پھر سے شہر زندہ ہوتا ہے۔ اور شہر کے ساتھ سارے مسائل ایک ایک کر کے سامنے آنا شروع کر دیتے ہیں۔ آج کالج میں فیس بھرنے کا آخری دن ہے۔ اگر آج بھی فیس کا انتظام نہیں ہوا تو پورا سال ضائع ہو جائے گا وہ کئی دن سے اس کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ لیکن کہیں سے کوئی امید نہیں پیدا ہوئی۔ ندا تیار ہو کر اپنے بچپن کے دوست بیر کمار کے پاس جاتا ہے۔ اس نے رات کو نشے کے دوران صبح فیس کا انتظام کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ بیر کمار آج کل اپنے بھائی کے گھر سے الگ شیلا نامی ایک طوائف کے ساتھ رہتا ہے۔ شراب اور جوئے کے ساتھ اب اسے افیم بھری سگریٹ پینے کی بھی لت پڑ گئی ہے۔ یہ نیا شوق اسے شیلا کی صحبت سے ملا ہے۔ اس نشے کے دوران اس نے جسم کی ساری شکتی ناف کے نچلے حصہ میں اترا آتی ہے۔ اس غیر فطری عمل نے اس کی راتوں کو اتنا جاگنے کا عادی بنا دیا ہے کہ آدھے دن سے زیادہ اعصابی تھکن اتارنے میں گذارنا پڑتا ہے۔ شروع میں جو نشہ برائے تفریح کیا جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ اس کی عادت بن جاتا ہے۔ موروثی جائداد میں سے جو تھوڑا بہت اس کے ہاتھ لگا تھا وہ اسی قسم کی عیاشیوں کی نذر ہو چکا تھا۔ آج کل وہ گھر میں جوئے کا اڈہ چلا رہا ہے۔ خود بھی کھیلتا ہے اور جیتنے والوں سے لیا مال بھی ایک ڈبے میں جمع کرتا رہتا ہے

ابتدا میں اس کا بڑا بھائی اسے گھیر گھار کے گھر لے جاتا تھا۔ بھابی کی روک تھام اور بڑے بھائی کا مزاج اس میں اعتدال پیدا کر دیتا تھا۔ وہ کام پر جانے لگا تھا ڈھنگ کے کپڑے پہننے لگا تھا۔ اور شام کو شراب پینے کے بجائے ندا کے ساتھ کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ندا کا گیت گاتا سنتا تھا۔ کچھ دن ایسے گذرتے، پھر کسی دن بھابی کی نصیحت یا بھائی کی کسی ڈانٹ سے بگڑ کر واپس اپنی پرانی روش پر آ جاتا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد بیر کمار گھر میں سب سے چھوٹا تھا...... لیکن جب اس کے بھائی کے یہاں اس سے بھی چھوٹے بچے آنے لگے ہیں تو اس کی طرف فطرتاً توجہ کم ہو جاتی ہے۔ بھابی اپنی پھیلتی ہوئی گرہستی میں بٹ جاتی ہے۔ اور بھائی اپنی بڑھتی ہوئی ذمہ داریوں میں کھو جاتا ہے۔ اب وہ بالکل آزاد ہے۔ اس آزادی کی پاداش میں وہ کئی بار جیل کی ہوا کھا چکا ہے۔ ندا جب اس کے گھر پر پہنچتا ہے تو گھر پر تالا لگا ہوا ملتا ہے۔ رات کو پولس والے اسے پھر سے گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔ ندا مایوس ہو کر جیسے ہی لوٹتا ہے شیلا سامنے سے آتی ہوئی مل جاتی ہے۔ عدالت میں بیر کمار کی ضمانت کی رقم بھرنے کے لئے وہ پڑوس کے بنیئے کے یہاں زیور پانچ ٹکا سود پر رکھ کر آئی ہے۔ ندا کو دیکھتے ہی وہ اپنے بلاؤز میں سے پسینہ سے بھیگا ہوا ایک لفافہ نکال کر دیتی ہے۔ رات کو سوتے میں تھانے کے حرام کھاؤ اسے اٹھا کر لے گئے۔ جاتے ہوئے یہ چٹھی تمہیں دینے کو کہہ گیا تھا لفافہ میں فیس کی رقم کے ساتھ ایک مختصر سی تحریر بھی ہے۔

"ندا تمہارے کالج کی فیس میں دیئے جا رہا ہوں۔ اس بیچ کوئی اور ضرورت ہو تو شیلا سے کہہ دینا وہ پوری کر دے گی۔ اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دینا" بیر کمار کی ضمانت نہیں ہوتی۔ اس بار جیل سے لوٹنے میں اسے کئی مہینے لگ جاتے ہیں۔ شیلا کچھ دن اس کا انتظار کرتی ہے۔ مانگ میں اس کے نام کا سیندور بھرتی ہے مندر میں شام کو روز دیا جلاتی ہے۔ لیکن جب شہر کے سارے زیور ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ تو وہ بھی مجبوراً مانگ کے سیندور اور مندر کے دیپ سے رخصت لے لیتی ہے۔ دو چار دن بازار میں بیٹھ کر پیسہ کماتی ہے۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے شہر چھوڑ کے کہیں چلی جاتی ہے۔ بیر کمار جیل سے آتا ہے۔ اور یوں ہی بے گھر بار زندگی گذارتا ہے۔ اس کی حالت دن بہ دن بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے...... جان پہچان والے اس سے کترا کر گذرنے لگتے ہیں۔ صبح سے شام تک شراب میں دھت رہتا ہے۔ ایک دن صبح وہ ندا کے گھر تک آتا ہے۔ اسے شاید اپنی ابتری کا احساس ہے۔ وہ کمرہ میں اندر آنے کے بجائے باہر ہی کھڑا رہتا ہے۔ ندا اسے دیکھ کر باہر آتا ہے وہ سر جھکائے دس روپئے مانگتا ہے۔ اور پیسے کر جانے کے بنا کچھ بولے خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ندا کی مدد کرتا رہا ہے۔ ندا کے پاس وہ پہلے جب کبھی آتا تھا۔ چپکے سے تکیے کے نیچے کچھ نہ کچھ رکھ کر چلا جاتا تھا۔ لیکن اس بار نہ وہ اندر آتا ہے۔ اور نہ ندا کے آواز دینے پر واپس مڑ کے دیکھتا ہے۔ اسے عجیب لگتا ہے اس واقعے کے کچھ دن بعد، دسمبر کی ایک سرد رات کی صبح کو وہ ایک نٹ پاتھ پر مرا ہوا پایا جاتا ہے...... ندا کے پاس شیلا کا بنارس سے خط آتا ہے۔ اس میں اس کی ایک تصویر ہے۔ اور خط میں بیر کمار کا پتہ لکھنے کی تاکید ہے......

فائن آرٹس کالج میں مقبول فدا حسین کے اعزاز میں ایک فنکشن ہے۔ ندا کو بھی اس میں مدعو کیا گیا ہے۔ اس جلسے میں حسین اپنی تقریر کے بعد گجراتی لہجے میں اردو شعر سناتے ہیں۔ اور ندا اپنی نئی نظمیں پڑھتا ہے۔ سننے والوں میں زیادہ تعداد کالج کی طالبات کی ہے۔ ندا کی گھریلو قسم کی نظمیں، اپنی جزئیات اور شوخی کے

کارن، محفل کو جگاتی ہیں۔ ان لڑکیوں میں ایک لانبے قد اور چھریرے بدن کی لڑکی ندا کے پرانے گھر کے محلے کی ہے۔ اس کا نام عشرت ہے۔ یہ ندا کی بہنوں کی سہیلی ہے۔ اس کا باپ پولس میں سب انسپکٹر ہے۔ اور ندا کو قرآن پڑھانے والی استانی کا بڑا بھائی ہے: ندا اور عشرت کی عمر میں پانچ برس کا فرق ہے۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تو اس کی چھٹی کے دن لڑکی کی دادی ایک ٹوٹکے کے لئے اسے بلا کر لے گئی تھی: ندا نے اس دن ہاتھ میں تلوار اٹھا کر زچہ کے پلنگ کے گرد سات چکر لگائے تھے اس کے صلے میں اسے سوا روپیہ اور مٹھائی دی گئی تھی۔ یہ محلے کے ایک پنڈت کے زائچے کے مطابق، گھر میں پہلی لڑکی ہونے کی بدشگونی کو ختم کرنے اور آئندہ لڑکوں کے لئے راہ ہموار کرنے کے لئے کیا گیا تھا لیکن بہت سے کئی لڑکیوں کے گھر سے چلے گئے۔ منجھلے لڑکے 'ندا کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر بھی بدشگونی کا بھوت ڈر کر بھاگا نہیں۔ اور پہلی لڑکی کے بعد چار پیچے اور اسی صنف کی نمائندگی کرنے چلے آتے ہیں۔ ان میں بڑی دو لڑکیاں پوری عورتیں بن چکی ہیں۔ چھوٹی لڑکیوں سے تعلق ہونے کی ابتدائی منزل سے گذر رہی ہیں۔ فائن آرٹس کالج میں پہلی ملاقات کے بعد، عشرت تو پہلے سے زیادہ محتاط رہنے لگتی ہے۔ لیکن اس کی سہیلیوں کی مسکراہٹوں اور آنکھوں سے دونوں کا یہ رشتہ چھلکنے لگتا ہے۔ ندا کی طرح شاید اس نے بھی، اپنی سہیلیوں کو اپنے راز کا ہمراز بنا لیا ہے: ندا ہر دوسرے تیسرے روز کسی نہ کسی بہانے اس کے گھر جانے لگتا ہے، اور دیر تک یوں ہی بیٹھا رہتا ہے کئی لڑکیوں کے گھر میں، ایک لڑکے کے آنے سے گھر کی خاموشیاں زیادہ باتونی ہو جاتی ہیں۔ چھوٹی لڑکیاں زیادہ بے تکلف ہیں۔ وہ جب تک وہاں رہتا ہے۔ یہ کسی نہ کسی بہانے اس کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ بنا مانگے پانی لے آتی ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد چائے لے آتی ہیں۔ اس کی باتوں میں وہ اتنی محو ہوتی ہیں کہ گھر میں اپنے ذمے کا کام ادھورا چھوڑ دیتی ہیں۔ ماں اندر باورچی خانے میں ہوتی ہے۔ اس کے بار بار آواز دینے پر بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوتیں۔ عشرت سے چھوٹی بہن کو، جو اس سے ایک سال ہی چھوٹی ہے۔ عشرت کے دور دور رہنے کے انداز اور ندا کے سامنے اس کی بنی تلی چال ڈھال سے کچھ دال میں کالا نظر آنے لگا ہے۔ اس آگاہی نے اس میں رقابت پیدا کر دی ہے۔ وہ ندا کو طرح طرح سے ستا کر اسے اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ باہر آنگن میں پیڑوں کو پانی دیتے ہوئے ٹیوب کا منہ اس کی طرف کر دینا پیچھے سے چٹکی لے کر ہنستے ہوئے بھاگ جانا یا پین کو زور سے جھٹک کر سفید قمیص کو داغ دار بنانا۔ اس کی نمایاں شرارتیں ہیں۔ اس کی اس قسم کی شوخیوں سے دونوں بہنوں میں خاموش جنگ سی جاری رہتی ہے۔ وہ ندا اور اسی بات پر دو سکھ کے سامنے صف آرا ہو جاتی ہیں۔ لیکن ندا کی موجودگی میں عشرت چھوٹی کے مقابلے میں اپنی نئی سنجیدگی کا توازن کھونے میں ہچکچاتی ہے۔ چھوٹی بہن اس کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھاتی ہے۔ عشرت اس کے لعن طعن کا ترکی بہ ترکی جواب دینے کے بجائے صرف اس کی طرف غصیلی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے وہ کمرہ میں جا کر بھی ندا کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی..... وہ مسلسل فاصلوں کی زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔

کالج جاتے اور وہاں سے لوٹتے وقت عشرت روز ندا کے کمرے کے سامنے سے گذرتی ہے۔ اس کے گذرنے کا وقت اس کے آنے سے ایک ڈیڑھ گھنٹے پہلے سے شروع ہو جاتا ہے۔ ہاتھ کی گھڑی کی رفتار سست ہو جاتی ۔ راستے کے سارے منظر دھندلے ہو جاتے ہیں۔ ندا اس وقت سارے کام چھوڑ کر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ آتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے گذر جاتی ہے۔ لیکن اس کے آنے اور گذرنے کے یہ تھوڑے سے لمحے سارے دن اس کے جسم میں مہکتے رہتے ہیں۔ ان دوریوں کو پاٹنے کے لئے عشرت نے اپنی ایک سہیلی کو ہمراز بنا لیا ہے۔ اس کا نام وحیدہ ہے۔ وہ پیغام رسانی کے ساتھ دونوں کو ملانے کا نیک فرض بھی نبھاتی ہے۔ وہ عشرت سے زیادہ تجربہ کار ہے۔ عشرت کو اس وادی میں قدم رکھے ابھی مشکل سے پانچ چھ مہینے ہی ہوئے ہیں۔ جب کہ وہ عشق کے کئی موسموں سے گذر چکی ہے۔ اس کا دوست مراد کی فوجی چھاؤنی میں کپتان ہے۔ گذری ہوئی ہند و چین اور آگے ہونے والی ہند و پاک جنگوں کے درمیانی پرامن مدت میں، وہ دونوں کئی بار دو لوگوں کا ایک شہر کو فتح کر چکے ہیں۔ لگاتار فتح یابیوں نے، چھوٹی بستی کی عام لڑکیوں کے مقابلے میں اسے زیادہ بے باک اور بے خوف بنا دیا ہے۔ پہلی بار وہی عشرت کو ندا کے کمرے میں لاتی ہے۔ وحیدہ باہری حصہ میں بیٹھی نگرانی کرتی ہے۔ اور وہ دونوں کائنات کی ساری زمین اور سارے آسمان کو ایک چھوٹے سے کمرہ میں سمیٹنے کا معجزہ جگاتے ہیں۔ اس معجزے کے بعد زمین اور آسمان کو پھر سے اپنی جگہ پھیلا کر ندا باہر نکل جاتا ہے۔ اس کے جاتے ہی اس کا کمرہ فوجی کپتان اور وحیدہ کی قربتوں کا ہمراز بن جاتا ہے۔ اور ندا سامنے ہوٹل میں بیٹھا ان کے رخصت ہونے کا انتظار کرتا ہے۔ فوجی اس احسان کے بدلے میں ملیٹری کینٹین سے ہر دوسرے تیسرے دن کسی اردلی کے ہاتھ سے رم کی بوتلیں بھجواتا رہتا ہے۔ جنہیں ندا اپنے دوستوں کے ساتھ، رات کو دیر تک خالی کرتا رہتا ہے ایک دو بڑے بازار اور تین سڑکوں اور گنتی کے چند محلوں کی بستی میں کوئی راز دیر تک راز نہیں رہتا۔ وقت کی سست رفتاری سب کو ایک دوسرے سے زیادہ ہی واقف کرا دیتی ہے۔ سب ایک دوسرے کو کپڑوں کے رنگ اور ڈیزائن اور آنے جانے کی سمتوں سے جانتے ہیں۔ اسٹیشن پر اترنے والے اجنبی مسافروں کو نئے پرانے تانگوں کے گھوڑے۔ بغیر کچھ بتائے پتے کے بھی صحیح ٹھکانوں پر پہنچا دیتے ہیں۔ خوشی، سوگ اور غیبت مشترکہ قدریں ہیں۔ خبریں دیواریں پھلانگ کر دوسروں کے آنگنوں میں گھومنے پھرنے کی عادی ہیں۔ عشرت کے ندا کے کمرے تک آنے کی خبر اس کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ ندا کا اس کے گھر آنا جانا بند ہو جاتا ہے۔ لیکن وحیدہ پہلے کی طرح

[باقی صفحہ ۲۱ پر دیکھئے]

دھنک رنگ

شاہد عزیز

بدلتے ہوئے موسموں کی صدا
میں صدیوں تلک یوں ہی سنتا رہا
ادھوری رہی زندگی عمر بھر
کبھی میں مکمل نہیں ہو سکا
مجھے ڈھونڈتی ہی رہی یہ زمیں
نہ جانے میں کب اور کہاں کھو گیا
کہیں جا کے کھو جائے گا ایک دن
پرندہ یہ سانسوں کا اڑتا ہوا
گرا کوئی پتہ کسی شاخ سے
کوئی زخم پھر سے ہرا ہو گیا

● ۱۰۹/۱ - طالاب تلائی، اودے پور - ۳۱۳۰۰۱ (راجستھان)

فیروز اختر

کسی کے دل میں خیال میرا
خیال بھی لازوال میرا
حصار جس دن بلند ہوں گے
کھلے گا اس دن کمال میرا
سبب اداسی کا جانتا ہے
وہ جانتا ہے ملال میرا
کتابیں بکھری لباس بکھرے
رہن سہن بے مثال میرا
وہ لمحہ لمحہ پگھل رہا تھا
عروج پر اشتعال میرا

● ۱/۲۲ مدار ٹولہ لین، ہاوڑہ ــــــ ۷۱۱۱۰۱

سیفی سرونجی

میں اس کو کھوج لیتا ہوں دنیا کی خاک سے
ملتا ہے مجھ سے دوستو جو بھی تپاک سے
اپنے پڑوس میں نہ محبت تلاش کر
جو بھی ملے گا تجھ کو وہ ہمت سے دھاک سے
اب کے برس تو پھول بھی کوئی نہ کھل سکا
منظر تھے میرے شہر میں کچھ ہولناک سے
رہتی ہے یہ نظر مری عالم پہ آج کل
مجھ کو نہیں ہے واسطہ کچھ ہند و پاک سے
قسمت بدل سکے گی نہ بستر پہ لیٹ کر
لکھتا ہے کیا، سلیٹ پہ ہر دم تو چاک سے

● سہ ماہی انتساب سیفی لائبریری سرونج ایم پی۔

عباس دانا

دل لگایا ہے تو! نفرت بھی نہیں کر سکتے
ہم ترے شہر سے! ہجرت بھی نہیں کر سکتے
ہم کو فرصت نہیں! پھر بھی تجھے خط لکھتے ہیں
تری یادوں سے! بغاوت بھی نہیں کر سکتے
اس نئے دور نے! ماں باپ کا حق چھین لیا
اپنے بچوں کو! نصیحت بھی نہیں کر سکتے
ہم! اجالوں کے پیمبر تو نہیں ہیں! لیکن
کیا چراغوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے؟
قدر انسان کی! گھٹ گھٹ کے یہاں تک پہنچی
اب تو قیمت میں! رعایت بھی نہیں کر سکتے

● ۵، فتح منزل بالمقابل ستیہ دیو کیمیکلز، بڑودہ ۳۹۰۰۰۴

معصوم انصاری

دھوپ اور چھاؤں کی خبر
اپنے ماحول پر نظر
سر پہ پھیلے آسماں سے
پاؤں لیکن زمین پر
خون ہوتا ہے یوں کسی کا
سب کو دھوکے میں ڈال کر
زندگی کے وسیع آنگن
کوئی دیوار ہو تو در
کس کو معصوم اتنی فرصت
اپنے قصے کو مختصر

● گھر نمبر ۲/۴۹ بہار دارہ، چوتھا نظا

جمشید مسرور

شکست کا لمحہ مسلسل نہ جانے کب درد بن
مری نگاہوں کے خواب لے لے ترے لبوں سے
شعور و احساس کی زمیں پر گلاب کھل رہے
ہوا کا اک نیم گرم جھونکا مری رگوں کا
کوئی تو آخر ہمیں بتائے کہ آندھیوں کے نگر
بہت زمانہ ہوا ہے یاد و وجود کی دھجیاں
یہ کونسا شہر سنگدل ہے نہ حرف میرے نہ
کہ جو بڑھے میرا اندق لے لے کر چاہے میرا
کئی تقاضے ہیں زندگی کے درست جمشید یہ
تقریب و خوش بیاں کی خاطر جمال آوارگی

● MASEN 46A,
OSLO 10 NORWAY.

اظہار اثر
وائی۔ ۵، ڈی۔ ڈی۔ اے۔ کالونی، رنجیت نگر، دہلی۔ ۸

مکھی

جس جاندار شے کے دو پر ہوں اور وہ اڑ سکتی ہو اس کو پرندہ کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مکھی بھی سو فیصد پرندوں کی صف میں آتی ہے کیوں کہ اس کے بھی دو پر ہوتے ہیں اور وہ اڑ سکتی ہے۔ لیکن اب اس کو کیا کیا جائے کہ حشرات الارض کے بارے میں تحقیق کرنے والے سائنس داں جو انگریزی میں خود کو اینٹومولوجسٹ ENTOMOLOGIST کہتے ہیں مکھی کو ہرگز پرندہ ماننے کو تیار نہیں بلکہ اس کو کیڑوں مکوڑوں کی صف میں گنتے ہیں۔ شاید مکھی انسانوں کی اسی ہٹ دھرمی کے باعث نسلِ انسانی کی دشمن بن گئی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مکھی کے پر ہوتے ہیں اور سائنس داں حضرات کی تحقیق کے مطابق ہی مکھی ایک سکنڈ میں سیکڑوں بار اپنے پروں کو حرکت دے سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مکھی کی آنکھ میں ایک نہیں سیکڑوں پتلیاں یا پہلو ہوتے ہیں جس سے اس کی نظریں ہر طرف دیکھ سکتی ہیں گویا وہ کافی وسیع النظر بھی ہوتی ہے۔ اگر سائنس دانوں کی یہ دونوں باتیں صحیح ہیں تو انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ مکھی کو پرندہ مان لینا چاہئے۔ اور مکھی جیسے حقیر نام کی بجائے اسے ہزار چشم کا خطاب ملنا چاہئے

؎ ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

کے مصداق ہم بھی کوئی مکھی کے طرفدار نہیں لیکن ہمارے بزرگوں نے سکھایا ہے کہ سچی بات کہنے سے کبھی نہیں جھجکنا چاہئے خواہ وہ دشمن کی تعریف ہی کیوں نہ ہو۔ اور سچ یہ ہے کہ مکھی بیچاری اپنے قد کی وجہ سے ماری گئی اگر اس مکھی کا قد چیل کے برابر ہوتا تو انسان جو آج مکھی کو حقیر شے سمجھتا ہے۔ اس کو بڑے شوق سے پالتا اس کے لئے پنجرے اور کھانا بنواتا۔ اور اس کا شمار بھی دنیا کے مشہور پرندوں میں ہوتا۔

قدرت نے مکھی کا جسم اور قد چھوٹا کر کے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا شاید اسی کمی کے ازالے کے طور مکھی کو اپنی نسل بڑھانے کی عجیب و غریب صلاحیت عطا کی گئی ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ مکھی ایک سال میں اپنے پوتے پوتیاں بلکہ پڑپوتیاں اور سگڑ پوتیاں بھی دیکھ لیتی ہے انسان مکھیوں سے بیزار ہو جاتا ہے تو ان کو مارنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا۔ زہریلی دوائیں چھڑکتا ہے پنکھوں اور مورچھلوں سے ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اب تو مکھیاں مارنے کے پلاسٹک کے خاص ہتھیار ایجاد ہو گئے ہیں۔ اس کے باوجود مکھیوں کو ختم نہیں کر پایا بلکہ جتنی مکھیاں ماری جاتی ہیں اتنا ہی ان کی نسل بڑھتی ہے۔

بظاہر مکھی انسان کے لئے بے مصرف شے ہے بلکہ ضرر رساں ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ یہ کھانوں پر بیٹھ کر ان پر بیماری کے جراثیم چھوڑ جاتی ہے۔ انسان ان کھانوں کو کھا کر بیمار پڑ جاتے ہیں اور مر جاتے ہیں لیکن یہ تو قدرت کا نظام ہے۔ ذرا سوچئے اگر مکھیاں کھانوں پر بیماری کے جراثیم نہ چھوڑیں تو انسان بیمار ہونا چھوڑ دیں گے۔ اس صورت میں بیچارے وید حکیم اور ڈاکٹر بھوکے مر جائیں گے۔ اور پھر انسان مریں گے نہیں تو گورکن اور کفن بیچنے والوں کا کاروبار کیسے چلے گا؟ قدرت نے تو سب ہی کو رزق دینے کا وعدہ کیا ہے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو مکھی کے بہت سے مصرف اور فوائد بھی ہیں۔ مثلاً بہت سے حضرات تیس مکھیاں مار کر تیس مار خاں کا خطاب حاصل کر چکے ہیں اور تاریخ میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔

بیکار لوگ مکھیاں مار کر دل بہلاتے ہیں۔ (یہ بھی فنکاری کی ایک قسم ہے) ورنہ بیچارے زندگی کی اذیت سے اکتا کر خودکشی کر لیں۔

؎ اگر نہ اتنا بھی ہو سہارا تو دم نکل جائے آدمی کا۔

مکھیاں بڑی پراسرار شے ہوتی ہیں۔ ان میں پل میں غائب اور پل میں حاضر ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ابھی کمرے میں ایک بھی مکھی نہیں تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے کمرہ مکھیوں سے بھر جاتا ہے۔ بس ذرا سی میٹھی چیز میز پر رکھنے کی دیر ہوتی ہے۔ مکھیاں بہت چالاک بھی ہوتی ہیں جب تک آپ کے ہاتھ پاؤں ہلتے نظر آتے ہیں مکھی پاس نہیں پھٹکتی ادھر آپ

کے ہاتھو پاؤں ساکت ہوئے یعنی آپ سوئے ادھر مکھیوں نے ہوائی جہازوں کی طرح آپ کے جسم پر لینڈنگ شروع کر دی ایسا لگتا ہے جیسے ہوائی جہازوں کے اسکواڈرن دشمنوں کے ہوائی اڈوں پر اتر رہے ہوں۔

جب سے بجلی ایجاد ہوئی ہے اور اندھیرا اجالے میں بدلنے کے بجائے بلب کے اوپر ہونے لگا ہے مکھیوں نے بلب لٹکانے کی ڈوریوں کو اپنی حوائج ضروری کی فراغت کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اگر آپ سال دو سال ڈوری پر توجہ نہ دیں تو مکھیاں اس کی موٹائی کو دوگنی کر دیں گی۔ اور بجلی کے تار کو مزید انسولیشن کی ضرورت نہیں رہے گی یعنی پھر بجلی کا کرنٹ تار سے باہر نہ آسکے گا۔ اس اعتبار سے مکھیاں انسانی زندگی کے لئے بہت اہم ہیں۔

انسان خود کو اشرف المخلوقات کہتا ہے لیکن مکھیاں خود کو انسانوں سے بھی برتر سمجھتی ہیں اس لئے وہ زمین پر رہنا پسند نہیں کرتیں بلکہ چھتوں پر آرام کرتی ہیں۔ ایک صاحب نے جنہیں مکھیوں کی زبان جاننے کا دعویٰ تھا دو مکھیوں کو باتیں کرتے سنا تھا۔ ایک مکھی انسانوں کا مذاق اڑاتے ہوئے دوسری مکھی سے کہہ رہی تھی۔

"یہ انسان بھی عجیب و غریب جانور ہے ہزاروں روپئے خرچ کر کے چھتیں بنواتا ہے اور خود زمین پر رہتا ہے۔"

حشرات الارض کے ماہر سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ مکھی دنیا کے ہر علاقے میں پائی جاتی ہے چاہے وہ ٹنڈرا کا برفانی علاقہ ہو یا افریقہ کے استوائی گرم علاقے ہر کہیں تحقیق کی جا چکی ہے کہ مکھیوں کی کم از کم دو لاکھ نسلیں اس دنیا میں آباد ہیں۔ لیکن یہ آخری بات اسلئے سمجھ میں نہیں آتی کہ انسانوں کی تو صرف چند نسلیں اس دنیا میں آباد ہیں۔ اور ایک دوسرے کا خون بہاتی رہتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ ایک ہی نسل کے انسان بھی فرقوں کے نام پر لڑتے رہتے ہیں۔ پھر مکھیوں کی دو لاکھ نسلیں کیسے ہو سکتی ہیں۔ اگر انسانوں کی اس قدر نسلیں ہوتیں تو اب تک ایک دوسرے کو ختم کر چکے ہوتے اور اس زمین پر صرف مکھیاں ہی مکھیاں ہوتیں۔

مکھی بہت حقیر شئے ہے پھر بھی بہت سے لوگ اس سے خوفزدہ رہتے ہیں۔ اسی لئے وہ اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے۔ اور کچھ لوگ آرام طلب ہوتے ہیں کہ ناک پر بیٹھی مکھی تک نہیں اڑاتے ایسے لوگ دراصل اتحاد باہمی کے قائل ہوتے ہیں۔ اور جیو اور جینے دو کے فلسفہ پر یقین رکھتے ہیں۔ اردو صحافت اور ادب میں بھی مکھی کو خاص اہمیت حاصل ہے اردو کے کاتب حضرات مکھی پر مکھی مارنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ یعنی مسودہ میں جو لفظ جس طرح ان کی سمجھ میں آتا ہے کتابت کرتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی سمجھنے میں وقت ضائع نہیں کرتے کہ پچھلے لفظ کا آنے والے لفظ سے کوئی با تعلق ہے یا نہیں۔ انسانوں اور مکھیوں میں کئی اقدار مشترک ہیں مثلاً بہت سی نسلیں ایک سال میں کئی کئی نسلوں کو جنم دے سکتی ہیں۔ پسماندہ اور ترقی پذیر ممالک کے باشندے (بشمول ہندوچین) اپنے فن میں ماہر ہیں۔

دوسری قدر مشترک خون ہے۔ مکھیوں کی بہت سی نسلیں اپنی پیاس مٹانے کے لئے خون چوستی ہیں۔ چاہے وہ انسان کا خون ہو یا جانور کا دولت مند اور خود غرض انسان اپنی ہوس بجھانے کے لئے غریب انسانوں کا خون چوستے رہتے ہیں۔ اور بہت سے انسان تو مذہب کے نام پر دوسرے کا خون بھی بہاتے رہتے ہیں۔ اور اعلان کرتے رہتے ہیں کہ نہیں سکتا تا آپس میں بیر رکھنا۔ مکھیوں میں سب سے خطرناک مکھی وہ ہوتی ہے جو رائفل کی نال پر نشانہ سیدھا باندھنے کے لئے ہے۔ اسی مکھی کی مدد سے انسان دوسرے انسان کے سینے میں گولی اور اپنے اس فعل کو مذہب یا وطن پرستی کا نام دے کر قتل کے الزام سے بچ جاتا ہے۔ کسی مکھی نے آج تک کسی انسان کو آڑ بنا کر دوسری مکھی کو نہیں بہلایا۔

بہت سے انسان اپنا مقصد نکل جانے کے بعد قریبی دوست کو دودھ میں گری مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیتے ہیں۔ اور کچھ اس قدر مکھی چوس ہوتے ہیں کہ ان کی تعریف بیان کی جائے تو اس کا خاندان بھی جھکنے لگیں۔ حالاں کہ کہا یہ جاتا ہے کہ آنکھوں دیکھی مکھی نگلی نہیں جاتی۔

مکھیوں کا ایک افادی پہلو بھی ہے۔ اگر ایک طرف وہ کھانوں پر بیٹھ کر بیماریاں پھیلاتی ہیں تو دوسری طرف بہت سے خطرناک جراثیم کی خوراک بھی بن جاتی ہیں۔ یعنی ایک طرح سے وہ موت کے کھاتے کا ڈیبٹ اور کریڈٹ برابر کر لیتی ہیں۔

مکھیوں کی اولین نسل نے کچھ نیک کام کئے ہونگے۔ جن سے قدرت نے ان کو عقل و شعور عطا نہیں کیا۔ یہ دونوں چیزیں ان کے پاس ہوتیں تو آج دنیا میں ایک بھی مکھی نظر نہ آتی۔ ساری مکھیاں ایٹم بم قسم کی کوئی چیز ایجاد کر کے مکھیوں کی تمام نسلوں کو تباہ کر چکی ہوتیں۔

گھس بیٹھ کرنے کے فن میں بھی مکھیاں طاق ہوتی ہیں۔ آپ دروازے کھڑکیاں بند کر لیجئے تمام راستوں پر جالیاں اور شیشے لگا دیجئے مکھیاں اندر داخل ہو جائیں گی کس طرح داخل ہوں گی؟ یہ راز نہ وہ بتاتی ہیں نہ کوئی آج تک سمجھ سکا۔ اس لئے انسان اب مکھی

کا ایک حصہ سمجھ کر اس کی ہر جگہ موجودگی کو برحق سمجھنے لگا ہے۔ کسی صاف ستھرے کمرے میں دیوار یا چھت پر مکھی دیکھ کر آپ کو ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی۔ مکھی کی اسی OMNI PRESENCE ہر جگہ پائے جانے کی صفت کو مدنظر رکھتے ہوئے انسان نے جاسوس مکھیاں بنانا شروع کر دی ہیں۔ سائنسدان مکھی کی شکل کے مائیکرو مائک (مائکروفون) بنا کر دشمنوں کے کمروں میں چپکا دیتے ہیں۔ دیکھنے والے اسے اصل مکھی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب کہ وہ نقلی مکھی کمرے میں ہونے والی ہر بات ٹرانسمیٹر کے ذریعہ دوسری جگہ پہنچاتی رہتی ہے۔

جب بہت سی مکھیاں اکٹھا ہو جاتی ہیں تو وہ بھنبھنانا شروع کر دیتی ہیں یہ عادت ان کو آدمی کی صحبت میں رہ کر پڑی ہے۔ بلدیہ کی انتظامیہ کی میٹنگوں میں۔ اسمبلی ہالوں میں۔ سیاسی جلسوں میں انسانوں کی بھنبھناہٹ سننے کے قابل ہوتی ہے۔ اسکول اور کالج کی کلاسوں میں بھی جب تک استاد نہیں آجاتا یہ بھنبھناہٹ سنی جا سکتی ہے۔

اسکولوں کا ذکر آیا تو یاد آیا کہ نصاب کی کتابوں میں بلبل، طوطا، طاؤس حتیٰ کہ چیونٹی تک پر نظمیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ لیکن مکھی پر کبھی کسی شاعر نے نظم نہیں لکھی۔ آخر وہ بھی تو خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ یہاں ہم مکھی پر ایک مختصر نظم پیش کر رہے ہیں۔ اگر یہ نظم نصاب کی کتاب میں شامل کر لی جائے تو بہت سوں کا بھلا ہوگا۔

بچو! تم نے مکھی دیکھی ہے
دسترخوان پہ رکھی دیکھی ہے
مکھی ایک درندہ ہے
دیکھو تو صرف پرندہ ہے
مکھی کے پر ہوتے ہیں
جو بیماری کا گھر ہوتے ہیں۔ (وغیرہ وغیرہ)

بچپن میں بڑی بوڑھیاں ہمیں بتایا کرتی تھیں کہ ملک بنگال کے ادھر ایک سندربن ہے۔ جس میں جادوگرنیاں رہتی ہیں جو خوبصورت مردوں کو مکھیاں بنا کر اپنے لمبے بالوں کے جوڑوں میں چپکا لیتی ہیں۔ روزانہ رات کو وہ ان کو مرد بنا لیتی ہیں۔ اور پھر صبح کو مکھی بنا کر قید کر لیتی ہیں۔ اسی لئے جو مرد ادھر چلا جاتا پھر پلٹ کر نہیں آتا۔ بچپن میں حیرت ہوا کرتی تھی کہ جادوگرنیاں انسانوں کو مکھیاں کیسے بنا دیتی ہوں گی۔ جب ذرا ہوش آیا تو پتہ چلا کہ اس زمانے میں بہت سے مرد روزگار کی تلاش میں بنگال جایا کرتے تھے۔ ان میں سے کچھ واپس نہیں آتے تھے وہیں شادیاں کر کے بس جاتے تھے۔

ویسے ہماری رائے ہے کہ حکومت کو تحقیق کرانی چاہئے کیا خبر واقعی اس طرح کی جادوگرنیاں سندربن میں رہتی ہوں۔ اگر ایسی جادوگرنیاں کا کوئی وجود ہو تو ان کی خدمات حاصل کر کے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔ ایسی جادوگرنیاں ملک کی زائد آبادی کو مکھیاں بنا کر ایک ہی مکان کی دیواروں سے چپکا سکتی ہیں۔ جب ضرورت ہوئی ان میں سے کچھ مکھیوں کو انسان بنا کر کام لے لیا۔ اور کام ختم ہونے کے بعد پھر مکھی بنا کر چپکا دیا۔

مکھیوں کے بارے میں اب ہم یہ مضمون ختم کرنے پر مجبور ہیں۔ کیوں کہ دیر سے ایک مکھی ہمارے اردگرد منڈلا رہی ہے۔ شاید وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہی ہے کہ ہم اس کی نسل کے بارے میں کیا لکھ رہے ہیں ان کی برائیاں تو نہیں کر رہے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اس نے اپنی ہم نسلوں کو بلا کر ہمارا گھیراؤ کیا تو ہمارے لئے مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔ ✹

بقیہ صفحہ ۲۹ زبان کے معیار کا مسئلہ

اب بھی بہت سے لوگ یہ شناخت نہیں رکھتے، مگر ادیب اس احتیاط کو ضرور برتتے ہیں۔ ہر ستارہ ایک تکلف ہے جو جب ذہنی عادت بن گیا ہے۔ ابھی تک تو یہی معیار ہے، لیکن کیا یہ جہت جہات آگے بھی برتی جائے گی؟ ✹

بقیہ صفحہ ۳۷ کورس

وہ تتلا کر گاتا ہے۔

چھلاں جی کی پدلی میں بالا آئے تھے
ایک ادا تو ہے گیلا ئے لام لے

اور اس وقت سردار کے چہرے کی ہنسی، خوشی اور چمک دیکھ کر میں اس پر اپنے نیک سے زیادہ فریفتہ ہو جاتا ہوں۔ ✹

مکتوب

ناجحسن خاں۔ علامہ اقبال سبدرگر، شملہ اپ نفیوسنجیا
آپ اپنے رسالے شاعر کے ذریعہ اس دورِ پرآشوب میں
جو خدمت انجام دے رہے ہیں وہ ہر طرح قابلِ تعریف ہے۔
ہے آپ کے قلم میں اور زیادہ طاقت عطا فرمائے اور آپ اپنے
بزرگوں کی طرح ہماری زبان کی زیادہ سے زیادہ خدمت کرتے رہیں
اور رسالے کو پڑھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے۔

رعقیل ـــــــ محمود منزل، دریا آباد، الٰہ آباد
شاعر برابر ملتا رہا ہے۔ مگر ادھر کافی دبلا پتلا ہو چلا ہے۔
اہے کہیں یہ "آگے بڑھیں گے دم لے کر" کی تیاری میں ہو۔
ہو سکتا ہے کہ ہم جیسے سفید پوش حضرات نے اس کی یہ
بیماری ہو۔ اُردو والوں کا یہ مزاج کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ آپ کو اور ہم
چائے خانے میں بیس پچیس روپے کی چائے پلا دیں گے مگر
روپے کا رسالہ نہیں خریدیں گے۔ آپ بحیثیت صحافی اس
کیا تجزیہ کرتے ہیں؟ کیوں ایسا ہے؟ یہ مسئلہ بھی اُردو میں تحقیق
ہے۔ ہماری کونسی نفسیاتی گرہ ہے جو ہمیں اُردو رسالوں کو
خریدنے سے روکتی ہے۔ ممکن ہو اور آپ مناسب سمجھیں تو اس
سوال کی شکل میں شاعر میں پیش کیجئے۔ دیکھئے اُردو کے
کیا جواب دیتے ہیں۔ بہرحال اس مزاج کے بننے کا کوئی سبب
؟

بزاندوری۔ ۱۰۰، ۲ آشیانہ جونا مسالہ اسٹریٹ نمبر ۲، اندور
شاعر کا تازہ شمارہ (جلد ۶۰ شمارہ ۱) موصول ہوا۔ اس بار تو واقعی
نے افسانوی حصہ کو بہت معیاری بنا دیا۔ رام لعل، جوگیندر پال اور
ن جیسے معتبر افسانہ نگاروں کے معیاری افسانے شائع کرنا "شاعر"
ہی ہے اور اس پر طرہ مدافاضلی کا چٹکی دار عبارت میں اپنی داستان
نا، بہت اچھا تھا۔ ان سب کے ساتھ ہی تاراچرن رستوگی نے سیمنار
کے ملتزمات کا بھرپور جائزہ لیا ہے چونکہ ان کا یہ مضمون ان کے
تجربات و تاثرات کی روشنی میں ہے اس لیے انہیں بہت سے ایسے
وں کا شاید علم نہیں جنہیں سیمنار کہتے بھی شرم آتی ہے۔ کیا سینٹ
یونیورسٹی یا یو جی سی کی مالی امداد حاصل کر کے چند رنگی رسالے پر
پیش پڑھ دینا ہی کافی ہوتا ہے؟ رستوگی صاحب کی اس
سے میں بھی پوری طرح متفق ہوں کہ سیمنار میں پڑھے جانے والے
ت کے تعلق سے یا تو بحث کی جانی چاہیے یا ان پر چند سوالات
جانے چاہئیں۔ ہمارے صوبے میں اقبال اکادمی قائم ہے۔ شاید
کی صاحب نے اس اکادمی کی جانب سے منعقد ہونے والے
وں میں شرکت نہیں فرمائی ورنہ ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات
ہیں اضافہ ہوتا کہ فراکادمیوں کے ذریعہ اس قسم کے سطحی کاموں کو
اُردو کے تہذیبی کاموں سے منسوب کیا جاتا ہوگا۔ غالباً اسی
کے تحت اب اس قسم کے سیمناروں میں سامعین کی تعداد روز بروز
کم ہوتی جا رہی ہے اس لیے کہ ان میں کوئی صورت سلیقہ کی نظر
تو آپ چاہے با شعور سامعین پیپرس کا بوجھ اپنے ذہن
پر نہ ڈالیں۔ رستوگی صاحب نے اپنے مقالے کے آخر میں جو تجاویز
پیش کی ہیں کاش ان کی روشنی میں اس طرف بھی کچھ ڈھنگ کے سیمنار
منعقد ہو سکیں۔ کمال کی بات تو یہ ہے کہ اب سیمنار کے نام پر چند شعراء کو
بلا کر ان سے ان کا کلام بلا وقت نظام سنوا دیا جاتا ہے۔ اور ان نظموں پر ناظم
صاحب ہلکا پھلکا تبصرہ فرما دینے کے بعد سیمنار کے اختتام کا اعلان کر دیتے
ہیں۔ لیجئے ہو گیا سرکاری امداد کے سہارے منعقد سیمنار۔ ایسے
کتنے ہی تماشے "ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں میں کھیلے" جاتے ہیں۔
ان سے نہ تو طلباء کو کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ دیگر شرکاء کو۔ سرکاری امداد
دینے والوں کو چاہیے کہ وہ ایسی پابندیاں عائد کریں جن کی تکمیل کے بغیر کوئی
سیمنار۔ سیمنار نہیں کہلایا جا سکتا۔ اگر ان پابندیوں کی تکمیل نہ ہو تو سختی
کے ساتھ باز پرس کی جائے۔ شاید اس کا کچھ اثر ہو سکے اور ہمارے
(یعنی اُردو والوں کے) سیمنار کچھ وقار پا سکیں۔

عبدالقوی دسنوی۔ صدر شعبۂ اُردو، سیفیہ کالج، بھوپال
شاعر مل گیا ہے، اچھا ہے۔ تاراچرن رستوگی کا مضمون "سیمنار اور
اس کے ملتزمات، دعوتِ فکر دیتا ہے۔ اُردو کے سیمناروں اور سیمناروں
کا بہت برا حال ہے۔ کچھ تو ایسے سیمنار یے پیدا ہو گئے ہیں جو ایک ہی مقالے
کو مختلف قسم کے سیمناروں میں نام بدل کر پڑھتے ہیں، کچھ زبانی مقالے
پڑھتے ہیں۔ اُردو نے اس طرح دونوں قسم کے فن کار پیدا کیے ہیں۔

تابش مہدی۔ ادارہ الایمان، دیو بند۔ (یو۔پی)
میں نے طلوع لائبریری سے شاعر کے کچھ نئے پرانے شمارے اور خاص
نمبر حاصل کیے ہیں۔ ان شماروں میں آپ کے اداریے پڑھ کر وجدان مجسم
اچھا لگا ہے۔ ابھی یہ سب شمارے اور خاص نمبر زیر مطالعہ ہیں۔

احمد یوسف۔ کمرشیل امپوریم، صدر گلی، پٹنہ (بہار)
شاعر میں پابندی سے دیکھ رہا ہوں، ادھر کے بھی شمارے
بے حد پسند آئے، مبارکباد۔

نامی انصاری۔ اے۔ ۱۲/۱ سول لائنس، کانپور
شاعر کے تازہ شمارے میں آپ نے خواجہ احمد عباس مرحوم
کا مشہور افسانہ "سردار جی" شائع کر کے ایک مفید کام کیا ہے۔ کاش
اس افسانے کو آپ اتنی مہین چھپائی کے ساتھ نہ چھاپتے۔ آپ کی توجہ اس
طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے مضمون میں
خواجہ احمد عباس مرحوم کے ایک انٹرویو کے حوالے سے لکھا ہے کہ "تاریخ
پیدائش جون ۱۹۱۲ء ہے۔ تاریخ وفات ابھی معلوم نہیں" مگر آپ
نے عباس صاحب کا جو بائیو ڈیٹا اس شمارے میں دیا ہے اس میں
تاریخ پیدائش ۷ جون ۱۹۱۴ء لکھی ہے اب ایک الجھن پیدا ہو گئی ہے،
کون سی تاریخ صحیح ہے، ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۴ء؟ آئندہ ریسرچ اسکالرز
اختلاف سنین سے مغالطے میں پڑ جائیں گے۔

اخلاق اثر۔ صادق منزل، چوکی امام باڑہ، ۔۔۔ بھوپال
شاعر کی اشاعت کا ۶۲واں سال مبارک ہو۔
گزشتہ شمارے ۱۹۹۱ء پر آپ کا نوٹ بہت اچھا لگا ہے۔ اس کے
برعکس مقامی روزناموں اور ویکلی ہفت روزہ کو فراہم کرنا چاہوں غلط
فہمیوں پر مجموعہ ذیل اقتباس برابر شائع کرتے رہیں تو اس کام کو
اور تقویت پہنچے گی۔

ہم انفرادی اور اجتماعی طور پر مردم شماری کے لیے آنے
ہوئے افسران کو تعاون دیں۔ خود بھی صحیح اندراج کروائیں
اور جہاں تک اس کے ساتھ جا سکتے ہوں جائیں اور مادری
زبان کے خانے میں زبان کا صحیح اندراج کروائیں یعنی اور
"ہماری مادری زبان۔ اُردو زبان"
"اُردو زبان ہماری مادری زبان"
شاید شاعر ہی میں یہ تحریر شائع ہوئی ہے۔
آپ اپنی پیاری زبان "اُردو" کے لیے کچھ وقت ضرور دیجئے"

محسن بھوپالی۔ محسن منزل ۱۱۷ ایف، ۵ ر گلی ۱۰، ناظم آباد کراچی
ممنون ہوں کہ شاعر کے تین شمارے ارسال فرمائے۔ مندرجات
سے تازگی کا احساس ہوا۔ بڑی بات ہے کہ آپ نے معیار کو نہ صرف برقرار
رکھا ہے بلکہ بہتر بنایا ہے۔
جلد ۶۱، شمارہ ۱ کے حصہ نظم میں "نظامت" (بے خوف فکر)
شامل کرنے کا شکریہ۔ اگر علم ہوتا کہ آپ میرے نظامت نے طویل شاعر
شائع کریں گے یا پچھلے شماروں میں اس قسم کی روش نظر سے گذری ہوتی تو
میں اس قدر بے احتیاطی سے نظامت نہ لکھتا کہ ایسا بدخط بھی نہیں ہوتا
مزید ستم یہ ہوا کہ محترم ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے میرے خط میں شائع کر دی
گئی۔ میں نے تو یہ رائے اس غرض سے درج کر دی تھی کہ آپ نظامت کے اوپر
کتابت کروا دیں گے۔ تاکہ انڈیا کے بعض قارئین کو اگر نظامت کے بارے میں
پہلے سے علم نہ ہو تو انٹرو INTRO سمجھ لیں گے۔ یہاں معاملہ برعکس ہو گیا
چنانچہ اب میں مالے کی حرف بہ حرف صداقت کے لیے ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب
کے خط میں ان کی اصل تحریر کا عکس بھیج رہا ہوں کہ تنقید اور تحقیق میں اس
طرح کی احتیاط لازم ہے۔ براہ کرم اس عکس کو ابتدائی قلمی صفحات میں
شریک فرما لیجئے گا (یعنی آثار لفظ لفظ میں)

اظہار اثر۔ ۵ / ۲ ولی نیو بخشیت نگر، ٹی ٹی ڈی اے کالونی۔ نئی دہلی
ماہنامہ شاعر کا تازہ ترین شمارہ اپنی شاندار ادبی روایات کے ساتھ
سب سلطان سبحانی کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ اس شمارے میں خواجہ
احمد عباس مرحوم پر فرمان فتح پوری کا مضمون خواجہ صاحب کی بلند و بالا
شخصیت کا بھرپور تعارف کراتا ہے۔ کہانیوں میں خواجہ احمد عباس
کی کہانی "میری موت" اور انور خان کی کہانی "حسرتِ حاصل" بہت خوب
صورت اور زندہ کہانیاں ہیں۔ جوگندر پال اور تقاضا
چرن رستوگی کا مضمون "سیمنار اور اس کے ملتزمات" سچائیوں کے باوجود
NEGATIVE فکر کی جھلک دیتا دکھائی دیتا ہے جس کے بارے
میں انہوں نے اسی مضمون میں ایک جگہ تحریر کیا ہے "اُردو والوں میں نہ
جانے کہاں سے ایک دو اصطلاحیں در آئی ہیں جو اُردو ادب کے علاوہ کسی
اور ادب میں میرے دیکھنے میں نہیں آئیں یعنی منفی تنقید NEGATIVE
CONSTRUCTIVE CRITICISM اور مثبت تنقید CRITICISM
حصہ نظم میں پاکستان کی شاہدہ حسن کی غزلیں دل کی گہرائیوں کو چھوتی محسوس
ہوتی ہیں۔

مہدی پرتاب گڑھی۔ محلہ شیخ پیشی، پرتاب گڑھ (یو۔پی)
شاعر نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال پورے کر لیے۔ یقیناً

اُردو رسائل کی دنیا میں ایک عظیم کارنامہ ہے۔ اُردو کی طرف سے اس بے اعتنائی کے دور میں رسائل کا زندہ رہنا آپ اپنے میں ایک معجزہ ہے مزید یہ کہ کسی ادبی رسالے کی زندگی تو معجزہ سے بھی آگے کی کوئی چیز ہے۔ یہ سب آپ کی لگن کے باعث ممکن ہو سکا۔ صفحات کی کمی کے باوجود بھی آپنے زیادہ سے زیادہ مواد دے کر کوزے میں دریا سمیٹنے کی سعی کی ہے۔

قمر جہاں ــــــ بھیکم پور، بھاگل پور۔ (بہار)

پیشِ نظر شمارہ میں "مختلف بحر غزلیں" کے عنوان سے شاہدہ حسن کی غزلیں کافی پسند آئیں۔

ملک نسیم کی نظم "ایک شام" اور حنا انجم کی غزل کے اشعار بڑے پیارے لگے۔

آپ کہیں گے کہ میں نے مرد قلم کاروں پر کوئی رائے نہیں دی۔ ایسی بات نہیں ہے کہ میں نے انہیں پڑھا نہیں، پڑھا بھی، کچھ چیزیں پسند بھی آئیں مگر میں نے سوچا کہ ان پر قلم اٹھانے والوں کی کمی نہیں ہے مظلوم تو ہم عورتیں ہیں جن کی چیزوں کو لوگ پسند بھی کرتے ہیں تو خاموش رہ جاتے ہیں، لیکن ان کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، جب کہ چپ چاپ انہیں توصیفی خط لکھ سکتے ہیں مگر نہ معلوم کیوں بھری محفل میں ان کا نام لیتے انھیں حجاب آتا ہے۔ یہ ایک ایسی روایت بن گئی ہے جس کی وجہ سے اس ترقی یافتہ عہد میں بھی خواتین کا ادب خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکا ہے۔ کیا آپ ایسا محسوس نہیں کرتے کہ عورتیں اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود گھٹ جاتی ہیں اور بقول حنا انجم ؎

میرے وجود کی خوشبو ہی گھر آنگن تک
کچھ اس میں دخل تو بادِ صبا بھی نہ کر سکی

م۔ ناگ ــ معرفت حمید خاں، جیا اکیز کپاؤنڈ بوریولی بمبئی نمبر ۹۲

شاعر بہت اچھا جا رہا ہے، اللہ کرے شب و روز اسی طرح ترقی کرے۔ آپ لوگوں کی محنت، لگن اور جذبہ کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ واہ صاحب! یہ تو آپ جیسے جیالوں کا کام ہے۔ میری کہانی "گھروندہ" کی شاعر میں اشاعت سے معلوم ہوا کہ کہانی بہت دور تک پہنچی ہے۔

جاوید اکرم ــــــ ۳۱۱ سول لائنز، فتح گڑھ (یوپی)

شاعر کا معیار اور اس کی انفرادیت بزرگوں کی دعاؤں اور آپ کی بے پناہ محنتوں کا ثمر ہے۔ شاعر کا اپنا ایک مخصوص لب و لہجہ اب اس کی پہچان بن گیا ہے۔ ع

وہ بھیڑ میں بھی جائے تو تنہا دکھائی دے

شاہد کلیم ــ وودھ کٹورہ، آرہ ــــ ۸۰۲۳۰۱ (بہار)

شاعر کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ خواجہ احمد عباس پر ایک اچھے مضمون کی اشاعت ضروری تھی۔ شاعر میں اچھی نظموں کی اشاعت پرعیان دکھیں۔ نظامی نے تنقید کی خاصی بات جیالی کسی بھوپالی پاکستان کے تھے اس لیے ان کی نظموں کی اشاعت ضروری تھی کیا؟

شفیقہ فرحت ــ اے۔۱۰۷ ودیا وہار، بھوپال ــ

شاعر کا معیار بلند، انداز تیکھا اور ندرت کا حامل ہے لیکن اکثر افسانوں میں ندرت، ابہام اور الجھاؤ کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہی جدیدیت کی سب سے بڑی خامی ہے جس سے ادب، قاری سے دور ہو گیا ہے اور عام قاری گمشدہ رسائل میں اپنی دلچسپی تلاش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ آج کے اردو ادب کا بڑا المیہ ہے۔ تنقیدی اور تحقیقی مضامین پر کم سے کم صفحات برباد کیے جائیں۔ اچھے تخلیقی ادب خصوصاً نثر پر توجہ دی جائے۔

خورشید ملک ــ تارین تکلی، شاہجہاں پور ــ ۲۴۲۰۰۱

"رام لعل کا قلم جواب دے گیا ہے"
"رام لعل اب صرف اپنا نام کیش کرتے ہیں"
"رام لعل بحیثیت کہانی کار ختم ہو گئے ہیں"
"رام لعل کے پاس موضوعات کا ذخیرہ ختم ہو گیا ہے، اس لیے سوانح عمری، سفرنامے، خطوط پر مشتمل کتاب، ڈرامے وغیرہ پر زیادہ وقت صرف کرنے لگے ہیں"
"گزشتہ کئی برسوں سے رام لعل نے کوئی قاعدے کی کہانی نہیں لکھی ہے"

ادھر کچھ عرصے رام لعل کے بارے میں اس قسم کی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ اس قسم کا پروپگنڈہ کرنے والے وہی لوگ ہیں جو رام لعل کی بڑھتی ہوئی بین الاقوامی شہرت سے حسد کرتے ہیں۔

ان لوگوں کو شاید معلوم نہیں کہ کسی قلم کار کا قلم کبھی جواب نہیں دیتا۔ جہاں تک نام کیش کرنے کا تعلق ہے، یہ مرتبہ بھی بڑی مدت کے بعد حاصل ہوتا ہے، لیکن رام لعل نے کبھی بھی اپنے نام کو کیش کرنے کی سعی نہیں کی۔ چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ سے اُردو کی صدق دل سے خدمت کرنے والے رام لعل نے کبھی کسی انعام یا تعریف کی خواہش نہیں کی۔ اگر ان کو کبھی کسی انعام سے نوازا بھی گیا تو اس سے اس انعام کی وقعت ضرور بڑھی، رام لعل کو بھلا ان انعامات سے کیا لینا دینا۔

اچھا کہانی کار کبھی اپنی کہانیوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ کبھی چھ ماہ یا ایک سال یا کبھی کبھی ایک سال سے بھی زیادہ وقت ایک کہانی مکمل کرنے میں لگا دیتا ہے۔ جب تک وہ پوری طرح سے مطمئن نہیں ہو جاتا اپنی کہانی دوسروں تک نہیں پہنچاتا۔ اس طرح وہ واقعی ایسی کہانی بن جاتی ہے جس کو مدت تک نہیں بھولا جا سکتا۔ اس کا ثبوت ہے رام لعل کی کہانی "پچھیرو" جو شاعر شمارہ ۸ جلد ۵۸ میں شائع ہوئی ہے یہ کہانی رام لعل کے مخالفین کا منہ بند کرنے کے لیے کافی ہے اس کہانی کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رام لعل کی گرفت اپنے قلم پر کتنی مضبوط ہے۔

ان کا فن بتدریج کندن کی مانند دمکتا جا رہا ہے۔

بلا شبہ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس وقت رام لعل اُردو دنیا کے صفِ اوّل کے کہانی کار ہیں۔ منٹو، کرشن چندر اور بیدی کے بعد اردو کہانی کے وہ ایک اہم ستون بن گئے ہیں جس پر اردو کہانی کی بلند قامت عمارت قائم ہے۔

میری دُعا ہے کہ ان کا سایہ اُردو کے اوپر قائم رہے۔

شکیب ایاز ــ گزری بازار، پٹنہ (بہار)

شاعر کا شمارہ ۱۱-۱۲ دیکھا۔ اس شمارہ میں "باقیات" کے عنوان کے تحت مرحوم ثاقب عظیم آبادی کی ایک غزل کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ ادارہ کی جانب سے جو باتیں درج کی گئی ہیں ان میں چند اندراجات غلط ہیں ان کی تصحیح ضروری ہے

۱۔ ثاقب عظیم آبادی کا سنہ ولادت ۵-۱۱-۱۹۰۲ء ہے اور یہ درست ہے۔ شاعر کے دفتر میں حضرت ثاقب کی خود نوشت سوانح کی زیروکس کاپی موجود ہے جسے میں نے برائے اشاعت دیر ہوئی ارسال کیا تھا۔

۲۔ ادارہ نے حضرت ثاقب مرحوم کو ایک کم معروف مجذوب شاعر لکھا ہے۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ آج تک کسی نے انھیں مجذوب نہیں لکھا آپ نے کیوں کر لکھ دیا؟ تحقیق میں انھیں اسناد کا درجہ حاصل تھا شاعر کی حیثیت سے کم معروف نہ تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں "الصباح" نام کا ایک ماہنامہ شائع کیا تھا پہلا شمارہ اپریل ۱۹۲۳ء میں چھپا تھا راقم کے پاس موجود ہے۔ مذکورہ شمارہ میں شاد عظیم آبادی اور ان کے حریف فضل حق آزاد کی نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ قاضی عبدالودود کا پہلا تحقیقی مقالہ اسی شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ اس عہد میں بحیثیت شاعر ان کی شخصیت متعارف تھی، ورنہ ایسے نامور شعراء اور محقق کی نادر چیزیں کیوں کر شائع ہوتیں؟ بہرحال الہ آباد سے ۱۹۷۶ء میں ایک کتاب "غزل: پس منظر و پیش منظر" شائع ہوئی تھی ان کی شاعری کے متعلق صفحہ ۱۹۵ میں یہ الفاظ موجود ہیں۔

"ثاقب عظیم آبادی کی شاعری روایت کی کمر خیز ماحول میں پروان چڑھی۔ ان کے کلام کی شاعرانہ لطافت و اثر آفرینی میں ایک مخصوص قسم کی شائستگی اور سنجیدگی ملتی ہے اور اس سنجیدہ مزاج میں نشاطیہ کیفیت کی ہر یالی مرتسم ہوتی ہے جس میں ایک نئی سطحی کیفیت اور نشاط لذت کا احساس ہوتا ہے جو دراصل شعر کی گمشدہ اثریت ہے جو فکر و احساس کی پراگندگی کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔"

ثاقب عظیم آبادی کا مجموعۂ کلام "سرمایۂ نشاط" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس دسمبر ۱۹۷۶ء کی کتاب میں کیوں کر موجود ہے؟ ظاہر ہے کہ معروف نہ تھے اور ان کا کلام مختلف رسالوں میں شائع و مقبول نہ تھا تو پھر مذکورہ کتاب میں یہ الفاظ کیوں کر درج کیے گئے؟

۳۔ "سرمایۂ نشاط" کے مرتب کا نام سید رضا مختص بہ تمنا ہے۔ ......

۴۔ "یادگارِ عشق" میں حضرت رکن الدین عشق دہلوی ثم عظیم آبادی کے حالات ضرور ہیں لیکن اس میں دیوانِ عشق شامل ہے۔ مرتب "یادگارِ عشق" نے تنقیدی تجزیہ کیا ہے عشق کے شعری مقام و مرتبہ متعین کیے ہیں تحقیق و تنقید کا حق ادا کیا ہے۔ عشق کا دیوان پہلی بار ۱۹۲۹ء میں منظر عام پر لانے کی سعی حضرت ثاقب نے کی تھی۔ مختلف کتابوں اور رسالوں میں اس کتاب کے حوالے موجود ہیں مثلاً:

[الف] "ثاقب عظیم آبادی نے تصوف کے موضوع پر عشق کے تین قلمی رسالوں۔ اسباح السجاد، سلطان العشق، تعلیم الفقرا کے علاوہ "مکتوبات" کا بھی ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ موجود ہیں..."

[بہار تاریخ ادب اردو مرتبہ اقبال جالبی جلد دوم حصہ دوم صفحہ ۵۶]

[ب] معروف محقق عطا کاکوی نے ان الفاظ میں یاد کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"ان کی پہلی کتاب یادگارِ عشق ہے جو حضرت عشق کے حالات اور کلام پر سیر حاصل تبصرہ و تنقید ہے اور اس میں جناب ثاقب نے بڑی داد تحقیق دی ہے:"

[بحوالہ سرمایۂ نشاط صفحہ ۱۱]

Regd. No. MH-B.Y.W 311 — Price Rs 5

THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

6[?]1 Years of Publication ✱ *(Publishing Date: 27-28)* ✱ Issue No. 3 1990 ✱ Telephone No. 359904

Registered with the Registrar of Newspapers at R N No. 14482/57

شاعر

ناطق گلاؤٹھوی

پ: ۱۱ر نومبر ۱۸۸۶ء ——— م: ۲۷ر مئی ۱۹۶۹ء

ترا کلام ہے گو بادۂ کہن ناطق
ہے آشکار مگر اس سے رنگِ فن ناطق
یہ سادگی، یہ زباں، یہ محاورات کا لطف
حسین ہے ترا بوسیدہ پیرہن ناطق

*

[illegible]

اعجاز امام صدیقی اعجاز صدیقی [illegible]

نام: سید ابوالحسن، قلمی نام: ناطق گلاؤٹھوی۔ والد: سید ظہور الدین [م: ۱۹۰۵ء] پیدائش: ۱۱ر نومبر ۱۸۸۶ء۔ کامٹی [ناگپور کے قریب ایک قصبہ] تعلیم گھر ہی پر حاصل کی ۱۸۹۴ء میں گلاؤٹھوی [ضلع میرٹھ] کے منبع العلوم میں داخل ہوئے۔ کچھ دنوں بعد دارالعلوم دیوبند میں داخل ہو گئے۔ دارالعلوم کے ممتاز اساتذۂ علوم و فنون سے تربیت حاصل کی ان میں مولانا محمود الحسن [۱۲۶۸ھ - ۱۳۳۹ھ] مولانا عبد الـ[illegible] [م: ۱۳۴۴ھ] خلیل احمد سہارنپوری [۱۲۶۹ھ - ۱۳۴۶ھ] احمد حسن مراد آبادی [م: ۱۳۳۰ھ] اور ماجد علی جونپوری [illegible] سے دلچسپی کے سبب مولانا رشید احمد گنگوہی [پ: ۱۸۲۸ء - م: ۱۹۰۵ء] کے ارادت مندوں میں شامل ہوئے۔ ناطق [illegible] کا خاندان سیاست میں عملی دلچسپی رکھتا تھا، مرحوم نے بھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ کانگریس اور تحریکِ خلافت میں پیش پیش رہے میونسپل کمیٹی کے ۱۹۲۱ء تا ۱۹۵۰ء ممبر رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مرکزی اسمبلی کے لیے بھی منتخب ہوئے۔

سید معشوق حسین اطہر ہاپوڑوی [خالہ زاد بھائی] کی ترغیب پر کمسنی ہی میں شاعری کی ابتدا کی۔ سید محمد مرتضیٰ بیان یزدانی میرٹھی [پ: ۱۸۵۰ء - م: ۱۹۰۰ء] سے اپنے ابتدائی کلام پر اصلاح لی۔ ان کے انتقال کے بعد خط و کتابت کے ذریعے [۱۹۰۲ء] اپنے کلام پر اصلاح لی [illegible] استاد کے انتقال کے بعد پھر کسی سے اصلاح نہیں لی ——— ناطق مرحوم نے دو شادیاں کی تھیں۔ [illegible] سے ۹ بچے [دو لڑکے اور چار لڑکیاں] پیدا ہوئے۔ ان میں سے چار بچے صغر سنی میں انتقال کر گئے تھے۔ ایک [illegible] بیوی کا انتقال ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مرحوم [illegible] میں مبتلا ہوئے۔ ۲۰ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو اسپتال میں داخل کیا گیا۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۶۹ء کو گھر آ گئے ۲۷ر مئی کو پھر [illegible] ۲۷ر مئی ۱۹۶۹ء کو بھان کھیڑا مسلم قبرستان [مومن پورہ ناگپور] میں سپرد خاک کیا گیا۔

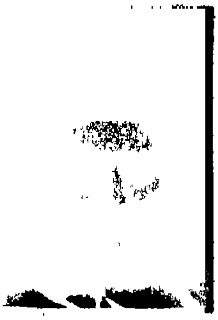
تصانیف ناطق گلاؤٹھوی

[illegible] [مجموعہ ... ابتدائی تخلیقات کا انتخاب] [illegible]

[illegible]

[illegible]

فکرِ امروز



۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۷ء تک اُردو جرائد کی نظمیں، اردو کے پمفلٹ اور اُردو کے اخبارات جو اپنی آزادگوئی اور آزاد خیالی اور آزاد نگاری کی وجہ سے بحق سرکار ضبط ہوئے انھوں نے ملک کی سیاسی زندگی میں کافی سے زیادہ بیداری پیدا کر دی۔ اردو کی سینکڑوں نظمیں ایسی ہیں جنھوں نے ایوانِ سیاست کو لرزا دیا اور ذہنِ استعمار میں زلزلے پیدا کر دیے۔

سول نافرمانی کے زمانے میں حکومت نے اُردو جرائد اور اُردو ادبا پر پابندیوں اور جیل خانوں کے راستے کھول کر اردو زبان کی مقبولیت اور ساحریت پر مہرِ تصدیق لگا دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب اُردو کی قوت اور بھی زیادہ بڑھ گئی اور تمام ہندوستان میں نظمیں پھیل گئیں جن کا ایک ایک شعر ایک شعلہ اور ایک ایک لفظ ایک بم تھا۔ اردو نظموں نے ملک میں عام طور پر بیداری اور احساس پیدا کر دیا اور مؤرخین کے اس قول کی تائید ہو گئی کہ "ادب زوال پذیر قوموں میں زیادہ ترقی پاتا ہے"۔ اگر ترقی یافتہ قومیں بھی ادب کی طرف مائل رہیں تو مجھے یقین ہے کہ ملک میں کبھی زوال ہی پیدا نہ ہو۔

[خطبہ صدارت سے اقتباس مطبوعہ شاعر (آگرہ) فروری ۱۹۳۸ء]

شاعر

ماہنامہ شاعر

اشاعت کا ۶۱ واں سال

جلد — ۶۱
شمارہ — ۴

فون: ۳۵۹۹۰۴

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت: ۵ روپے

زرِ سالانہ	لائبریریوں سے
۵۰ روپے	۶۰ روپے

تاحیات خریداری	معاونین سے	ممالکِ غیر سے
۱۰۰۰ روپے	۱۰۰ روپے	۳۵۰ روپے

ناز اچرن رستوگی۔ حامدی کاشمیری۔ منصور سبزواری
لطیف الزماں خان۔ انیس رفیع۔ ناصر بغدادی
شکیلہ رفیق۔ اسد رضوی۔ راغب مرادآبادی
شاہد میر۔ وامق جونپوری۔ مناظر عاشق ہرگانوی
شمیم قاسمی
۴۶

○

شمارہ ۴ [۱۹۹۰ء] جلد ۶۱

کوئی آنکھ اشکوں سے خالی نہیں

میں اپنے غم زدہ دوستوں کو پرسہ نہیں دے سکتا کہ کس کس شہر کے نام تعزیتی خط لکھوں، اپنے کس کس دوست کے آنسوؤں کو اپنے دامن میں جذب کروں۔ میرا قلم میرے شدید جذبات واحساسات کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ منظر بہ منظر رواں ہوئی آنکھوں نے نام نہاد سیاسی چہروں کو پوری طرح بے نقاب دیکھ لیا ہے۔ میں اپنے شہر کو روؤں کہ پورے ہندوستان کو؟ ہندوستان کے قریب ترین ماضی سے جو خونی داستانیں اس عہد کو دی گئی ہیں وہ سب رفتہ رفتہ مانند پرچھائیں جاری ہیں۔ میں زبوں حال لوگوں کو خطوط لکھ رہا ہوں، ایک ایک گاؤں قصبے اور شہر کو دلاسہ دے رہا ہوں، پُرسہ دے رہا ہوں مگر شاید میں اپنے آپ کو حوصلہ دے رہا ہوں، اپنے آپ کی تعزیت کر رہا ہوں۔ خوف! دہشت، بربریت، درندگی! مذہب کے نام پر سیاسی بھیڑیوں کا ننگا ناچ۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک خوف ہی خوف، سراسیمگی ہی سراسیمگی! کون کس سے داد و فریاد کرے؟ کس سے سوال کرے کہ اے سیاسی لوگو! کیا تمہیں اپنی سیاسی بساط سجانے کا اور کوئی راستہ نہیں سوجھتا؟ کیا تم نے ہندوستان کو اپنی جاگیر سمجھ رکھا ہے؟ تم کہاں سے آئے ہو؟ کیا تم سے پہلے ہندو نہیں تھے؟ کیا تم سے قبل مسلمان نہیں تھے؟ تم تو اپنے اپنے مذاہب کی روح سے بھی واقف نہیں۔ ایک ایک چہرہ دکھ بھری داستانوں سے مسخ ہو رہا ہے۔ اب سے پہلے تو اتنی شدت اختلافات میں نہیں تھی۔ اب تو پورا ملک ہی نفرتوں کی آگ میں جل رہا ہے۔ کوئی ہے جو میرے قلم کو بانٹ لے!!؟ کوئی ہے جو میری آواز ان غریب اور بلکتی ہوئی عوام تک پہنچا دے جو غریبی اور بدحالی سے کسی طرح جوجھ رہے تھے مگر اب تو خوف اور صرف موت کے خون سے نبرد آزما ہیں۔

کہاں ہیں ہندوستانی زبانوں کے قلمکار، فن کار، ادبا و شعراء، وہ سب خاموش کیوں ہیں؟ پدم شری، پدم بھوشن، بھارت رتن، گیان پیٹھ ایوارڈس اور ایسے ہی قومی اعزازات پانے والوں نے اپنے اپنے اعزازی تمغے اب تک کیوں نہیں اتارے۔؟ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے کس انتظار میں ہیں؟ یہ لوگ ان سیاسی بونوں کے خلاف احتجاج کیوں نہیں بلند کرتے، کیوں جہاد کے لیے گھروں سے باہر نہیں آ رہے ہیں۔ ہم سب کس انتظار میں ہیں؟۔

ہندوستان کس کی ملکیت ہے؟ کون اس کا محافظ ہے؟ کس سے سوال کیا جائے؟ جو چہرے آج نمایاں ہیں اور جو پس منظر میں ہیں کیا یہ سب اس ملک کی تباہ کاری کے ذمہ دار نہیں ہو گئے؟ ملک، سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈروں سے بلند ہوتا ہے مگر اب یہ بلندی تو پستی کا نوحہ سنا رہی ہے۔ مندر بناؤ، مسجد بناؤ، گرجے اور گرودوارے بناؤ مگر ملک کو تقسیم کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ ماضی نے ہمیں کیا دیا۔ اپنی تاریخ کو فراموش کر کے جذباتی فیصلوں پر عمل کرنے والے آج رو رہے ہیں۔ تم اب کونسی خونی تاریخ لکھنے کے خواب سوچ رہے ہو؟ اگر دماغ ہے تو اپنی صحیح تاریخ پہچانو اور اگر دل بھی رکھتے ہو اور اپنی اپنی سماعتوں پر ناز ہے تو ان چیخوں کو بھی سنو جو تم سے پکار پکار کر کچھ کہہ رہی ہیں۔ اس مٹھی بھر بھیڑ سے مرعوب مت ہو جاؤ جس کے پاس جسم تو ہے مگر سوچنے والا دماغ نہیں۔ غریب اور کچلی ہوئی بے زبان بھیڑ کو طاقت سے ضرور مغلوب کیا جا سکتا ہے اور یہی ہو رہا ہے مگر میں یہ سارے سوال کس سے کروں، میں اپنے یہ خیالات کس پر ظاہر کروں۔ میری آواز میں آواز ملانے والے کہاں ہیں؟ میری پیاری زبان اردو کے قلم کاروں کو کیا ہو گیا ہے۔ اکاڈمیاں کیوں چپ ہیں؟ قومی ادارے کیوں خاموش ہیں؟ احتجاجی جلسے کیوں نہیں ہو رہے ہیں، ماتمی جلوس کیوں نہیں نکل رہے ہیں۔ اگر میرے جذبات واحساسات تنہا میرے نہیں ہیں، اس جمہوری ملک کے تمام لوگوں کے یہی جذبات واحساسات ہیں، سبھی گریہ کناں ہیں، رو رہے ہیں، بلک رہے ہیں تو پھر یہ عوامی طاقت کس کے انتظار میں ہے؟ اس طاقت کو رہنمائی ملنی چاہیے ہندوستانی زبانوں کے قلم کاروں سے، فن کاروں سے، شاعروں، ادیبوں سے۔ موسیقاروں سے، ملک کے تمام فلاحی ادارے مندر و مسجد کے خلاف تنازعات سے اوپر اٹھ کر اپنی آواز بلند کریں۔ اس ملک کو بچائیں کہ کہیں ان کے نیک مقاصد ان کے اپنے راستے کی رکاوٹ نہ بن جائیں ——

میری آواز ان کے ساتھ ہے ——

सांझ भई उर दिया जरे   पिया न आये पास।
नैननसे दुइ गंग बहीं   उर डूबन लागी आस॥

سانجھ بھئی اور دیا جرے پیا نہ آئے پاس
نینن سے دو گنگ بہیں اور ڈوبن لاگی آس

सांझ (سانجھ) شام   दिया (دیا) چراغ۔
नैनन (نینن) آنکھ۔

"شام کا وقت ہوا اور چراغ بھی جل گئے مگر پیا اب تک نہ آئے۔ آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے اور ناامیدی ہونے لگی۔"

(۸۲)

یہ بڑا پیارا دوہا ہے جس میں قابل تعریف بات یہ ہے کہ محبوبہ خود اپنی آنکھوں سے کہتی ہے۔

नैना रे तुमही बुरे   तुमसा बुरा न कोय।
आपही प्रीत लगायके   आपही बैठे रोय॥

نیناں رے تم ہی برے، تم سا برا نہ کوئے
آپ ہی پیت لگائے کے آپ ہی بیٹھے روئے

"اے آنکھو! تم ہی بُری ہو اور تمہارے برابر کوئی برا نہیں خود ہی محبت کی آگ لگاتی ہو اور خود ہی بیٹھی رویا کرتی ہو!"

۸۳

पीतम तुम परदेस सिधारे लै गये मेरा चैन।
तुमरे कारन राम दुहाइ - तड़पत हूं दिन रैन

پیتم تم پردیس سدھارے لے گئے موا چین
تمرے کارن رام دھائی تڑپت ہوں دن رین

"اے پیارے تم پردیس گئے اور میرا چین بھی لے گئے۔ تمہاری جدائی میں دن رات تڑپ رہی ہوں۔"

(۸۴)

منتخبات ہندی کلام مرتبہ: ڈاکٹر جعفر حسن [پی ایچ ڈی (ہائیڈل برگ)، سند یافتہ مدرس جرمن (جامعہ برلن) استاد معاشیات و عمرانیات، کلیہ جامعہ عثمانیہ] ۱۹۳۰ء میں دی حیدرآباد بک ڈپو چادر گھاٹ حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی تھی۔ ۲۳۶ صفحات کی ڈیمائی سائز کی کتاب میں فہرست مضامین کے ذیل میں تمہید کے تحت ہندی کی خصوصیات، ہندی بھاشا اور مسلمان کے علاوہ ہندی جذبات عالیہ (اخلاق تصوف فلسفیانہ مسائل) عاشقانہ تخیلات، عشقیہ دوہے، متفرقات اور ضمیمہ [کتب برائے مطالعہ] عنوانات دیے گئے ہیں۔ سو دوہوں کا خوبصورت انتخاب مع مبسوط حاشیوں کے ایک اہم کتاب ۔۔۔ جو اب کم یاب ہے۔

MAKHDOOM MOHIUDDIN

URDU HALL,
ABID ROAD,
HYDERABAD-A. P.

Date ۱۳ دسمبر ۶۹

اعجاز صاحب آداب

بھیجی ہے ایک نظم اب دوسری نظم کبھی بھیج دوں گا

مخدوم

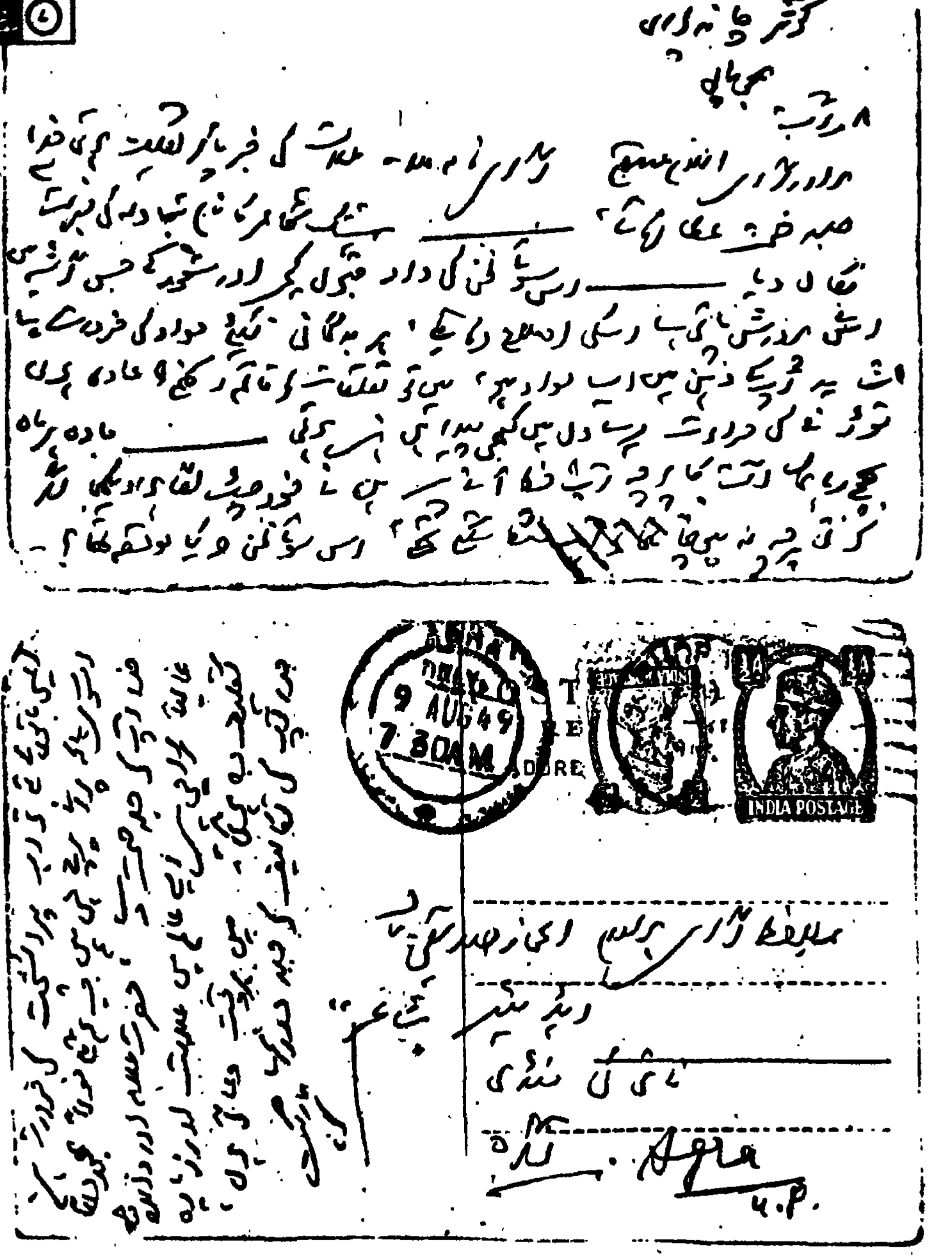
پیار کی چاندنی

چپہ چپہ دمکتا ہوا ہے کہ آرزو ہوں میں
خون بہا نے وفا دل کی سوغات تھا
جیب و دامن کی وارفتگی دیکھیاں
جرم کیا جرمِ غم کی مکافات کیا
عشق کے مشغلے عشق کے ولولے
ہم سفر صبح کیا شام کیا رات کیا
چشم اہلِ ہوس مسکراتی رہے
چشم اہلِ ہوس مسکراتی رہے
ابنِ آدم کے سر جھڑ جاتے رہو
زندگانی سرِ دار گاتی رہے
یاد ہو یاراں میں اک جامِ غم اور دو
رات کی تیرگی سوز گاتی رہے
دل بڑھاتی رہی ہاتھ کی نرمیاں
پیار کی چاندنی جھلملاتی رہے

مخدوم

ابوسعید محمد مخدوم محی الدین [پ: ۴ فروری ۱۹۰۸ء حیدرآباد ۔ م: ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء دہلی ۔ تدفین: حیدرآباد] نے اپنی یہ نظم شاعر کے لیے ارسال کی تھی۔ مذکورہ نظم ان کے دوسرے شعری مجموعے "گلِ تر" [۱۹۶۱ء] میں شامل تھی۔ اوّلین شعری مجموعہ "سرخ سویرا" [۱۹۴۴ء] شائع ہوا تھا۔ تیسرا شعری مجموعہ "بساطِ رقص" [۱۹۶۶ء] تھا جس میں دونوں شعری مجموعے بھی شامل کر لیے گئے تھے۔ نظم "پیار کی چاندنی" بساطِ رقص کے صفحہ نمبر ۱۶۶، ۱۶۷ پر درج ہے۔ اس کتاب کو ۱۹۶۹ء کا ساہتیہ اکادمی ایوارڈ تفویض کیا گیا تھا۔

کوثر چاندپوری بنام اعجاز صدیقی



[سید علی کوثر] کوثر چاندپوری [پ: ۸ر اگست ۱۹۰۴ء چاندپور ضلع بجنور۔
م: ۱۳ر جون ۱۹۹۰ء دہلی] اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ادیب اور تجربہ کار
معالج۔ تنقید، تاریخ، طب، افسانہ، ناول، طنز و مزاح، رپورتاژ، انشائیہ اور
بچوں کا ادب تخلیق کرنے والے۔ تقریباً ایک سو پچاس کتابوں کے خالق ایک اہم علمی و
ادبی شخصیت۔ مدیرِ شاعر قبلہ اعجاز صدیقی مرحوم کے دیرینہ بزرگ رفیق۔
۸۶ سال کی عمر میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔



شہریار

جو کچھ رستوں سے گلی سڑکوں کا رخ کیا تھا
کھڑاؤں پہلے اتار دیتے
بدن کو کپڑوں سے ڈھانپ لیتے
تمہاری سیراب نیندلیوں پر ثبت نہ جھنے ہیں کچھ رہے ہیں
کہ تم نے راتوں کو رات سمجھا
ہر ایک موسم میں اس کی نسبت سے پھل اُگائے
بدن ضرورت غذا ہمیشہ لطیف ملی ہے
ذہانت اختصار کیا پڑا ہے
جو کچھ رستوں سے گلی سڑکوں کا رخ کیا ہے

تمہاری یادوں کا یہ سہارا

تمہاری یادوں کا یہ سہارا
کہ جس پہ اب تک تھا ناز مجھ کو
اکیلے پن میں نہ کام آیا
تو آتشکدہ کی امید تھی
جو اس کے سیلاب کی خبر
جنوں میں اب کر کے دم ہنسا ہے
جو سب تو ہو گا تھا ہو رہا ہے
کہ جو افسوس ہے تو اس کا
یہ بات تو بھی بھلا نہ پاؤ
کہ جو سے میرے تعلق بنا ہے

غزل

جنوں کے جن کے تقاضے ہیں بدلے جاتے ہیں
کہ ساتھ وقت کے لو ہم بھی بدلے جاتے ہیں
زمیں نے ہم کو بہت دیر میں قبول کیا
جلی حروف میں یہ بات لکھے جاتے ہیں
ضرور ہم سے ہوا ہے کہیں پہ کوتاہی
تمام شہر میں سناٹے بچھے جاتے ہیں
کہ آنے والا ہے دریا ترے زوال کا وقت
سبھی ہم سے لگ کنارے پہ ٹھہرے جاتے ہیں
دلوں کو جن سے تعلق بڑا تمام ہے اب
اُسی کا راستہ دن رات دیکھے جاتے ہیں

اسسٹنٹ میڈیکل کالج کیمپس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

سلیم اختر
الجودت، ۵۹۹ - III سی جہانزیب بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور ۸

تنقیدی آشیرباد

مقام: شہر کا فائیو سٹار ہوٹل

وقت: سہ پہر

منظر: ایئر کنڈیشنڈ ہال میں شہر کی خوش پوش خواتین اور حضرات جمع ہیں۔ اسٹیج پر ایک وزیر صاحب بطور صدر تشریف فرما ہیں ایک اور وزیر صاحب مہمان خصوصی ہیں۔ ان کے ساتھ صاحب کتاب براجمان ہیں۔

ایکشن: جلسہ کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ ایک ایک نقاد آتا ہے۔ اور حق دوستی یا حق نمک ادا کرتا ہے تالیوں کی گونج میں نقاد آتا ہے اور تالیوں کی گونج میں نقاد جاتا ہے۔ تعریف کی حلیم تیار ہو رہی ہے اور ہر نقاد بقدر ہمت اوست اس میں گرم مصالحہ ڈالتا جاتا ہے۔

نتیجہ: تعریفیں سن سن کر صاحب کتاب کا نفس موٹا ہوتا جا رہا ہے۔ اور کئی ہزار کے بل کے باوجود تقریب مہنگی نہیں محسوس ہوتی۔

حاصل: ٹائیں ٹائیں فش!

کسی تنقیدی مقالے کا ایسا ڈرامائی آغاز کوئی اچھی بات نہیں کہ تنقیدی عمل کا ڈرامابازی سے کوئی تعلق نہیں لیکن کتابوں کی رونمائی کی تقریبات جس کثرت سے ہو رہی ہیں اس نے آپ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا اب تنقید کا منصب صرف یہی رہ گیا ہے کہ نقاد تعریف کے ڈرامہ کا ایک کردار بن کر رہ جائے؟ اسی لئے بعض اوقات کسی کا نقاد کہنا الزام لگانے کی گالی کی صورت اختیار کرکے گویا کٹہرے میں لا کھڑا کرتا ہے۔ میں کمزور اعصاب کا نقاد ہوں اس لئے فوراً اقبال جرم کرکے معافی کا خواستگار ہوتا ہوں۔ لیکن یہ نہ سمجھ لیجئے کہ سب نقاد میری مانند کمزور اعصاب کے حامل نہیں ہوتے اس لئے بیشتر کا خود کو مجرم سمجھنا تو درکنار انہیں تو شاید کسی طرح کے جرم کا احساس نہ ہوتا ہوگا۔ ہر نقاد نے دوستوں کی فرمائش پر کتابوں کی رونمائی کی تقاریب کے لئے کبھی نہ کبھی ایسے مضامین ضرور لکھے ہوں گے جنہیں لکھتے ہوئے وہ شرمایا ہوگا چاہے جلسے میں پڑھتے وقت نہ گھبرایا ہو۔ لیکن بعد میں کتاب کا معیار اور اپنی تعریف میں تفاوت کا احساس کرکے یقیناً پشیمان ہوا ہوگا اسے کہتے ہیں:

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا!

”تقریبی مضامین“ کا تو بطور مثال تذکرہ کیا جا رہا ہے۔ ورنہ دیباچے، پیش لفظ، مقدمے، فلیپ اور سرورق کے لئے آراء سبھی کا یہ عالم ہے کہ ان میں مروت کے لئے خلوص تو بہت ملتا ہے مگر تنقید نہیں ہوتی اس لئے انہیں تنقید کی بجائے ”تنقیدی آشیرباد“ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں بھی اس تنقیدی گناہ کا مرتکب ہوا ہوں۔ اور میں نے بھی دل کھول کر تنقیدی آشیرباد دیا ہے۔ ہر چند کہ نہ میں تنقید کا گرو ہوں۔ اور نہ میرا کوئی چیلا —— لیکن ٹھہرئیے! میں جو غیر مشروط طور پر ”تقریبی مضامین“ کی ”سرپرستانہ تنقید“ کے خلاف لکھ رہا ہوں تو اس ضمن میں پہلے تو یہ کہ ایسی کہ تنقید بیانات خود کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ تنقید کا ”مریضانہ“ بن جانا یا مضمون کا توصیفی ہو جانا مذہبات خودغرضی کا باعث ہے یا محض ناقص خیالات ہی خام آراء کی علامات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خواب جوانی کی مانند تنقید کی بھی متعدد اور متنوع تعریفیں کی گئی ہیں۔ اور سب کلیتاً درست نہ ہونے پر بھی جزوی صداقت کی حامل تو یقیناً ہوتی ہیں۔ اسی لئے اس ضمن میں معروف ناقدین کی آراء جمع کرکے ان کی حسن و قبح کی جانچ کے برعکس ہم مختصراً اسے ایسی صداقت کی حامل یہ سیدھی سی بات کہتے ہیں کہ تنقید تخلیق کی میزان ہے۔ عملاً نقد تخلیقات کی خوبیوں اور خامیوں کی ”بیلنس شیٹ“ مرتب کرنے کا نام ہے اس لئے نقاد کو منصف یا جج سمجھنے پر اعتراض ہو تو پھر بیلنس شیٹ کی رعایت سے اسے آڈیٹر تو یقیناً سمجھا جا سکتا ہے جس طرح آڈیٹر ”ڈیبٹ اور کریڈٹ“ کی صورت میں بیلنس شیٹ تیار کرتا ہے۔ تنقید کا عمل محدود ہے تو محض پر کوئی تکلف تک

محدود رہتی ہے۔ لیکن تنقید اپنی وسیع ترصورت میں جب فلسفیانہ طرزِ استدلال اپناتی ہے تو اگر ایک طرف وہ نظریہ سازی کرتی ہے تو دوسری طرف ان نظریات کی روشنی میں فرد، معاشرہ، اجتماعی شعور، تاریخ اور عصر کا تجزیاتی مطالعہ بھی کرتی ہے۔ تنقید کی اصل اہمیت اور اس کا جواز بھی اسی سے مہیا ہوتا ہے۔ اسی لئے اگر بلحاظ معیار اور اسی بنا پر بلحاظ اہمیت محض شارح اور نقاد میں خاصہ تفاوت ملتا ہے۔ تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ شارح شعر میں علمِ بیان کی خوبیاں اجاگر کر کے اور مشکل الفاظ کے معانی بیان کر دینے کے بعد جب خیال کی تشریح کر دیتا ہے تو اس کی دانست میں اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ جب کہ نقاد کا کام وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں پر شارح نے اپنا کام ختم کیا تھا۔ ادھر بیشتر تقریبی مضامین کا یہ عالم ہے کہ وہ تشریح سے آگے نہیں بڑھتے اور یہ تشریح بھی باندازِ مدح ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مضامین کو مدلل مداحی بھی تو نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ اپنے لب و لہجہ کے باعث یہ تو غیر مدلل مداحی ثابت ہوتے ہیں اگرچہ ایسے مضامین تعلقاتِ عامہ کے فروغ کا باعث بنتے ہیں لیکن وہ حضرات جن کا یہ شوق نہیں وہ بھی اس امر کو ملحوظ رکھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ مضمون دوست کی فرمائش اور اس کی خوشنودی کی خاطر لکھا جا رہا ہے اور دوستوں کا یہ عالم ہے

انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

یہ میرا ذاتی تجربہ ہے (ایسا تجربہ جس کی دیگر ناقدین بھی توثیق کر سکتے ہیں) کہ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ تعریف کے باوجود بھی دوست اس لئے ناخوش رہتا ہے کہ یہ تعریف اس کی توقعات کے مطابق نہ تھی۔ چنانچہ ہم نے توصیفی مضامین نہ لکھ کر تو دوست گنوائے ہی تھے مگر بعض اوقات توصیفی مضامین لکھ کر بھی دوست گنوا بیٹھے کہ تنقید کی ہنڈیا میں تعریف کا مصالحہ کم رہ گیا۔

میں نہیں جانتا وہ کون کافر تھا جس نے سب سے پہلے کتابوں کی رونمائی کی تقریبات کی طرح ڈالی لیکن جو کوئی بھی تھا وہ قطعاً ہمارے شکریہ کا مستحق نہیں۔۔۔ لیکن ٹھہریے شاید میں یہ فیصلہ جلدی میں کر رہا ہوں۔ اس لئے کہ ہر امر کسی فرد سے متعلق ہوتا ہے اور ہر واقعہ اپنے عصر سے مشروط ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا میر تقی میر نے اپنے کلیات کی تقریبِ رونمائی کرائی تھی؟ کیا دیوانِ غالب کو کسی فائیو سٹار ہوٹل میں لانچ کیا گیا تھا؟ اور کیا مولانا شبلی نعمانی نے "سیرۃ النبی" کی تقریبِ افتتاح کے لئے کسی وزیر کو زحمت دی تھی؟ ان سب کا جواب اس لئے نفی میں نہیں کہ اس عہد میں پبلسٹی کی یہ صورتیں نہ تھیں بلکہ اس لئے نفی میں ہے کہ وہ لوگ SNOW BIZ کے عہد میں سانس نہ لے رہے تھے۔ اس لئے ان کا سب سے بڑا انعام تخلیق ہوتی تھی۔ واضح رہے کہ میر خود کو "مستند" سمجھتے تھے۔ اس لئے انہیں کسی کی سند کی ضرورت نہ تھی۔ غالب نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا کے قائل تھے۔ اس لئے دیوان کی اشاعت پر شیفتہ، حالی، اور مجروح جیسے احباب کو مقالات لکھنے کی زحمت نہیں دیتے۔۔۔ ویسے یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ اگر غالب نے دیوان کی تقریب کرائی ہوتی تو صدارت کس سے کراتے، میری ذاتی رائے میں شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفر کے برعکس وہاں کے انگریز حاکم سے صدارت کراتے کہ تقریبِ رونمائی کا پھل اس طرح مل سکتا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ آج کا زیرک ادیب صدارت کیلئے ہمیشہ کسی وزیر کا متلاشی ہوتا ہے۔ کہ اس بہانہ وزیر صاحب سے تعارف کی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور دوسرے وزیر صاحب کی ذاتِ بابرکات کی وجہ سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمائندے اور اخبارات کے فوٹوگرافر بھی آ جاتے ہیں۔ ادھر ہمارے اخبارات کا وطیرہ بھی یہ ہے کہ خبر اور تصویر کی اہمیت وزیر یا مہمانِ خصوصی کے اسٹیٹس کے حساب سے متعین ہے لہٰذا کتاب، صاحبِ کتاب یا مقالہ نگاروں کے اسماء کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ ہم جلد بازی کے دور میں سانس لے رہے ہیں اس لئے ہم انسٹنٹ کافی کے عادی ہیں۔ اور شارٹ کٹ کے ذریعہ سفر کرتے ہیں۔ لیکن کافی کی مانند انسٹنٹ فیم نہیں ملتی اور نہ ہی ہم محنت اور لگن کی بجائے شارٹ کٹ سے شہرت کی بلندیوں کو چھو سکتے ہیں۔ آج ہم فیض، ندیم اور اشفاق احمد کو مشہور اور مقبول تصور کرتے ہیں لیکن کون جانے انہوں نے اس مقام کے حصول کیلئے کتنی محنت کی ہوگی۔

ادھر ادیب کے لئے اپنی پہلی کتاب کا تحرک کچھ پہلے بچے یا پہلے پیار کی پیدائش جیسا ہوتا ہے اور مصنف سمجھتا ہے کہ میں نے اس کتاب سے دنیا کو تسخیر کر لیا ہے لیکن وہ یہ اساسی حقیقت فراموش کر دیتا ہے کہ آج شعر کہنا ایک آزاد اور خود کار تسم کا دو دھاری عمل ہے۔ اس لئے کہ آج کا شعر کسی خلا میں نہیں تخلیق پاتا۔ اس کے پیچھے کئی سو سال کی شعری روایات ہوتی ہیں۔ اس لئے شعر کے اچھے برے مقبول یا نامقبول ثابت ہونے کا انحصار محض اس کی فنی خصوصیات پر نہیں ہوتا بلکہ اچھے خیال سے بھی وہ اچھا شعر قرار نہیں پاتا۔ دراصل آج کے شعر نے خود کو دو طرح سے منوانا ہے ایک تو کئی سو برس پر محیط شعری تاریخ کے تناظر میں اپنے جنم کا جواز فراہم کرنا ہے۔ اور دوسرے عصری شاعری میں اپنے وجود کا اثبات کرنا ہے۔۔۔ اس دوہرے امتحان میں کامیابی کے بعد ہی وہ شعر زندہ شعر قرار پائے گا۔ غزل کی تاریخ ہزاروں شعراء پر مشتمل سہی مگر کتنے شاعر زندہ رہ سکے، اس طرح آج کے شعراء جو شاعری کر رہے ہیں۔ ان میں سے کتنے وقت کی میزان کا پلڑا جھکانے میں کامیاب ثابت ہوں گے، حالت تو یہ ہے کہ شعری مجموعے اوراقِ گل کی طرح آراستہ چھپنے کے ساتھ ہی خزاں گزیدہ سپنوں کی مانند وقت کے شجر

کی ڈالی سے یوں سمجھ جاتے ہیں کہ ـــــــ "رے گئی پون ارشا" اسی لئے تو زیادہ تر کتابیں بڑے تخلیق کاروں کے "تخلیقی سفر" بلکہ آج نہایت غبار راہ میں ہے" کے مقابلے میں محض گرد راہ ثابت ہوتی ہیں ـــــ اور اسی موقع پہ تنقید کے کردار کا آغاز ہوتا ہے۔ ہم اسے "مربیانہ تنقید" کہیں، "تقریبی تنقید" کہیں، یا "تنقیدی آشیرباد" ـــــ یہ ایک ہی دو تو ہے اور اس کا نقصان اس امر میں مضمر ہے کہ دوستی، تعلقات یا مفادات کی خاطر ناقص کے نقائص نہیں گنوائے، اور مقام کی خامیوں کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ اگر یہ نقاد کی کم نگاہی کی وجہ سے ہو تو کوئی حرج نہیں کہ وہ اتنی ژرف نگاہی کا حامل نہ تھا کہ تخلیق کا تفصیلی تجزیہ کر سکتا لیکن ہوتا یہ ہے کہ نقاد جانتے بوجھتے اپنی تنقیدی بصارت کو MYOPIC بنا لیتا ہے۔ جس کا اعتراف بالعموم تقریب رونمائی کے بعد کچھ ان الفاظ میں کیا جاتا ہے۔ "یار! کتاب تو بس ایسی ویسی ہی تھی مگر کیا کرتا اپنے دوست کی کتاب جو ٹھہری!"

"مربیانہ تنقید" کے فروغ میں انفرادی سطح پر دوستانہ تعلقات سے لے کر اجتماعی سطح پر ادبی گروہ بندیوں تک ـــــ کئی طرح کے عوامل کارفرما نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اپنے گروپ کی ترقی، قوت اور دہشت میں اضافہ کے لئے یہاں بڑے بڑے فنی حربے اپنائے جاتے ہیں وہاں "تنقیدی آشیرباد" میں بھی فراخ دلی سے کام لیا جاتا ہے۔ بے معنی نظم میں اسرارِ حیات تلاش کئے جاتے ہیں۔ جس افسانہ کی چول چول ڈھیلی ہو اسے روحِ عصر کا استعارہ قرار دیا جاتا ہے۔ فنی لحاظ سے ناقص ناول صدی کا بہترین تخلیق قرار پاتا ہے ـــــ اور رُلا دینے والے انشائیے میں شگفتگی کے ایسے تازہ منظر دیکھا جاتا ہے۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ انہیں لغوی الہام نظر آتا ہے۔

لیکن اس کے برعکس صورتِ حال بھی کوئی ایسی دل خوش کن نہیں ہے اور یہ ہے "مربیانہ کے مقابلے میں مخاصمانہ تنقید" ـــــ جس میں اگر ایک انتہا پر انفرادی بغض کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری انتہا پر یہ گروہی کینہ کی مظہر ہوتی ہے۔ اس کا واحد مقصد صرف کردار کشی ہے اور بس! اگر مربیانہ تنقید میں خامیاں نہ دیکھنے کے لئے نقاد ایک آنکھ بند کر لیتا ہے تو "معاندانہ تنقید" میں خوبیاں نہ دیکھنے کو نقاد دونوں آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ اور یوں تنقیدی بددیانتی اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ جاتی ہے۔

ہمارا معاشرہ ہر حوالے میں شارٹ کٹ کا متلاشی رہتا ہے۔ چنانچہ ادبی شہرت کا شارٹ کٹ تقریبات کے بعد اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں اور ادبی کالموں کی صورت میں تلاش کر لیا گیا ہے بلکہ دیکھا جائے تو ادبی ایڈیشن اور ادبی کالم ـــــ ادبی تقریبات کی ضمنی پیداوار نظر آتے ہیں۔ ادبی ایڈیشنوں میں رپورٹنگ ہوتی ہے۔ اور تصویر یں چھپتی ہیں جب کہ کالم میں تعریف کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں۔ (یا پھر ٹانگ کھینچی جاتی ہے) شاید اسی لئے اب ادبی جرائد کے مدیران کے برعکس ادبی ایڈیشنوں کے نگران اور کالم نگار "بادشاہ گر" بن چکے ہیں۔ ادھر کالم کے ذائقہ اور کالم نگار کی آرا کی اہمیت کا انحصار کالم نگار کی ذاتی پسند و ناپسند اور اسلوب کے ساتھ ساتھ اس کی نیت اور شخصیت میں اخلاقی جرأت کے جوہر پر بھی ہوتا ہے۔ صرف اسی ایک بات پر کالم کی اور کالم نگار کی رائے کی اہمیت کا تعین ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے نام سے لکھنے کی جرأت بھی رکھتا ہے یا نہیں؟

ـــ گر یہ نہیں تو بابا باقی کہانیاں ہیں!

صاحبو! یہ ہے ہمارے عہد میں تنقید کا معکوس سفر ـــــ ایسا معکوس سفر جو اسے انتہا تک لے آیا۔ کہ صبح کی تنقید میں شام کو پنساری پڑیاں باندھتا ہے۔ مگر یہ قابلِ افسوس یا قابلِ مذمت اس لئے نہیں کہ یہ سب کچھ عصری تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اگر جیسی روح ویسے فرشتے والی بات سچ ہے تو پھر جیسے ادیب ویسے نقاد والی بات کو بھی درست ہی سمجھنا چاہئے۔

ہم ایسے دور انحطاط میں سانس لے رہے ہیں۔ جس عہد میں بنیادی صداقت کے حامل اداروں کو گھن لگ چکی ہو۔ جہاں قدروں کا زوال اجتماعی المیے کو جنم دے رہا ہو۔ جہاں حق اور انصاف جیسے الفاظ محض "حرف مکرر" کی صورت اختیار کر چکے ہوں اور جس معاشرہ کا ٹریڈ مارک منافقت ہو تو پھر وہاں کے تخلیق کار اگر محنت اور فنی لگن کی بجائے تنقیدی سرپرستی کے خواہاں ہیں تو یہ مروّج چلن کے عین مطابق ہے۔ اسی طرح نقاد اگر برا لکھنے والے کو حیاتِ جاودانی کی سندیں تقسیم کرتے ہیں تو وہ کیا کریں اگر انہیں بھی تو اس معاشرہ میں اپنے ادیب دوستوں کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے۔ جب معاشرہ کا ہر سرکردہ شخص قول اور فعل کے تضاد کی عملی تصویر پیش کر رہا ہو تو پھر نقاد کی گفتگو اور تحریر میں بُعد کی شکایت کیوں؟

اور آخری بات ـــــــ

یہ مضمون اقبالِ انجم نے یاد دہانی کرایا، اس کا جواب آپ پر چھوڑتا ہوں۔

مٹھی بھر غزلیں

محمد علوی

ہزل

وہ منظر کیسا ہوگا
تم نے تو دیکھا ہوگا
راتوں رات اس بستی کا
موسم بدل گیا ہوگا
پہلی بوند گری ہوگی
پھر آنگن دریا ہوگا
بچے بھیگ رہے ہوں گے
گھر میں شور مچا ہوگا
یہاں وہاں دیواروں سے
پانی اُتر رہا ہوگا
اُجلے اُجلے بستر پر
پھر پانی ٹپکا ہوگا
پانی گندہ میلا سا
گلی گلی پھرتا ہوگا
پھر بجلی چمکی ہوگی
پھر وہ چونک پڑا ہوگا
ایسے موسم میں اس نے
مجھ کو یاد کیا ہوگا
کئی دنوں کے بعد علوی
سورج پھر نکلا ہوگا

◆

بچے بچے باہر رہتے ہیں
گھر میں آکر مر رہتے ہیں
ایک ذرا سا دل ہے اپنا
لوگ اس میں کیونکر رہتے ہیں
خوابوں کا اک شہر ہے جس میں
طرح طرح کے ڈر رہتے ہیں
اک جیسے دن رات ہیں پھر بھی
روز نئے چکر رہتے ہیں
آپ اگر ملنا چاہیں تو
شام کو علوی گھر رہتے ہیں



◆

سچ تو یہ ہے کہ گماں ہوں میں بھی
تو نہیں ہے تو کہاں ہوں میں بھی

جن میں جل بجھ گئے احباب مرے
ان مکانوں کا دھواں ہوں میں بھی

موت کی سمت سفر ہے سب کا
ساتھ میں سب کے رواں ہوں میں بھی

مجھ میں رہتی ہیں یہ پریاں کیسی
کیا کوئی اندھا کنواں ہوں میں بھی

یاد کرتا ہوں پرانی باتیں
سوچتا ہوں کہ جواں ہوں میں بھی

جھوٹ ہی جھوٹ بھرا ہے مجھ میں
کسی مجرم کا بیاں ہوں میں بھی

خواب میں دیکھ کے خود کو علوی
ایسا لگتا ہے کہ ہاں ہوں میں بھی

۹۔ سمیر وہار سوسائٹی، سرکھیز روڈ، احمد آباد ۳۸۰۰۵۵

◆

کیوں نہ مہکیں گلاب آنکھوں میں
ہم نے رکھے ہیں خواب آنکھوں میں
رات آئی تو چاند سا چہرا
لے کے آیا شراب آنکھوں میں
دیکھو ہم اک سوال کرتے ہیں
لکھ کے رکھنا جواب آنکھوں میں
اس میں خطرہ ہے ڈوب جانے کا
جھانکیے مت جناب آنکھوں میں
کبھی آنکھیں کتاب میں گم ہیں
کبھی گم ہے کتاب آنکھوں میں
کوئی رہتا تھا رات دن علوی
انہی خانہ خراب آنکھوں میں

◆

اٹھی کچھ ایسے بدن کی خوشبو
سمٹ گئی پیرہن کی خوشبو
سحر ہوئی تو عجب ادا سے
کلی میں اتری کرن کی خوشبو
ہواؤں سے دوستی نہ کرنا
لٹا نہ دینا چمن کی خوشبو
مزے اڑاؤ گے ہجر توں کے
لئے پھرو گے وطن کی خوشبو
اندھیری راتوں میں دیکھ لینا
دکھائی دے گی بدن کی خوشبو
یہ کون علوی چلا گیا ہے
سمیٹ کر انجمن کی خوشبو

بلراج ورما

۲۴-ڈی، پاکٹ ۔ ۱۳، میور وہار، دہلی ۔ ۱۱۰۰۹۱

سدھارتھ

(سدھارتھ ۔ گوتم ۔ بدھ ۔ ایک کیفیت کے نام)

راجہ بوڑھا تو تھا ہی ۔ اس پر اُس موذی بیماری کا شکار جو اُس کے عہد کے دھنونتریوں نے ہر اعتبار سے لاعلاج قرار دے رکھی تھی ۔ ایک طویل مدّت تک اس تکلیف میں مبتلا رہنے کی وجہ سے وہ اتنا مجبور اور لاغر ہو گیا تھا کہ ہزاروں کوسوں پر پھیلی اپنی وسیع و عریض سلطنت کی باگ ڈور اپنی پُرانی آن بان اور شان سے سنبھالے رکھنا اب اس کے لیے کسی طرح ممکن نہ رہا تھا ۔

راجہ کی رانیاں جڑواں بہنیں تھیں جنہیں اُس نے ایک ہی بیاہ میں ایک ہی دن پر بیاہ کیا تھا ۔ اتفاق سے دونوں کے ہاں اولاد بھی تقریباً ایک ساتھ ہوئی ۔ دو بیٹے ایک ہی ہفتہ کے اندر ۔ غالباً اسی وجہ سے محل کے پروہت نے ولی عہد کے چناؤ کے سلسلے میں کوئی قطعی رائے دینے سے انکار کر دیا تھا ۔ وہ کسی ایک راجکمار کو ساری حکومت سونپ دینے کے حق میں نہ تھا ۔

رانیاں جُڑواں بہنیں تھیں ۔ اُن کے جنمنے کے اوقات کا وقفہ بھلے چند پلوں کا رہا ہو مگر جو دنیا میں پہلے وارد ہوئی وہ بڑی تو تھی ہی ۔ اُس کا بیاہ بھی چھوٹی سے چند لمحے پہلے ہوا تھا مگر اس کا کیا جواب کہ چھوٹی کے شہزادے کا جنم بڑی کے راجکمار سے ہفتہ بھر پہلے ہوا تھا اور اس لحاظ سے وہ دوسری یعنی بڑی بہن کے بیٹے سے بڑا تھا ۔ جوان ہو کر دونوں راجکمار ایک جیسے شور بیر اور باشعور نکلے ۔ وہ اپنے اپنے حقوق کے بارے میں پورے طور پر چوکنے تھے اور جانتے تھے کہ والد کے بعد حکومت کی گدی کے دونوں برابر کے حقدار رہے ۔ گدی پہلے ہی ایک تھی ۔ بگڑ ملک تو بڑا تھا ہندو دیو مالا کے سب سے اُتم اور سمجھ دار حکمراں مہاراج رام چندر جی نے اپنی حکومت کو اپنے دو بیٹوں میں بانٹ کر ایک ایسی پرتھا کا بیج بو دیا تھا جس کا اثر اتنے یُگ بیت جانے پر بھی اس ملک میں قائم تھا ۔ حالات کے پیش نظر محل کے پروہت یعنی راج گورو نے

مشورہ دیا کہ ریاست کی تقسیم کر دی جائے ۔ بوڑھے راجہ کو کچھ کم مگر اس کی دونوں رانیوں کو یہ بھا ؤ بڑا پسند آیا ۔ مائیں ہونے کے ناطے اپنی اولاد کے حقوق کا تحفظ دونوں کے لیے فطری تھا ۔ خاصی تگ و دو کے بعد حکومت کے دوسرے مشاہیر نے بھی شاہی پروہت کی بات مان لی ۔

دونوں راجکماروں کے اپنے اپنے مذہبی اور سیاسی صلاح کار تھے جن کا فائدہ اسی میں تھا کہ وطن کا بٹوارہ ہو جائے ۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں نے جو مذہبی پیشوا بھی تھے اور سیاسی سربراہ بھی اپنے الگ الگ پیروکار تیار کر رکھے تھے اور یہ سب کچھ اس طرح ہوا تھا کہ عوام یعنی پرجا کے لوگ ، چھوٹے بڑے اپنے آپ دو حصّوں میں بٹ گئے تھے ۔ اس دوران بوڑھا راجہ بھی بیٹوں کے اثر و رسوخ کے دائروں کی حدیں نہ صرف پہچان گیا تھا بلکہ اپنی موت سے پہلے والی ساری سیاسی الجھنوں سے بھی پورے طور پر آگاہ ہو گیا تھا ۔ ملک میں اب دو قسم کی رعایا تھی ، دو سیاسی پارٹیاں ، دو گروہ جن کے اپنے جھنڈے اپنے جدا جدا نام اور الگ الگ نعرے تھے ۔ جہاں یہ سب ہوتا ہے ۔ گروہ پھیل کر قومیں بن جاتے ہیں اور قوموں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے اپنے لیے الگ الگ دھرموں اور خداؤں کا بھی چناؤ کر لیں ۔

راجہ جانتا تھا کہ قوم ایک ہو ، جھنڈا ایک ہو اور سب کا نصب العین ایک ہو تو بڑی طاقت بن جاتی ہے مگر یہ ایک ایسی طاقت ہوتی ہے جس پر کوئی فرد واحد اپنی من مانی سے حکومت نہیں کر سکتا اور کرتا ہے تو دیر تک جا نہیں رہ سکتا ۔ اس کے برعکس بٹے بکھرے لوگوں پر حکمرانی نسبتاً آسان ہوتی ہے ۔ بٹی قوم اور آوارہ ہجوم کا یہ فرق ہر کامیاب حکمران نے ہر فاتح نے ہر دور میں سمجھا ہے ۔

راجہ کے شاہی جھنڈے کا رنگ ہرا تھا جو نیلے اور پیلے کے

طلاپ سے بنتا ہے۔ راجکماروں میں سے ایک نے نیلا اور دوسرے نے پیلا چن کر شاہی جھنڈے کا وقار ختم کر دیا۔ اب نیلا اور پیلا مخالف پارٹیوں کے رنگ تھے جن کی سیاست ہی نہیں خدا اور مذہب بھی الگ الگ تھے۔ بٹوارے کا اصول بھی طے ہو گیا۔ ملک کے جس حصّے میں رعایا کی اکثریت نے نیلا رنگ اپنایا تھا وہ نیلے جھنڈے کے ساتھ ہو لی اور جس نے پیلے رنگ والے جھنڈے کو ترجیح دی تھی وہ پیلے جھنڈے تلے جمع ہو گئی۔

پھر ایک دن راجہ مر گیا۔ رانیاں بیوہ ہو گئیں۔ اور مہارانیوں کی بجائے اب راج ماتائیں بن گئیں۔ کچھ لوگ جو ابھی ابھی قومی یکجہتی جیسے پرانے اور فرسودہ آدرشوں سے جڑے ہوئے تھے نہ نیلوں میں شامل ہوئے نہ پیلوں میں۔ لہٰذا انھیں دونوں اطراف کے سربراہوں نے ایک دم فراموش کر دیا۔ اب اکثریت والے اقلیتوں کو اپنے دائرہ اثر و رسوخ میں لانے یا ملک بدر کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ جو مان گئے وہ بچ گئے جو نہ مانے یا تو قتل کر دیے گئے یا ہجرت کر کے اپنوں میں جا ملے۔ وہ جو نہ نیلے تھے نہ پیلے دونوں گروہوں کے راستوں کے روڑے سمجھے جانے لگے۔ انھیں میں گوتم تھا اور اس کا بیٹا سدھارتھ۔ بٹوارے کے روز گوتم نیلے جھنڈے والے علاقے میں تھا اور سدھارتھ پیلے جھنڈے والے علاقے میں۔

بٹوارے سے چند روز پہلے نیلوں کے مقامی صدر نے جو گوتم کا جگری دوست بلکہ لنگوٹیا رہا تھا اُسے بار بار اپنے بیٹے کے پاس چلے جانے کا مشورہ دیا تھا مگر وہ راضی نہ ہوا —— اُس نے لاکھ سمجھایا کہ بٹوارے کا اعلان ہوتے ہی وہ لوگ ایک کی بجائے دو قومیں بن جائیں گے اور چونکہ اس نے نیلے جھنڈے کی سرداری قبول نہ کی تھی اس لیے اُس کا وہاں سے چلے جانا ہی مناسب تھا۔

" مگر سبھی جانتے ہیں کہ ہم باپ بیٹے نہ نیلے ہیں نہ پیلے۔ ہمارے لیے نہ یہ علاقہ محفوظ ہے نہ وہ —— ملک بھلے ہی بٹ جائے مگر دونوں اطراف کے حکمران ایک ہی خون کے چھینٹے ہیں۔ بھائی بھائی ہیں۔ اُن کا ماضی ایک ہے، اُن کی تہذیبی جڑیں ایک ہیں۔"

" حیرت ہے یار کہ تو اتنا پڑھا لکھا ہو کر بھی شہر کی ہر دیوار پر اتنے جلی حروف میں لکھی عبارت نہیں پڑھ سکتا۔ ہم اب نیلے یا پیلے نہیں ایک دوسرے کے مخالفین بلکہ جانی دشمن ہیں۔ تو اپنے دوست کی بات کو سمجھتا کیوں نہیں؟"

" تو مجھے ڈرا کر یہاں سے بھگا دینا چاہتا ہے مگر میں جانے والا نہیں۔ یہ میری بستی ہے۔ یہاں میرے کتنے دوست کتنے شاگرد ہیں۔ دشمن ایک نہیں۔ میں نے نہ کبھی نیلے جھنڈے کی مخالفت کی ہے نہ پیلے کی۔"

" تو ہم میں سے ایک ہوتے ہوتے بھی الگ تو ہے نہ "

"میں الگ کہاں ہوں۔ میں تو تم ہی میں سے ہوں۔ میں نے بس اتنا ہی تو چاہا اور کہا ہے کہ دونوں بھائی ساری قوم سارے ملک کو سالم رکھ کر حکومت کی باگ ڈور سنبھالیں۔ میرا مشورہ دونوں کے حق میں ہے میں دونوں کا ہتیشی ہوں۔"

"تو تو اُصولوں اور آدرشوں کی بات کر رہا ہے جب کہ میں اس کالی آندھی کا ذکر کر رہا ہوں۔ جو جیسے ہی چھوٹے گی تو ایک دم اس کی زد میں آ جائے گا اور تجھے کوئی بھی بچا نہ سکے گا۔"

" آندھی تو جیسے اِدھر آئے گی ویسے ہی اُدھر بھی آئے گی۔ اگر میں یہاں محفوظ نہیں تو وہاں بھی اس سے بچ نہ سکوں گا۔ یہاں میرا، میرے آبا کا گھر ہے۔ وہاں۔ اُدھر میرا کیا ہے۔"

" اُدھر تمہارا بیٹا ہے اور اُدھر تم اجنبی ہو۔ اِدھر سبھی جانتے ہیں کہ تم کون ہو، کیا ہو، اُدھر یہ مشکل نہ ہو گی۔ ایک بار آندھی گزر جائے پھر تم محفوظ ہی محفوظ ہو۔"

" تو تو بھی جانتا ہے کہ جسے تو آندھی کہہ رہا ہے وہ وقتی دھند ہو گی جو اپنے آپ چھٹ جائے گی۔"

" دھند اندھی ہوتی ہے۔ دھند میں کسی کو کچھ دکھائی نہیں دیتا"

"دھند وقتی ہوتی ہے۔"

" اس لیے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ جب وہ منحوس گھڑی آئے گی۔ جس کا مجھے خدشہ ہی نہیں پورا یقین ہے تو گلیوں، سڑکوں اور شاہراہوں پر بوکھلائی اکائیاں ہوں گی۔ بپھری، غصیلی اور خونخوار اکائیاں۔ غیظ و غضب کے نعرے لگاتی لاسمت بھیڑ جس کی آمد پہ خدا بھی اکثر اپنی پناہ گاہوں میں دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔

" ہم تم اور ہمارے جیسے سیکڑوں ایسے لوگ ہیں جو اس طرح کی بھیڑ میں کبھی شامل نہ ہوں گے۔"

" تو ریاضی کا معلم ہوتے ہوئے بھی آنکڑوں کی حقیقت کو بھول رہا ہے، ہزاروں لاکھوں کے مقابلے میں سینکڑوں کی کیا وقعت ہوتی ہے۔"

"تو میرا دوست ہے۔ تیرا گھر میرا قلعہ ہے"

"قتل فصیل بند قلعوں میں بھی ہوتے ہیں بلکہ زیادہ آسانی سے ہوتے ہیں۔ میرے گھر میں میرا چھوٹا بھائی اور تیرا ماتحت ہے جو تیرے بے پناہ علم کو ہمیشہ ہی حسد و نفرت سے دیکھتا آیا ہے۔"

"اپنوں کے ہاتھوں پائی ہوئی موت۔ موت نہیں شہادت ہوتی ہے پیارے۔"

"تو کیا بچے ہو۔ موت موت ہوتی ہے۔ شہادت کوئی چیز نہیں ہوتی کوئی بھی اپنی مرضی سے کبھی شہید نہیں ہوا۔ شہادت ایک احمقانہ لفظ ہے جو آدمی نے غیر معمولی اموات کو احترام سے یاد رکھنے کیلئے گھڑ رکھا ہے۔ مجھے تیرا شہید ہونا قطعی منظور نہیں۔ مجھے یہ بھی منظور نہیں کہ تو یہاں محض اس بھرم پر ٹھہرا رہے کہ تیرا دوست ایک معزز اور بارسوخ شہری ہے اور حکمران طبقے کا مقامی صدر۔ میرا مشورہ مان میرے بھائی اور چپ چاپ اپنے بیٹے کے پاس چلا جا——"

"اپنا وطن چھوڑ کر بدیس چلا جاؤں!"

"ادھر اُس پار تیرا بیٹا ہے۔ تیری سب سے پیاری چیز۔ تیرے پاس زندگی گزارنے کے لیے کافی سرمایہ ہے۔ سب سے بڑا سرمایہ تو تیرا علم اور تیرا بیٹا ہے۔"

"تو سمجھتا کیوں نہیں ہے دوست کہ اس شہر میں میرے پُرکھوں کا گھر ہے۔ میرا بچپن، میری جوانی، میری ہر پیاری یاد اس سے جڑی ہوئی ہے۔ اس کی مٹی میں میرے شفیق ماں باپ اور میری اپنی یشودرا دفن ہے، یہ میری جڑ ہے جس سے اکھڑ کر، کٹ کر میں سوکھ جاؤں گا۔ جو موت سے بھی بدتر ہوگا۔"

کمزور بینائی والے آدرش وادی گوتم نے دیوار پر لکھا نہ پڑھا۔ جیسے ہی خون و غارت گری کا بگل بجا اور بھیڑیوں کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے مہینوں پہلے تیز کیے ہوئے ایک گنڈاسے نے گوتم کا سر قلم کر دیا۔

قاتل نے گنڈاسا پھینک کر بھائی کے سامنے سر جھکا دیا۔

"میں تیرا قصور وار ہوں۔ میں نے تیرے سب سے پیارے، سب سے عزیز دوست کو قتل کیا ہے۔ تو جو سزا تجویز کرے گا، مجھے منظور ہوگی۔ اس کی جان لینا میرا حق تھا۔ اُس کے مال و اسباب پر تیرا حق ہے"

بھائی کچھ نہیں بولا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ گوتم کا قتل نہیں ہوا اس نے خودکشی کی ہے۔ اُس نے موت کا یہ انداز خود چنا تھا۔ اس قسم کی خود اختیاری کا حق کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔ یہ خدا کے انتظامیہ میں بے جا دخل اندازی ہے۔ خدائی سے انحراف ہے۔ پھر دونوں بھائیوں نے مل کر مرحوم کی حویلی کا سامان اکٹھا کیا جو بیچا یا خرید ا جا سکتا تھا اُسے الگ کیا اور جو کسی بھی دوسرے طریقے سے ہٹایا نہ جا سکتا اُسے یکجا کر کے اور توڑ پھوڑ کر لکڑیوں کے ایک بڑے ڈھیر میں منتقل کر دیا گیا۔ جب یہ سب ہو چکا تو دونوں بھائیوں نے گوتم کا کٹا سر اور باقی کا دھڑ بڑے احترام سے اٹھا کر لکڑیوں کے اُس ڈھیر پر رکھ دیا۔ گھر کا سارا گھی لا کر مرحوم کے بدن اور لکڑیوں پر چھڑک دیا گیا۔

آگ دینے سے پہلے مرحوم کے دوست، اُس کی بیوی اور قاتل بھائی نے سرنگوں ہو کر اپنا آخری سلام پیش کیا——

"تو بڑا دھرماتما تھا—— تیرا دھرم، تیرا مذہب کیا تھا میں نے کبھی نہیں سمجھا—— تیری اس آخری یاترا میں ہمیں کیا کرنا چاہیے، کون سے منتر پڑھنے چاہئیں، میں نہیں جانتا، لہٰذا اپنے ہی رب بزرگ و برتر سے دعا گو ہوں کہ وہ تیری آتما کو شانتی دے اور تو جب اور جہاں بھی پُنر جنم لے اپنے جیسا اچھا جن کر۔ ہمارے جیسا بُرا جن کر تو کبھی بھی نہیں کیوں کہ دوستی کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی میں تیری حفاظت نہ کر سکا۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا میری محترم بھائی۔"

اس واقعہ کے کوئی تین چار مہینے بھر بعد وہ ایک رات سو رہا تھا کہ اس نے گوتم کو سامنے بیٹھے اپنی مترنم آواز اور معروف مسکراتی مُدرا میں چہکتے دیکھا۔

"ارے تم؟!"

"تو سمجھتا ہے میں مر گیا ہوں۔ مگر میں اتنی آسانی سے تجھے چھوڑنے والا نہیں۔ اُس روز اپنی جلتی چتا سے اٹھ کر میں نے جہاں پناہ لی تھی وہاں تیرے بھائی کا گنڈاسا بھی نہیں پہونچ سکتا۔ وہ دنیا کی سب سے محفوظ جگہ ہے۔ ایک ماں کی کوکھ۔ میں قتل نہ کر دیا جاتا اور تیرا دوست بن کر اپنے اس شہر میں رہتا بھی تو اجنبیوں کی طرح۔ اب میں یہاں شان سے رہوں گا۔ تیرا بیٹا بن کر اور میرا قاتل مجھے اپنی گود میں کھلائے گا۔

"تیرے قتل کے بعد وہ جس قدر پشیمان ہوا ہے ......"
میں کیا جانتا نہیں۔ کالی آندھی کے اس تند و تیز بہاؤ نے کتنوں کے پاؤں اکھیڑ دیے تھے۔ تو اپنی جگہ پر جما رہا کیوں کہ تو تو گھاٹ کا پتھر ہے ـــ"

تو تو نے اُسے معاف کر دیا ـــ

"میں نے بھی۔ میرے خدا نے بھی۔ سوچ اور مدہوشی کے عالم میں کیا ہوا گناہ گناہ نہیں ہوتا۔"

وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ گوتم کی آواز اُسے اب بھی سنائی دے رہی تھی اگرچہ بیڈ کے سامنے والی کرسی جس پر اُس نے گوتم کو ابھی ابھی بیٹھے دیکھا تھا اب خالی تھی۔

ساتھ لیٹی ہوئی بیوی کے پھولے ہوئے پیٹ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اُس نے کہا: "چار مہینے کا ہو چلا ہے ہمارا گوتم۔"

"آپ کو کیسے معلوم کہ وہ گوتم ہے۔ لڑکی بھی تو ہو سکتی ہے۔؟!"

"ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے مگر گوتم نے کبھی جھوٹ نہیں بولا"

اُس نے گوتم سے اپنی بات چیت کی کہانی سنا دی۔ "تیری کوکھ میں جو پل رہا ہے وہ ایک ایسا مرد ہے جس کا بدل ہماری آج کی دنیا میں ملنا مشکل ہے۔ شادی کے پندرہ سال بعد جس پہلی اولاد کا دیدار ہوگا۔ اُس نے مر کر تجھے ماں بنا دیا۔ تیری عورت کی جُون کی تکمیل کر دی۔ تیرا رتبہ تیرا وقار بلند کر دیا۔ آماں تیری خالی کوکھ کو دیکھ کر جل بھُن جایا کرتی تھی۔ تجھے دعائیوں کا گھُسرا کہہ کر کوسا کرتی تھی۔ آج زندہ ہوتی تو تیری بلائیں اتارتی۔"

ایک دن گوتم کے لیے سوئٹر بُنتے بُنتے اُس کے منہ سے اچانک نکل گیا۔

"دیورجی کو آج کل کیا ہو رہا ہے۔ کس طرح مارے مارے پھرتے ہیں گوتم بھیا کی حویلی کے کھنڈرات میں۔"

"باپ کا قاتل تھا مگر اس کا ایک ایک پیسہ اور وہ سارے زیورات جو ہمارے پاس محفوظ تھے خود پہنچا کر آیا ہے بیٹے کو۔

سدھارتھ کو معلوم ہے کہ وہی اُس کے باپ کا قاتل ہے؟

جو آدمی اُس کے مرحوم باپ کی ساری پونجی اپنی جان پر کھیل کر بیٹے کو پہنچانے اکیلا اتنی دُور گیا تھا وہ اس کے باپ کا قاتل کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اُس نے بار بار رو رو کر سدھارتھ کو بتایا کہ اُسی نے اس کے باپ کی جان لی تھی مگر بیٹا کیسے مانتا۔ وہ یہی سمجھتا رہا کہ چاچا اُس کے باپ کی حفاظت نہ کر سکے اسی لیے اپنے آپ کو اس کا قاتل سمجھتے ہیں۔"

"جیسا باپ، ویسا بیٹا ـــ کیوں جی اس قسم کے لوگ ہماری دنیا میں اتنے کم کیوں ہوتے ہیں۔؟"

آخری جملہ وہ اکثر دہراتی۔ پھر وہ دن آ گیا جس کا دونوں کو پچھلے سولہ برسوں سے انتظار تھا۔ سپنا سچا تھا۔ لڑکا کیا تھا سچ مچ کوئی فرشتہ تھا۔

گوتم یونانی دیوتاؤں کی طرح خوبرو، توانا اور پُر وقار نکلا ـــ اٹھارہ ہی سال کی عمر میں اُس نے ریاضی میں بی اے آنرز کر لیا۔ صوبے کے فارغ طالب علموں میں اس کا نام سرفہرست تھا ـــ

"میں بڑا ہو کر آئینسٹائن بنوں گا۔"

آئینسٹائن کون تھا ماں نہیں جانتی تھی۔ اُسے البتہ یقین ضرور تھا کہ اس کا غیر معمولی بیٹا جو بننا چاہتا ہے وہ یقیناً کوئی بڑی شے ہو گی۔

بٹوارے کے دنوں جیسی وبا ایک بار پھر لوٹ آئی۔ زن، زر، زمین فساد کی جڑیں مانے گئے ہیں مگر اب کے جو ہو رہا تھا وہ کوئی دنگا فساد نہ تھا۔ باقاعدہ جنگ تھی۔ دو بھائیوں میں، دو ملکوں میں، دو مسلح فوجوں کے مابین۔ باہر کے دشمنوں کے دیے ہوئے ہتھیاروں سے انھیں کی غیبی سرداری میں انھیں کے طور طریقوں سے لڑی جانے والی جنگ۔

جہاں دیگر ہزاروں مرد عورتیں اور بچے مرے گوتم کے والد بھی دشمن کے ہوائی حملے کا شکار ہو گئے۔ ماں بیوہ ہو گئی اور گوتم یتیم ـــ

اُس کے باپ کو دشمن کی کسی گولی نے ہلاک نہ کیا تھا نہ کسی بم سرنگ یا گرینیڈ کے پھٹنے سے ہی ان کی موت ہوئی تھی۔ اس موت کی نوعیت قطعی انوکھی تھی۔ دشمن کے کسی مسخرے ہوا باز نے چند اشتہار پھینکے تھے، لوگوں کو محض یہ بتانے کے لیے کہ وہ اُن کا دشمن نہیں دوست ہے اور انھیں کی بستی کی پاکیزہ دھرتی پر اس کا جنم ہوا تھا اُس نے اپنی بستی کے لوگوں سے اپیل کی تھی کہ وہ سب مل کر اس بے بنیاد اور بے مطلب لڑائی کو بند کرانے کے لیے جہاد کریں۔

کسی وجہ سے اُس ہوا باز کے اِن دوستانہ اشتہاروں کا ایک

بنڈل جس میں بمشکل پانچ چھ سو اشتہار سے کھلا نہ تھا اور سیدھا گوتم کے باپ کی بے بال چاند پر آگرا تھا۔ چوٹ کی نوعیت اندرونی اور موت کی وجہ غالباً وہ غیر معمولی جھٹکا تھا جو برقی دھکے کی طرح ان کے سارے وجود کو برہم کر گیا تھا۔

"یہ ہواباز کون تھا؟ کوئی سرپھرا گوتم؟"

"یا کوئی سدھارتھ" چاچا نے وضاحت کی

گوتم اور سدھارتھ ایک ہی نام ہیں ——— ایک کیفیت کے دو نام ان گنت سینکڑوں ہیں اس دنیا میں جو زندگی کے تاریک ترین گوشوں میں بھی چھوٹے چھوٹے معصوم جگنوؤں کی طرح روشنیاں پہنچاتے رہتے ہیں۔ نیک، حسین اور شفیق لوگ۔ رحم و دردمندی کے سرچشمے۔ سمجھیں مقدس، ضیا بار فرشتے جو انسانیت کا درس دینے کے لیے ہی اس نسبھر دنیا میں بار بار جنم لیتے ہیں۔

یہ کچھ بھی ہو اس حرام زادے نے میری، ہماری دنیا اُجاڑی ہے میرے بھائی کو ہلاک کیا ہے میں اس کی شناخت کراؤں گا تاکہ اسے اس کی حکومت سے مناسب سزا دلوا سکوں۔ یہ اپنے ملک سے غداری اور غیر سے بیجا ہمدردی کا یعنی کورٹ مارشل کا کیس ہے۔

"تم ایک شریف زادے کو حرام زادہ کہہ رہے ہو چاچا۔ تم نے باپ کا قتل کیا تھا تو برسوں پریشان رہے تھے، اب بیٹے کو سزا دلوا کر اپنی باقی ماندہ زندگی بھی حرام کرنا چاہتے ہو؟"

"تو تم مانتے ہو کہ یہ کام سدھارتھ ہی کا تھا"

"کوئی سدھارتھ کوئی گوتم۔ وہ جو کوئی بھی ہے ایک دردمند اور انسان دوست آتما ہے۔ تم اس کے ساتھ وہی سلوک روا رکھنا چاہتے ہو جو ہر عہد کے مہذب لوگ اپنے ولیوں اور پیغمبروں سے کرتے آئے ہیں۔"

گوتم نے ملک کی سب سے اہم اور اونچی ملازمت سے استعفا دے دیا اور ایک مقامی کالج میں ریاضی کے معمولی لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت لے لی۔

"میرا مستقبل ریاضی میں ہے۔ یہ میرے خون میں ہے۔ یہ میری وراثت ہے۔ ہندسوں کے اسی فلسفہ میں زندگی اور موت کا راز چھپا ہے۔"

"زندگی کے بارے میں تو تم ہی جانو مگر اس میں قطعی کوئی شک نہیں کہ موت کا راز تمھارا ریاضی خوب جانتا ہے۔ تمھارے ہی جیسے ایک سرپھرے ماہر ریاضیات نے ذرّے کی تقسیم کا فارمولا پیش کر کے پرمانو کی اختراع کی تھی اور ساری گوری تہذیب کو بازار میں ننگا نچوا دیا تھا۔"

"پرمانو ایک عظیم شکتی ہے چاچا۔ آپ خود ریاضی کے معلّم ہیں اور جانتے ہیں کہ اس ناقابلِ مغلوب طاقت کا واجب استعمال ہی نوعِ انسان کی عاقبت بھی سدھار سکتا ہے اور اسے نیست و نابود بھی کر سکتا ہے۔ زندگی کا رنگ روپ سنوارنے سجانے کے لیے ہی مہیا تھا آئینسٹائن نے اس عظیم شکتی کو کھوجا اور دریافت کیا تھا۔ یہ جنگ جو ہم نے ابھی ابھی لڑی ہے کوئی جنگ تھوڑے ہی تھی۔ جنگیں کیا اس طرح اتنی جلدی ہار جیت کے بغیر ہی ختم ہو جایا کرتی ہیں۔ یہ تو ایک طرح کا بڑی ہی گھٹیا قسم کا فساد تھا ایک ہی باپ کے دو نا اہل بیٹوں کے مابین۔ لڑنے والے سارے کے سارے فسادی تھے، سپاہی نہیں تھے۔ آدمیت کی جنگیں تو رامائن مہابھارت اور میدانِ کربلا میں لڑی گئی تھیں جہاں سر کٹوا کر بھی بہادروں کی تلواریں چلتی رہی تھیں۔ جنگیں دل کی توانائی روح کے حوصلے اور بدن کی قوت سے بڑے بڑے آدرشوں کے تحفظ کے لیے لڑی جاتی ہیں آسمانوں سے نہتے شہریوں پر اس طرح قہر کی بارش برسا کر نہیں۔ آپ نے کبھی شوخ و شریر بچوں کو محض تفریحاً مکھیاں یا کیڑے مکوڑے مارتے دیکھا ہے؟ اپنے زعم میں آسمانوں سے موت کی بجلیاں گرا کر اور بھولے معصوم بچوں اور عورتوں کو ہلاک کر کے جھنڈا اٹھانے والے سپاہی ایسے نا سمجھ بچوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ عہدِ قدیم میں یونان و مصر و روما کے حکمران نہتے انسانوں کو بھوکے اور خونخوار جانوروں سے لڑا کر اپنی محبوباؤں کی دلجوئی اور تفریحِ طبع کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ ہماری جنگ بھی کچھ اس قماش کا کارنیوال تھی۔ کسی قسم کی بہادری کا مقابلہ نہ تھی۔ ہماری مقبول عام کرکٹ کی طرح جہاں ہار جیت کا فیصلہ مقدر کرتا ہے۔ جو لڑائی بچوں اور عورتوں کے خلاف لڑی جاتی ہے۔ وہ جنگ نہیں ہوتی کیونکہ بیچاری بے سہارا عورتیں اور معصوم بچے کبھی کوئی جنگ نہیں جیت سکتے۔ آج کی کوئی جنگ اصولوں اور آدرشوں کے تحفظ کے لیے نہیں لڑی جاتی تا قومی وقار بڑھانے کے لیے ہی لڑی جاتی ہے۔ محض چند جھوٹی اور بے معنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اور اپنے شہریوں پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کی غرض سے لڑی جاتی ہے۔ میں ریاضی کے آنکڑوں سے ہی نوعِ انسان کو سمجھاؤں گا کہ ہر جنگ ایک بے معنی مصرف ہے لاکھوں

کروڑوں روپے آدمی کی زندگی بنانے سنوارنے کے لیے نہیں انہیں ہلاک زخمی اور اپاہج بنانے پر خرچ کر دیے جاتے ہیں۔ یہ ایک وحشی کھیل ہے جو پہلے بھی کئی بار کھیلا جا چکا ہے۔ اس میں سپاہی کم اور شہری زیادہ تعداد میں مرتے ہیں۔ اس وحشیانہ جاہلیت و بربریت نے کتنی بار کتنی قدیم اور بلند و بالا تہذیبوں کو مسمار کیا ہے

میں ـــ میں ـــ میں "

گوتم کے چاچا نے بیٹے کی عجیب و غریب باتوں سے بوکھلائی اپنی بیوہ بھاوج کی طرف حسرت سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"تمہارا یہ بیٹا تمہارے مرحوم شوہر کے دوست کی طرح آج اسی مالیخولیا کا شکار ہے جو اُس پر ملک کے راج پاٹھ کی تقسیم کے دنوں طاری تھا اور جس کی وجہ سے وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا تھا ـــ"

"پھر اس نے کھل کر اپنی بھاوج کو تسلّی دیتے ہوئے کہا۔" آپ حوصلہ نہ ہاریے بھابھی جان۔ یہ پیروں پیغمبروں اور ولیوں کا نہیں عام آدمیوں۔ معمولی آدمیوں کا زمانہ ہے۔ آپ ہمّت رکھیے۔ اوپر والا چاہے گا تو سب اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی بھی جذبہ چاہے کتنا گہرا ہو ہمیشہ ایک سی شدّت سے برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے بھابھی جان۔ یہ لڑکا کون سی زبان بول رہا ہے ؟"

"یہ جو کچھ ہے اور جو کہہ رہا ہے اس کے لیے تم، تمہارا مرحوم شوہر ہی نہیں بلکہ ہم سب برابر کے ذمّہ دار ہیں۔ ہم نے اس کا نام گوتم رکھا تھا جو کسی فردِ واحد کا نہیں ایک کیفیت کا نام ہے۔ تم نے اُس پارکے سدھارتھ کی حرکت دیکھی ہے۔ سدھارتھ بھی کسی فردِ واحد کا نہیں ایک کیفیت کا نام ہے اور آپ جانو ہر کیفیت کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اس کا یہ مسیحائی درس اور یہ وجدانی کیفیت ایک اُبال ہے۔ ایک جھاگ"

"مجھے تو یہ سمندر کا کبھی نہ ختم ہونے والا جھاگ لگے ہے بھیّا"

سب ٹھیک ہو جائے گا بھابھی جان۔ میں نے کہا نہ کہ یہ پیروں پیغمبروں اور ولیوں کا نہیں معمولی، بے حد معمولی آدمیوں کا زمانہ ہے اور تمہارا بیٹا بھی گوتم بدھ نہیں صرف مسٹر گوتم ہے اور وہ اُدھر والا سدھارتھ بھی بیا تما بدھ نہیں ہوا بازسدھارتھ ہے۔ دونوں اسی دور کے دو آدمی ہیں۔ معمولی آدمی۔ ✺

بقیہ صفحہ ۳۲ خواب رد

ایک اندھا موڑ پا کر گاڑی کی رفتار کم کر لی ہے۔ "تم چپ چاپ کیوں بیٹھے رہے؟"

"میری وکالت تم جو کر رہے تھے"

"تو میری وکالت کی فیس ادا کرو۔"

"استرہ مینے تمہاری بیری میکے جا رہی ہے۔ یہ کیا کہ ہے کہ تم کو روالٹ ملتی رہے گی؟"

"تم کو تم کو کیا، فقیر بابو؟ زبان کو ناپاک مت ہونے دیا کرو۔"

میرے منہ میں تو ہم بدم مولا کا نام رہتا ہے باؤ اسحٰق۔ "فقیر محمد اسے جواب دے کر ہنسنے لگے ہے۔

"میرے ساتھ تو چہکنے لگے ہو، وہاں ستّی کیوں گم ہو گئی ہے۔"

"تمہاری بات اور ہے۔ تمہارے سامنے اردو بولتے ہوئے مجھے لگتا ہے کہ اپنی ہی زبان بول رہا ہوں۔ مگر نواب صاحب اپنی غلط سلط باتیں اتنی صحیح اردو میں کرتے ہیں کہ انہیں سن کر میرے تو پاؤں پھولنے لگتے ہیں۔"

اچھا کیا جو مجھے بتا دیا۔ اب جب بھی ہاتھ پیر نکلنے کی سوچو گے۔ اسی دم ذرا کر کے تمہیں بھائی جان کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔"

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو باؤ اسحٰق۔ جسے زبان آتی ہے۔ وہ غلط ہو یا صحیح، ہمیشہ صحیح بول رہا ہوتا ہے۔ اور جسے نہیں آتی اگر وہ صحیح بھی بولے گا تو بہر حال غلط بولے گا۔ دھیان سے چلاؤ۔ اسحٰق مرزا کو سڑک سے نیچے آتے ہوئے پا کر اس نے پھر تنبیہہ کی ہے۔

"تو تمہارا مطلب ہے کہ تم اسی لئے ہاتھوں پیروں کو منہ پر ترجیح دیتے ہو؟"

ہاں، اور کیا؟ ورنہ ہم غریب مجھ سے معلوم ہوں یا گونگے؟" مگر بابو میرے ہاتھوں پیروں سے تصرف ماند پڑتے ہیں۔ "بے چارے بیٹے کیا بتاؤں جو بھی سمجھا اسحٰق۔" بابو فقیر محمد نے آہستہ شاید لیے میں جواب دیا ہے "مگر کچھ بھی کہہ لو جیسے کسی کوئی اتنی بات سمجھا لیا"

[باقی آئندہ]

شاہین بدر

اہلِ دنیا کیلئے یہ ماجرا ہے مختلف
پتھروں کے شہر میں اک آئینہ ہے مختلف

میرے بچے کتنے حیراں ہیں کہ ان کے واسطے
پیشِ رو کے نقشِ پا کا سلسلہ ہے مختلف

ڈولتی ہے سانس کے طوفاں میں کشتی زیست کی
بادبانی کے لیے اب کے ہوا ہے مختلف

ساعتوں کی دھوپ نے جب بھی تسلی دی گھنی
قدوقامت اپنے سائے کا ملا ہے مختلف

چن لی آنکھوں سے ہماری نیند کی سب کرچیاں
وقت کے گونگے قبیلے کی سزا ہے مختلف

دیکھئے تو سبز کھیتوں میں شعاعوں کا ہے رقص
سوچئے تو موسمِ رنگِ ادا ہے مختلف

چشمِ حیرت سے نہ یوں دیکھا کریں شاہین بدر
موسمِ اخلاص کی ٹھنڈی ہوا ہے مختلف

● پلاٹ نمبر ۲۰، ایریا بی زیڈ (۵)، کورنگی ۲، کراچی۔ ۳۱

راہی قریشی

کچھ نہ دے گا یہ اندھیرے کا سفر، لوٹ چلو
یاد کرتا ہے اُجالوں کا نگر، لوٹ چلو

دشت در دشت یہ سائے کی رفاقت کب تک
کوئی منزل نہ کوئی راہگذر، لوٹ چلو

منتظر ہونگے گلے، شکوے، تبسم، آنسو
آج تو سب سے ملو، آج تو گھر لوٹ چلو

بھیگی آنکھوں کی سبھی کرنیں بجھیں روزن میں
کھڑکیاں بند ہوئیں، بند ہیں در، لوٹ چلو

ہے وہی دوریٔ منزل، وہی راہوں کا عذاب
رہبری کرتی نہیں گردِ سفر لوٹ چلو

وہی افسردہ سا آنگن، وہی ہجرت کی فضا
وہی دہلیز، وہی دیدۂ تر، لوٹ چلو

دیکھتا کوئی نہیں، بس یہی دیکھا راہی
اپنی جانب نہیں اب کوئی نظر لوٹ چلو

● شعبۂ اردو، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ (کرناٹک)

رحمت امروہوی

ایک نظم

تا بکے کنجِ قفس
بس ہجومِ یاس بس

گل کھلائے گی ضرور
یہ بہار اب کے برس

جان میں جان آگئی
سن کے آوازِ جرس

اُن گلوں کا ذکر کیا
جن میں خوشبو ہے نہ رس

دیکھ نفرت سے نہ دیکھ
ہم پہ آوازیں نہ کس

ہم کبھی شبنم صفت
ہم کبھی شعلہ نفس

اک دلِ رحمت ہے اور
اس قدر غم ہیں کہ بس

● نیو منیشن، مرزا پور، احمد آباد ۔ ۳۸۰۰۰۱



یوسف سرمست
۲۹/۱/۷ ۔ ۶ ۔ ۲ ۔ ۸ روڈ نمبر ۱۲، بنجارہ ہلز، حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۳۴

تبصرہ نگاری

تبصرہ جیسا کہ اس لفظ کی معنویت سے ظاہر ہے۔ کسی چیز کو دیکھنا ہے۔ اس کا مادہ عربی کا سہ حرفی لفظ بصر ہے۔ بصر کے معنی بینائی یا آنکھ کے ہیں۔ عربی سہ حرفی مادے سے کئی الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ اسی طرح بصر سے باصر، باصرہ، بصارت، بصیرت، بصائر، بصیر، تبصر، مبصر، اور تبصرہ بنے۔ تبصرے کے لفظی معنی ہیں بینا کرنا، سمجھانا۔ لفظی معنی خود رہنمائی کرتے ہیں کہ یہ تنقید سے کسی نہ کسی حد تک الگ ہے۔ تنقید بھی عربی کے مادے نقد سے مشتق ہے۔ نقد کے معنی پرکھنے کے ہیں۔ ادب میں پرکھنے کا کام بھی چوں کہ آنکھ سے لیا جاتا ہے اس لئے تبصرہ اور تنقید ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ نقد ادب میں کوئی خارجی کسوٹی یا پیمانہ نہیں ہوتا جس پر ادب کو گھس کے یا کس کے دیکھا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں آنکھ ہی سب کچھ ہوتا ہے۔

تبصرہ اور تنقید کی سرحدیں گو مل جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی ان میں فرق اور امتیاز کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ تبصرہ کا نام بینا کرنا ہے۔ یعنی کسی چیز کو اس کا جائزہ لینا۔ تبصرہ نگار کا کام صرف دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے۔ گویا تبصرہ نگاری متعارف کرنے کا دوسرا نام ہے۔ تعارف کروانے میں رکھ رکھاؤ اور سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک آپ خود کسی شخص سے پوری طرح واقف نہ ہو جائیں، کسی دوسرے سے اس کا تعارف کروانا بے جا ہوگا۔ واقف ہونے پر آپ خود ہی محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ شخص کسی دوسرے سے متعارف کروانے کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ اگر کسی وجہ سے متعارف ناگریز ہو جائے تو آپ کو ایسا انداز اختیار کرنا پڑتا ہے کہ دوسرا سمجھ جاتا ہے کہ آپ کسی "شریف زادہ" کا تعارف کروا رہے ہیں۔ یا ہو ذات شریف۔ تبصرہ نگار کی یوں ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ خاص طور پر موجودہ زمانے میں۔ کیوں کہ بے شمار کتابوں کا سیلاب چھاپہ خانوں سے امڈا چلا آ رہا ہے اردو کی کتابیں بھی اس گئی گذری حالت میں ہر سال بے شمار چھپتی ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ خذف ریزوں کے انبار میں ہیرے بھی شامل ہیں۔ اس تبصرہ نگار کو بہت ہی محتاط اور ذمے دار رہنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اسے انبار میں سے ہیروں کو علاحدہ کرنے کا کام سونپا گیا ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا اندیشہ ہے کہ ہیرے خذف ریزوں میں دب کر نہ رہ جائیں۔ تبصرہ نگار کا بنیادی کام یہی ہے کہ وہ یہ بتائے کہ یہ ہیرا ہے یا نہیں۔ کیوں کہ جوہر شناس نگاہ کی ریزہ کاری بھی نظر کو خیرہ کر دیتی ہے۔ اسے ہیرے کو پہچاننا ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہ نقاد کے منصب سے بہت قریب ہو جاتا ہے۔ یعنی آنکنے کا کام انجام دینا ہوتا ہے۔

تبصرے اور تنقید میں یہی فرق ہے کہ تبصرہ نگار صرف ہیرے کی نشان دہی کرتا ہے تنقید نگار اس کا حجم، اس کا رنگ اور اس کی تراش خراش دیکھ کر اس کا درجہ متعین کرتا ہے اس کی قدر و قیمت کی وضاحت کرتا ہے۔ تبصرہ نگار کا کام ابتدائی ہوتا ہے جبکہ تنقید نگار کا کام انتہائی۔

دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ تبصرہ نگار گو ابتدائی کام کرتا ہے۔ لیکن یہ بہت ہی اہم کام ہے۔ اس لئے تبصرہ نگاری کے آداب اور حدود کا تعین ضروری ہے۔ لیکن اردو میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا ہے۔ البتہ ظ۔ انصاری نے اپنی کتاب "کتاب شناسی" میں تبصرہ نگاری کے بارے میں ترسٹھ صفحات لکھے ہیں۔ وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اپنی کتاب "فاروقی کے تبصرے" میں تبصرہ نگاری کے فن کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بھی قابل توجہ ہے۔ لیکن انہوں نے اور ظ۔ انصاری نے تنقید کے حوالے سے تبصرہ نگار اور نقاد کے فرق کو واضح کرنے کی جو کوشش کی ہے۔ وہ پوری طرح کامیاب نہیں ہے۔ شمس الرحمٰن لکھتے ہیں:

"سب سے پہلا فرق تو یہ ہے کہ تبصرہ نگار کا مخاطب بہت فوری اور سامنے کا قاری ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ کیوں کہ تبصرے کے ہی نہیں دنیا میں ہر قسم کے ادب کے مخاطب بعض وقت "بہت فوری" اور سامنے کے قاری" رہے ہیں۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں۔

"تبصرہ اس لئے لکھا جاتا ہے کہ جو قاری اس وقت موجود ہے اسے کتاب سے متعارف کیا جائے۔"

تبصرہ کا کام صرف "اس وقت موجود" قاری کو متعارف کروانا نہیں ہوتا بلکہ ہر اس قاری کو متعارف کروانا ہوتا ہے جو کتاب سے ناواقف ہے۔ خواہ وہ "اس وقت" "موجود ہو" یا اس وقت"۔ فاروقی نے "تنقیدی مضمون" کے بارے میں لکھا ہے۔

"تنقیدی مضمون کا مخاطب آج کا قاری بھی ہوتا ہے اور کل کا بھی۔ لہٰذا اس میں ایسے فیصلے اور رائیں دینے سے احتراز کیا جاتا ہے۔ جن کی درستگی VALIDITY آئندہ زمانے میں مشکوک ہو سکے یا ہو جائے۔ مثلاً "ضرب کلیم" پر تنقید لکھنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کتاب ناکام ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کی شاعری ناکام ہو گئی۔"

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے آج اور کل کی تخصیص بالکل بے بنیاد ہے۔ جو مثال دی گئی ہے۔ وہ آج بھی مشکوک رہے گی اور کل بھی۔ "ضرب کلیم" کو "ناکام" کہ کر اقبال کی شاعری کو کامیاب کہنا خواہ مخواہ کی موشگافی ہے۔ یہ خود انتہائی مشکوک انداز بیان ہے۔ یہ بیان بڑی حد تک مشکوک نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ اقبال کی شاعری کے بعض حصے" شعریت کے اعتبار سے کامیاب نہیں ہیں۔ جیسے "ضرب کلیم" کی شاعری"۔ اس کے باوجود یہ کہنا کہ کوئی تنقیدی بیان آج بلکہ کل کے لئے بھی مشکوک" نہیں ہو سکتا خواہ مخواہ کی خوش فہمی ہے جس کا کوئی جواز نہیں۔ تبصرہ ہو یا تنقید ہر صورت میں مشکوک بیانات سے احتراز ضروری ہے۔ بہر حال تبصرہ ہو یا تنقید اعلیٰ درجے کے ہوں گے جن کی "درستگی VALIDITY" ہر زمانے میں مسلم ہے۔

تبصروں کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ یہ تنقید، تحقیق اور تعبیر کی راہیں ہموار کرتے ہیں۔ ظ۔ انصاری نے تبصرہ نگاری کے چار رجحانات گنائے ہیں۔ ایک تحقیقی، دوسرا تنقیدی، تیسرا تعبیری اور چوتھا تکلف برطرف۔

لیکن ہر رجحان کی خوبی یا خامی سے بحث نہیں کی ہے۔ حالاں کہ ہر رجحان میں اگر توازن کو قائم نہ رکھا جائے تو خامی بھی ضرور ملے گی۔ جیسے قاضی عبدالودود کے تبصرے تحقیقی تبصروں کی بہترین مثال ہیں۔ لیکن اس میں ادبی تنقید کا پہلو اس قدر غائب رہتا ہے کہ کتاب کی قدر و قیمت صحیح طور پر متعین نہیں کی جا سکتی۔ میر کی شاعری کی قدر و قیمت اس کے سید ہونے یا نہ ہونے پر منحصر نہیں ہے۔

ع اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

اگر یہ مصرعہ میر پر صادق بھی نہ آئے تو بھی مصرعے کی سچائی اور صداقت پر حرف نہیں آسکتا۔ اگر تبصرے صرف تنقیدی ہوں اور تحقیق سے یکسر خالی ہوں تو پھر منشی سجاد حسین کسمنڈوی کی کتابوں کو منشی سجاد حسین، اڈیٹر اودھ پنچ سے منسوب کر کے غلط نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ تعبیری تذکروں میں اپنی آئیڈیالوجی کی تائید میں پول دبزار میں پڑی ہوئی "مکھی" کو بھی ہمارے احباب نگلنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یا فیض کی خوب صورت نظم "مطلوبہ آزادی" کی تحسین نہ کر کے کفرانِ ادب کے مرتکب ہوئے ہیں۔ رہے تکلف برطرف تبصرے، یہ تو صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو ہم عصر ادیبوں اور شاعروں سے بے تکلف ہو اور بے تکلف انداز میں بات کرنے کا ہنر جانتا ہوں۔ کیوں کہ یہاں بھی اگر حد سے گذر جائیں تو خود تبصرہ نگاری کا تکلف بھی ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں مقصود ان رجحانات کی تنقیص نہیں ہے۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ ہر حالت میں اعتدال اور توازن کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔

دوسرے ادبی شعبوں کی طرح تبصرہ نگاری بھی بڑی علمی اور ادبی ریاض چاہتی ہے۔ بڑے وسیع مطالعے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اور اس کے سوا دیانت داری اور غیر جانب داری چاہتی ہے۔ جو موجودہ عہد میں تبصرہ نگار پر بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برآ ہو جائے تو یہ ادب اور شاعری کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔ ❋

رعنا حیدری

ذرا پھر سوچ کر دیکھوں

ذرا پھر سوچ کر دیکھوں
تمہارے بن گذرتی زندگی کا رنگ کیسا ہے
ابھی تک میں جو خود ایوانِ دل میں
جھانک کر دیکھے بنا جیتی رہی
دیکھوں وہاں کس آرزو کو کس تمنا کو
عود و عنبر کی جگہ جلتا ہوا میں چھوڑ آئی تھی
کہاں پر خواہشوں کا عطر رکھا تھا
سجیلا سا لباسِ دوستی کیا آج تک ویسا ہی رکھا ہے
چلوں دیکھوں
منقش نظروں کے تاروں سے بنا قالین
کیا اب تک بچھا ہے
وہ تیرے کھلتے شگوفوں کو بڑی منت سے روکا تھا
کئی شرمیلے آنسو ان پہ چھڑکے تھے
کہ ہم آئیں تو کھل جانا
فضا کو گنگنانا سکھا آئی تھی اپنے اور تمہارے نام کے نغمے
تمہارے واسطے
اونچی سی پاکیزہ جگہ محفوظ رکھی تھی
کہ قدموں میں تمہارے بیٹھ جاؤں گی
تو سب کچھ بھول جاؤں گی
جو دیکھا جھانک کر ایوانِ دل میں
سبھی کچھ جوں کا توں رکھا ہوا تھا
بنا کچھ اور سوچے میں وہاں سے لوٹ آئی ہوں

● اجنتا لاج، جیسنگھ پورہ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

عشرت ظفر

مشورہ

خود کو میری انگلیوں کے لمس سے محفوظ رکھ
پھر کہیں ایسا نہ ہو
ایک اک کر کے ترے اسرارِ جسم
فاش ہوں
اور نیلگوں وسعت کے خواب آلود گھنے شاداب جنگل میں
تو کرے خود کو تلاش
اور ترا سرمایہ خوشبو کے پرندے کی طرح
تیرتا پھرتا رہے اڑتا رہے
تیرا یہ رنگین شہابی جسم اک کشکول بن کر
ٹھوکریں کھاتا پھرے ہر کوچہ و بازار میں
اور آب و گل کے زنداں میں یہ تیری روح بھی
پھڑپھڑاتی ہی رہے زخمی پرندے کی طرح
خود کو میری انگلیوں کے لمس سے محفوظ رکھ

● ۸۸/۲۸۸ نعیم آباد کانپور (یوپی)

حفیظ آتش



شعور

میں اس جزیرے میں جب رکا تھا
تو یاں کے منظر
میرے لیے اجنبی تھے، لیکن
بہت حسین تھے۔
یہاں کے سب رنگ میری آنکھو
اس طرح سے اتر گئے تھے
کہ جیسے اس کے سوا نہیں کچھ
مگر میری روح کے سمندر کی
جاگتی موجیں کہہ رہی تھیں،
یہ خواہشوں کے طویل جنگل
یہ عادتوں کی اندھیری کھائی
ترے لیے
خودکشی کے پھندے بنا رہی ہے
مگر میں اب جینا چاہتا ہوں
مجھے صلیبوں کی زینتیں دو
میرے لہو کے یہ سارے قطرے
اٹھا لو!
کھیتوں کی نذر کر دو!

● بیکا کالاقہ اسپیشیم بازار شفقت!

شکیلہ رفیق
معرفت نیشنل میڈیکیور، آرام باغ روڈ، کراچی۔ ۱ (پاکستان)

کسوٹی ۱۹۹۰ء

میں نے ایک شخصیت سوچی ہے۔ جواب کیلئے آپ کے پاس ۲۰ سوالوں کی گنجائش ہے۔"

۱۔ شخصیت مرد ہے؟

"جی ہاں"

۲۔ تعلق برّاعظم ایشیا سے؟

"جی!"

۳۔ برّصغیر کی کوئی شخصیت!

"جی ہاں!"

۴۔ عمر چالیس سال سے کم؟

"جی نہیں"

۵۔ پچاس سال سے زائد؟

"جی"

۶۔ ساٹھ سال سے بھی زائد؟

"جی"

۷۔ وجہ شہرت؟

"اس سوال میں کئی سوال شامل ہیں، شرط صرف ایک سوال کی ہے"

۸۔ تعلق شعبہ تعلیم سے؟

"جی نہیں"

۹۔ کوئی اداکار؟

"اداکار بھی نہیں"

۱۰۔ سیاست تو وجہ شہرت نہیں؟

"قطعاً نہیں"

۱۱۔ کھیل سے کوئی تعلق؟

"نہیں"

۱۲۔ ادب سے متعلق کوئی شخصیت؟

"جی نہیں"

"ابھی تک شعبے ہی کا تعین نہیں ہوا جب کہ بارہ سوال ہو چکے ہیں۔"

"کیا یہ بھی سوال ہے؟"

"کمال کرتے ہیں آپ! بھلا یہ سوال کیوں کر ہو سکتا ہے؟"

"ٹھیک ہے تو کیجئے سوال"

۱۳۔ گلوکاری.........یا یوں سمجھ لیں کہ شخصیت کا تعلق فنونِ لطیفہ سے ہے؟

"نہیں"

۱۴۔ اچھا یہ بتائیے.........شخصیت کا تعلق پڑوسی ملک ہندوستان سے ہے؟

"وہاں سے بھی"

"وہاں سے بھی؟.........عجیب سا جواب ہے، آپ واضح جواب دیجیے اور میری اس بات کو سوال نہ شمار کریں"

"جواب واضح ہی ہے.........ویسے آپ کی بات مانے لیتے ہیں اور اسے سوال شمار نہیں کرتے.........اب اگلا سوال کیجئے"

۱۵۔ شخصیت مسلمان ہے؟

"الحمدللہ"

۱۶۔ شادی شدہ؟

"جی ہاں"

۱۷۔ تعلق پاکستان سے؟

"یہاں سے بھی"

"پھر ویسا ہی جواب.........

آپ کے جوابات نہایت مبہم ہیں"

"آپ کے سوالات بھی تو اتنے واضح نہیں ہیں"

"یہ غلط بیانی ہے، میں بالکل صاف اور سیدھے سوالات کر رہا ہوں"

"بحث سے کیا حاصل...... بہرحال اگلا سوال کیجئے۔"

۱۸۔ چلئے بقول آپکے صاف طور پر پوچھ رہا ہوں۔ شخصیت پاکستان میں مقیم ہے!

"جواب اثبات میں ہے۔"

۱۹۔ کب سے؟

"گو کہ یہ بھی ایک سوال ہی ہے مگر آپ کی خفگی کے پیش نظر کچھ نہیں کہتا......

جواب ہے تقریباً بیالیس (۴۲) سال سے"

۲۰۔ یعنی شخصیت پاکستانی ہے؟

"ابھی اس بات کا تعین نہیں ہوا"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ ایک شخص جس کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی ہے اور وہ ۴۲ سال سے پاکستان میں مقیم ہے۔ آپ اس کی قومیت کے بارے میں مشکوک ہیں؟ کمال کرتے ہیں آپ!!" —— "مشکوک میں نہیں ہوں......

"بہرحال! میں بس یہ نہیں جانتا...... آپ مجھے سوچ کر یقینی جواب دیں، اور میرے اس سوال کو بھی شمار نہ کریں۔"

"چلئے آپ کی خفگی کے پیش نظر اس سوال کو بھی شمار نہیں کرتا..... اب آپ اگلا سوال کریں۔" —— "شخصیت مذہبی ہے؟"

"ملاؤں والی کوئی خصوصیات بظاہر تو اس میں نظر نہیں آتیں...... لیکن اس سے پکا مومن میری نظر میں کوئی نہیں۔"

"آپ! آپ...... بے یقینی کا شکار ہیں۔ آپ کو خود اپنے کسی جواب پر یقین نہیں...... تو آپ مجھے کیا جواب دیں گے۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں، میں نے تو اپنا صرف ذاتی خیال بھی جواب میں شامل کر دیا تھا۔ اور..... جہاں تک بے یقینی کی بات ہے تو فی الوقت تو سب ہی۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ نے میرا اتنا وقت ضائع کر دیا ہے"

"وقت تو سب ہی ضائع کرتے ہیں...... بہرحال اگر آپ نے شکست تسلیم کر لی ہو تو میں آپ کو درست جواب بتا دوں!"

"چھوڑئیے جی! اگر آپ نے پہلے ہی بتا دیا ہوتا کہ آپ اس کھیل میں سنجیدہ نہیں ہیں تو میں......"

"میں نے آپ سے عرض کیا نا کہ میں تو سنجیدہ ہوں مگر......"

"بس بس اگر یہ سنجیدگی ہے تو مذاق جانے کیا ہوتا ہے"

"آپ تو ناراض ہو گئے...... شکست تسلیم کر لینے میں عظمت ہے.... آپ مان لیں تو میں......"

"میں نہیں مانتا...... میری جانب سے آپ عظیم تو کیا عظیم ترین بن جائیے مگر میں اپنی شکست بغیر ہارے کیوں تسلیم کر لوں واہ...!"

"لیکن میں نے تو آپ کو پورا موقع دیا ہے...... آپ نے نہ صرف بیس سے زائد سوال کئے ہیں لیکن ایک ایک سوال میں کئی سوال شامل بھی کئے ہیں۔ اس سے زیادہ اور آپ کیا چاہتے ہیں اور پھر۔ آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ آپ ہارے نہیں ہیں۔"

"اس لئے کہ آپ نے ابتدا ہی سے مجھے کنفیوز کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"دیکھیں جی! کنفیوژن کا شکار تو آپ، میں بلکہ ہم سب ہیں...... جب ہم سب ابہام کی دنیا میں سانس لے رہے ہیں تو وضاحت کیوں کر ہو؟ بہرحال... بات کو مزید نہ الجھائیے میں آپ کو درست جواب بتائے دیتا ہوں۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا، کچھ نہیں کہنا...... میں ابہام سے نکلنا چاہتا ہوں، اگر آپ...... آپ مجھے اس میں سے نہیں نکال سکتے تو پھر ختم کیجئے اس کھیل کو

بقیہ صفحہ ۴۰ دیواروں کے بیچ

ملتے ہیں۔ دس، پچاس، ساٹھ، ہزار۔ ان گنتیوں میں چھپے ہوئے نام، ان ناموں میں پوشیدہ نفرتیں، محبتیں، زمینیں، نسلیں، شجرے، خواہشات..... کتنی داستانیں دیکھتے دیکھتے خاموش ہو جاتی ہیں۔ نہ ان سے کوئی لوک گیت بنتا ہے۔ نہ انہیں کوئی دہرانے کی زحمت اٹھاتا ہے۔ اور دنیا یوں ہی چلتی رہتی ہے۔ ہندوستان سے کٹ کر پاکستان بنتا ہے۔ پاکستان سے ٹوٹ کر بنگلہ دیش الگ ہوتا ہے۔ سرحدی گاندھی کا بڑھاپا۔ ہندوستان سے بھی خفا ہے۔ پاکستان سے بھی ناراض ہے۔ ہر سال آزادی کا جشن منایا جاتا ہے۔ یہاں نیتاؤں کی سمادھیوں پر پھول چڑھائے جاتے ہیں، وہاں قائدین کی مزاروں پر چراغ جلائے جاتے ہیں۔ مراد آباد، سندھ، پنجاب، ویت نام، لبنان، ابھرتے رہتے ہیں ڈوبتے رہتے ہیں۔ انسان تباہی کے ڈائنامائٹ کا موجد، اپنے نام پر امن کا نوبل پرائز تقسیم کرتا ہے۔

خدا حیرت سے دیکھتا ہے، فٹ پاتھ کے پتھر سے نیچے اترنے سے پہلے ہی سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے پیپل کے درخت سے، ہوا سے ہل کر ایک سوکھا ہوا پتہ ٹھیک اسی جگہ آن گرتا ہے جہاں چیونٹا پتھر سے اتر رہا ہے۔ وہ چیونٹے کی کشتی بن جاتا ہے۔ کشتی پانی کے بہاؤ میں کنارے سے لگتی ہے۔ اور چیونٹا کسی زیارت سے لوٹے ہوئے مسافر کی طرح منڈیر پر چڑھتا ہے۔ وہ ایک طویل سفر پورا کر چکا ہے۔ اب شاید وہ اس مٹھاس کے قریب ہو جائے گا جس کی خوشبو آواز بن کر دیر سے اسے پکار رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ رہا ہے لیکن اسی پل نالی سے لگی منڈیر پر ایک پیلی چونچ والی مینا کہیں سے آ کر اچانک اترتی ہے۔ اور سامنے چلتے ہوئے چیونٹے پر پہلے چونچ مارتی ہے۔ اور پھر منہ میں بھر کر اڑ جاتی ہے۔ [باقی آئندہ]



عبد الاحد ساز

حریفِ موجِ ہوا

بڑے جتن سے، بڑی لگن سے

نظر کی باریک کنگھیوں سے
ہنر کی سحر کار انگلیوں سے
سنوارے گیسوئے فکر میں نے

جنوں کے بوٹے خرد کی کلیاں
شعور کی، تجربوں کی لڑیاں
مزاج کے تار میں پرو کر
حسین گجرے بنائے میں نے

میں مطمئن تھا، قریب بھی تھا

کہ اپنی ان ساری کاوشوں کو
کوئی انوکھی تراش دے دوں
ہر اک سرِ مو کو پیچ دے کر
نیا سا اک ارتعاش دے دوں

طلسمِ اظہار کے جگا دوں
حصارِ ابلاغ کے بنا دوں
نگار کے آئینے سجا دوں

ہوا کا جھونکا اک ایسا آیا

گرہ گرہ کل متاع کا کل
بکھر گئے دستِ مشقِ فن سے
تمام آرائشوں کے ساماں

میں منتشر بھی ہوں دُور بھی ہوں

یہ دُور رہ کر یہ دیکھتا ہوں
کہ زلف بڑھتی ہی جا رہی ہے
ہر اک بُنِ مو میں اک نمو ہے

میں دیکھتا ہوں کہ اب یہ گیسو
نہیں ہیں منت پذیرِ شانہ
دراز ہے درد کا فسانہ

میں مطمئن ہوں، میں سوچتا ہوں

اگر یہ زلف اپنے پیچ و خم سے
الجھ کر ان سے گزر سکی تو
خود اپنے حلقوں، خود اپنی گرہوں
میں بے محابا ہوا کے جھونکوں
کے اوج کو قید کر سکی تو
بکھر کے خود میں سنور سکی تو

یہ زلف، زلفِ رسا بنے گی
حریفِ موجِ ہوا بنے گی

انتظار باقی ہے

کانپتی ہیں ہونٹوں پر
کتنی ان کہی باتیں
گونجتے ہیں کانوں میں
کتنے ان سُنے نغمے
جاگتے ہیں پلکوں سے
انگلیوں کے پوروں تک
خواب کتنے ان دیکھے
لمس ان چھوئے کتنے

نام ہے طلب جس کا

مستقل حرارت ہے
حسرت و تمنا کے
آنسوؤں سے نم لیکن
ان بجھے شراروں کی

دائمی مسافت ہے
بے بسی خواہش سے
درد کی رسائی تک
قید سے رہائی تک

خاک و خوں کی سرحد
اُس طرف بھی امکاں ہے
جان و تن سے باہر بھی
زندگی فروزاں ہے

آنکھ جسم بھی جانے
سانس تھم بھی جائے
دل کے تہہ نشیں جذبے
روح میں پہنچتے ہیں

عمر صرف مہلت ہے
عشق لمحۂ دائم
اعتبار باقی ہے

مرا جسم سلامت ہے
تیرا عشق ہے قائم
انتظار باقی ہے

● محمد حاجی آدم اینڈ کمپنی، ۸۴ چکلا اسٹریٹ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

سید یحییٰ نشیط
قلعہ مسجد وارڈ، دارود ۔ ۴۴۵۲۰۲ (مہاراشٹر)

کلاسکی ادب اور توہم پرستی

عقیدے کی شاعری میں بربنائے غلوئے عقیدت ضعفِ ایمانی کا در آنا تعجب خیز نہیں۔ یہ ضعف بڑھ کر نہ صرف یہ کہ توہم پرستی تک پہنچتا ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو اس کی حدیں کفر و شرک سے بھی آگے نکل جاتی ہیں۔ " اسمِ محمدؐ کی جلوہ گری " (بذریعۂ ابجدی طریقہ سے ہر نام میں ۹۲ ثابت کرنا)٭ احد و احمد میں میم' کا پردہ یا حضورؐ کو پیکرِ بشریت میں خدا کہنا وغیرہ اسی ذہنیت کے وہم و بدعقیدگی ہیں۔ کلاسک شعرا کے ' ایسے ' کلام کو جب ' ایمان افروز ' گردانا جانے لگا تو اسی بنیاد پر وہ مقبولیت کے اعلیٰ مدارج پر پہنچے۔ اور بعضوں کو تو ' دامت برکاتہ ' سے بھی متصف کر دیا گیا۔ پھر مرنے کے بعد " رحمت اللہ علیہ " کہلائے جانے لگے۔ مولانا جامی کی " یوسف زلیخا " پر " معارف " میں کبھی ایک مضمون آیا تھا۔ مثنوی کی بنیاد پر مضمون نگار نے حضرت جامیؒ کو صوفیہ کا گل سرسبد، ایمان و یقین کا پیکر کہا تھا۔ اور اس کے مطالعے کو راہِ سلوک میں سنگِ میل کی حیثیت دی تھی، وغیرہ وغیرہ جب کہ جامیؔ نے اس مثنوی میں نہایت ہیجان انگیز جنسی واقعات ہر درجہ عریاں انداز میں قلم بند کئے ہیں۔ جو بے بنیاد، خلافِ سنت و شرع ہونے کے علاوہ نصِ قطعی سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ بلکہ بہ اعتبارِ تاریخ بھی یہ مثنوی شانِ پیغمبری کے لئے بہتانِ عظیم ہے۔ پھر بھی لوگوں نے عقیدتاً اسے مرتبہ بلند عطا کیا۔ یہ قصور شاعر کا نہیں عوام الناس کا ہے۔ کلاسکی ادب میں ایسے واقعات کی کمی نہیں۔

عربی ادب میں " قصیدۂ بردہ " نعتیہ شاعری میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ علامہ بوصیریؒ (م ۶۹۷ھ) کے اس قصیدے نے جو شہرت و قبولیت حاصل کی ہے، قصیدۂ بانت سعاد کو وہ آج تک حاصل نہیں ہو سکی۔ کہا جاتا ہے کہ قصیدۂ بانت سعاد کو سن کر آنحضورؐ نے کعب بن زہیر بن ابی سلمہ کو نہ صرف معاف کر دیا تھا بلکہ بردہ (چادر) بھی اسے مرحمت کی تھی۔ عالمِ رویا میں ایسا ہی واقعہ علامہ بوصیری کو پیش آیا تھا۔ اور حضرت محمدؐ نے خواب میں اسے چادر عنایت کی تھی۔ جس کی وجہ سے بوصیریؒ کو شفائے کاملہ نصیب ہوئی تھی۔ اس روایت کا عوام الناس پر اتنا اثر ہوا کہ جہلاء تو جہلاء علمائے کرام نے بھی قصیدۂ بردہ سے تعویذ گنڈے کا کام لیا۔ چنانچہ مولانا عبداللہ عباس ندوی لکھتے ہیں:

" راقم الحروف کے پاس باجوری کی شرح ہے۔ جس میں ہر شعر کے فوائد مذکور ہیں۔ مثلاً اس قصیدے کے پہلے تین شعر کاغذ پر لکھ کر سرہانے رکھا جائے تو بخار دور ہو جائے گا۔ اور فلاں شعر کے ورد سے روزی بڑھے گی۔ اور فلاں شعر کو لکھ کر گھول کر پی لیا جائے تو اس سے بیماریاں دور ہوں گی۔"

[عبداللہ عباس ندوی عربی میں نعتیہ کلام لکھنؤ ۱۹۷۵ء ص ۱۰۹] بطور تبرک بوصیری کے پہلے تین قصیدے کے اشعار درج ذیل ہیں۔ آپ بھی مستفیض ہوں۔

اَمِنْ تَذَكُّرِ جِيرَانٍ بِذِي سَلَمٍ	تجھے یاد آ گئے کیا ذی سلم کے پیارے ہمسائے
مَزَجْتَ دَمْعًا جَرَى مِنْ مُقْلَةٍ بِدَمِ	یہ خوں آمیز آنسو کیوں تری آنکھوں میں بھر آئے
اَمْ هَبَّتِ الرِّيحُ مِنْ تِلْقَاءِ كَاظِمَةٍ	نواحِ کاظمہ سے کیا یہ متوالی گھٹا آئی
اَوْ اَوْمَضَ الْبَرْقُ فِي الظَّلْمَاءِ مِنْ اِضَمِ	کہ دامانِ اضم میں وقتِ شب بجلی سی لہرائی
فَمَا لِعَيْنَيْكَ اِنْ قُلْتَ اكْفُفَا هَمَتَا	یہاں تو ضبطِ گریہ سے رواں ہوتے ہیں اور آنسو
وَمَا لِقَلْبِكَ اِنْ قُلْتَ اسْتَفِقْ يَهِمِ	کہ دل کو تھامیے تو اور ہو جاتا ہے بے قابو

نوائے بردہ (مترجم فرزند احمد) لاہور ۱۹۷۵ء ص ۹۰۔۹۱

عربی ادب کے جامی شیخ عبدالرحیم البرعی (م ۸۰۳ھ) کے نعتیہ کلام کا بھی یہی حال ہے۔ یمن کے صوفی حلقوں میں موصوف کا شمار ہوتا ہے۔ اہلِ یمن ان کے اشعار کو بطور وظیفہ پڑھا کرتے ہیں۔ حج و زیارت کو جانے والے خاص طور سے ان کے منتخب قصائد اپنے اوراد کے ساتھ رکھا کرتے ہیں۔ ان شعرا کے علاوہ حضرت حسان

بن ثابتؓ، کعب بن مالکؓ، طوسیؒ اور ابن حجر عسقلانی وغیرہ کے کلام کو بھی بطور تعویذ گنڈے کے استعمال کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ اسے چاہے تو ہم پرستی پر محمول کریں یا عقیدت میں شمار کریں۔ بہر حال کلاسکی ادب کا عوام الناس نے ایسا بھی استعمال کیا ہے۔ جو ادب کی افادیت کا مظہر ہے۔ یہ صرف عربی ادب تک ہی محدود نہیں بلکہ فارسی، ہندی اور اردو میں بھی اس کی وافر مثالیں مل جاتی ہیں۔

فارسی کے پہلے صوفی شاعر ابو سعید ابوالخیر (م ۴۴۰ھ) کی کئی رباعیات بطور تعویذ استعمال ہوتی آئی ہیں۔ صاحب "نقش سلیمانی" نے لکھا ہے کہ:

"جب کوئی مشکل سخت و دشوار پیش آئے تو رباعی حضرت شیخ ابوالخیر ابو سعیدؒ کو اس طرح پڑھے کہ اول وضو کرے اور پھر دو رکعت نماز پڑھ کر بیٹھے اور شیرینی لے کر فاتحہ حضرت ممدوح کی کرے پھر درود شریف کے بعد رباعی کو ستر بار پڑھے۔ اور اپنے مطلب پر دھیان رکھے۔ ہر مرتبہ بعد رباعی کے ایک بار یا شیخ ابوالخیر ابو سعیدؒ کہے۔ جب موافق تعداد مذکور کے رباعی پڑھ چکے تو پھر درود شریف پڑھے یہ رباعی اثر یا قاضی الحاجات کا رکھتی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

نقش سلیمانی: خواجہ اشرف علی لکھنوی: دہلی حصہ اول ص ۲۲

یارب بہ محمد و علی و زہرا　　　یارب بہ حسن و حسین و آل عبا

از لطف برآر حاجتم در دو سرا　　　بے منت خلق یا علی الاعلیٰ

[ابو سعید ابوالخیر (مرتبہ) آقائے م۔ ابدالی، "تاثرات" لاہور بلا تاریخ ص ۹]

عامل خواجہ اشرف علی کہتے ہیں کہ واسطے دفع ہونے درد زہ کے یہ شعر مجرب لکھ کر عورت کی داہنی ران پر باندھے۔ خدا کے فضل سے درد دور ہوگا فرزند پیدا ہوگا۔

برا جائے شد خرما جائے شد　　　تو خواہی بزائی و تو خواہی مزائے　　　(نقش سلیمانی ص ۱۵)

جو شخص ذیل کی رباعی کو ہر روز بعد نماز پنجگانہ کے تین بار پڑھے گا اس کی سب حاجتیں پوری فرمائیں گے۔

اے خالق ہر بلند و پستی　　　شش چیز عطا بکن ز ہستی

علم و اعمال فراخ دستی　　　ایمان و امان و تندرستی

فارسی کا چلن نہ ہونے کے باوجود کئی مساجد میں بعد نماز فرض، امام کو دعا میں اس رباعی کو اہتمام سے پڑھتے ہوئے راقم نے بھی سنا ہے۔ ادب پاروں کو یوں عقیدتاً ہی سہی "ذریعۂ نفع رسانی" بنائے جانے رکھنے کی روایت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے۔ ادب کے کار آمد اور افادی ہونے کی یہ چند مثالیں ہیں۔ ہمارے ناقدینِ ادب کے اس تصور سے انکار کر بھی لیں لیکن ان تاریخی شواہد سے مفر ممکن نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سادہ لوح عوام کا اس کے ذریعہ استحصال بھی کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔

فارسی کلاسک میں حافظ شیرازی کے کلام کو بلند و بالا مقام حاصل ہے۔ عوام الناس اور علمائے کرام نے ان کے دیوان کو فال گیری کے لئے کار آمد بنایا ہے چنانچہ حافظ کے کلام سے فال گیری کا کام لینے کا ایک مشہور واقعہ اکثر سنا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہ ایران کی بیوی کا ہیروں کا بار چوری ہو گیا تھا۔ شاہ کی ایما پر رات کو کسی نے دیوانِ حافظ سے فال نکالا تو جو شعر حاصل ہوا اس کا مصرع اولیٰ تھا کہ

"چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد"

شاہ کی کنیز ہاتھ میں چراغ لئے وہاں کھڑی تھی۔ اسی لئے فال کے مطابق اسی کو دھر لیا گیا۔ بعد میں کنیز نے اقرار جرم کر لیا۔ ہمیں اس افسانے میں خوش عقیدگی کے علاوہ کچھ اور نظر نہیں آتا۔ اگر یہ واقعہ مبنی بر حقیقت ہو بھی تو ہمارا ایمان اسے اتفاق ہی سے تعبیر کرے گا۔ لیکن آج بھی دیدہ و دانستہ دیوانِ حافظ سے فال گیری کا کام لیا جا رہا ہے۔ اور عوام کا ایک طبقہ اس پر یقین بھی رکھتا ہے۔ تو ایسے لوگوں کے لئے یہ ادبی صحیفہ کار آمد ہی ٹھہرے گا۔

ہندی ادب میں تلسی داس سے منسوب ایسا ہی ایک فال نامہ مروج ہے۔ ایک چوکور کے اندر غالباً ۱۴ عمودی اور اتنے ہی افقی خانے ہیں جن میں تلسی داس کے دوہوں کے حروف تہجی درج ہیں۔ آنکھ بند کر کے جس حرف پر انگلی رکھ دی جائے وہاں سے ہر نواں یا تیرہواں حرف شمار کرتا چلا جائے تا آنکہ چوکور کے تمام حروف شمار میں آ جائیں۔ شمار کردہ تمام حروف با ترتیب لکھنے سے تلسی داس کا ایک با معنی دوہا تیار ہو جاتا ہے۔ جس سے مطلوبہ چیز کا اشارہ ملتا ہے۔

اردو ادب میں بھی یہ "کفر" جا بجا ملتا ہے۔ صرف دو ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ اردو اشعار تعویذ گنڈوں کے طور پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ذکر کیا

دکنی ادب میں تو اس کی بہت ساری مثالیں موجود ہیں۔ چونکہ سادہ لوح عوام بنگال کے کالے جادو پر یقین رکھتے ہیں اس لئے مثالیں اسی علاقے کی دی جا رہی ہیں۔
حضرت شیخ شرف الدین یحیٰی منیریؒ (م ۷۸۲ھ) اردو ادب میں اپنے کچھ منتروں، دوہروں، نسخوں اور فال نامے کے لئے معروف ہیں۔ ان سے منسوب فال نامے کا ذکر جمیل جالبی نے اپنی ضخیم تصنیف تاریخ ادب اردو جلد اول کے صفحہ نمبر ۹۳ پر کیا ہے۔ حضرت منیریؒ سے منسوب سانپ اتارنے کا منتر بھی ہے۔ جو بہت مشہور و معروف ہے۔ اس کے عامل ہندوستان بھر میں ملتے ہیں۔ اس منتر کے عامل کے لئے ضروری ہے کہ تینوں نوری راتوں (شب معراج، برأت و قدر) میں بائیں ہاتھ سے پانی کھینچ کر اس سے وضو کرے اور وظیفہ کرے۔ اسی طرح عامل کے لئے ضروری ہے کہ شب میں کھانا کھاتے وقت چراغ گل نہ ہونے دے۔ ورنہ افسوں کا اثر جاتا رہے گا۔ سانپ کا زہر اتارنے کے لئے عامل کا کام صرف اتنا ہے کہ خبر لانے والے کو ذیل کا منتر پڑھ کر طمانچہ مارے سانپ گزیدہ کا زہر اتر جائے گا۔ منتر مشہور یہ ہے، جسے مولوی عبدالحق نے بھی اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔

کالا ہنسا نہ ملا نسے سمندر تیر
پنکھ پسارے بکھ ہرے زمل کرے سریر
درد رہے نہ پیڑ
شرف حرف مائل کہیں درد بچھو د بسائے
گرد چھوئیں دبار کی سو درد دور ہو جائے

[مولوی عبدالحق، اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، علیگڑھ ص ۱۸۔ ۱۷]

سید سلیمان ندوی نے نقوش سلیمانی میں مخدوم اشرف کچھوچھویؒ (م ۸۰۸ھ) کے بچھو کے کاٹنے کے کئی منتر نقل کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

دھر بند ہون، دھر کند ہون   سو الاکھ سیاری بند ہون
اپنے بھگت گرو کے سکت   ہون بکھ جو آگے چڑھے   (نقوش سلیمانی ص ۹۳)

موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ "نسخ و کتابت کی غلطیوں سے مسخ ہو گئے ہیں" ہو سکتا ہے کہ اس وجہ سے اب ان کا اثر بھی زائل ہو گیا ہو۔
"مجربات سلیمانی" میں خواجہ اشرف علی نے آدھے سر کے درد کے لئے ایک افسوں بشکل دوہرہ درج کیا ہے۔ اول و آخر اس دوہرے کے درود شریف پڑھ کر سات بار اس افسوں کو پڑھ کر دم کرے درد سر جاتا رہے گا۔ دوہرہ یہ ہے۔

آدھا سیسی بسی کنپٹی بسی کپارے   اکو محمدؐ ہانک دو بربس کرے خدائے (ص ۹۶)

ادب کو افسوں، منتر، تعویذ گنڈے اور عملیات کے لئے استعمال میں لانے کی ایسی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ علمائے کرام نے "قرآن میں شفا ہے" والی آیت سے استدلال کر کے تعویذ اور جھاڑ پھونک کو روا رکھا ہے۔ اسی لئے انہوں نے قرآن جیسے باعظمت ادب عالیہ کے ساتھ ہی دیگر زبانوں کے ادب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور ادب کو دیگر گوشوں میں نہ سہی حیات انسانی کے "اس" گوشے کے لئے مفید و کار آمد بنایا۔ اسے اب توہم پرستی پر محمول کیا جائے یا پھر اندھی عقیدت پر یا پھر دور از کار استدلال کے سہارے جزو ایمان سمجھا جائے۔ مختلف زبانوں کے کلاسیکی شعر و ادب کو اس طور پر برتے جانے کی یہ چند مثالیں تحقیق کا ایک دلچسپ موضوع ہیں۔ ✻

بقیہ صفحہ ۴۳ تخلیقی تجربے اور انحرافات

روایات سے انحراف کا خیال ہمارے ذہن میں بے قاعدگی کا تصور ابھارتا ہے۔ لیکن در حقیقت ایسا نہیں۔ تخلیق میں روایت سے انحراف کے باوجود موضوع اور ہیئت کے درمیان ہم آہنگی اور ترتیب نظر آتی ہے۔ یہ ترتیب تخلیق کی ہر سطح یعنی صوتی، صرفی اور نحوی سطح پر نظر آتی ہے۔ اس طرح تخلیق کا ہر حصہ اس ہم آہنگی اور ترتیب کی وجہ سے تخلیق کار کے INNER VISION تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انحرافات کے باوجود تخلیق کی لسانی ہم آہنگی بصیرت کو تشکیل کرنے میں ایک اہم رول انجام دیتی ہے۔ تخلیق کے الفاظ و تراکیب کے باہمی ربط کے تجزیے کے بغیر تخلیق کار کے وجدان و بصیرت تک رسائی نہیں حاصل کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوبیاتی تنقید ادبی تخلیق کے لسانی ساخت اور انحرافات کے باہمی ربط کو نظر انداز نہیں کرتی اور اس باہمی رشتے کے ذریعے تخلیق کار کے INNER VISION تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ ✻



خ۔ زماں انصاری

نہیں ہے کچھ تو یہ اصرار کیا ہے
ذرا دیکھوں پسِ دیوار کیا ہے

لبوں پر خامشی آسیب کی سی
کہیں کھلتا نہیں اسرار کیا ہے

ردائے وقت میں لپٹے پڑے ہیں
خبر کیا! جبہ و دستار کیا ہے

مری ٹھوکر پہ، ہو کوئی مخالف
محبت میں رسن کیا دار کیا ہے

بلندی سے تعاقب میں ہیں آنکھیں
زماںؔ حائل کوئی دیوار کیا ہے

● پلاٹ نمبر ۱۴۴، ٹی۔ ۲ سرکل، این ٹی پی سی کالونی، ۴۱۱۰۲۳



کامران نجمی

گزر رہا ہے ہر اک پل قیامتوں کی طرح
ہم ایسے لوگ ہیں خستہ عمارتوں کی طرح

جبینِ وقت پہ کیسے میں جھوٹ لکھ دیتا
کہ حرف حرف تھا روشن صداقتوں کی طرح

کبھی خیال کی صورت بکھر بھی جائیں گے
سمٹ رہے ہیں ابھی تو علامتوں کی طرح

ہمیں اے لرزشِ پیہم سنبھال کر رکھنا
کہ ہم مقیم ہیں دل میں امانتوں کی طرح

مرا ندیم ہے لیکن وہ منصفِ دوراں
مجھے بھی ضبط کرے گا ضمانتوں کی طرح

وہ کون لوگ ہیں نجمیؔ جو اس نئے یُگ میں
لپٹ کے روتے ہیں خود سے روایتوں کی طرح

● شعبہ اردو، ایس۔ کے۔ کالج، سیکر-۳۳۲۰۰۱ (راجستھان)



ہلال فرید

راستہ دیر تک سوچتا رہ گیا
جانے والے کا کیوں نقشِ پا رہ گیا

آج پھر دب گئیں درد کی سسکیاں
آج پھر گونجتا قہقہہ رہ گیا

اب ہَوا سے شکایت کر رہا ہے گلہ
ایک گل شاخ پر کیوں بچا رہ گیا

ہنستے گاتے ہوئے لفظ سب مٹ گئے
آنسوؤں سے لکھا حاشیہ رہ گیا

وقت کی دھار میں بہہ گیا سب مگر
نام دیوار پر اک لکھا رہ گیا

اُس کے دم سے کہے شعر میں نے ہلالؔ
پھول اس دھوپ میں جو کھلا رہ گیا

● بی ۔ ۸، میڈیکل کالج کالونی ۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

جوگندر پال
۲۴ منداکنی انکلیو، کالکاجی نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۹

خواب رو

قسط نمبر ۸

" میں آپ کا نیاباورچی ہاں، بڑے مولوی سائیں۔" اچھی بیگم نے انہیں بتایا کہ سائیں باباکو اسحٰق مرزا نے بھیجا ہے۔ اور اس نے اسے کام پر رکھ لیاہے۔

دیوانے مولوی صاحب نے سائیں کا بھرپور جائزہ لیاہے۔ اور کہا ہے "سندھ وندھ کے معلوم ہوتے ہو؟"

"جی ہاں، بڑے مولوی سائیں،"

" کیا تم لوگوں کو اپنے دیس میں کام نہیں ملتا؟ " " کام تو بڑی مشکل سے ملتا ہے، سائیں۔" سائیں باباکی سمجھ میں نہیں آرہا کہ دیوانے مولوی صاحب اس سے کیا جواب طلب کر رہے ہیں۔

" اسی لئے سندھی اور پنجابی مہاجرین کی کثیر تعداد ہمارے نواح میں آبسی ہے۔" وہ اچھی بیگم کے پیچھے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے ایک بار پھر سائیں باباکی طرف مڑے ہیں۔ "خوب جی لگا کے کام کرو بھیا۔ لکھنو بڑے قسمت لوگوں پر اپنا دروازہ کھولتا ہے۔"

— ۷ —

ہاں، ہاشم، مائی ڈیری ڈیئر فرینڈ، پچھلے دو ماہ میں تم نے مجھے جتنے بھی خطوط لکھے وہ سبھی مجھے مل گئے۔ مگر کیا کروں، تمہارے ان خطوط میں ایک بھی ایسا نہ تھا۔ جس میں کوئی دل کی بات ہو، یا کم از کم کام کی سند۔ اب بھی میں تمہیں تمہارے کسی خط کا جواب دینے کے لئے نہیں لکھ رہا۔ بلکہ صرف تم سے مل بیٹھنے کی خواہش، پوری کر رہا ہوں۔ غلط نہیں کہ لکھ لکھ کر کسی کے سامنا نہیں ہو جاتا۔ لیکن تمہارا لکھا ہوا پڑھ کر تو کوئی مجھے لگا کہ تم سے اور ہو رہا ہو جاتا ہے۔ سو ظالم، اور خط لکھ کے مجھے جدائی میں اور مت تڑپاؤ۔ اس کی بجائے وقت نکال کر خود آپہنچا کرو۔

اسحٰق مرزا نے چھٹی کو روک سوچا ہے۔ ہاں، اگر ہاشم آسکے تو لطف آجائے۔ لاہور پشاور کا رخ کئے ایک مدت بیت چکی ہے۔ اس کے آتے ہی اسے اپنے ساتھ کار میں بٹھالوں گا۔ اور حیدر آباد پار کر کے اسے بتاؤں گا ہم کہاں جا رہے

جتنی دیر میں خدا کا واسطہ دے دے کر وہ چلاتا رہے گا۔ کہ مجھے چار دن میں واپس سعودی عرب پہنچنا ہے، میں اسے بہاولپور ملتان سے بھی آگے لے آؤں گا۔ باؤ فقیر محمد کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ بیش تر۔ سرور تر۔ چلّو باؤ تمہارے پنڈ ہو آئیں۔ اوئے یارا، یہ کوئی پچھن والی بات ہے؟ چلّو ابھی چلّو۔ اسحاق مرزا اسی لئے پنجابی کو اتنا عزیز رکھتا ہے کہ کٹھی کے اتنے سخت اور دل کے اتنے نرم! اک ذرا ان کے دل میں ہاتھ ڈال کر جو چاہو نکال لو۔ اسحٰق مرزا کی چھوٹی سالی کلثوم کی شادی گذشتہ سال ایک بڑے بڑے گھنے مونچھوں پنجابی زمیندار سے انجام پائی تھی۔ سبھی کا اپنے چودھری کی مونچھوں کا کچھ کرو۔ ایک بار اسحٰق مرزا نے اس سے کہا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں چبھنے لگتی ہیں۔ وہ بولی میں بھی ڈرا کرتی تھی دولہا بھائی، کہ شیر کی سواری کب تک کر پاؤں گی۔ میری آنکھیں بھی چبھا کرتی تھیں مگر اس نے مجھے بتایا، کھڑی فصلیں ہیں یہ بھی۔ انہیں دیکھ دیکھ کر تو تمہارے دل میں: انے پھوٹنے چاہئیں۔ میں کلثوم نہیں دولہا بھائی، کبھی میرے گاؤں آکر دیکھو، ہماری فصلوں کو آنکھوں میں بسا لو گے۔ اسحٰق مرزا نے فیصلہ کیا ہے کہ اس دورے میں وہ کلثوم کے یہاں بھی ہو آئیں گے۔

اسحٰق مرزا پھر چھٹی پر جھک گیا ہے۔

ہاشم یار، میں نے ابھی ابھی سوچا ہے کہ اب کے جب تم اپنے ملیح آباد آؤ گے تو تمہیں چکمہ دے کر پنجاب اور سرحد کی جانب لے جاؤں گا۔ اب تمہیں بتا ہی دیا ہے تو کان کھول کے سن لو تمہیں بہرحال جانا ہوگا۔ "نا" کہو گے تو تمہیں اٹھوا کے لے جاؤں گا۔ بھابی کہتی ہے تم آتے ہی واپسی کی رٹ لگانا شروع کر دیتے ہو۔ اسی لئے چپ ہو کر رہ جاتی ہے کہ یہ شب تیری کا قصد کئے ہوئے کو روک کر تو پاپ کیوں لگے۔ مگر تم وہ شب حج کی نیت سے تھوڑا ہی جاتے ہو۔ تمہیں تو پیسے کا لوبھ واپس کھینچ رہا ہوتا ہے۔ اور کسی کو لوبھ سے روکنا تو ہر کیف ثواب کا کام ہے۔ اب کے لمبی چھٹی لے کر آؤ۔ ریل یا ہوائی جہاز کی بجائے میری کار میں چلیں گے۔ باؤ فقیر محمد کو ہم ساتھ لے لیں گے۔ بڑا یار باش آدمی ہے۔ بابو بنا گورنمنٹ سے تعلق رکھتا ہے۔ جو ہمارا

شاعرِ ملت اقبالؒ کا شہر ہے۔ اس مردم خیز شہر کی ان گلیوں میں گھومیں گے جہاں ہم دونوں کے اس محبوب شاعر کو اپنی آئندہ کی سوچوں کی پرچھائیں دکھائی دینے لگی۔ بالو خیر محمد کا کہنا ہے کہ اپنے شہر لوٹتے ہی مجھے بھولی ہوئی نمازیں یاد آ جاتی ہیں۔ ہاں، لاہور تو سیالکوٹ سے بھی پہلے پہنچیں گے۔ تم نے سن ہی رکھا ہوگا۔ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ مجھے معلوم ہے بابا، تم نے لاہور دیکھ رکھا ہے مگر تمہارے بارے میں یہ ہے کہ تم لاہور دیکھ کر بھی پیدا نہ ہو سکے، میرے بھائی عہدِ طفلی میں ابّا جان کی انگلی پکڑ کر لاہور تو گیا، تمہارے ملیح آباد کا اکلوتا بازار کبھی دیکھنے میں نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے چار بچوں کا باپ بن کر بھی تمہارا ابھی پیدا ہونا نہیں ہوا۔

خوب یاد آیا پیارے۔ ثروت سے مجھے شہزادی شیتا کی چھٹی بھی آئی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ اس کا میاں لیفٹیننٹ کرنل بن گیا ہے۔ انگریزوں کے راج میں ہمارے بڑے فخر سے اپنے فیتوں کی نمائش کرتے پھرتے تھے۔ آزادی نے ہمارے بچوں کو اپنے جوہر دکھانے کے لئے کتنے مواقع فراہم کیے ہیں! کوئی جہاں تک بھی اپنے بل بوتے پر چلتا جائے۔ میں تمہاری طنزیہ مسکراہٹ کو محسوس کر رہا ہوں مگر سوچو، یہی کیا کم ہے کہ ہم نسلی دیواریں پھاند لینے میں کامیاب رہے ہیں۔ اور اللہ ہی بہتر، جہاں تک اس کا دم نہیں ٹوٹتا وہاں تک ہمارا ہر شہری اپنی دوڑ جاری رکھنے کا مجاز ہے۔ اتنے کھلے میدان کی بات بذاتِ خود غیر اہم نہیں۔

ہاشم علی دراصل اسی لئے ملک سے باہر چلا گیا تھا کہ یہاں اسے اپنی تربیت اور صلاحیت کے مطابق کوئی کام نہیں مل رہا تھا۔ کہیں کامیابی کے آثار نظر آنے بھی لگتے تو اوپر سے کسی اور کی سفارش آ جانے پر وہ ہاتھ مل کر رہ جاتا۔ اسحٰق مرزا نے اسی وقت بھی اس سے پاکستانی شہری کی دوڑ کے وسیع تر امکانات کا ذکر کیا تھا۔ اس دوڑ کا کیا فائدہ۔ ہاشم علی نے جل بھن کر کہا تھا۔ اس ملک میں تو ہر کوئی جہاں سے شروع کرتا ہے وہ ساری عمر کی دوڑ دھوپ کے بعد وہیں آ پہنچتا ہے۔ اسحٰق مرزا نے کبھی نہیں چاہا ہے کہ اپنے ماموں زاد بھائی کے بیان کردہ تلخ حقائق سے چشم پوشی کی جائے۔ اس کی تو یہ خواہش ہے کہ حقائق سے بھاگنے کی بجائے مردِ مومن کے مانند ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔

کسی قوم کی تکمیل میں ---- اس نے چٹھی کو آگے بڑھایا ہے۔ ہر نئی نسل کو وہاں سے شروع کرنا پڑتا ہے۔ جہاں اس کے پیش روؤں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ آج اگر ہمیں گناہگاروں خرابیوں کے سدھار کے لئے دکھ جھیلنا پڑتے ہیں تو یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ ہمارے جھیل لینے سے ہمارے بچے انہیں جھیلنے سے بچ جائیں گے۔ تم اپنے دکھ جھیلو، انہیں صرف اپنے جھیلنے دو۔ یہ میں کس چکر میں پڑ گیا ہاشم! اگر تم ہر کیا اس طرف سے سمجھ لیا کرو تو اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ مگر کیا مضائقہ ہے، تمہارے الجھنوں کے مطابق چکروں کا ایک یہ فائدہ تو ہے کہ جہاں سے چلیں۔ چلتے چلتے ہی پھر وہیں آ جاتے ہیں۔ شہزادی نے اپنی چٹھی میں یہ بھی لکھا ہے کہ ممکن ہے اس کے میاں کو ہماری دلی کی ایمبیسی میں سال چھ ماہ کے لئے ملٹری اٹیچی کا عارضی معاون بنا کے بھیجا جائے۔ اس کا میاں اسے بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہے لیکن شہزادی کو جانے کیوں تامل ہے۔ مگر میں اسے لکھوں گا کہ وہ بہر صورت ساتھ جائے۔ کیا ایسا نہیں ہے ہاشم، کہ ہمارے دونوں ملکوں کے سانجھے مرض کی ایک نمایاں علامت شک و شبہ ہے جو ہم ایک دوسرے سے بے سبب برتنے سے کبھی گریز نہیں کرتے! آئندہ نسلوں کا چھٹکارہ یوں ہی ہو سکتا ہے۔ کہ دونوں جو انہیں کے نو عمر اکثر ملا کریں اور لڑنا بھی ہو تو قومی لڑائیاں لڑنے کی بجائے صرف نجی طور پر لڑیں جھگڑیں، خوب لڑیں جھگڑیں، پیار سے یا غصے سے، مگر ملتے رہیں۔ یہ تو دو پڑوسی ملکوں کے لوگ ہوئے، سچائی یہ ہے کہ میاں بیوی سالوں تک ایک دوسرے سے نہ ملنے کی قسم کھا لیں۔ تو خواہ وہ طلاق لیں یا نہ لیں، ان کا رشتہ بھی آخر سوکھ کر ہی بکھر جاتا ہے۔ اور کبھی ان کا ملنا ہو جائے تو ایک دوسرے ہی سے ایک دوسرے کے بارے میں پوچھتے پھرتے ہیں کہ فلاں کہاں ملے گا۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ ہمارے دل میں ہو تو کہیں باہر بھی ملے۔ نہیں، ہاشم علی میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ ایسا نہیں ہو سکتا تو کیوں نہیں ہو سکتا۔ یہیں کراچی میں کوئٹہ کا ایک نوجوان کوئی ساڑھے تین دہے پہلے نوکر ہوا۔ تنخواہ واجبی سی تھی۔ اس لئے بیچارہ گھر پیسے بھیجتا رہا مگر اپنا وہاں جانا ہمیشہ ٹالتا رہا۔ اور، اگلے سال ضرور جاؤں گا، کی امید پر اسے پینتیس برس گزر گئے اور پھر جب کام سے ریٹائر ہوا۔ اور گھر لوٹنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہا تو وہاں گیا اور گھر پہنچ کر دروازہ کھٹکھٹایا اندر دروازے پر اپنی نوبیاہی بیوی کو پاکر ------- اور اس سے کچھ کہے بغیر لپٹ گیا اور ذرا ہی بعد میں یہ معلوم کر کے بہت شرمندہ ہوا کہ وہ تو اس کی چونتیس سالہ کنواری بیٹی ہے۔ اور کہ اس کی بوڑھی بیوی اندر بیمار پڑی ہے بے خبر ابھی اور سنو، اندر اس کی بڑھیا گردے کے درد سے کھاٹ پر پڑی ہائے ہو کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی کہ آپ سے آ گئے ہو بھائی؟ میرے مرد کا کچھ اتا پتا سنا دیں۔ سنا ہے وہاں تین بیویاں رکھے ہوئے ہے۔ اور اتنے پیسے میں کھیلتا ہے کہ شریعت اگر اجازت دیتی تو تین اور کر لیتا۔ نہیں، ہاشم نہیں، گھر سے جدائی ہاتھ بھی لگے ہوئے محل نہ ہو تو اسے ہنسی میں نہیں اڑایا جا سکتا۔ جو آپس میں ملتے ہی نہیں وہ ایک دوسرے کو کیا سمجھیں گے؟ حقیقت ہے کوئی پیسے بھی کما لے، ہاں، مجھ کو یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ کئی سال ایک ساتھ رہتے رہتے بعض لوگ پھر ایک دوسرے سے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ہم اس پر بحث کر رہے ہیں کہ آشنائی کے لئے وصل کیوں ضروری ہے۔

اسحٰق مرزا نے مسکرا کر قلم روک لیا ہے۔ کیا وہ ہاشم کو یاد دلائے کہ نوجوانی

میں جب ریحانہ نے ناکام عشق میں وہ خودکشی کے درپے ہو گئی تھا۔ اس ریحانہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ منقطع ہوتے ہی وہ کیوں کر اپنی بیوی سے شادی پر اتنا شاد کام تھا اور شادی کے بعد کیسے دھیرے دھیرے پیدا کرتا چلا گیا؟ اسحٰق مرزا کو محسوس ہوا کہ ہندو پاک کی بات قلم سے نکلی جا رہی ہے۔ اس نے قلم کو انگلیوں میں مضبوطی سے دبالیا ہے۔

کیا تمہارا ابھی یہی مشاہدہ نہیں، ہاشم؟ ہندوستان کے تعلق سے ہمارے بڑے تو اس قدر ناشکیبا کا شکار ہیں کہ یہیں کے آموں کو ملیح آباد کے آم نہ کہہ لیں۔ تو انہیں وہ کرسی کا بھی نہیں گردانتے۔ اور چھوٹوں کا خیال ہے کہ ہندو جانور کا گوشت نہیں کھاتے، بس یا تو گھاس پھوس کھاتے ہیں یا آدمی کا گوشت۔ ملاحظہ ہو، یکساں تاریخ کے دو ملکوں کے باشندوں کی فکر کے پیمانے کتنے مضحکہ خیز ہیں۔ ایک طرف یورپ کے ترقی یافتہ ممالک ہیں کہ وہاں سینکڑوں ریل گاڑیاں ہر روز ایک ملک سے دوسرے میں اس مانند داخل ہوتی رہتی ہیں جیسے ایک ہی ملک کے ایک شہر سے دوسرے شہر میں۔ دوسری طرف ان دو بدقسمت پڑوسی ملکوں کے باشندے تصور میں بھی ادھر سے ادھر جانے سے کتراجاتے ہیں کہ کہیں ویزا نہ ہونے کے باعث دھر نہ لئے جائیں۔

ہماری سرکاروں کی اولین ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہونا چاہئے ڈیئر ہاشم کہ اپنے اپنے ہنگامی مفادات کو بالائے طاق رکھ کر دونوں طرف داخلے میں ڈھیل چھوڑ دیں۔ ورنہ خوف زدہ عوام کی فطری صلاحیتیں پنپیں گی تو کیا مسلوب ہو کر رہ جائیں گی۔ چند ہی روز کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان ہندوستانی سندھی وکیل اپنے باپ کا پرانا گھر اور شہر دیکھنے یہاں آیا ہوا تھا۔ وہ کسی کامن فرینڈ کا انٹرو ڈکشن لایا تھا، تاکہ میں اس کی ہر ممکن مدد کروں۔ جو میں کرنا بھی چاہتا تھا۔ لیکن ابھی وہ میرے یہاں کھانے پر آیا ہوا تھا کہ دوسرے دن انٹلی جنس کا ایک افسر میرے سر پر آ سوار ہوا۔ آخر آپ کا اس کے ساتھ تعلق کیا ہے؟ وہ بار بار پوچھتا رہا۔ اور آخر جب میں نے اسے بتایا، میں نے کلاسیکی فارسی شعرا کو بڑی معصوم عمر تک پڑھا ہے، تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ پانے کے باوجود بگڑ گیا کہ میں کیا پوچھ رہا ہوں۔ اور آپ کیا جواب دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے آدمی کئی روز تک میرے پیچھے سائے کی طرح لگے رہے۔ سچ پوچھو تو ان کے بعد اس کے ہم جنسوں کے خوف سے میں نے اس نہایت بھلے لڑکے سے ٹیلیفون پر بھی رابطہ نہ کیا، سوچتا ہوگا، ہم لوگ کتنے بد تمیز ہیں۔ ایک اور بھی سنتے جاؤ، میرا کلرک ابھی دنوں ہندوستان کے اعظم گڑھ سے لوٹا ہے۔ کہہ رہا تھا۔ کوئی بیس برس بعد ماں، بہن اور بھائی سے ملنے گیا تھا۔ وہاں کی سی۔ آئی۔ ڈی کو جب اس کی آمد کی خبر ملی تو وہ لوگ اس کی ماں سے یہ جاننا چاہتے تھے کہ اس کا بیٹا اس سے کیوں ملنے آیا ہے، یعنی بیس سال کی جدائی کے بعد بیٹے کی ماں سے ملنے کی معصوم سی خواہش بھی کسی بہت بڑی غیر ملکی سازش کا پیش خیمہ تو نہیں ــــــ ہ کیا ہم واقعی پاگل ہو چکے ہیں؟ نہیں ہاشم، پاگل لوگ تو نہایت بے ضرر ہوتے ہیں۔ ہمارے پاگل ابو کے مانند۔ اس اعتبار سے میں ابو کے پاگل پن کو خیر سے کم نہیں مانتا۔ وہ اپنا پرانا لکھنؤ دیکھنے کے لئے رہا کیوں جائیں؟ ساری دنیا میں تو ایک ہی لکھنؤ ہے۔ اور وہ لکھنؤ یہاں کراچی میں ہے۔ ذرا ٹھہرو، ہاشم، میرا جی بھر آیا ہے!

اسحٰق مرزا نے بھی اوائل میں اپنے بڑے بھائی کے مانند تجویز کیا تھا کہ ابو کا علاج کرایا جائے۔ مگر ابھی اماں کی باتیں سن کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ ابو کے پاگل پن کا علاج بھی انکا پاگل پن ہی ہے۔ جب مرض اتنی بھیانک صورت اختیار کر جائے تو اللہ میاں کی رحمت سے مرض ہی سے مرض کے علاج کی تدبیر ہونے لگتی ہے۔ اسحٰق مرزا اپنی اس خواہش سے بے چین ہوا اٹھا ہے کہ جو ہاجرین اپنے چھٹے ہوئے مقامات کی دید کو ترستے رہتے ہیں انہیں زبردستی پاگل پن کے ٹیکے لگا دئے جائیں۔ ایک لمحے کی چبھن ہی تو ہے، جس کے بعد سرکاری شہریوں کے ضابطوں سے آزاد ہو کر وہ اپنے اولین مقامات پر ہنستے کھیلتے بسر کرنے لگیں گے۔ پاگل لوگ اتنے نیک، اتنے انجان اور کھلنڈرے ہوتے ہیں کہ کڑی سے کڑی سرکاریں بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شرمسار ہو جاتی ہیں۔

اسحٰق مرزا بے حد اداس ہو گیا ہے اور وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہنا چاہتا ہے۔ اور قلم کو میز پر رکھ کر اس نے فیصلہ کیا ہے کہ چٹھی کو کل پرسوں پورا کرے گا۔

——— ۸ ———

اسحٰق مرزا اور اس کا پنجابی پڑوسی بابو فقیر محمد نواب محل میں رات کے کھانے سے فارغ ہو کر اسحٰق مرزا کی کار میں واپس گھر جا رہے ہیں۔ اس آخر ہفتہ اسحٰق مرزا کے لڑکے کی طبیعت ناساز ہے۔ اس لئے وہ بیوی بچوں کی بجائے بابو فقیر محمد کو ساتھ لے آیا تھا۔ سڑک کو کھلا اور کھلا پا کر اسحٰق مرزا نے گاڑی کی رفتار تیز کر لی ہے۔ اور اپنے دوست کو مخاطب کیا ہے۔

"ہمارے بھائی جان بات چیت کیا کرتے ہیں، تقریر فرماتے ہیں۔" "ہاں، اسحٰق باؤ! انہیں سنتے ہوئے میری تو سستی گم ہو گئی۔" اسحٰق مرزا ہنس دیا ہے۔ مجھے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ ہمارے دھان پان نواب نواب مرزا اپنے مخصوص انداز میں پنجابیوں کو خوب رگید رہے تھے۔ اور تم ڈیل ڈول کے پنجابی بڑے بے بسی سے سر جھکائے انہیں سنتے جا رہے تھے۔ جسمانی برتری والے شخص کو اس طرح بے بس پا کر میری طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔"

"ارے آگے دیکھو! باؤ"

اسحٰق مرزا نے سنبھل کر اسٹیرنگ پر ہاتھ مضبوط کر لیا ہے۔ اور سڑک پر آگے

[باقی صفحہ ۵۱ پر دیکھئے]



سطین اخگر

ملالِ ہجر بھی اب موسمِ بہار ہوا
ترا وصال ترے بعد بار بار ہوا

جوابِ دید ملا بھی تو زخم کی صورت
میں اپنے تیر سے خود آپ ہی شکار ہوا

میں سوچتا رہا اک موج کو لبِ دریا
وہ لوٹ آئے گا اک دن یہ اعتبار ہوا

سفر کی خاک مجھے راستہ بتاتی گئی
ان انتشارِ شب و روز میں غبار ہوا

تمام شہر کو دیکھا تمہاری آنکھوں سے
تمہارے فیض سے دنیا میں آشکار ہوا

● آفتاب ہوسٹل، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ



شاهد جمیل

ہر ایک چیخ معطل، ہر اک صدا منسوخ
ہزاروں سجدوں کا حاصل، دعا منسوخ

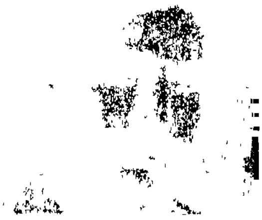
مجھے کہ تجھ میں چراغوں کو ڈھونڈنا واجب
تجھے کہ مجھ میں چمکنے کی ہر ادا منسوخ

ہزار آہٹیں صدقے، ہر انتظار نثار
مگر وہ سامعہ ایسا کہ باصرہ منسوخ

وہ دن کا خواب اجالا، یہ شام کی تعبیر
قلم بدستِ قمر، شب کا زائچہ منسوخ

ہزار کھینچتے ساحل، مگر وہ اک دریا
خدا کے دشت سے گذرا کہ ناخدا منسوخ

● سب رجسٹرار، سب رجسٹرار آفس۔ ٹیکاری (بہار)



ارشد عبدالحمید

اپنے چہرے کو یوں پڑھا کرنا
مجھکو آئینہ کرلیا کرنا

چیخ اٹھے گی روحِ جنگل کی
سوکھے پتوں پہ مت چلا کرنا

میں تو راہوں میں پھیل جاؤں گا
تم بھی دہلیز پر جلا کرنا

رات ہاتھوں میں چاند لائے گی
صدقہ تنہائی کا ادا کرنا

بھول جاؤ شکستہ خوابوں کو
زرد پتوں کا سوگ کیا کرنا

● جے پور ڈیولپمنٹ اتھارٹی، جے پور

پرویز ید اللہ مہدی
بی۔٢٦، بہرام، چوتھا منزلہ، باندرہ (ایسٹ) بمبئی ٤٠٠٠٥١

نصیحت آمیز مضمون ہے

مطالعہ بازی

مطالعہ صرف کتابی نہیں، اکتسابی بھی ہوتا ہے۔ کتابی مطالعے کے لئے آدمی کا پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے، اکتسابی مطالعہ رسمی تعلیم کا محتاج نہیں ہوتا۔ چنانچہ پڑھے لکھے لوگ کتابی مطالعے میں سر کھپا کر، مضمون نا شرو اور کتب فروشوں سے زیادہ، ماہر چشم ڈاکٹروں اور چشمہ فروشوں کا بینک بیلنس بڑھاتے ہیں۔ جبکہ ناخواندہ اصحاب کتابوں کی جگہ کتابی چہروں کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتے ہیں اور دور کی ایسی ایسی کوڑیاں لاتے ہیں کہ اچھے اچھے چہرے کوڑی کے ہو جاتے ہیں۔ ہمارا شمار اگرچہ ناخواندہ لوگوں میں نہیں ہوتا اس کے باوجود ہمیں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ ہمارے مطالعہ کا مطلع خاصا وسیع ہے اور مطالعے کے بہانے ہم شہر کے تمام دار المطالعے دیمک کی طرح چاٹ چکے ہیں۔ یہاں تو سرے سے یہ حال ہے کہ خود اپنا لکھا پڑھنے کی توفیق مشکل سے میسر آتی ہے بلکہ سچ پوچھئے تو کتب بینی کیلئے جیسی چشم بینا کی ضرورت ہوتی ہے ہم شاید اس سے محروم ہیں۔ تاہم اپنے محدود مطالعے کے باوجود مطالعے کے موضوع پر خامہ فرسائی کی جسارت محض اس بنا پر کر رہے ہیں کہ اچھے اچھے پیشہ ور "مطالعہ بازوں" کا بہت قریب سے مطالعہ کر چکے ہیں۔

یوں تو لفظ "مطالعہ" سے ہمارے کان اس وقت سے آشنا ہیں جب ہمارے علم کا دائرہ صرف نصابی کتابوں تک محدود تھا۔ اور مطالعے کا مطلب اہم اسباق کی تلخیص کا "جوشاندہ" تیار کر کے "ہو الشافی یہ جانئے ہے نہ کافی" کا نعرہ لگا کر غٹاغٹ پی جانا ہوا کرتا تھا۔ یوں بھی طالب علمی کے زمانے میں مطالعے کا مقصد علم حاصل کرنا نہیں۔ کسی طرح سالانہ امتحان میں کامیابی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ گویا اسکول اور کالج کی چار دیواری میں علم "برائے علم" نہیں "برائے ڈگری" ہوتا ہے۔ اسی لئے ایک عام طالب علم کا ذہن ہمیشہ بحر علم کی سطح پر تیرتا رہتا ہے، اس کی تہہ میں کبھی نہیں اترتا، کبھی کبھار اکا دکا علم کا پیاسا طالب علم تہہ میں اترنا چاہے بھی تو اساتذہ کرام یہ کہہ کر اس کے حوصلے پست کر دیتے ہیں کہ

یہ علم نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

ہماری ناقص تحقیق کے مطابق مطالعہ تین طرح کا ہوتا ہے مطالعہ، سرسری مطالعہ، خودسری مطالعہ ——— اسکول کے نصاب طالب علم مجبوراً جو کچھ پڑھتا ہے وہ زیر سری مطالعے کے تحت آتا ہے۔ اور "ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار" سے شروع ہو کر "ستارہ کیا تری تقدیر کی خبر" پر ختم ہو جاتا ہے۔ ——— کالج اور یونیورسٹی کے طلبا پر جو کتابیں زبردستی دی جاتی ہیں ان کا جبراً و قہراً مطالعہ سرسری مطالعے کے ضمن میں آتا ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ مطالعہ چونکہ سرسری ہوتا ہے اس لئے افسر بننے کے خواب دیکھنے والے طالب علم کو معمولی کلرکی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ وہی کلرکی جس کے بارے میں اکبر الہ آبادی کہہ گئے ہیں ؎ کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد آدمی البتہ اپنی مرضی سے جس مطالعے میں خود اپنا سر کھپاتا ہے وہ بلاشبہ "خودسری" کے مطالعے کی تعریف میں آتا ہے۔ اگلے وقتوں میں خودسری مطالعے کی بنیاد پر آدمی کو "سر" کے خطاب کا اہل قرار دیا جاتا تھا جبکہ دور حاضر میں خودسری مطالعہ آدمی کو "سر پھرا" یا "سر" بنا دیتا ہے۔ دوسری زبانوں میں خودسروں کی پوزیشن کیا ہے؟ یہ تو ہم یہ تو نہیں جانتے، البتہ اردو میں خدا کے فضل سے خودسروں اور مغروروں کی کمی نہیں۔ ان خودسروں کے سروں پر سرخاب کی پر تو نہیں ان کے گھروں میں کتابوں کے ڈھیر ضرور ہوتے ہیں۔ جن پر چڑھ کر ان کی خودسری، کم از کم اتنی بلند تو ہو ہی جاتی ہے کہ جہاں خدا بندے سے خود تو خیر کچھ نہیں پوچھتا۔ البتہ چھوٹے موٹے بندے یعنی نو آموز ادیب اپنے مجموعہ ہائے کلام، از راہ عقیدت و احترام ان خودسروں کی خدمت میں پیش کر کے، بڑی انکساری سے پوچھتے ہیں۔ بتا تیری رضا کیا ہے؟ لیکن افسوس یہ خودسر حضرات جو ادبی حلقوں میں عالی جناب عزت مآب کے القاب سے یاد کئے جاتے ہیں ان بیش بہا نذرانوں کے

بے رحمانہ سلوک کرتے ہیں، بعض انہیں ایک ہاتھ سے قبول کرتے اور دوسرے ہاتھ سے بدذوق لوگوں کے ہاتھوں اونے پونے داموں فروخت کر دیتے ہیں۔ اور یوں جن نازک اندام کتابوں کو عزت مآبوں کی لائبریریوں و مطالعہ گاہوں کی امان میں ہونا چاہئے وہ راستوں اور فٹ پاتھوں کی زینت بن جاتے ہیں۔ ! !

ہمارے ہاں "مطالعے" سے مراد عموماً زائد از نصاب لٹریچر کی ورق گردانی سے لی جاتی ہے۔ چنانچہ جن صاحب ذوق حضرات کا داخلِ نصاب ریکارڈ انتہائی معمولی ہوتا ہے وہ خارج از نصاب مطالعے کے باب میں اکثر غیر معمولی ہوتے ہیں۔ جو بھی سخت جان کتاب نصاب کے رند سے محفوظ ہوتی ہے ان کی دسترس میں پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ہیں ہمارے دوست خواجہ جزاک اللہ جز نبدی ـــــ مطالعے کے معاملے میں موصوف نہ موضوع کے پابند ہیں نہ موقع محل کے تابع گویا بس ہو ٹرین ہو کوئی مطالعہ گاہ ہو ہر جگہ مطالعہ کا شغل جاری و ساری رہتا ہے۔ یہاں ہم موصوف کے مطالعے کے خبط بلکہ جنون کی صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے ایک دن ہم ان کے درِ دولت پر پہنچے تو دیکھا، ایک ضخیم کتاب گود میں رکھے مطالعے میں گلے گلے غرق ہیں۔ نزدیک پہنچے پر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی وہ کوئی ادب یا فلسفہ کی کتاب نہیں۔ ٹیلی فون ڈائرکٹری تھی۔ ہم نے متحیر لہجے میں کہا ـــــ "خواجہ صاحب" ٹیلی فون ڈائرکٹری کیا کوئی پڑھنے کی چیز ہے بھلا؟۔"

بولے ـــــ میں جانتا ہوں ٹیلی فون ڈائرکٹری پڑھنے کی نہیں۔ دشمن کے سر پر دے مارنے کی چیز ہے، لیکن مجبوری انسان سے کچھ بھی پڑھوا لیتی ہے اور میری مجبوری یہ ہے کہ میرے مطالعے کی رفتار، کتابوں کی اشاعت کی رفتار سے آگے نکل گئی ہے۔ اس لئے نہیں ماموں سے نکا ماموں بہتر کے اصول پر عمل کر کے، دوبارہ ٹیلیفون ڈائرکٹری پڑھ رہا ہوں۔ یعنی دوسرا "دور" کر رہا ہوں ـــ !!"

مطالعے کے تعلق سے عموماً یہ غلط فہمی عام ہے کہ اس سے مطالعہ باز کے محض ذوقِ مطالعہ کی تسکین ہوتی ہے۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ دراصل مطالعہ کی ہمہ گیر خصوصیات سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔ مطالعے سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ آدمی اگر چاہے تو مطالعے کے ذریعے اپنے دیگر اغراض و مقاصد بھی پورے کر سکتا ہے جن کا مطالعے سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ یہاں ہم اپنے مربی و محسن علامہ بجوڑ ہمدانی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ علامہ موصوف دن بھر مطالعے سے مکمل پرہیز کرتے ہیں لیکن رات میں جب بسترِ استراحت پر پہنچتے ہیں تو ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب ضرور ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ علامہ کو سونے سے پہلے مطالعے کی لت ہے۔ اصل میں جب تک موصوف کے سینے پر کوئی بھاری بوجھ نہ دھرا ہو ـــــ وہ سو نہیں سکتے۔ ان کی نیند کا تعلق کتاب کے موضوع یا مواد سے نہیں اس کے وزن سے ہوتا ہے۔ کتاب جس قدر ضخیم ہوتی ہے ان کی نیند بھی اسی قدر عظیم یعنی گہری ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر بھاری بھرکم کتاب علامہ کے حق میں ماں کی لوری یا نیند کی گولی کا کام کرتی ہے۔ اتفاق سے ان کے ہاں کتب خانے میں اساتذہ کے بے شمار کلیات، جدلیاتی لسانیات، اردو کی ساختیات، تنقید کے مابعد الطبیعاتی نظریات جیسے جناتی موضوعات پر مشتمل کتابوں کے انبار موجود ہیں جن کا مطالعہ آدمی کو چین کی نیند بلکہ بشرطیکہ موت کی نیند سلا سکتا ہے۔ ہم ایسوں کی تو صرف ان کتابوں کے سر ورق دیکھ کر ہی آنکھ بند ہونے لگتی ہے۔ یوں بھی ہر کتاب مطالعے کے لئے نہیں ہوتی۔ کچھ اس لئے چھاپی جاتی ہیں کہ آدمی انہیں خرید کر عزت حاصل کرے اور کچھ کا مقصد آدمی کو کنفرم کروا کے اس کی صحت بنانا ہوتا ہے۔ چنانچہ موخر الذکر کتابیں کتب خانوں سے زیادہ اکھاڑوں کے لئے موزوں ہوتی ہیں۔

مانا کہ مطالعے سے ایک مطالعہ باز بہت کچھ سیکھتا ہے علم حاصل کرتا ہے کوئی کوئی خواب خرگوش کے مزے بھی لوٹتا ہے۔ لیکن اس میں سب سے بڑی قباحت یہ ہے کہ اس سے بعض قارئین کا پیٹ اس قدر پھول جاتا ہے کہ وہ اپنے مطالعے کا نچوڑ اگلنے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں۔ پیشہ ور مبصرین تو خیر اپنے مطالعے کا نچوڑ جس میں کتاب و صاحبِ کتاب دونوں کا نچوڑ شامل ہوتا ہے تبصروں کی شکل میں پکی روشنائی سے چھپوا کر اپنے دل اور پیٹ کا غبار کسی طور نکال لیتے ہیں لیکن ایسے پڑھے لکھے مبصرین جو پڑھائی میں تیز و طرار مگر لکھائی میں کمزور ہوتے ہیں وہ اپنے مطالعے کے تاثرات بیان کرنے کے لئے قلم کی جگہ زبان کا سہارا لیتے ہیں۔ اور "منہ زبانی" مبصرین کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان مبصرین کے تاثرات میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں مطالعے کا نچوڑ کم سے کم اور دیگر احوال کا دخل زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے ایک شناسا کے اوقات مطالعہ صرف لوکل ٹرینوں میں "اپ اینڈ ڈاؤن" کرنے تک محدود ہیں نتیجتاً ان کے زبانی تبصروں میں مطالعہ کا نچوڑ کم اور لوکل ٹرینوں کے جھٹکے زیادہ پائے جاتے ہیں ـــــ ایک مرتبہ ہمارے مضامین کا ایک مجموعہ کہیں سے ان کے ہاتھ لگ گیا۔ جس کے مطالعے کے بعد موصوف نے جو زبانی تبصرہ فرمایا وہ کچھ اس طرح سے تھا ـــــ "بوریولی سے اندھیری تک تو آپ کا طرزِ تحریر گاسٹ ٹریک' FAST TRACK بزبان انشا

دوڑتا رہا لیکن اندھیری کا پلیٹ فارم چھوڑتے ہی لائن بدل کر "سلو ٹریک" SLOW TRACK پر مڑ گیا۔ اور کھار تک اسی ٹریک پر رکتا بڑھتا چلتا رہا پھر کھار سے اچانک بلا نوٹس ویسٹرن لائن سے ہاربر لائن HARBOUR LINE پر نکل گیا۔ ایک ہی مجموعے میں اتنے ٹریک بدلنا کوئی صحت مند علامت نہیں ——— !" ملاحظہ فرمایا آپ نے مطالعہ کا انوکھا اچھوتا نچوڑ جس میں ہمارے مجموعہ ہائے مضامین پر تبصرہ کم سے کم اور بمبئی کے مضافاتی ریلوے لائینوں کا تذکرہ زیادہ سے زیادہ تھا۔

یہ درست ہے کہ مطالعہ کے لئے موضوع، مواد، موقع محل کی کوئی قید نہیں۔ تاہم موضوع کی مناسبت سے مطالعہ باز کے لئے اپنے انداز نشست و برخاست پر خصوصی توجہ دینا ازبس ضروری ہے۔ ورنہ بصورت دیگر کتاب اور صاحب کتاب کا تو کچھ نہیں بگڑتا "صاحب کتاب" پر قدرت کا عتاب کسی نہ کسی عذاب کی شکل میں ضرور نازل ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہلکے پھلکے لٹریچر کا مطالعہ کسی بھی پوز میں کیا جا سکتا ہے۔ بیٹھ یا پیٹ کے بل لیٹ کر یا پھر کروٹ لیتے ہوئے۔ لیکن اگر ایسی پوزیشن میں تنقیدی لٹریچر کا مطالعہ کرنے کی حماقت سرزد ہو جائے تو نتائج خطرناک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا تنقیدی ادب بالخصوص اردو تنقید کا مطالعہ کرتے وقت مطالعہ باز کا پورے خشوع و خضوع کے ساتھ رکوع کی حالت میں بیٹھنا لازمی ہے۔ اس سے تنقید کے اسرار و رموز تو یقیناً نہیں کھلتے، قلب پڑھنے والے جان لیوا کمر سے ضرور بچا جا سکتا ہے۔ یاد رہے اس انداز نشست و برخاست میں ذرا سی بھول چوک مطالعہ باز کے جیتے جاگتے وجود کو چشموں میں برخاست کر سکتی ہے۔ لہٰذا یہ بات گرہ میں باندھ لیجئے کہ تنقیدی مطالعے کی محفوظ ترین بیٹھک سا اگر کوئی ہے تو وہ صرف "باادب باملاحظہ" پوزیشن ہے۔ تنقید کی طرح فلسفے کے بھی اپنے تقاضے اپنے اصول ہیں۔ فلسفے کا مطالعہ کرسی پر براجمان ہو کر بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور بستر پر نیم دراز ہو کر بھی لیکن جس طرح موٹر سائیکل اور اسکوٹر چلاتے ہوئے سر کی حفاظت کے لئے "ہیلمٹ" لازمی ہے، اسی طرح فلسفے کے مطالعے کے دوران آنکھوں پر دبیز شیشوں کی عینک اور ہونٹوں میں ضخیم پائپ لازمی عناصر ہیں۔ بلکہ فلسفے کی ضخامت، عینک کے شیشوں کی دبازت، اور پائپ کی جسامت میں اگر پوری طرح تال میل ہو تو منجدھر سے منجھد فلسفہ بھی پانی ہو جاتا ہے۔ جو نا عاقبت اندیش مطالعہ باز، عینک اور پائپ کے ہتھیار بلکہ پتوار کے بغیر فلسفے کا مطالعہ کرتے ہیں ان کی نظر پہلے تو فلسفے کی گہرائی میں اترتی ہی نہیں اور اگر غلطی سے اتر جاتی ہے تو دوبارہ واپس نہیں آتی۔

اس خطرناک صورت حال سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ مطالعہ باز ہر صورت میں جیسی روح ویسے فرشتے والی پرانی کہاوت پر سختی سے کاربند رہے۔ اس سلسلے میں ناشرین و مصنفین بھی ذرا سا ثبوت دے کر قارئین کی مشکلیں آسان کر سکتے ہیں۔ جس طرح دوائیں بنانے والی کمپنیاں، دوا کی ہر پیکنگ میں ترکیب استعمال رکھنا نہیں بھولتیں! اسی طرح اگر ناشرین و مصنفین بھی ہر کتاب میں مطالعہ کی پرچیاں رکھنا شروع کر دیں تو مطالعہ باز خود کو موضوع کے ساتھ طرح ہم آہنگ کر کے بلا خطر اپنے مطالعے کی پرواز بلند کر سکتا ہے۔ بقول

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز
کبوتر با کبوتر مطالعہ با مطالعہ باز ...!

مطالعے کے مذکورہ بالا اصول و آئین تقریباً سبھی شائقین پر لاگو ہوتے ہیں تاہم خوبصورت خواتین ان سے مبرا ہیں۔ کہ ان کی بازی کسی اصول اور آئین کی تابع نہیں ہوتی۔ یہ جس اسٹائل جس "پوز" میں چاہیں مطالعہ کر سکتی ہیں۔ پھر بھی حسینوں کی اکثریت کو اوندھا کر مطالعہ کرنا بے حد مرغوب ہوتا ہے۔ اس مخصوص "پوز" کی وجہ سے مطالعہ کتاب چوں کہ چاروں خانے چت پوزیشن میں ہوتی ہے! مطالعے کے مضر اثرات حاوی نہیں ہونے پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ رد عمل شیطانی کوئی بھی موضوع حسینوں کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ یوں دوشیزاؤں کا مطالعہ در اصل مطالعہ نہیں ہوتا بلکہ صرف بہانہ ہوتا ہے یہ کتابوں کا مطالعہ نہیں کرتیں، کتابیں ان کے حسن کا مطالعہ کرتی ہیں۔ انجام کار اس حسرت کے ساتھ حسن کی بارگاہ میں گھٹنے ٹیک کر کہ مطالعہ تو دل ناتواں نے تو خوب کیا۔ ✺

بقیہ صفحہ ۴۵ ٹھہری ہوئی دھوپ

جسم کی گھٹتی ہوئی توانائی کے ہمراہ اپنے اعضا بھی سُن لگتے ہیں!

اسے محسوس ہوا کہ اپنے ہی کمرے کی دیواریں اور چھت اس طرح مسمار کر دینے کے لئے یلغار کرنے والی ہیں ——— اس نے آواز چیخ ماری اور سہم کر اپنی آنکھیں میچ لیں! ✺

دھنک رنگ

عطا عابدی

رہے اب نہ لوٹوں گا، مگر آواز دیتا ہے
رستے گھر ہوا اوجھل تو گھر آواز دیتا ہے
ولی بے چین روح آتی ہے پھر سنسان وادی میں
دلی پھر رات کے پچھلے پہر آواز دیتا ہے
ہت ہمت شکن ہے دوری منزل مگر اے دل
پیہم مرا ذوقِ سفر آواز دیتا ہے
ریچے یادِ ماضی کے نظر میں کھلنے لگتے ہیں
صور میں ترا جب رہ گزر آواز دیتا ہے
حق میں چلے تو ہو مگر محتاط بھی رہنا
ن خطرہ عطا ہر موڑ پر آواز دیتا ہے

انکار ملی۔ا ی-۲۲ر۱۵۳، ذاکر نگر نئی دہلی ۲۵

ذاکر وارثی

مر کے چراغوں کو جلانے میں لگا ہے
لال کہ چراغوں کے مقدر میں ہوا ہے
کون جلاتا ہے تعصب کی ہوائیں
داب درختوں کو دھواں کس نے دیا ہے
ہی کے جہازوں کو یہاں کون چلائے
شخص گناہوں کی تجارت میں لگا ہے
کھیں ہیں کہ کشتی کی طرح ڈوب رہی ہیں
وفا کا عجب دل کے سمندر سے اٹھا ہے
ے کی ہتھیلی میں چمک دیکھ رہا ہوں!
ن کو جو ملی ہے وہ جہانگیر بنا ہے

۷۔ لال اسکول گلی، ادجین (ایم پی)

غفّار راز

جب میں ہوں مسافر تو مرا گھر کیسا
ہو گھر ہی نہ جس کا تو اسے ڈر کیسا
ہر چیز ٹھہرتی سی نظر آتی ہے
ٹھہرا مری آنکھوں میں یہ منظر کیسا
گھبرا کے نکل آئے نہ گھر سے باہر
اک شور بپا ہے مرے اندر کیسا
اک پیاس ہوں میں اور ہے پیاسا تو بھی
پھر بیچ میں حائل یہ سمندر کیسا
تقدیر کا لکھا ہے تو ٹل جائے گا
اے رازؔ بھٹکنا ترا در در کیسا

راز بھون، نئی سڑک، حیدرآباد-۲۸۲۰۰۱

محمود شاہد

اک مختلف جہاں کا اظہار ہو رہا ہے
اک دوسرا ہی انسان بیدار ہو رہا ہے
صادق انا کا سورج حیران ہے فلک پر
کاذب انا کا تارا دم دار ہو رہا ہے
سانسیں ترس رہی ہیں تازہ خنک ہوا کو
صدیوں پرانا جنگل بیمار ہو رہا ہے
آساں نہیں ہے ناداں موجوں پہ حکمرانی
سویا ہوا سمندر بیدار ہو رہا ہے
میں خود کو زندہ رکھوں دل کے بغیر یعنی
اک معجزے کا مجھ سے اصرار ہو رہا ہے

۱۹۸/۱۳، ایم۔ آر۔ اسٹریٹ، کرنول-۵۱۶۰۰۱

ریاض لطیف

زندگی قید ہے حبابوں میں
کچھ حقیقت تو ہے سرابوں میں!
مجھ کو دنیا میں ڈھونڈنے والو،
اک نقاب اور ہے نقابوں میں!
تب سے شاید ہوا ہوں بے معنی
جب سے ڈوبا ہوں انتخابوں میں
کیسی تاریخ چھو گئی ان کو
ہیں ورق نم سے کچھ، نصابوں میں
خستہ دیوار میں دھڑکتا ہے
اک تمدن کا دل خرابوں میں

۴۷، ڈائمنڈ گرانس ہل احمدآباد ۰۰۰۰۰۲

جمیل فاطمی

ہم اپنی ذات پہ جب غم کا پیکر اوڑھ لیتے ہیں
ہمارے زخمِ دل نشتر پہ نشتر اوڑھ لیتے ہیں
کبھی تو کاٹنے کو دوڑتی ہے گھر کی تنہائی
کبھی ہم آدمی کے خوف سے گھر اوڑھ لیتے ہیں
پسِ پردہ سیہ کاری ہے جن کا مشغلہ پیہم
غضب ہے وہ شرافت عمر بھر اوڑھ لیتے ہیں
کلیدِ کامیابی ہاتھ جب آتی نہیں ان کے
تو وہ روٹھا ہوا اپنا مقدر اوڑھ لیتے ہیں
ردائے کہنہ جب ان کو جمیلؔ اچھی نہیں لگتی
نئے اسلوب کی چادر سخنور اوڑھ لیتے ہیں

[illegible]



ندا فاضلی

۱۰۳ - امرا پارٹمینٹ ، ڈانڈپاڑہ - ۱ ، کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲

دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۱۴

ندا کا ان دنوں کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں ہے۔ کمرہ کا کرایہ چڑھ چکا ہے۔ کالج کی پڑھائی کام کاج کی تلاش کی نذر ہو چکی ہے۔ روٹیاں چاند کی مانند حسین ہو کر دور سے لبھانے لگی ہیں۔ دن بھر ادھر ادھر بھٹکنے کے باوجود، کبھی صبح کا ناشتہ دوپہر کے کھانے سے ناراض رہتا ہے۔ کبھی رات کا کھانا ان دونوں سے اپنی خفگی کا اظہار کرتا ہے۔ نچلے متوسط طبقے کے معاشرہ کی پرورش نے ضرورتوں کو گونگا کر دیا ہے۔ نہ ہونٹ پریشانی کے لفظ اگل پاتے ہیں۔ نہ ہاتھ مجبوری بن کر پھیلتے ہیں۔ ہندی کے ادیب شانی بھوپال سے گوالیار شفٹ ہو کر آئے ہیں۔ وہ ایک سرکاری ہندی ماہنامہ مدھیہ پردیش سندیش کے اعزازی بورڈ میں ہیں۔ دن میں ایک دو بار ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ ندا کے حالات کا اندازہ چہرے سے لگاتے ہیں۔ ان کے کہنے پر وہ ایک دن رات بھر جاگ کر، مدھیہ پردیش سندیش کے لئے گوالیار کے ایک مرحوم شاعر نارائن پرشاد مہر پر ایک مضمون تیار کرتا ہے۔ ایسے رسائل میں اصولاً شاعر یا ادیب کی پیدائش یا موت کی تاریخوں ہی میں مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ لیکن ندا کی ضرورت رات کی تاریکی میں جانشین دنیا بھر گویا ری کو ان کی وفات سے دو مہینے پہلے ہی مار دیتا ہے۔ مضمون لکھ بیٹھے ہی، وہ صبح سندیش کے آفس پہونچتا ہے۔ شانی صاحب وعدہ معاوضہ کی پیشگی رقم چالیس روپئے کا چیک اسے دلوا دیتے ہیں۔ رسالہ ایک دو دن میں اس مضمون کے ساتھ باہر آتا ہے۔ مہر صاحب کے بڑے لڑکے بدری پرشاد جو عدالت میں جج ہیں اپنے باپ کے اس قتل پر سندیش کے ایڈیٹر کو مجرم ٹھہراتے ہیں۔ شانی کو پہلی بار آفس کے کام میں ان کی بے توجہی پر نوٹس ملتا ہے۔ شانی پریشان ہیں۔ ندا اپنی غلطی پر نادم ہونے کے بجائے بدری پرساد سے ملتا ہے اور ان کے سامنے اردو کتابوں میں کتابت کی الجھنوں کو، ایک کیس کے طور پر پیش کرتا ہے۔ وہ مطمئن ہو کر ندا کو جرم قتل سے بری ہی نہیں کرتے معاوضہ کے طور پر ایڈیٹر کو فون پر اپنے پتا کے جنم پر ندا سے ایک اور مضمون لکھوانے کی تاکید کرتے ہیں۔ شانی سے نوٹس واپس لیا جاتا ہے۔ اور ندا کو دوسرے آرٹکل کی بھی ایڈوانس رقم مل جاتی ہے۔ بدری پرساد کی سفارش پر ایڈیٹر ندا سے اسی قسم کے اور بھی مضمون لکھنے کی فرمائش کرتا ہے۔ لیکن انہیں دنوں اسے اریگیشن کے آفس میں ایک عارضی خالی جگہ پر تین مہینے کے لئے کلرک بنا دیا جاتا ہے۔ اور دو بزرگ شاعروں کو وقت سے پہلے مارنے یا پیدا کرنے کے خدائی منصب سے دور ہو جاتا ہے۔ یہ آفس شہر سے دور ایک ویران علاقہ میں ہے۔ پرانے کھپریلوں کی چھت، دوپہر بھر بھٹی کی طرح تپتی ہے۔ آفس کے سارے بوڑھے ادھیڑ عمر کلرک ہاتھوں کو قلم کے لئے کم استعمال کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پنکھے زیادہ جھلتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چندہ کر کے چپراسی سے برف منگوا کر مٹکے میں ڈالی جاتی ہے۔ ندا کو یہ ملازمت اس شرط پر ملی ہے کہ جو تین تنخواہیں ملیں گی ان میں سے ایک پوری تنخواہ ایک سو پینتیس روپئے بطور رشوت آفس کے ہیڈ کلرک کو دیئے جائیں گے۔ لیکن تنخواہ کے دن ندا اپنا وعدہ پورا کرنا بھول جاتا ہے جب ہیڈ کلرک دوسرے دن اس سے تقاضہ کرتا ہے تو وہ وعدہ کو ایمانداری سے نبھانے کے بجائے، اس کرپشن کے خلاف انجینیر کے آفس میں تحریری شکایت کر دیتا ہے۔ وہ اپنی کارگذاری پر خوش ہے۔ اس نے سماجی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ اس کے اس اقدام سے آفس میں اس کا اچھا خاصا رعب جم جاتا ہے۔ ہیڈ کلرک اب ناراض ہونے کے بجائے، نہایت نرم انداز میں اس سے ملتا ہے۔ آفس کے دیگر کلرک اس کی اس جرأت سے کافی متاثر ہیں۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتے ہیں اور ندا ہر روز لنچ کے اوقات میں ان کے درمیان بیٹھ کر، فخریہ انداز میں انہیں سماج میں انسان کی اہمیت اور اس کے بنیادی حقوق سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ روس کی ترقی کی اصلی تصویر بناتا ہے۔ چین کی خوشحالی کا راز بتلاتا ہے۔ لیکن دوسرے مہینے کے پندرہ دن گذرنے سے پہلے ہی، انجینیر کے حکم کی تعمیل میں، ہیڈ کلرک اسے نوکری سے علاحدہ کر دیتا ہے اس کی جگہ پر اب دوسرا آدمی کام کرتا ہے۔ اس سے ہیڈ کلرک اور انجینیر دونوں خوش ہیں۔ وہ ندا کی طرح اکیلا نہیں ہے۔ اس کا گھر ہے بال بچے ہیں وہ کتابی عبارت اور عملی عدالت کے فرق سے واقف ہے۔ اور ندا سے زیادہ ذمہ دار بھی.....

اور موت کی کشمکش اور اس کی پراسراریت کی علامت بن جاتے ہیں۔ ندا اپنے کمرے کے سامنے بیٹھا ہوا دیکھتا ہے کہ اس کے دائیں ہاتھ کی کیاری سے ایک کالا چیونٹا اگر اپنے کسی سفر میں پل کی طرح استعمال کر رہا ہے۔ وہ تھوڑی دیر یونہی اسے چلتا ہوا دیکھتا ہے۔ اور پھر وہ ہاتھ کی حرکت سے زمین پر نیچے گر جاتا ہے۔ نیچے گر کر بھی وہ رکتا نہیں ہے۔ اس کا سفر جاری رہتا ہے۔ اسی طرح وہ چلتے چلتے کافی آگے بڑھ جاتا ہے۔ اب وہ ندا سے ایک گز کی دوری پر ہے۔ اسے اس کے اس طرح بڑھتے پہنچنے نے ندا میں اسے دیکھتے رہنے کی دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ دونوں میں تماشہ اور تماشائی کا رشتہ بن جاتا ہے۔ لگتا ہے چیونٹے کو کہیں جانے کی عجلت ہے۔ لیکن اب تک وہ بچے کی حد تک تھا لیکن اب وہ بچے کے سائے سے باہر نکل کر کھلے میدان میں آ گیا ہے۔ جہاں آنے جانے والوں کے قدم ہیں۔ زمین پر اپنی غذا تلاش کرتے والے پرندوں کے چونچیں ہیں۔ پیڑوں سے اترتی ہوئی بن آنکھوں کی ہوائیں ہیں۔ اور پھر اس کے آگے چلتی ہوئی سڑک ہے۔ جس پر گاڑیاں، سائیکلیں، تانگے اور کاریں لگاتار گذرتی ہیں۔ چیونٹے کے جسم کے لحاظ سے یہ نہ جانے کتنی بڑی کائنات ہوگی۔ وہ چاروں طرف سے خطروں میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن رفتار میں ہے معلوم نہیں اسے اس کا احساس ہے بھی یا نہیں۔ کیتے ہیں بہت سے جاندار سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے دور ہوتے ہیں۔ ایک بچہ کاندھے پر اسکول کا بستہ لٹکائے نظر آتا ہے۔ بچے کی رفتار اس کے بچپن کی طرح سے بے پروا ہے۔ آنکھیں کہیں ہیں۔ پاؤں کہیں ہیں۔ اس کے جوتے کے تلے اور چیونٹے کے درمیان اب بس ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے۔ فاصلے کم ہوتے ہی، اس کا بچے کے جوتے کے نیچے آنا یقینی ہے۔ ندا کا اشتیاق بڑھتا ہے۔ وہ بچے کو روکنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کی آواز سے پہلے ہی اس کا پاؤں رستہ پر ایک اکھڑے ہوئے پتھر سے الجھ جاتا ہے۔ وہ اپنی کتابوں کے ساتھ چیونٹے کی سمت سے ترچھا ہو کر گر جاتا ہے۔ اس کے گھٹنے میں چوٹ آتی ہے، وہ کچھ دیر وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ وہ رونے لگتا ہے۔ لیکن اس کے رونے اور زخمی گھٹنے کے خون سے بے خبر چیونٹا اپنی دھن میں مگن ہے۔ اور مسلسل ندا کی نظروں میں ہے۔ ندا اس وقت اپنے بارے میں سب کچھ بھولا ہوا ہے۔ اس وقت صرف اس کی رفتار سے سروکار ہے۔ کبھی وہ سوچتا ہے کہ یہ جان بوجھ کر خودکشی کر رہا ہے۔ کہیں کونے کھدرے میں دبکا رہتا تو اچھا رہتا۔ کبھی اسے خیال آتا ہے کہ ہر زندگی کا ایک وقت معین ہے۔ اور اس وقت سے پہلے موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ چیونٹا اب رینگتا ہوا سڑک کے بالکل قریب پہنچ گیا ہے۔ شاید اس کا سفر یہیں تک ہے۔ جس کی مٹی جہاں کی ہوتی ہے وہ وہیں آ کر زندگی کی آخری سانس پوری کرتا ہے ...... اب جیسے ہی وہ سڑک سے لگے پتھر سے اترے گا۔ اس کی رفتار بھی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے گی۔ لیکن یہاں تک پہونچنا بھی اس ننھی سی جان کو دیکھتے ہوئے ایک معجزہ سے کم نہیں ہے۔ انسانوں کے علاوہ کسی کے الگ الگ نام نہیں ہوتے۔ وہ سب اپنی قسم کے اعتبار سے ایک ہی نام سے جانے جاتے ہیں۔ جیسے چیونٹا کہیں کا ہو صرف چیونٹا ہوتا ہے۔ کبوتر صرف کبوتر ہوتا ہے۔ گلے دودھ دے یا قصائی کا گوشت بنے، ایک نام سے پکاری جاتی ہے۔ شاید اسی لئے ان میں موت کا ماتم اور پیدائش کا جشن نہیں ہوتا۔ یہ اکائیوں میں منقسم نہیں ہوتے ...... چیونٹے اور مٹھاس کا رشتہ بھی عجیب ہے۔ دونوں صدیوں سے اپنے رشتے کی وضع داری نبھا رہے ہیں۔ زندگی کی کڑواہٹ بھی موت کے دائرے میں شاید میٹھی ہو جاتی ہے۔ مٹھاس اور چیونٹے کو لاکھ الگ کرنے کی کوشش کرو لیکن جب بھی موقع ملتا ہے، دونوں ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ شاید یہ کسی مٹھاس کو اپنی منزل بنائے ہوئے ہے۔ اس مٹھاس کے علاوہ اس لمحہ ساری کائنات اس کے لئے بے معنی ہے ..... چیونٹا اب پتھر سے اتر چکا ہے۔ سامنے سڑک ہے۔ ایک موٹر سامنے سے آ رہی ہے۔ اس کے آگے دھول اڑتی جاتی ہے۔ اس دھول میں یہ کالی اپنی چوکڑی بھول جاتا ہے۔ اس غبار میں وہ زمین سے اوپر اٹھتا ہے۔ اور قریب سے جاتے ہوئے ایک پولس والے کے بوٹ پر گر کر ٹھہر جاتا ہے۔ موٹر گذر جاتی ہے اور یہ خاموشی سے پولس والے کے نیچے تلے قدموں کی رفتار میں جوتے سے نیچے اتر کر پہلے کی طرح باقی سڑک پار کرنے لگتا ہے۔ ندا کے دائیں ہاتھ سے، سامنے کی سڑک تک لگاتار کئی حادثوں سے بچتا ہوا وہ یہاں تک آیا ہے۔ اب مشکل سے ایک ہی فٹ کا رستہ باقی ہے۔ جیسے ہی وہ سڑک پار کر کے فٹ پاتھ کے پتھر تک پہنچے گا پھر اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بس فٹ پاتھ سے پہلے ایک نالی فرق ہے۔ اس نالی کے پانی سے پار اترنا بھی کٹھن مرحلہ ہے۔ اس کے وجود کے لحاظ سے تو یہ پانی سمندر جیسا وسیع اور گہرا ہوگا۔ ممکن ہے یہی اس کی آخری منزل ہو پانی کے ساتھ وہ بھی بہہ جائے گا۔ پانی آگے جا کر کسی ندی میں کھو جائے گا۔ اور ندی سمندر میں مل کر سمندر بن جائے گی۔ کبیر داس کے مصرعے ہیں۔

مالا لکڑی ٹھاکر پتھر گنگا جمنا پانی پانی   رام اور کرشنا مرتے دیکھے چاروں وید کہانی

اتنی بڑی دنیا اور اس کی رنگا رنگ چہل پہل میں ایک چیونٹے کی جنگ و دو کی بھلا کس کو یاد آئے گی۔ ندا کے فرصت کے کھیل کی بھلا کیا اہمیت۔ یہاں تو ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہیاں بھی کچھ دن کے بعد تاریخ کا غیر ضروری حصہ بن کر لائبریریوں میں محفوظ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ہند و چین کی سرحدوں پر کام آنے والے کتنے سپاہیوں کے نام لوگوں کو یاد ہیں۔ فسادات میں رات دن چلتے پھرتے انسان اعداد کی صورت میں اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ یہ اعداد بھی سرکاری اور غیر سرکاری

[[illegible] پر دیکھیے]

رفاد فتیحی
اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر، سپرون، سولن۔۱۷۳۲۱۱

تخلیقی تجربے اور انحرافات

فرد ہمیشہ ہی سے تغیر پسند واقع ہوا ہے۔ طبعی نفسی اور معاشرتی دائروں کی طرح وہ اپنے ذہنی جذباتی اور تخیلاتی دائروں کی یکسانیت میں بھی تبدیلیوں کا خواہاں ہوتا ہے۔ بلکہ اوّل الذکر دائروں کی بہ نسبت وہ موخر الذکر دائروں میں بدرجہ زیادہ ہی آزاد ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہاں فکر و تخیل کی جولانیاں ہوتی ہیں اس لئے وہ ان میں یکسانیت اور بے لچک روایات کی پابندی قبول نہیں کرتا۔ ان ساری تبدیلیوں اور جدتوں کے پس منظر میں فرد کے اپنے عصری تقاضے نقل و تقلید کے رجحان اور خود نمائی کے جذبات کی کارفرمائیاں ہوتی ہیں۔ دیگر فنون کے مقابلے میں فن شعر و ادب کا میدان تجربات و اختراعات کے لئے وسیع تر ہے۔ کیوں کہ نئے طرز و اسالیب کی اختراعات کا انحصار فن کے وسیلۂ اظہار پر ہے فن کا وسیلۂ اظہار اگر مجرد اور غیر محسوساتی ہو تو اختراعات کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فن تعمیر یا مجسمہ سازی میں وہ رنگا رنگی نہیں نظر آتی جو موسیقی یا شعر و ادب میں نظر آتی ہے۔ ہر تخلیق کا بنیادی عنصر اظہار EXPRESSION ہوتا ہے جو کسی وسیلے سے اپنا وجود پاتا ہے۔ ادبی تخلیق کے اظہار کا تجربہ تخلیق کی زبان میں نظر آتا ہے۔ تخلیق کی زبان عام زبان سے مختلف ہوتی ہے۔ تجربہ جب اپنی شناخت کرلینے پر آمادہ ہوتا ہے تو وہ اپنی شناخت مخصوص لازمی اور فطری لسانی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ یہی لسانی صورت تجربے کی اصلیت بھی ہے اور اس کی شناخت بھی۔ شاعر اور ادیب کا لسانی شعور جادوئی انگلی سے تجربے کی علامتی اظہار کے نامعلوم امکانات پر حاوی ہو جاتا ہے اور تخلیق جنم لیتی ہے۔ تخلیق کی لسانی ساخت میں عنصر حیثیت کی بھرپور نمائندگی کے لئے بعض صوتی صرفی اور نحوی انحرافات بھی نظر آتے ہیں جو اس لسانی ساخت کو ایک نیا روپ بخشتے ہیں۔ شعری فضا کی مناسبت سے نئے الفاظ اور نئے اصوات کی اختراعی جدت میں خود ساختگی کی ذہنی صلاحیت کی کارفرمائی تو شکل دکھائی دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ ادبی تخلیق زیادہ سچی لگتی ہے شاعر اور ادیب کو عصری ادب کے نئے لسانی ڈھانچے میں اصول و قواعد سے انحرافات کا بخوبی اندازہ ہے اسی لئے وہ کہتا ہے....

جن کے رہتا ہے خود بیاں میں نقص　　　　کہہ رہے ہیں میری زبان میں نقص

اصول و قواعد سے انحرافات کے یہ نمونے صرف دورِ حاضر کے ادیبوں اور شاعروں تک محدود نہیں بلکہ شاعری کے روزِ اوّل سے ہی ان کے نمونے ملتے ہیں۔ اردو شاعری میں معائب سخن کی جو مثالیں ملتی ہیں وہ درحقیقت قواعد کے اصولوں سے انحرافات کی مثالیں ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معائب سخن دراصل قواعد کے اصولوں سے انحراف یا ان سے بے تعلق ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ قواعد کے اصولوں سے انحراف کی بعض مثالیں انسانی ذہن کے مخصوص کیفیت کی ترجمان بن جاتی ہیں۔ ان کے ذریعے کلام میں زور اور حسن پیدا ہوتا ہے۔ اور ترسیلِ خیال یا اظہار احساس کا عنصر بڑھتا ہے۔ انحراف کی ایسی مثالیں مستحسن ہیں۔ اس کے برعکس انحرافات کی ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جو خیال کو اور معنی کو مبہم اور گنجلک بنا دیتی ہیں۔ ایسا ترتیب الفاظ کے بگڑ جانے یا نحوی اصولوں سے انحراف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بحر، وزن یا ردیف و قافیے کی پابندی کی وجہ سے ترتیب الفاظ کچھ اس طرح بگڑ جاتی ہیں کہ مفہوم مبہم یا گنجلک ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس ایک مصرعے کو دیکھئے۔

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ

اس مصرعے میں "گئی ٹوٹ" کے درمیان چھ الفاظ کے فقرے "جو فصل خزاں میں شجر سے" کی موجودگی مصرعے کو گنجلک بنا رہی ہے۔ ایسا صرف قواعد کے انحراف کی وجہ سے ہوا ہے۔ اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ الفاظ فقروں اور افعال کے بے قاعدہ اور غیر فنکارانہ استعمال سے معائب سخن پیدا ہوتے ہیں۔ مثالوں کی کمی نہیں۔ لیکن مثالوں سے گریز کرتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اصول و قواعد سے انحرافات اور نئے لسانی تجربے اپنی

اتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان جدید لسانی تجربوں کی وجہ سے اگر تخلیق کی زبان کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا ہے اور کسی طرح کی ابہام کی کیفیت پیدا ہوتی تو اصول و قواعد سے انحرافات تخلیق کی زبان کے لئے مستحسن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلوبیاتی تنقید STYLISTICS اصول و قواعد سے انحراف یا بے ضابطہ ادبی زبان کی اس شکل کو اہمیت دیتی ہے۔ کیوں کہ یہ ادبی زبان کا ایک اسلوب ہے۔ جہاں زبان کے بے ہنگم اور ناتراشیدہ ہیئت کے ذریعہ شعری اظہار کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بے ہنگم اور ناتراشیدہ الفاظ شاعر کے غیر مرئی خیالات ABSTRACT IDEAS کو مرئی پیکر دار میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ زبان ایک خاص قسم کی منضبط شعری ترتیب کے تابع نہیں ہوتی پھر بھی یہ ادبی زبان کا حصہ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ظفر اقبال کی اس غزل پر:

اشکل پیروی انجان ایجاد — سگ متقد طبجب اشعار نے کا
زبان زادوں طن موقع مناسب — فلک اشکاف بابا کارنے کا
ظفر بے انت برٹباتان تجنگر — بلغن بے کا سنے بے چارنے کا

کہنے کو تو اس غزل کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس غیر منظم غزل میں شاعر نے اپنے عہد کی بے حسی اور ذہنوں کے اضطراب کے درمیان ایک تخلیقی رشتہ جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں روایت کو توڑا گیا ہے۔ ضابطوں سے بے نیاز ہو کر اپنے عہد کے اضطراب کو انتہائی بے تکلفی سے بیان کیا گیا ہے۔ عہد حاضر کے انسان کی کھوکھلی زندگی کے "بوردم" کے اظہار کے لئے ایک ایسے لب و لہجہ اور اسلوب کو اختیار کیا ہے جو اپنے منفرد مفہوم کو آشکار کرتا ہے۔ اس کے برعکس کہا جا سکتا ہے کہ اس غزل میں ابہام پسندی اہمال کی سرحدوں میں داخل ہو گئی ہے۔ دراصل یہ ابلاغ کی لاشعوری تخلیق کا محل تعمیر کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اگر الفاظ صرف سطحی ہوتا اور انحرافات اور ظاہری بے ربطی کی تہہ میں معنوی ربط ہوتا تو ان کا اجتماعی تاثر یقیناً دل آویز ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو تخلیق اہمال کی کو چھو لیتی ہے۔

ادھو ٹوں نے میزوں پر کافی پی
اور تے کی دیواروں پر
ا ب ج د ن ق
اٹا اٹا جینا کروں
کرتے برسے کو دپڑوں

بڑے ڈاک خانوں کی گھڑیوں میں گیارہ
بجا برف

پیروں کی رس انگلیاں ہونٹ سر اور آنکھیں
بدن سے جدا دور کمرے کی چادر میں بکھرے ہوئے زرد نقطے
نہ چوراہے میں سبز رستہ
نہ پیل شسرت
نہ دیوار کی سرخ رنگت رکاوٹ
نہ کاروں کی جھگڑ
نہ چہروں کا کہرام
اونچی عدالت کھہایئن طرف کی عمارت ہے
جس کے گھونسلے میں پرندے نہیں ہیں

گو یہ درست ہے کہ شعر محض الفاظ کے سطحی اشاروں کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اور اس میں معنی صرف لغوی معنی نہیں ہوتا بلکہ وہ سب کچھ اور ہوتا ہے جو لفظ کی گونج پیدا ہوتا ہے۔ لیکن لفظ و معنی کا یہ رشتہ دراصل اس کے استعمال میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ انفرادی طور پر بامعنی الفاظ بھی بے ربط اور بے قاعدہ استعمال سے بے معنی بن جاتے ہیں۔ اس بے ربط اور بے قاعدہ استعمال کی وجہ سے تخلیق میں ابہام اہمال کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔ دھندلے سایوں میں معنی کی تلاش ایک فکر انگیز تلاش سے جو لطف و مسرت کے دھارے پھوٹتے ہیں لیکن تجربہ تخلیق اور تنقید کے درمیان فاصلہ بڑھ جاتا ہے تو تخلیق ابہام کے اندھیرے میں گم ہو جاتی ہے تخلیقی فنکار تجربہ ساز ہوتا ہے۔ لیکن ناکام ہو تو تخلیق کی تہہ میں جو چیز بچتی ہے وہ صرف ناکام تجربہ ہوتا ہے۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ادیب اور شاعر اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے ایسا اسلوب اختیار کرتے ہیں جو قواعد کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا۔ جب کسی فنکار کے داخلی محسوسات تخلیقی شکل میں ظاہر ہونے کے لئے بے قرار ہوں اس وقت تخلیق کی زبان صرف و نحو کی حد بندیوں میں محصور ہونے سے گریز کرتی ہے۔ اگر تخلیق کار تخلیقی اظہار صرف و نحو کے دائروں میں محدود رکھنے کی کوشش کرے تو ایسی صورت میں روانی کے امکانات ختم ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیق کار زبان کے اصول و قواعد سے انحراف کیا کرتا ہے۔ یہاں یہ سوال ہمارے ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا ادیب کو زبان کے اصولوں سے انحراف کی آزادی ہے...... ؟؟؟ یہ سوال ارسطو سے لے کر بحث کا موضوع بنا رہا ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ تخلیق کار کو اس بات کا حق ہونا چاہئے کہ ضرورت کے مطابق وہ اپنے آپ کو قواعد کے قید و بند سے آزاد

جب کہ اس کے برعکس دوسرے ماہرین تخلیقی زبان میں اس قسم کی آزادی کو مناسب نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں قواعد کی قید و بند کے بغیر زبان کا حسن جاتا رہتا ہے اور اس حسن کے بغیر زبان بے جان ہو جاتی ہے۔ یورپین ماہرین لسانیات نے بھی اس موضوع پر غور کیا ہے۔ اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یورپین ماہرین لسانیات میں ایک اہم نام چومسکی کا ہے۔ چومسکی نے بھی ان موضوعات کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چومسکی کا کہنا ہے کہ ہر زبان کی اپنی کچھ قدریں ہوتی ہیں۔ جس کے ذریعے ہم یہ غور کر سکتے ہیں کہ ادیب کو ادب کی تخلیق میں روایت سے انحراف کی کس قدر چھوٹ ملنی چاہیئے۔ اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے جدید ماہرین لسانیات نے ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ یورپین ماہرین لسانیات نے "ڈگری آف گرامیٹکلنس" DEGREE OF GRAMMATICALNESS کا نام دیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق ادیب کو اصول و قواعد سے آزادانہ انحراف کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چومسکی اس موضوع پر مزید اظہار خیال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ادبی زبان عام زبان سے لچکدار ہوتی ہے۔ ادبی زبان کی لچک FLEXIBILITY یا اس کا جامع ہونا فکر، جذبے اور تخیل کی خوبصورت آمیزش سے وجود میں آتی ہے مگر جذبے اور تخیل کی وہ آمیزش جس کی وجہ سے زبان میں تہہ داری پیدا ہوتی ہے، عام بول چال میں نہیں نظر آتی۔ روزمرہ کی بول چال میں یہ تہہ داری کبھی کبھی نظر آتی ہے۔ کبھی کبھی یہ واضح استعارے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور کبھی مخفی استعارے کی شکل میں۔ مثال کے طور پر ان جملوں کو دیکھئے۔

(۱) بھائی بات تو پوری کر لینے دیجئے۔ آپ بیچ میں آ کودے۔

(۲) آپ ذرا ذرا سی بات پر رونے لگتے ہیں

(۳) میں بس ایک سکنڈ میں آتا ہوں۔

پہلے جملے میں دخل در معقولات کے سبب ناگواری کا اظہار ہے۔ دوسرا جملہ کسی شخص کے اس رجحان کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ بہت جلد ہراساں اور شاکی ہو جاتا ہے تیسرا جملہ جلد آنے کی بابت ظاہر کرتا ہے۔ ان تمام جملوں میں الفاظ کے آزاد معنی اس طرح مستحکم ہو گئے ہیں کہ انہوں نے لغوی معنی کو خارج کر دیا ہے۔ اس طرح کا استعمال بول چال کی زبان میں عام ہے۔ تخلیقات میں بھی تخلیق کار زبان کو اس طرح استعمال کرتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ تخلیق کی زبان میں کبھی کبھی انحراف کی بھی جھلکیاں نظر آتی ہیں تخلیق کا تقاضہ یہ ہے کہ الفاظ اس طرح استعمال کئے جائیں کہ وہ اپنے سیاق و سباق میں اس درجہ مقید نہ ہوں جس طرح عام بول چال کی زبان ہوتی ہے۔ ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ اس لچک اور آزادی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ لہٰذا اعلیٰ اور معیاری ادب میں تخلیق کار اس حد کا احترام کرتا ہے۔ اور اسے نہیں توڑتا۔ گو اس میں شک نہیں کہ معیاری ادب کی تخلیق بھی صرف و قواعد کی قید و بند کو سامنے رکھ کر نہیں کی جاتی بلکہ صرف اصولوں کو ذہن میں رکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ معیاری ادب میں بھی انحرافات کے نمونے ملتے ہیں لیکن ان انحرافات میں ایک توازن ملتا ہے۔ میر کی شاعری اس کی خوبصورت مثال ہے۔ میر کی زبان میں اتنی رنگا رنگی اور تنوع ہے کہ انحرافات کا در آنا ایک قدرتی عمل ہے۔ میر نے ادبی زبان کو عام روزمرہ کی زبان کا رنگ دینے کے لئے انحرافات کا سہارا لیا۔ لیکن ان انحرافات میں بھی ایک توازن نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے میر کے اسلوب میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی میر کے اسلوب کی کامیابی ہے چند مثالیں دیکھئے۔

ساقی کی جو باغ پر کم نگاہیاں ہیں　　مانند جام خالی گل سب جماہیاں ہیں
اب حوصلہ کرے ہے ہمارا بھی تنگیاں　　جانے بھی دو بتوں کے تئیں کیا خدا ہیں یہ..
مشہور ہے دنوں کی میری بے قراریاں　　جاتی ہے لامکاں کو دل شب کی زاریاں

تجریدی اسما کو جمع بنانے کا یہ طریقہ صرف روزمرہ کی زبان تک محدود ہے۔ اعلیٰ اور معیاری ادب میں تجریدی اسما کو جمع بنانے کی ایسی مثالیں کم ملتی ہیں۔ میر نے روایت سے انحراف کرکے ان اسما کو اپنی زبان میں استعمال کیا ہے۔ نگاہ سے نگاہیاں بنانے کا یہ طریقہ صرف "اسلوب میر" کی دین ہے۔ میر کی یہ مثالیں انحراف کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ ان متوازن انحرافات کی وجہ سے میر کے اسلوب میں ایک بے تکلفی کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔

اردو شعر و ادب میں معنوی انحرافات کی بھی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں۔ انسانی ذہن نے جس قدر معنی کو الفاظ کا جامہ دیا ہے۔ ان میں بے انتہا ایسے مدرکات محسوسات ہیں جن کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ ذہن میں مدرکات کا یہ بیکراں ہمیشہ پر سکوت اور خاموش نہیں رہ سکتا۔ اس میں طوفان اٹھتے رہتے ہیں۔ یہ طوفان تخلیق کار کے خیالات کی ترسیل کے لئے الفاظ کی پرتیں ادھیڑتا ہے۔ اور غیر ملفوظ معنی کے لئے الفاظ کا پیرہن تلاش کرتا ہے اس طرح الفاظ کا دائرہ عمل بڑھ جاتا ہے۔ اور الفاظ نئے معنوی پیرہن میں سج سنور جاتے ہیں۔ الفاظ کے پرتوں کو ادھیڑنے اور معنوی گہرائیوں میں اترنے کی وجہ سے تشبیہہ، تمثیل، کنایہ اور استعارہ جیسی صنعتیں وجود میں آتی ہیں۔

[باقی صفحہ ۲۸ پر دیکھئے]

فاروق راهب
محلہ بنیاپٹی، موتیہاری۔ ۸۴۵۴۰۱ (بہار)

ٹھہری ہوئی دھوپ

عمر کے سارے تقاضے پورے ہو گئے تو زندگی کے پر ہول سنّاٹے میں تنہائیاں حملہ آور ہوئی تھیں۔ اور وہ اپنے ہی مکان کے آباد گوشوں میں پُر سکون ویرانے کی تلاش میں تھا۔

حیات جاوداں کے خواب بننے والوں کے قافلے میں کبھی وہ بھی شامل تھا، مگر اب! ــــــ

احساس کے تمام تانے بانے ٹوٹ چکے تھے۔ اور وہ پرانی دیوار پر ٹنگے ہوئے اکھڑے پلاسٹر کے سمان جیون سنگرام کی بیتی یادوں کے سہارے ہی اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ گذرے ہوئے گداز لمحوں کی ساری پرکیف ساعتیں اس کے ہمراہ تھیں۔ اور ان کی خوشبوئیں اس کی سانسوں کے سلسلے کو قائم رکھنے میں مددگار و معاون بنی ہوئی تھیں ــــ تبھی تو وہ پژمردگی کے چند لمحے میں منتشر ہو جانے کے بعد بھی محفوظ تھا!

اس کی صحرائی زندگی میں وہ ایک دن اچانک ہی طلوع ہوئی تھی۔ اور وہ وقت کو بلیر تھامے ہوئے خوشبودار ہواؤں کے تیز جھونکوں کے بہاؤ میں دور تک اڑتا چلا گیا تھا ــــ اور آنکھیں ہوش سے جب ہمکنار ہوئیں تو وہ اس کے سامنے بھکاری کی طرح دامن پھیلائے کھڑا تھا!

وہ اسے پھولوں سے لدی ہری بھری پھولی ٹیکری اونچی پہاڑی کی مانند محسوس ہوئی تھی جس پر وہ احساس کے زینوں کے سہارے ان گنت بار چڑھتے اترتے ہانپ ہانپ گیا تھا۔ اور آخر میں اس کی چوٹی سے پھوٹے جھرنے میں پھسلا کر اتھاہ گہرائیوں میں گرتا ہوا جب سنبھلا تو آنگن میں کئی پھول کھل کر گنگنانے اور مسکرانے لگے تھے۔

" ہائے شیلو! اگر تم حاصل نہ ہوتیں تو اپنے جہانِ تصور میں، میں انوار کی بارش سے محروم رہ جاتا اور میرے دل کی سنسان تاریک گذرگاہیں کبھی منور نہ ہوتیں "

" ایسا ــــ چاپلوس! "

اس کی کھلکھلاتی ہوئی کھلاہٹ ہنسی نے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اس نے اپنے سفر کو جاری رکھا تھا۔

" تمہارے ملنے سے میں ناامیدیوں کے بھیانک جنگل میں پھنسنے سے بچ گیا۔ ورنہ اس کی خاردار جھاڑیاں مجھے لہولہان کر دیتیں اور تب حقیقت کے بدن پر پڑیں خراشیں گنگنا ہٹوں کے لئے بدنمائی کا سبب بن جاتیں! "

" تم باتونی ہو، بہت باتونی! "

اور اس کے کھلکھلاتے ہوئے قہقہوں نے قوس قزح کے ساتوں رنگ بکھیر دیئے تھے۔

یادیں!! زہر میں بھیگی ہوئی جھولتی تمناؤں کی یادیں!

اور صلیبوں پر ٹنگے ہوئے خواب ــ اور وہ نظر گرد وغبار کے اٹھتے ہوئے مرغولے ــ کوئی نشان باقی نہیں تھا جو اس کے زخموں کے لئے مرہم کا کام کرتا ــ بس چیخیں! صبح سے شام تک کے ہنگاموں میں گھلی ہوئی چیخیں ــ جو کبھی اسے زندگی کی دعوت دیا کرتی تھیں اور ان چیخوں ہی کو اپنے متحرک وجود کا ضامن سمجھتا تھا۔ مگر اب!

مگر اب تو اس کے کانوں میں سنّاٹے چیخ رہے تھے ــــ اور وہ لمحہ لمحہ پگھلتا، قطرہ قطرہ ٹپکتا ہوا گھٹتا جا رہا تھا۔

ہاہاہا!"

جملہ پورا کرنے کی ضرورت نہیں تھی، صرف اشارہ ہی کافی تھا۔ اور وہ خواہشوں کا احترام لازمی سمجھتا تھا۔ روشنی کے زوال سے پہلے ہی اس نے اپنی بساط سے زیادہ اپنے مکان کے مکینوں کے لئے سامانِ عیش و عشرت مہیا کر دیا تھا۔

لیکن جب جذبات کی ساری شوخیاں وقت کی ڈھلان کے ساتھ ماند پڑتی گئیں۔ اور وہ مختلف قسم کی بیماریوں کی زد میں آ گیا تو اپنے آپ کو ڈھونا بھی اس کے لئے کٹھن ہو گیا تھا۔

اپنے ہی اندر سب موجود ہوتے ہوئے بھی وہ مسکین نہیں تھا

موسموں کا وہ ریلا جس کے دلفریب نغموں نے آسودگی دی تھی اب بگولوں کا رقص پیش کر رہے ہیں۔ اور وہ اندھی کوٹھڑی میں خود کو سمیٹے ہوئے اپنے بچاؤ کا کوئی ذریعہ ڈھونڈ رہا تھا۔

"او ہو! بابا! بلڈ پریشر، بلڈ یوریا، بلڈ شوگر ــــ کتنے روگ آپ نے پال رکھے ہیں۔

"ہاں۔ مگر کیسے اور کیوں؟"

خلا میں لٹکے ہوئے سوال کا ان کے پاس جواب نہیں تھا!

بہت زیادہ مان اور سمّان دے کر اس نے اپنی ہی انگ کو گستاخ اور بد مزاج بنا لیا تھا ـــ اور اپنے ہی لہو کی بے وفائی اسے نچوڑتی جا رہی تھی۔

شروع میں جب جسم کا سارا تناؤ باقی تھا اور سمندر کی بپھری لہروں پر سوار ہو کر پار ہو جانے والی شکتی اس میں باقی تھی تو ہر فرد غلاموں کی طرح اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے حکم کا منتظر رہتا۔ اس کے سر میں ہلکا سا درد بھی ہوتا تو سب کے سب بے چین ہو جاتے اور اس کی خدمت میں بازی مارنے کی ایک ہوڑ سی لگ جاتی۔ خاص کر اس کی ہمسفر شیلو اس قدر مضطرب ہوتی کہ وہ اپنی تکلیف بھول کر اس کی دل جوئی کرنے لگتا۔

"ارے، کچھ نہیں! یہ تو دو منٹ میں ختم ہو جائے گا بس تم لوگ ایک کپ گرما گرم چائے پلا دو" خواہش کا اظہار ہوتے ہی تمام لوگ کچن کی طرف بھاگے۔ شیلو بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کر جانے لگی تو اس نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے قریب کھینچ لیا۔

"تم کہاں؟ میری مسیحا! تم میرے پاس بیٹھو تاکہ موت کا وقت ٹل جائے۔"

"اللہ توبہ! مریں تمہارے دشمن۔"

"میرا تو کوئی دشمن ہے ہی نہیں، اس لئے اس کے مرنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔"

"میں یہاں سے چلی جاؤں گی، اگر تم ایسی ہی منحوس گفتگو کرتے رہے۔"

"ہائے! تمہارے چلے جانے کے بعد میرے پاس بچے گا ہی کیا؟ بس جسم! روح تو تم ہو"

"ہائیں ہاں! شاید لوگ تم ہی سے سیکھتے ہوں گے۔"

"ہا ہا ہا!"

لیکن ہنسی کی تو صرف چھبن رہ گئی تھی جس پر نڈھال جسم پڑا ہوا، اپنے مسلسل ٹوٹنے کے شک میں مبتلا خود کو بار بار ٹٹول رہا تھا۔

مگر بجھتی چنگاریوں میں اب دم کہاں تھا کہ خاک سے اڑ کر فضا کو اپنی مٹھی میں باندھ لیتیں۔

چند دنوں تک تو خوب اس کی دل و جان سے سیوا کی گئی۔ مگر دھیرے دھیرے لاپرواہی برتی جانے لگی۔ اور خدمت گاروں ہی کی طبیعت خراب ہونے لگی۔

"بار بار تیل مالش کرنے سے تو میرے ہاتھ بھی ناکارہ ہو جائیں گے۔"

شیلو کی جھنجلائی آواز نے تو اسے کسی کا نہیں رکھا تھا!

کبھی کبھار جب اسے اپنے جیون ساتھی سے قربت کا احساس ہوتا تو وہ پوچھنا چاہتا۔

"شیلو! تم بھی ــــ ؟!!"

مگر اس کے چہرے پر پھیلی اجنبیت کو دیکھ کر وہ اس کے لئے کبھی ہمت نہیں جٹا پایا۔

مرض لاعلاج کا ساتھ نبھانا دشوار ہوتا ہی ہے!

ایسے میں نازک رشتے بھی داؤ پر لگ جاتے ہیں۔

ویسے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے دکھ کا اظہار کرنے سے گریز کرے گا۔ وہ اپنے لئے دوسروں کو مصیبت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

مسکراتے ہوئے ہنستے لبوں کو وہ پھر سے سمیٹ لینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ روح کو تازگی بخشنے والا دور پھر سے اس کے قدموں میں لوٹ آنے لگے تاکہ قریب ہوتی ہوئی موت کو وہ شکست دے سکے۔

لیکن یہ ایک دیوانے کا خواب ہی تھا۔ جو وہ سوچ رہا تھا!

ہوا میں اچھلتے ہوئے وہ قہقہے، زندگی سے بھرپور وہ آوازیں، جن سے برسوں سے شناسائی تھی۔ اب بھی اس سے کوئی زیادہ دور نہیں تھے۔ بس ایک چھلانگ ـــ اور وہ ان کی قربت حاصل کر لیتا۔

"ہاہاہا! ہاہاہا!! فن ٹاسٹک، فن ٹاسٹک!"

او ہو! کیا کمال ہے۔

"وہ دیکھو! کیسی پاگلوں جیسی حرکت کر رہا ہے"

"ہاں۔ بالکل پاپا!"

لیکن ان کی آوازیں حلق میں اٹک گئیں اور چہروں پر سانپ رینگ گئے۔ وہ ان کے بیچ ہونے میں دھنسنے کے بعد ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔

سبھی اپنے تھے مگر کوئی اس کا نہیں تھا!

کوئی خانہ ایسا نہیں تھا جہاں اس کی موجودگی کا ثبوت ہوتا!

تھی اس کی شریک حیات کی آنکھیں جو، دری کی طرف اٹھی تھیں اور وہ ان کی بے التفاتی محسوس کر کے کچھ کہنے سے قبل ہی ہکلا کر اٹھا اور لڑکھڑاتا ڈگمگاتا ہوا دیواروں کے سہارے اپنے کمرے میں آیا اور بستر پر چت گر پڑا۔

مکتوبات

واجدان رستگی —— بیرو باڑی، گوہاٹی (آسام)

شاعر شمارہ ۲/۹۱ میں شامل اداریہ بڑی دانش وری اور ژرف بینی کا آئینہ دار ہے۔ واقعی آجکل زندگی کا ہر شعبہ انتشار کا شکار ہے، ایسا انتشار جو حرف و لفظ کی سرحدوں سے بھی آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ زمانہ حقیقت میں کروٹیں لے رہا ہے مگر ہم [illegible] سوالات، پیچیدہ موضوعات، اور نو بہ نو استدراجات و ترجیحات سے مخاطب ہونے کی کوشش ہی نہیں کر رہے ہیں۔ نہ جانے کیوں، شاعر اقبال خصوصی نمبر کے بعد میں نکلنے والے ہر شمارہ کو دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں کہ مذکورہ نمبر میں بھی مدیر نے ایسے سوالات اٹھائے ہیں جن پر غالباً ہم انگشت بدنداں ہو کر رہ گئے ہیں۔ اردو حلقوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو کسی جریدے میں اس مخصوص شمارہ پر تبصرہ تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ حقیقتاً اقبال خصوصی نمبر نے اقبالیات اور ماہرین اقبالیات پر ہی استفہامیہ لگا دیا ہے۔ میں نے اس سے ابھرتے سوالات کا بھرپور جائزہ لیا ہے، جو میری تصنیف IQBAL IN FINAL COUNTDOW میں شامل ہے۔

[illegible] مشکلات نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ بات شمارہ ۳/۹۱ کی ہو رہی تھی۔ جناب شمس الرحمان کی تضمین رباعیات بہت خوب ہیں شمس الرحمن صاحب بڑے شاعر بھی ہیں اور دیدہ ور نقاد بھی۔ افتخار امام کی تینوں غزلیں بہت خوب ہیں کیوں کہ ان میں حالات گرد و پیش سے زائدہ سوچ موجود ہے۔ ان غزلوں کو اگر اداریے کے ساتھ پڑھا جائے تو ایک انوکھا تاثر ابھرتا معلوم ہوگی۔

پروفیسر حامدی کشمیری اچھے شاعر ہیں مگر ان کا مضمون "اکتشافی تنقید۔ چند پہلو" کچھ عجیب ہے۔ لفظ اکتشاف چوں کہ کشف سے مشتق ہے لہٰذا پروفیسر موصوف نے تنقید کو کشف المحجوب بنا دیا ہے۔ "اکتشافی تنقید" کے دونوں لفظ یعنی اکتشافی اور تنقید ایک دوسرے سے متحارب ہیں۔ کشف کی تنقید نہیں ہو سکتی اور تنقید کو اگر کشف کے مقام تک لایا جائے تو مابعد الطبیعات تک معاملہ پہنچ جائے گا۔ میری انگریزی تصنیف A HANDBOO OF LITERARY TERMS & AESTHETICS میں ہر ادبیاتی اصطلاح کو شامل کیا گیا ہے مگر اس نوعیت کی عجیب و غریب اصطلاح میرے مطالعہ میں ہنوز نہیں آئی۔ تنقید میں آج کل متعدد علوم سے استفادہ کیا جاتا ہے اور ان میں نفسیات اور سماجیات بھی مددگار ہوتے ہیں۔ مزید براں غالب کے اس شعر سے

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

کے مطلب حالی سے لے کر فاروقی تک جملہ شارحین نے وحدت الوجود کے پس منظر میں بیان کئے ہیں اور وہ سب کے سب غلط فہمی کے مرتکب ہوئے ہیں تو پھر صحیح معنی کیا ہیں۔ جو تشریح حامدی صاحب نے کی ہے وہ بالکل غیر صاف ہے۔ اور میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ غالب صرف وحدت الوجود ہی سے واقف تھے جو تصوف سے ملا ہے یا تھا۔ دیکھئے غالب کا ایک شعر ہے

قطرہ و موج و کف و سیلاب جیحوں است و بس
این و آن و ما و تو [illegible] هستی [illegible]

بالکل وحدت الوجود پر استوار ہے۔ ایک مراسلہ مزید وضاحت میں مانع ہے۔

"ذرودِ مسعود" سے "تذ مسعود" تک انتقادیاتی انداز بیان سے تفنا تعاری ہے۔ "ذرودِ مسعود" قابلِ قدر تصنیف نہیں کہی جا سکتی۔

شگفتہ فرحت کی افسانہ نگاری ہمیشہ باغ باغ رہی ہے، سدا بہار کیفیت سے بھرپور۔ یہ حقیقت ہے کہ شاعر کا ہر شمارہ ادبیاتی عناصر سے بھرپور ہوتا ہے۔

حامدی کاشمیری —— شالیمار، سری نگر (کشمیر)

تازہ شاعر موجب مسرت ہوا۔ شاعر کا ہر نیا شمارہ آپ کے ذوقِ نظر اور جمالیاتی احساس کا ایک دل نواز نمونہ بن کر آتا ہے۔ سلطان سبحانی کا سرورق سجا بنایا ہوا خاکہ نظر نواز بھی ہے اور با معنی بھی۔ عبدالقوی دسنوی صاحب کا "ذرودِ مسعود..." بے حد تشنہ ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کی رباعیات اور رشید امجد کا افسانہ پڑھا۔ جوگندر پال اور ندا فاضلی کی قسط وار تحریریں دلچسپ ہیں۔ آپ کا اداریہ حسبِ معمول فکر انگیز ہے۔

لطیف الزماں خان۔ ۱۴۹ /بی غالب حالی روڈ گلگشت ملتان (پاکستان)

شاعر کے شماروں کے لیے آپ کا شکر گذار ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا اگست ۱۹۸۳ء میں شاعر کے غالب نمبر کی تلاش میں آپ کے گھر پہنچا تھا۔ وہ شمارہ اب تک حاصل نہیں کر سکا ہوں۔

سیماب صاحب قبلہ سے زندگی میں صرف ایک بار نیاز حاصل ہوا۔ آگرہ میں ان کے مکان پر۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے میرا ایک دوست عزیز الدین جو نہایت خوش الحانی سے سیماب صاحب کا کلام سناتا تھا، مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ صحن کھلا تھا لکڑی کی ایک چوکی پر بیٹھے مرحوم سیماب صاحب وضو بنا رہے تھے۔ سرخ سپید رنگ قد چھوٹا سر پر بال بہت کم تھے۔ کرتا پاجامہ بے داغ۔ عزیز الدین نے سلام کے بعد تعارف کرایا۔ میری عمر اس وقت ۱۸ یا ۱۹ سال رہی ہوگی۔ مجھے اس وقت اندازہ ہی نہ ہوا کہ میں کتنے بڑے انسان اور کیسے باکمال شاعر کے سامنے کھڑا ہوں۔ مگر ۱۹۴۶ء کی وہ تصویر آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔

فرمان صاحب کا مضمون "خواجہ احمد عباس ایک امر قلمکار" پڑھا تو اپنی بدنصیبی کا احساس ہوا۔ واجدہ تبسم مجھے ساتھ لے کر خواجہ صاحب کے گھر گئیں مگر وہ گھر پر موجود نہ تھے۔ پھر ہم کمال امروہی کے گھر گئے وہ بھی نہیں ملے۔ یہ اگست ۱۹۸۳ء کی بات ہے۔

جوگیندر پال کی تصویر دیکھی تو گذشتہ دسمبر میں ان سے ملاقات یاد آگئی۔ وہ میرے عزیز دوست محمد علی صدیقی کے یہاں تھے بیگم پال بھی کراچی آئی ہوئی تھیں۔ کھانے کی میز پر بہت باتیں ہوئیں لیکن اصل گفتگو کا لطف دوسرے دن، رامیں ملی الصبح پہنچ گیا۔ پال بہت نرم لہجہ میں باتیں کرتے ہیں۔ ہم دونوں نے کئی گھنٹے اردو افسانے، افسانچوں کے بارے میں تبادلہ خیال کیا بالخصوص کرشن چندر زیر بحث رہے۔

ندا فاضلی صاحب کی ایک مختصر سی کتاب ملاقاتیں پڑھی تھی گذشتہ سال مارچ کے آخری ایام میں علی گڑھ اپنے سابقہ وطن میں تھا، گرلز کالج میں مشاعرہ تھا۔ محترم سردار جعفری میرے کرم فرما انہی دنوں کو یاد کرتے تھے جب وہ اور مجاز اپنا کلام گرلز کالج میں سناتے تھے تو سامعین (لڑکیاں) پردے میں ہوتی تھیں۔ وہ صدارت کر رہے تھے اور ندا صاحب مشاعرہ کنڈکٹ کر رہے تھے۔ بڑی بے چین طبیعت پائی ہے انھوں نے۔ وہ شاعر کا تعارف اس طرح کراتے کہ وہ ایک چبھتے ہوئے جملے ضرور کہہ جاتے کسی موقع پر جعفری صاحب نے ٹوکا اور ایک مرتبہ تو محبت سے ڈانٹ پلائی۔ لیکن جب ندا صاحب نے اپنا کلام سنایا تو انھیں بڑی داد ملی۔

دیوانِ غالب کامل پر تبصرہ میں نے بڑے شوق سے پڑھا۔ رضا صاحب میرے کرم فرما ہیں ان کا غالب پر اتنا اور ایسا کام ہے کہ کبھی بھی نظر انداز نہ کیا جا سکے گا۔ وہ بڑے ہی خلیق اور شفیق انسان ہیں۔ برصغیر میں رضا صاحب واحد انسان ہیں جو غالب کے نام اور سو [illegible] کو لوٹتے کھسوٹتے نہیں۔ وہ تو ایسے لوگوں کو بھی کتابیں بھیجتے اور بھجواتے رہتے ہیں جن کا کتابوں سے کوئی تعلق نہیں دعا ہے کہ وہ تا دیر سلامت رہیں اور غالب پر کام کرتے رہیں۔

محترم گوپی چند نارنگ صاحب کے مکتوب میں میرا بھی ذکر آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے صحیح لکھا ہے وہ مجھے بالکل نہیں جانتے۔ کبھی خط بھی نہیں آیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب سے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میں نے نثار احمد فاروقی صاحب پر الزام نہیں لگائے حقیقت بیان کی ہے۔ دن، تاریخ، مقام، اشخاص تک کے نام دئے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ فلاں فلاں اصحاب زندہ ہیں جس کا جی چاہے تصدیق کر لے۔ فاروقی صاحب نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کا مشورہ قبول کیا اور میرے خطوط سے اقتباسات دو قسطوں میں شائع کرائے ہیں۔ وہ تھوڑی دیر کو، بہت تھوڑی دیر کو اس تاثر کو قائم رکھ سکیں گے جو انھوں نے قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

محترم ڈاکٹر نثار احمد فاروقی صاحب کے خطوط میرے پاس بھی ہیں لیکن میں ان میں سے اقتباسات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہیں نکالوں گا۔ غالب سے متعلق تمام خطوط کسی لائبریری کو دے دوں گا تاکہ آنے والی نسل یا آج کے ناقدین خود فیصلہ کر سکیں کہ فاروقی صاحب کتنے سچے ہیں۔ یہ ایک علمی بحث ہے ورنہ ذاتی طور پر مجھے ان سے کچھ کہنا نہیں ہے۔

انیس رفیع —— کاشش وانی پٹنہ (بہار)

شاعر کا تازہ شمارہ پڑھ ڈالا۔ نکہ امروز میں علامہ سیماب اکبر آبادی کے ادب اور سیاست سے متعلق ارشادات مجھ جیسے طالب علم کے علم میں اضافے کا باعث ہیں۔ نصف صدی سے قبل STATE POLITICS اور کلچر کا اس قدر گہرا ادراک ہم جیسوں کو حیرت زدہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ POL. SC. میں آنرز اور ایم اے کرنے کے باوجود اردو زبان کے حوالے سے اتنا عمدہ تجزیہ میرے ذہن میں نہیں ابھرا۔ بڑے فنکار کی یہی پہچان ہے۔ [illegible] سخن اور نکہ امروز کے سلسلے میں اس اعتبار سے بے حد معلوماتی ہیں۔ "جھلکیاں" میں آپ نے مردم شماری ۱۹۹۱ء کے لیے جو لائحہ عمل مرتب کیے ہیں وہ بہت موثر اور مفید ثابت ہوں گے۔

محسن بھوپالی کا تجزیہ "نقال نے" متاثر نہیں کرتا، ویسے تجزیہ [illegible]

نفسیات۔ ...
من عنوان گلشن کا آنسو دیدہ ام
ORIGINALITY پر شبہات کے دروازے کھولتا ہو
نکارا چہن رستمل کا ، انکشاف غلط ہو تک ۔ بہت دنوں
فضل کا افسانہ پڑھا ۔ "بکھیرو" ایسا برادن جیسے کردار کے
اچھا افسانہ ہے ۔

بغدادی ——— اے۔ ۲ ، ۱۲/۳ گلشن اقبال کراچی
آپ کے عنایت کردہ شاعر کے شماروں کے منتخب ادب
ترجمہ اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ۔ جوگندر پال کے خواب
ابتدائی افسانے ذہن پر دیرپا تاثرات مرتب کرتے ہیں جبکہ
نامساعد حالات میں بھی اردو زبان کی ارتقاء و ترویج کی بھی
جوت جگا سکتے ہیں ۔

ور سبزواری ——— نوح ، ضلع گڑگاؤں (ہریانہ)
شاعر کے تازہ شمارے میں آپ کی تینوں غزلیں بڑی دلکش
ہیں ۔ یوں بھی لاغری کے باوجود شاعر اپنا معیار قائم کیے
ہے تاہم اشاعتی مراحل اپنی جگہ ہیں ۔

کلیم رفیق ——— معرفت جمیل میڈیکو آرام باغ روڈ کراچی ۱۔
شاعر کے کئی شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے ۔ آپ
نہیں شکر گزار ہوں ۔ سب سے پہلے "خواب رو" پڑھتی ہوں
کے سحر میں گرفتار ہوں ۔ میری جانب سے جوگندر پال کو مبارکباد ۔

رضوی ——— محمد پور ، مبارک ، مظفر پور (بہار)
شاعر کا نیا شمارہ ۱۔ ۱۹۹۰ء باصرہ نواز ہوا ۔ تاخیر کے باوجود
یہ ادبی سفر اعتدال کے ساتھ جاری رکھتے ہوئے ہے مبارکباد ۔
صفحات میں ان دنوں شاعر کے شمارے اس قدر دلچسپ
وعالی رہے ہیں کہ اس کی دوسری کوئی مثال نہیں ۔ ندا فاضلی
نوشت "دیواروں کے بیچ" بہت ہی دلچسپ اور منفرد طرز
لیے ہوئے ہے جو انھیں کا حصہ ہے ۔ مذکورہ شمارے میں
اور انور خان کی کہانیاں معیاری ہیں ۔ منظومات میں شاہد
حامدی کاشمیری قمر ملک ، محمد احمد رمز ، حنا انجم ، جمال اویسی
حسن ، شاہد میر اور ظہیر انور کی تخلیقات پسند آئیں ۔

ب مراد آبادی ——— آر ۔ ۱۶ سیکٹر ۱۱ الف بی ایریا کراچی ۔
شاعر کے شمارے موصول ہوئے ، بے حد شکر گزار ہوں ۔
اللہ آپ کو سلامت رکھے ۔ جو چراغ شعر و حکمت حضرت
بہلت (نور اللہ مرقدہ) نے جلایا تھا اسے اب آپ اپنے
لہو سے روشن کیے ہوئے ہیں ۔ اس دور میں کسی ادبی رسالے کا
رہ جانا ایک معجزہ ہی تو ہے ، مگر :

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

شاہد میر ——— گورنمنٹ کالج ، بانسواڑہ (راجستھان)
آپ کی قربانیوں کا شاعر کے تازہ شمارے میں اتنی ہی تازہ کار
تی مشاعروں میں شکتی ہی ہیں ۔ ایک عمدہ معیاری شمارے پر
مبارکباد ۔

کر چوہدری ——— ملال کالونی ، پوسٹ بکس ۲ جگاوٹ بجنور ۔ (یوپی)
شاعر میں محمد اللہ پر آپکی آزادی چاہیے "پڑھا ۔ جی خوش
ہوا کہ محض اتفاقی ہی کہیے کہ "عجائبات " کی پیشگی تائید میں

ایک مختصر نظم "دنیا ایک ملک ، انسان ایک قوم" اب سے کوئی ڈیڑھ
دو ماہ قبل کوکھنی "جھلکیات" دہلی میں شائع ہوئی ۔ تمہارے ادارے
اور میرا قلم پر عمل درآمد شاید اکیسویں صدی کے آغاز میں شروع
ہو جائے ۔

مناظر عاشق ہرگانوی ۔ کہسار ، ۲/۲ پورہ بھاگلپور (بہار)
ڈاکٹر خورشید سمیع کا مضمون میں نے بعد میں پڑھا شاعری
اور وہ بھی نئی شاعری کے پیچ و خم کو بیان کرتے وقت انھوں نے نئے
آفاق روشن کیے ہیں ۔ ایک مختصر مضمون میں جتنا احاطہ انھوں نے
کیا ہے اس سے زیادہ کی گنجائش لیکن بھی نہیں تھی ۔ شوکت حیات
نے مکتوب نگار بننے کے لیے وہ فہرست شائع کرائی ہے ۔ جو تنقید
لکھنے کے بھی اپنے اصول ہوتے ہیں پھر خورشید سمیع نئی شاعری کے
پیچ و خم پر کوئی کتاب نہیں لکھ رہے تھے کہ ناموں کی کھتونی کرتے ۔
حقیقت فہمی ، حقیقت افروزی اور حقیقت شناسی کے لیے تنقید
کی زبان میں جس تخلیقیت پروری اور تجربہ جوئی کی ضرورت ہوتی
ہے اس سے خورشید سمیع کا مضمون مرصّع ہے ۔ شوکت حیات نے
مضمون کو پڑھ کر نہیں بلکہ سونگھ کر وہ مراسلہ لکھا ہے اور خواہ
مخواہ لکھا ہے ۔ !

نثار احمد فاروقی ان دنوں احساس بے بسی میں نظر آ رہے ہیں
ورنہ وہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے یوں الرجک نہ ہوتے ۔ نارنگ
بہرحال نارنگ ہیں ۔ کمزوریاں ہر کسی میں ہوتی ہیں اس کا یہ مطلب
نہیں ہے کہ اس کے کارناموں سے چشم پوشی کی جائے ۔ چاند میں
بھی داغ ہے لیکن اس کی چاندنی بہرحال ہر کسی کے لیے ہے ۔ نثار احمد
فاروقی شاید اسی لیے احساس کمتری میں مبتلا نظر آ رہے ہیں کہ ادب
اور لسانیات سے نارنگ کی پہچان کیوں نہیں ۔ یہ تو روز روشن
کی طرح سامنے کی بات ہے کہ نارنگ اس حوالے سے اردو میں ہمیشہ
زندہ رہیں گے ۔ لیکن نثار احمد فاروقی ؟ ان کی شناخت کہاں بنتی
ہے اور زندہ رہنے کے بہانے کون سے ہیں ؟ اردو ادب کی دنیا
بے وفا بھی ہے اور زبردست پارکھ بھی ہے ، بکھنے اور چھپنے
والوں کی بھیڑ ہمیشہ رہی ہے ۔ !

شمیم قاسمی ۔ ملی ہاؤسس ، نور گنج ، سہسرام (بہار)
اپنی تمام تر سابقہ روایتوں ، زندگی کی صحت مند قدروں
اور عصری ادب کا واضح تشخص کے لیے رواں دواں شاعر کے
تقریباً تمام شمارے میرے ذہن و دل میں ہمیشہ تازہ رہتے ہیں ۔
مجھے کہنے دیجیے کہ شاعر اور صرف شاعر کی وجہ سے میرے اندر کا
تخلیقی فنکار ابھی مرا نہیں ہے ۔ یہ غلطی رسمی نہیں کہ شاعر نے مجھے
ہمیشہ انسپائر کیا ہے ۔ ذہنی طور پر میں آپ کو ہمیشہ اپنے قریب
محسوس کرتا رہا ہوں ۔ زیر نظر شمارہ میں آپ کی غزل کے دو شعر
(دو ور دو دشتی بھی یہ بھی محفوظ ہو چکا ہوں) میرے تخلیقی سفر کی
مکی رکی سی سا عتوں میں تجدید المہاد کا سبب بنے ہیں ۔

وہ خواب تھا بکھر گیا ، خیال تھا ملا نہیں
مگر یہ دل کو کیا ہوا ، یہ کیوں بجھا پتہ نہیں
ہم اپنے اس مزاج میں کہیں بھی گھر نہ کر سکے
کسی سے ہم ملے نہیں کسی سے دل ملا نہیں

"اکتشافی تنقید — چند پہلو" حامدی کاشمیری کی توجہ متوازن

حقائق کا شناسا در ہے اور دبستان تنقید کی مختلف تحریک
کشمکش کا احاطہ کرتی ہوئی وامِق الکشافی تنقید پر براہ راست
روشنی ڈالتا ہے ۔ شمس الرحمان فاروقی کی تضمین رباعیاں اُن کے تازہ کلام
ہونے کی علامت ہیں ۔ شعری تخلیقات خصوصاً غزلوں کا انتخاب بہتا
یوں بھی ٹھوک بجا کر کرتے ہیں اس لیے یہی کہنا درست ہوگا کہ
ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے ۔ لیکن صاحب تمنگ دلگت
کے تمت پنہاں کی غزل کا مطلع ہے

درد بدن کے بھی سب دل میں رہتے ہیں
اب اشکوں کے دریا کم بہتے ہیں

ایک کیفیت ایک سرور دے گیا ۔ مظہر غزالی کے شعر متفق
نہیں کہ یہاں REPETITION ہے لیکن مندرجہ ذیل اشعار میں ان
کے لب و لہجے کے اعتراف نے قارئین کو اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور
کیا ہے ۔ عجیب دھند ہے دشت سفر میں چھائی ہوئی

نہ ختم ہوتا ہے رستہ نہ گھر نکلتا ہے !
ہنگامے بہت ہو چکے صدیق مجیبی !
آرام سے اب بیٹھ کہیں تسمہ کھول

"در بدر" کے شاعر بدین کمار اشک حسب معمول پسند آئے کیا
اچھا مقطع کہا ہے :

شاید کوئی اس کے آنگن جا اُترے
روز کبوتر اشک اُڑایا کرتا ہے

میری جانب سے ان قلمکاروں کو مبارکباد ۔ "دیواروں
کے بیچ" مسلسل میرے مطالعہ میں ہے ۔ اور ایسا محسوس
ہو رہا ہے کہ بھائی ندا فاضلی بہت خوبصورتی سے اپنے آپ کو
(بزبان نثر) پروجیکٹ کرتے جا رہے ہیں ۔ کہیں کہیں پر اظہار
بیان قدرے سطحی ہے (منٹو کی طرح بولڈ ہرگز نہیں) اور صحافتی
کا جذبہ بھی غالب ہے ۔

پروفیسر خورشید سمیع کا "نئی شاعری کے پیچ و خم" بہت ہی
زیادہ ہنگامہ خیز رہا اور حلقہ احباب میں محض اس لیے چرچا
کا سبب بنا کہ پروفیسر موصوف نے جمیل کو جمیل ہی سمجھا ورنہ
ہمارے چند نام نہاد تنقیدی بابا لوگ لفظوں کی بازیگری سے جمیل
کو کمتر بنانے میں اچھا خاصا نام کما چکے ہیں ۔

نتیجتاً پورا اردو ادب بالخصوص شعری ادب تنگ نظری اور
نظریاتی کشمکش کا شکار ہو کر رہ گیا ہے ۔ شکر ہے کہ پروفیسر
موصوف اپنی تحریر میں بہت سنجیدہ اور محتاط نظر آتے ہیں ۔ ان
کا مطالعہ وسیع اور ذہن کشادہ ہے ۔ وہ علاقائی عصبیت سے
بہت دور ان چند لوگوں میں سے ہیں جو اردو کی روٹی نہیں کھاتے
لیکن اردو زبان و ادب کے بے لوث خدمت گار ہوتے ہیں اور ان
کا سفر مفاہیم کی سمت گامزن رہتا ہے ۔ پروفیسر خورشید کو یہ بھی
معلوم ہے کہ اردو شاعری کے شطرنج پر کیسے شاہ ، وزیر ،
گھوڑے اور پیادوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہے ۔ کون کس
چال میں کس کی زیادہ اہمیت اور بساط ہے ۔ پروفیسر موصوف
اردو ادب میں گروپ بندی اور گروہ نظری سے بہت دور
قلم کاغذ میں آتے ہوئے موضوع کو بہت متوازن لہجے میں پیش
قاری کے ذہن میں اتارتے ہیں ۔ [ ] ...

کتب و رسائل

دھند اور پل صراط

معروف اور معتبر شاعر صدیق مجیبی کا نیا شعری مجموعہ جلد شائع ہو رہا ہے۔ ○ سینٹرل اسٹریٹ، ہند پیری، رانچی (بہار)

ذہنِ جدید

سہ ماہی

ذہنِ جدید زندہ رسالہ، موضوعات، مضامین اور مواد کے "تنوع" تازگی اور نئے پن کی بنا پر ہر حلقے میں گفتگو کا موضوع، ایک نیا با تصویر رسالہ ادب، آرٹ اور کلچر کے مختلف پہلوؤں پر تازہ ترین معلومات دینے کے مقصد سے نکالا گیا۔ اس رسالے کو آپ فخر کے ساتھ اپنے احباب اور اعزا کو بطور تحفہ پیش کر سکتے ہیں۔

ضخامت: ۱۹۲ صفحات — قیمت: بیس روپے — زرِ سالانہ: اسّی روپے — شاہکار گٹ اپ۔ مدیرہ: جشید جہاں — ترتیب: زبیر رضوی ○ ملنے کے پتے: پوسٹ بکس ۷۰۴۲، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ — سینٹرل نیوز ایجنسی، مدراس ہوٹل، کناٹ پلیس، نئی دہلی۔ مکتبہ جامعہ، دہلی، علی گڑھ، بمبئی۔

سوغات

اردو کا عہد ساز ادبی رسالہ اپنی نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے۔ پہلا شمارہ جنوری ۱۹۹۱ء میں شائع ہو رہا ہے۔ ایجنٹ حضرات مطلوبہ تعداد سے پیشگی مطلع فرمائیں۔ رسالہ صرف بذریعہ وی پی ارسال کیا جائے گا۔ مدیر: محمود ایاز۔

ضخامت: چار سو صفحات — قیمت: چالیس روپے —

○ پتہ: سوغات، ۴۰، تھرڈ مین، سیکنڈ کراس، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸ (کرناٹک)

بگولے

شموئل احمد کی منتخب کہانیوں کا مجموعہ منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ اس میں ۱۲ کہانیاں شامل ہیں۔ ضخامت: ۱۳۸ صفحات — قیمت: بیس روپے۔ مطبوعہ: ۱۹۸۸ ○ پتہ: ۳۰۱، گروے اپارٹمنٹ، نیو پاٹلی پتر کالونی، پٹنہ ۱۳۔

عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نئی تحقیقی کتاب شائع ہو گئی ہے۔ ضخامت: ۲۹۶ صفحات، قیمت: ۱۲۰ روپے، ڈیمائی سائز، طباعت آفسیٹ ○ پتہ: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

مقدمہ قطب مشتری

ڈاکٹر طیب انصاری کی نئی تحقیقی کتاب شائع ہو گئی ہے۔ واضح رہے کہ قطب مشتری گولکنڈہ کے ملک الشعراء ملا اسد اللہ وجہی کی شہرۂ آفاق مثنوی ہے۔ ڈاکٹر طیب انصاری نے نہایت ہی ذمہ داری کے ساتھ تحقیق کیا ہے کہ یہ مثنوی شہزادہ محمد قلی قطب شاہ اور بھاگ متی کی داستانِ عشق ہے اور یہ کہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد کا پہلا نام بھاگ نگر تھا۔

○ پتہ: مکتبہ رفاہِ عام، روضہ بزرگ گلبرگہ ۴ (کرناٹک)

بوئے رمیدہ

جگن ناتھ آزاد کا نیا شعری مجموعہ جسے نفیس اکادمی کراچی (پاکستان) نے شائع کیا ہے — قیمت: نوّے روپے۔ ○ پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۱۱۰۰۰۶۔

منتخب ہائیکو

اردو کے تیس شعراء کے ہائیکو کا انتخاب، اردو، ہندی، بنگلہ اور انگریزی میں شائع ہو گیا ہے۔ مرتبین: مناظر عاشق ہرگانوی، سوشوبھن سین گپتا۔

صفحات: ۱۱۲۔ قیمت: ۲۵ روپے ○ پتہ: کوہسار، برہ پورہ، بھاگلپور (بہار)

بے شناخت

معتبر افسانہ نگار ناصر بغدادی کے افسانوں کا نیا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ معیاری افسانوں کے قارئین کے لیے ایک انمول تحفہ اور فکشن کے خود ساختہ ناقدین کے لیے ایک چیلنج۔ سرورق سے آخری صفحے تک ندرت، جدت اور تازہ کاری کی ایک نئی مثال۔

ضخامت: ۲۰۷ صفحات — قیمت: ۷۵ روپے۔ مطبوعہ: ۱۹۹۰ء ○ : ندا پبلی کیشنز، اے ۱۲/۱۴۱-۰۲ معمار اسکوائر، گلشنِ اقبال، بلاک ۱۴، کراچی (پاکستان)

سرِ شاخِ طوبیٰ

جدید اردو شاعری کی مخصوص، منفرد اور جانی پہچانی آواز فضا ابن فیضی کا نیا شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ اس میں حمد، نعت، ترانے اور دیگر منظومات شامل ہیں۔

ضخامت: ۲۲۴ صفحات۔ قیمت ۷۵ روپے۔ مطبوعہ ۱۹۹۰ء

○ رابطہ: فیضی پبلی کیشنز، مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱ (یوپی)

پیراہنِ جاں

بزرگ شاعر منظر شہاب کا اولین شعری مجموعہ جس میں ان کے تمام عمر کے مختلف النوع احساسات کی شعری کشید ہے، منظرِ عام پر آ گیا ہے۔ اس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔

صفحات: ۱۴۴۔ قیمت: پچاس روپے۔ مطبوعہ: ۱۹۸۹ء

○ روڈ نمبر ۱، ہاؤس نمبر ۷، آزاد نگر، جمشید پور ۸۳۲۱۱۰۔

عبدالرحیم خانخاناں

اردو میں اپنے موضوع پر ایک مبسوط تحقیقی کتاب۔ یہ کتاب رحیم کی سوانح بھی ہے اور ان کے عہد کا تہذیبی اور مذہبی منظر نامہ بھی ہے۔

صفحات: ۱۸۲ — قیمت: اسّی روپے۔ مطبوعہ: ۱۹۹۰ء

○ رابطہ: خسرو کتاب گھر، ۱۵۰ بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

مجلہ فنون لاہور

اردو کا عہد ساز ادبی رسالہ جو احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ تازہ ترین شمارہ نمبر ۳۰، جون، جولائی ۱۹۹۰ء ۵۰۸ صفحات پر مشتمل ایک خصوصی اشاعت ہے۔ اس ضخیم شمارے میں وہ سب کچھ ہے جس کی ایک باشعور اور ذہین قاری کو تلاش رہتی ہے۔

قیمت: ۷۵ روپے۔ تزئین: موجد۔

○ رابطہ: پنجم ملک چیمبرز، ارشال، لاہور (پاکستان)

اکائی سے پہلے

ضیاء انجم کا اولین شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ غزلیں، دوہے، رباعیات، قطعات اور آزاد نظمیں۔ احساسات کی دھنک رنگ، فکر اور جذبہ کا حسین تخلیقی امتزاج۔ ایک شعری مجموعہ۔ صفحات: ۱۱۲ — قیمت: ۲۰ روپے۔ مطبوعہ،

○ پتہ: ۱۰۶ کینٹ، جبل پور (ایم پی)

ن

معروف شاعر علیم صبا نویدی کا ۲۳واں شعری مجموعہ شائع ہو گیا ہے اسے پروفیسر محبوب پاشا نے مرتب کیا ہے۔ نعتوں پر مشتمل اس مجموعے میں دس معتبر ناقدین کے علیم صبا نویدی کی نعت پر مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں۔ صفحات: ۸۸ — قیمت: مطبوعہ ۱۹۹۰ء ○ ۲۶۰ امیر النساء بیگم اسٹریٹ، ماؤنٹ روڈ، مدراس ۶۰۰۰۰۲ (تامل ناڈو)

حرفِ جنوں

کے چند اوراق

یہ کتابچہ سلیمان آصف کے زیرِ ترتیب انتخابِ کلام "حرفِ جنوں" کے چند اوراق پر مشتمل ہے۔ نظم و غزل میں اقبال کی شعری روایات کا پیرو فکری شاعری کی نئی تخلیقی مثال۔

ضخامت: ۴۸ صفحات۔ قیمت: ۱۰ روپے۔ مطبوعہ: ۸۰

○ رابطہ: ۳/۲۳۵ اے، محلہ زیگر گرہ، وارانسی (یوپی)

ادبی کائنات

آیت اللہ خمینی نمبر

اردو کا علمی، تہذیبی اور فکری ماہنامہ "ادبی کائنات" جس نے مختصر وقت میں کئی معیاری شمارے پیش کیے اور سنجیدہ قلم کاروں کو نئی سمت، تازہ کار فکری جہت سے روشناس کیا۔ تازہ ترین خاص اشاعت آیت اللہ خمینی مرحوم پر ایک گراں قدر، وقیع اور دستاویزی ہے۔ ایک بلند قامت عالمی شخصیت کو غیر معمولی تعزیتی عقیدت جیسے نوجوان ادیب، مفکر، خطیب عقیل الغروی نے مرتب کیا ہے۔ خصوصی نمبروں کی عام روش سے ہٹ کر خمینی کی شخصیت کے وجدانی اور ادبی پہلوؤں کو اس نمبر میں اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ تخلیقی ذہنوں کے لیے ایک نادر تحفہ۔ ایک نیا ادبی تاریخی تناظر۔

ضخامت: ۳۲۲ صفحات۔ قیمت: ۲۹ روپے۔ شمارہ ۲۴، ۲۵۔ مطبوعہ: نومبر ۸۹ تا جنوری ۱۹۹۰ء۔

○ رابطہ: ادبی کائنات، ۱۴ امام باڑہ، لکھنؤ رشید مارکیٹ

بقیہ صفحہ ۴۷ مکتوبات

یہ شعور اور ایمان داری کتنوں میں ہے۔ میں رام لعل کے خط سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ خورشید عہدِ حاضر کا ایک ایسا نقاد ہے جس کے تنقیدی ادراک میں توانا کشادگی ہے اور جو اپنے منصب کو خوب پہچانتا ہے۔ آج اردو ادب کو خورشید سمیع جیسے چند نقادوں کی کمی ہے! شمارہ نمبر ۱۲-۱۱ میں شوکت حیات کا خط کسی خاص ردِعمل کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور وہ اپنی اس تحریر میں نہایت سنجیدہ نظر آتے ہیں۔

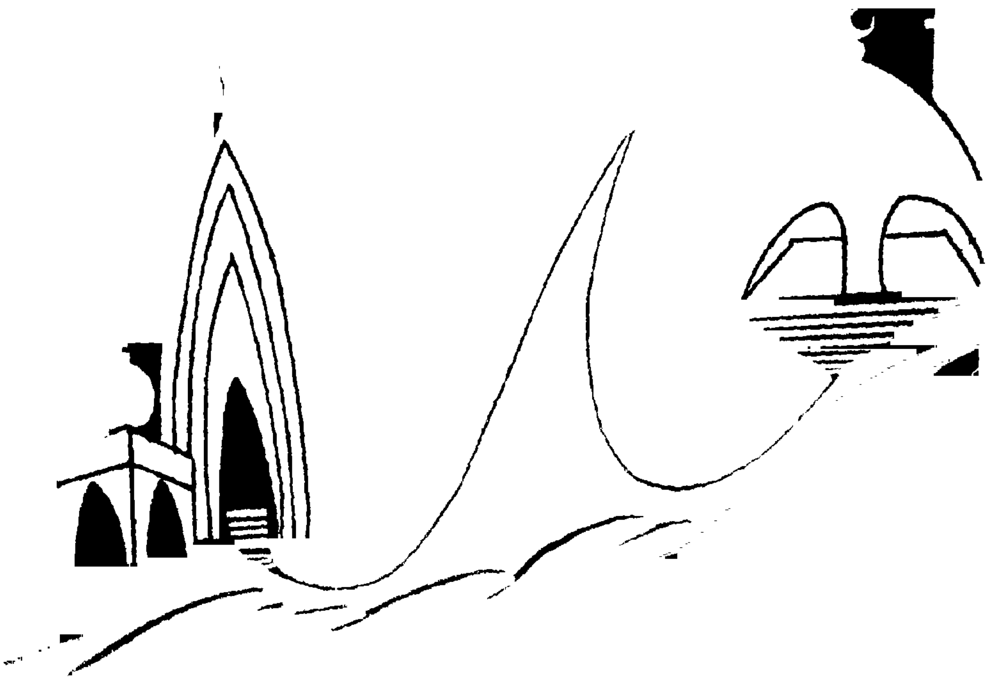
ان کے خط کا کوئی مثبت پہلو نہیں۔ "خواب" آخر چھوڑ گئی۔ کہانیاں ابھی نہیں پڑھ سکا ہوں۔ شمارے کے قلم کاروں کے لیے نیک خواہشات۔

Regd. No. MH-B.Y.W. 311 Price: Rs. 5

THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

61-Years of Publication ❋ (Publishing Date: 27-28) ❋ Issue No. 4 1990 ❋ Telephone No. 359904.

Registered with the Registrar of Newspapers at R.N. No. 14482/57.





میر حسن دہلوی

۱۲۰۱ھ

ہے لطف تری رنگِ سادگی میں ہے
[illegible] میر قلم تیرا مثنوی میں ہے
[illegible] سب کہیو اتفاق اسی پر
[illegible] میں ہے

میر غلام حسن، معروف میر حسن، مشہور شاعر میر غلام حسین ضاحک کے صاحب زادے تھے۔ پرانی دہلی کے ایک محلّے سید واڑے میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگ [illegible] تھے۔ عربی فارسی کی تحصیل ترتیب تکمیل تھی۔ بقول مولوی سید اشرف حسین [شاگرد رشید [illegible]] شکل و شمائل: میانہ قد، خوش اندام، گورا [illegible] سب کپڑے صیم پہننے کا شوق تھا۔ بانکی ٹوپی، تن زیب کا انگرکھا، پھنسی ہوئی آستینیں، سر سے دوپٹہ بندھا ہوا، خندہ جبیں، شگفتہ مزاج، [illegible] اور طرز ادا صاف و سادہ تھی۔ میر حسن کے ۳ صاحب زادے تھے جو خود بھی شعر کہتے تھے: میر مستحسن خلیق [میر انیس؛ ۱۲۴۹ھ کے والد] میر احسن خلق اور میر محسن محسن۔ فیض آباد سے لکھنؤ آ گئے تھے اور یہیں انتقال کیا۔ مفتی گنج میں دفن کیے گئے۔

[illegible] کلام پر اپنے والد سے اصلاح لی پھر دہلی میں خواجہ میر درد [۱۷۲۰ء – ۱۷۸۴ء] سے اصلاح لی۔ دہلی سے اپنے والد کے ساتھ فیض آباد [illegible] جو اودھ کا دار السلطنت تھا تو میر ضیاء الدین ضیاء [م ۱۷۷۱ء] سے مشورۂ سخن کیا۔ بعض حوالوں میں ہے کہ مرزا محمد رفیع سودا [illegible م: ۱۱۹۵ھ] کو بھی اپنا ابتدائی کلام دکھایا تھا۔

میر حسن کا غیر معمولی شہرت کا کارنامہ مثنوی سحر البیان ہے جسے نواب آصف الدولہ [م: ۱۲۱۲ھ] کے نام معنون کیا گیا تھا۔ بعض تذکرہ نگاروں [illegible] میر حسن کی شاعری میر سوز [۱۱۳۳ھ – ۱۲۱۳ھ] کے رنگ کی شاعری تھی۔

مثنوی سحر البیان [illegible] کا سلسلہ میر حسن کی حیات ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ کل گیارہ مثنویاں تخلیق کیں [illegible] کے علاوہ مثنوی شادی، رموز العارفین، گلزار ارم، مدح جواہر خاں اور تہنیت عید [illegible] سحر البیان [illegible] اشعار پر مشتمل ہے۔ حسرت موہانی نے ۱۵ سو اشعار کا ایک معیاری انتخاب کیا تھا [illegible] حبیب الرحمٰن [illegible] [illegible] [۱۹۷۵ء] کلیات میر حسن [illegible] میر حسن [illegible]

شاعر

بانی مدیر
سیماب اکبرآبادی مرحوم

جاری شدہ ۱۹۳۰

بہ یادگار
اعجاز صدیقی مرحوم

اشاعت کا ۶۱ واں سال

علمی ادبی تحریکی ماہنامہ

جلد — ۶۱
شمارہ — ۵ تا ۱۲

فون نمبر: ۳۵۹۹۰۳

مدیر
افتخار امام صدیقی

معاون
ناظر نعمان صدیقی

قیمت :- ۵ روپے

زرِ سالانہ ۵۰ روپے
لائبریریوں سے ۶۰ روپے

تاعمر خریداری ۱۰۰۰ روپے
معاونین سے ۱۰۰ روپے
ممالک غیر سے ۳۵۰ روپے

فکر امروز



دنیا کی گزشتہ ہزار سالہ تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں علم و ادب کو سیاست اور قومیت کی تعمیر میں دخل نہ ہو۔ آج سیاست، قومیت اور وطنیت کو علم و ادب سے الگ رکھ کر ہمارے بزرگ علم و ادب کا دانستہ استخفاف فرما رہے ہیں۔ غالباً ان کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ادبی مجالس کے انعقاد کا منشا صرف تفریح و نشاط اور ہنگامی چہل پہل ہے اس نقطۂ نظر نے ادبی وقار کو جو نقصان پہنچایا ہے اس سے کون واقف نہیں۔

[تصویر] [رامپور] مارچ ۱۹۴۳ء

عصری اردو شاعری کا خوب سیرت تخلیقی روپ

واردات ، شعریت ، معیار

تازہ کار شاعر عبدالاحد ساز کا اوّلین شعری مجموعہ

خموشی بول اٹھی ہے

شائع ہوگیا ہے۔

زمانوں کو ملا ہے، سوزِ اظہار
وہ ساعت، جب خموشی بول اٹھی ہے

پرمعنی سرورق ◆ روشن کتابت وطباعت ◆ مضبوط جلد

ضخامت ★ ۱۹۲ صفحات — قیمت ★ چالیس روپے

پتہ:

قلم پبلی کیشنز، ۰۰ باپو کھوٹے اسٹریٹ، بمبئی نمبر ۴۰۰۰۰۳

شاعر

مقالات

نظمیں

کہانیاں

غزلیں

ناولٹ

خودنوشت

منتخب غزلیں

طنز و مزاح

بساطِ سخن

بازیافت

لفظ لفظ

محفل بینی

سرورق
ایک راستہ

عمل
سلطان سبحانی

مکتوبات

شمارہ ۵ تا ۱۲ [۱۹۹۰ء] جلد ۶۱

قارئین شاعر کے نام

سال ۱۹۹۰ء کا شمارہ نمبر۵ (مئی) آپ کی نذر ہے۔ یہ شمارہ بھی شاعر کے گزشتہ شماروں کی طرح پسند کیا جائے گا اور مقبول ہوگا۔

اقبال نمبر [۱۹۸۸ء] کی تاریخ ساز مقبولیت اور غیر معمولی پذیرائی کے باوجود تاحال شاعر اپنے روایتی مسائل سے نبرد آزما ہے بلکہ ان میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ عام شماروں کی اشاعتوں میں اتنی بے ترتیبی پہلے کبھی نہیں آئی تھی۔ ۱۹۸۹ء کے شمارے ۱۹۹۰ء کی شش ماہی تک گئے اور ۱۹۹۰ء کے صرف ۵ ہی شمارے شائع ہو سکے، اس طویل خلیج کو کم کرنا ممکن ہی نہیں ہو سکا۔ اب اگر ۱۹۹۰ء کے مزید شمارے شائع کیے جائیں تو شاید ۱۹۹۱ء بھی اس غیر معمولی تاخیر کی نذر ہو جائے گا۔ شاعر کے بیشتر اہم پروجیکٹ جن پر کام جاری ہے، اسی تاخیر اور بے ترتیبی کے سبب بروقت منظرِ عام پر نہیں آ سکے ہیں۔

ہمارے معزز قارئین، قلم کار اور ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے شاعر کے ایجنٹ حضرات کا مسلسل اصرار ہے کہ رسالے کو وقت پر شائع کیا جائے، ہر شمارے پر مہینہ درج کیا جائے چاہے درمیانی اشاعتیں رد ہی کیوں نہ کر دی جائیں۔ ہماری کوشش یہی رہی کہ کسی طرح ۱۹۹۰ء کے تمام شمارے شائع ہو جائیں مگر ایسا ممکن نہیں ہو سکا، اس کی کئی وجوہ ہیں۔

قارئین حضرات! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ گزشتہ کئی ماہ اس ملک پر قیامت کے گزرے ہیں کہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ محفوظ نہیں رہ سکا ہے۔ علاقائی علاحدگی پسندی اور مذہبی تعصبات سے پھیلنے والے خون ریز فسادات، کشت و خون اور خوف و دہشت نے ہندوستان کا چہرہ ہی مسخ کر دیا ہے کہ فرد بے معنی ہو کر رہ گیا ہے اور اب ایک دنیا تاریخ کے ہولناک ترین جنگ کی زد پر ہے کہ ہندوستان اپنے اندرون میں تباہ حال تو ہو ہی رہا تھا اب بیرونِ ملک حالات سے بھی شدید طور پر متاثر ہوا ہے۔

شاعر قطعی ایک غیر تجارتی اور غیر سرکاری خالص علمی و ادبی جریدہ ہے جو اپنے محدود ترین وسائل میں کسی طرح سانسیں لے رہا ہے، ملک کے موجودہ بدترین حالات سے بے طرح متاثر ہوا ہے۔ نتیجہ میں ۱۹۹۰ء میں زبردست مالی بحران کا شکار ہوا، ابھی اقبال نمبر کا خسارہ پورا بھی نہیں کر پائے تھے کہ ۱۹۹۰ء کے حالات نے اس میں مزید اضافہ کر دیا، بہت ساری پیچیدگیاں پیدا کر دیں ان سب کے باوجود شاعر کے جو بھی شمارے شائع کیے گئے وہ ہر اعتبار سے متنوع اور اعلیٰ معیار کے تھے۔

شاعر کے معزز قارئین اور کرم فرما حضرات کے پرخلوص مشوروں کا احترام کرتے ہوئے اور رسالے کو ماہ بہ ماہ شائع کرنے کی خواہش سے شمارہ نمبر۵ کی اس اشاعت کے ساتھ سال ۱۹۹۰ء کو شاعر کی ۶۱ ویں جلد پہ ختم کیا جا رہا ہے۔ ان کم اشاعتوں سے سالانہ خریداروں پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، مدتِ خریداری میں جتنے شمارے کم ہوں گے ان کا اضافہ کر دیا جائے گا۔ سالانہ خریدار مطمئن رہیں۔

شاعر کا یہ شمارہ فروری کے اوائل میں آپ تک پہنچے گا۔ فروری کے اواخر یا پھر مارچ کے شروع میں جنوری فروری کے دو شمارے کسی طرح شائع کیے جائیں گے تاکہ مارچ کے شمارے سے ماہ بہ ماہ شاعر آپ تک پہنچتا رہے۔ دعا کیجیے کہ ہم اپنے مقاصد میں کامیاب رہیں۔ شاعر ایک روایت، ایک تاریخ کا نام ہے۔ اردو زبان کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ۔ دعا کیجیے کہ یہ روایت ایک صدی نہیں کئی صدیوں تک جائے۔

۱۹۹۱ء میں شاعر اپنی اشاعت کے **"۶۲ ویں سال"** میں نئے عزائم کے ساتھ قدم رکھ رہا ہے۔ سالِ رواں میں کئی خصوصی و موضوعاتی شمارے تو پیش کیے ہی جائیں گے، ایک ضخیم خاص نمبر بھی شائع کیا جائے گا۔ لیکن ہمارے خوابوں کی عملی صورت گری آپ کے بھرپور تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ شاعر نے اب تک جتنے بھی چھوٹے بڑے موضوعاتی شمارے اور خاص نمبر شائع کیے ہیں وہ شاعر کے خیر خواہوں، قلم کاروں، سالانہ خریدار اور ایجنٹ حضرات کے تعاون ہی کا نتیجہ رہے ہیں۔ حالیہ اقبال نمبر اس کی ایک روشن مثال ہے۔ آپ ہی کے تعاون اور مشوروں کی روشنی میں شاعر کے جامع پروگرام بنائے جا رہے ہیں۔ ادبی رسائل کی روایتی نہج کو شاعر ہی نے تبدیل کیا اب رسالے کو مزید زندہ اور تازہ کار بنانے کی مزید کوششیں جاری ہیں۔ آپ کے اپنے شاعر کے لیے ہم آپ کے مفید مشوروں کا خیر مقدم کریں گے۔

شاعر کے وقت پر شائع نہ ہونے اور مسائل کے گرداب میں پھنسے رہنے کا ایک بنیادی سبب خریداروں کی طرف سے وقت پر زرِ سالانہ کی عدم وصول یابی بھی ہے۔ بار بار کی توجہ اور یاد دہانی کے اب بھی خاصی تعداد میں شاعر کے سالانہ خریداروں نے اپنا زرِ سالانہ اور بقایاجات نہیں بھجوائے ہیں۔ اگر سالانہ خریدار وقت پر تجدیدِ خریداری کرتے رہیں تو شاعر کے بہت سے مسائل ازخود حل ہو سکتے ہیں۔ شاعر کے اخراجات کا بڑا حصہ خریداروں کے زرِ سالانہ ہی سے پورا کیا جاتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ شاعر وقت پر شائع ہوتا رہے، اس کی خصوصی اشاعتیں اور خاص نمبر آتے رہیں تو زرِ سالانہ وقت پر ارسال کر کے ہمارے ہاتھ مضبوط کیجیے۔ شاعر واحد ادبی رسالہ ہے جو اپنے سالانہ خریداروں کو ان کی مدتِ خریداری ختم ہو جانے کے باوجود جاری رکھا جاتا ہے، اس امید پر کہ زرِ سالانہ ضرور وصول ہو جائے گا لیکن اکثر و بیشتر مایوسی ہی ہوتی ہے، اس میں سراسر زیاں ہے۔ اب یہ سلسلہ ختم کیا جا رہا ہے۔ آئندہ شمارے سے جن سالانہ خریداروں کی مدتِ خریداری ختم ہو جایا کرے گی ان کے نام شاعر کی ترسیل بند کر دی جائے گی۔

ہاں! اگر آپ کی طرف سے زرِ سالانہ بھیجنے میں تاخیر ہو رہی ہو اور آپ خط کے ذریعہ دفتر کو رسالہ جاری رکھنے کی اطلاع دیں تو شاعر آپ کو ملتا رہے گا۔

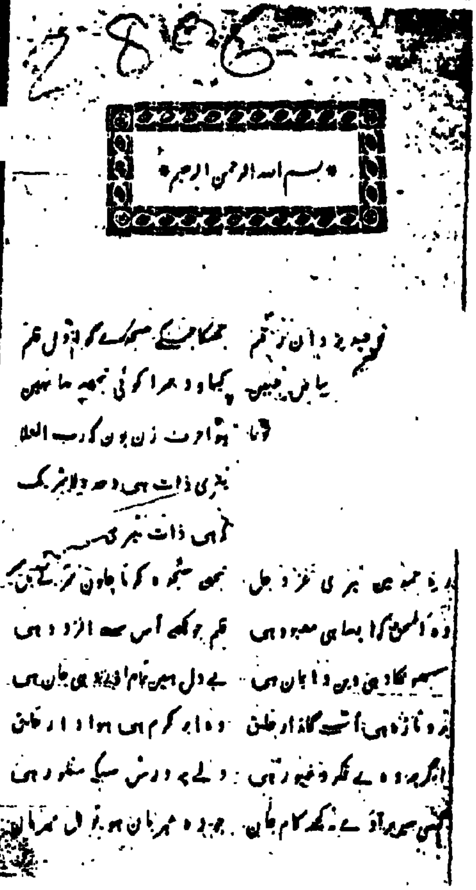
جن خریدار حضرات کے ذمہ ایک سال یا اس سے زائد برسوں کا زرِ سالانہ باقی ہے ان کے نام شاعر کا یہ آخری شمارہ ہے۔ ذیل کے چوکھٹے میں بقایاجات کی تفصیل ✓ نشان لگا کر دی جا رہی ہے اس امید پر کہ اب ہمیں مایوسی نہیں ہوگی اور آپ تمام الجھنوں اور باتوں سے قطع نظر فوری طور پر ادھر توجہ دیں گے بصورتِ دیگر شاعر کی ترسیل روک دی جائے گی۔

[ادارہ]

☐ آپ کا زرِ سالانہ .... میں ختم ہوا ہے / تھا۔ اس سے قبل بھی یاد دہانی کی گئی تھی، ایک بار پھر توجہ کی درخواست ہے۔ آپ کے خط اور منی آرڈر کا انتظار رہے گا۔ اگر آپ منی آرڈر سے رقم ارسال نہ کر سکیں تو پوسٹ کارڈ کے ذریعہ دفتر کو وی پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

اگر آپ کسی وجہ سے شاعر کی ترسیل بند کرنا چاہتے ہوں تو آپ کی طرف شاعر کے جو بقایاجات ہیں ان کی تکمیل کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔





مثنوی سحر البیان کے دو قدیم نسخے

مثنوی سحر البیان، میر حسن کی حیات میں متعدد بار طبع ہو چکی تھی۔ زیر نظر ایڈیشن ۱۲۶۹ھ بمطابق ۵۳-۱۸۵۲ء کا ہے۔ اس کا ترقیمہ فارسی ٹائپ میں صفحہ نمبر ۱۴۴ پر دیا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: "پوشیدہ نہ رہے کہ یہ نسخہ بارہا طبع ہو چکا ہے اور اس وقت نایاب ہے اس لیے محمد فیض اللہ نے ۱۲۶۹ھ میں اسے چھاپا۔" صفحہ ۱۴۴ پر جہاں صحت نامہ ختم ہوتا ہے وہاں شہر کلکتہ کا اندراج ہے۔ اس نسخے میں ایک بات قابلِ توجہ یہ ہے کہ مثنوی کے آخر میں مرزا قتیل اور مصحفی کے قطعات تاریخ تو ہیں لیکن ماہر کا قطعۂ تاریخ حذف کر دیا گیا ہے جبکہ بعد کے نسخوں میں یہ قطعۂ تاریخ موجود ہے کیا یہ قطعۂ تاریخ بعد میں کہا گیا تھا؟ مثنوی کا سالِ تصنیف ۱۱۹۹ھ ہے۔ دوسرا نسخہ ۱۳ رمئی ۱۸۷۱ء کا ہے، جو مطبع نولکشور سے طبع ہوا تھا۔ یہ دونوں نسخے کالی داس گپتا رضا صاحب کی لائبریری میں موجود ہیں۔

میر حسن دہلوی

[شعری انتخاب]

عشق کا راز گر نہ کھل جاتا
اس قدر تو نہ ہم سے شرماتا

تک کے تب بیٹھتا ہے وہ ہم پاس
آپ میں جب ہمیں نہیں پاتا

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ
میں تماشا وفا کا دکھلاتا

مر گئے ہم تو کہتے کہتے حال
کچھ تو تو بھی زباں سے فرماتا

سب یہ باتیں ہیں چاہ کی ورنہ
اس قدر تو نہ ہم پہ جھنجھلاتا

میں نہ سنتا کسی کی بات حسن
دل جو باتیں نہ مجھ کو سنواتا

جاتا تھا اس کے کوچے میں، میں بے خبر چلا
پاسے اسی نے ٹوک کے پوچھا، کدھر چلا

جس اشتیاق سے کہ میں آتا ہوں تیرے پاس
کیا ہو جو آوے تو بھی یوں ہی بے خبر چلا

غیروں میں اس نے منہ تو چھپایا تھا مجھ کو دیکھ
پر میں بھی اس کی چھیڑ سے منہ ڈھانپ کر چلا

کس میں رکھوں گا اپنی حسرت کو میں بھلا
شیشہ تو دل کا خونِ جگر ہی سے بھر چلا

لکھنے کی یاں نہ تاب، نہ پڑھنے کا واں دماغ
کہہ دیں گے کچھ زبانی، اگر نامہ بر چلا

پھر رات غیر کی جو کہیں نکلی اس سے بات
سن سن کے میں خفا ہو، وہیں روٹھ کر چلا
غصہ میں دیکھ مجھ کو لگا کہنے: اور لو!
اک بات بس کہی نہ کہی، یہ تو مر چلا
اب کوئی آوے یا کہ نہ آئے حسن کہ یہ
بے چارہ اپنی جان سے آپ ہی گزر چلا

غم خانۂ دل عیش کا گھر ہووے گا یا رب
آباد کبھی یہ بھی نگر ہووے گا یا رب!

جب دیکھوں ہوں اس کو تو یہ آتا ہے مجھے رشک
کس کس کا یہ منظورِ نظر ہووے گا یا رب!

بگڑی تو ہے غیروں سے اور اب ہم سے و لیکن
کیا جانیے! وہ شوخ کدھر ہووے گا یا رب

جان و دل و دیں کھو بیٹھے اک اس کی نظر پر
ایسا بھی کوئی اور بشر ہووے گا یا رب!

رونے سے مرے سنگ تلک ہو گئے پانی
دل میں کبھی اس کے بھی اثر ہووے گا یا رب

داغوں کو ترے غم کے جو رکھے تر و تازہ
یہ میرے سوا کس کا جگر ہووے گا یا رب!

روتے ہی گزرتی ہے شب و روز حسن کو
اب اس سے تو کیا حال بتر ہووے گا یا رب

مجھ کو عاشق کہہ کے اس کے روبرو مت کیجیو!
دوستاں! گر دوست ہو، تو یہ کبھو مت کیجیو!

جس ادا کا کشتہ ہوں میں، وہ رہے میرے ہی ساتھ
اس ادا کو جتنے ہیں اے خوب رو مت کیجیو!

وقتِ رخصت دل نے اتنا ہی کہا رو کر کہ بس
اب پھر آنے کی مرے تو آرزو مت کیجیو!

میں تو یوں ہی تم سے دیوانہ سا بکتا ہوں کہیں
اس کے آگے دوستاں! یہ گفتگو مت کیجیو!

زلف کے کوچے سے ہو گلشن میں گزرے ہے صبا
آج واں جا کر گلوں کو کوئی بو مت کیجیو!

کل کے جھگڑے میں بھلا ہے کہ کہے یارو! اگر
وا ابھی جو ہوا سو کہیو! میری رو مت کیجیو!

واں حسن ہرگز نہیں ہے وصل پھر جانے میں کچھ
آشنائی پر بھروسا اس کی تو مت کیجیو!

دل غم سے ترے لگا گئے ہم
کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

ماتم کدۂ جہاں میں جوں شمع
رو رو کے جگر بہا گئے ہم

مانندِ حباب اس جہاں میں
کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

کھویا گیا اس میں گو دل اپنا
پر یار! سبب تجھے تو پا گئے ہم

تھا ہم میں اور اس میں وہ جو پردہ
سو اس کو حسن اٹھا گئے ہم

دل بر سے ہم اپنے جب ملیں گے
اس گم شدہ دل سے تب ملیں گے

یہ کس کو خبر ہے اب کے بچھڑے
کیا جانیے! اس سے کب ملیں گے

دنیا ہے، سنبھل کے دل لگانا
یاں لوگ عجب عجب ملیں گے

ظاہر میں تو ڈھب نہیں ہے کوئی
ہم یار سے کس سبب ملیں گے

آرام حسن تبھی تو ہوگا،
اس لب سے جب اپنے لب ملیں گے

سیر ہے تجھ سے مری جان! جدھر کو چلیے
تو ہی گر ساتھ نہ ہووے، تو کدھر کو چلیے

خواہ کعبہ ہو کہ بت خانہ غرض ہم سے شیخ
جس طرف دل کی طبیعت ہو، اُدھر کو چلیے

زلف تک رخ سے نگہ جاوے نہ اک ان کے سوا
شام کو پہنچیے منزل، جو سحر کو چلیے

جب میں چلتا ہوں ترے کوچے سے کترا کے کبھی
دل مجھے پھیر کے کہتا ہے: ادھر کو چلیے

ان دنوں رات اسی فکر میں کٹتی ہے حسن
صبح کب ہووے کہ پھر یار کے گھر کو چلیے

ہم نہ نکہت ہیں، نہ گل ہیں، جو مہکتے جاویں
آگ کی طرح جدھر جاویں، دہکتے جاویں

اے خوشا مست! کہ تابوت کے آگے جس کے
آب پاشی کے بدل مے کو چھڑکتے جاویں

جو کوئی آوے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

غیر کو راہ ہو گھر میں ترے سبحان اللہ
اور ہم دور سے در کو ترے تکتے جاویں

وقت اب وہ ہے کہ اک ایک حسن ہو کے تنگ
صبر و تاب و خرد و ہوش کھسکتے جاویں

ہمدم! نہ پوچھ مجھ سے؟ غرض اک بلا ہے
جو روبرو ہو اس کے سو جانے کہ کیا ہے

بیگانہ وار بھی نہ ملا ہم سے وہ کبھی
ہم سادہ دل یہ جانتے تھے، آشنا ہے

ہجراں تو ہے، پہ یہ نہیں معلوم کچھ ہمیں
ہم آپ سے جدا ہیں کہ ہم سے جدا ہے

پھر پھر کے پوچھتے ہو عبث آرزوئے دل
تم جانتے تو ہو کہ مرا مدعا ہے

میں نے تو بات بھی نہیں کی اس سے ہرگز
اک یہ بھی چونچلا ہے کہ ناحق خفا ہے

معذور رکھ حسن کو جو بے طاقتی کرے
عاشق ہے، دردمند ہے اور مبتلا ہے

اس کی جب بزم سے ہم ہو کے تنگ آئے
اپنے ساتھ آپ ہی کتنے ہوئے جنگ آئے

حسن میں جب تپش گرمی نہ ہو رہی دیوے
شمعِ تصویر کے کب گرد پتنگ آتے

دل کو کس بوقلموں جلوے نے سے خون کیا
اشک آنکھوں سے جو یہ رنگ برنگ آتے

آہ تعلیم کو اٹھتی ہے مرے سینے سے
دل پہ جب اس کی نگاہوں کے خدنگ آتے

شرط گر پوچھو، تو ہے اس میں بھی قسمت
عاشقی کرنے کے ہر ایک کو ڈھنگ آتے

حیرت افزا ہے عجب کوچۂ دلدار حسن
جو وہاں جاتے ہیں اس طرف سے دنگ آتے

[نقوش (لاہور) غزل نمبر مطبوعہ ۱۹۶۰ء]

عزیز قیسی

پشیماں سحراں دراز...

(۱)

یہ سحرا - (یہ فضاؤں کی رانی)
دھیرے دھیرے سلگتی جلی ہے
نقش خانے میں نیلی فضا سے
[illegible] پائل چھنکتی چلی ہے
[illegible] کھلتے ہیں کلیوں کی صورت
[illegible] پھر - گرد پھر - گلوں پر
[illegible] ستاروں کی چھوٹیں
برستی ہے نادیدہ شبنم

—

[illegible] — نارسا درد —
ناشنیدہ نوا —
[illegible]
[illegible] کو خبر کیا
[illegible] کی آبادیوں کو خبر کیا
[illegible] دل —

[illegible] - قریب آثار - افسوں گرفتہ
[illegible] اک کمند ہے۔
[illegible] کا منتظر ہے

—

(۲)

کتنا خاموش ہے یہ ویرانہ
اک پرندہ سا -
(دا ہمہ سا کوئی)
[illegible] کے نزدیک پھڑپھڑاتا ہے
کس کی یاد آئی - کیسی ہے آواز
چاندنی زخمہ زن ہے
پردہ ساز
اک چھناکے سے (شیشہ علاں کی طرح لرزاں ہے)
ٹوٹ جائے گا
کہ دنیا چاند کا مسئلہ ہے
ٹوٹتا ہے یقین شیشے کا

(۳)

تیرگی کے مہیب جنگل میں
اک پرندہ کا چیتا شعلہ
کالی کالی گھٹا کے زنداں سے
چاندنی کا پتہ نہ نکلا
جیسے ویرانے میں افق کے قریب
دھیرے دھیرے سلگ رہی ہو چتا
بڑھ گئی پھر جمیش کے کالی گھٹا
جیسے یہ چڑھ کے چاند ڈوب گیا

تیر کیوں [illegible] سرد اجالے کا
دل کا ~~[illegible]~~ بکھرا ہوں میں ٹوٹ گیا
ایک تارا پلک کے ساحل سے
ٹمٹماکے چھوٹ گیا

(۴)

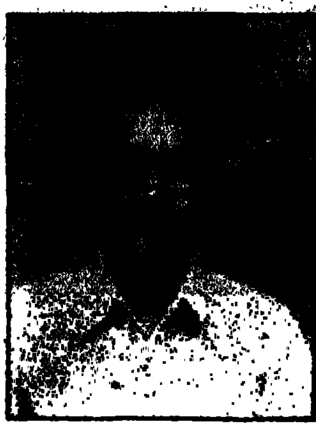
محو درد جراں داہر بستہ
یہ شب
شب درد میں [illegible]

دیکھتے ہیں چاند کی جبیں پر
شبنم سی کیوں جیسے گر کر
سمٹ کے دھواں سا بن گئی ہے
ایک ایک لہو کی بوند جیسے
چھنتے ہوئے دل پہ گر رہی ہے
بستر کے شکن شکن ہوں جیسے
نشتر سے بچھائے ہیں کسی نے
وہ درد - نقش ہے جس کا عنواں
یہ غم کہ جو سکھ دہر سبب ہے
یہ شب - مری زندگی کی شب ہے

(۵)

آ خرِ شب گھٹا کا سناٹا
چشم نم دیدہ جیسے گم سم ہے
آسماں - چاندنی - ستارۂ صبح
آج کس کے خیال میں گم ہے
چاند - ستارے، افق کے زانو پر
تھک کے دم توڑ دے تو کیا ہوگا؟
پھر سحر نور سے نہائے گی
پھر اجالے کا سماں ہوگا؟

آج سے دل میں رہ گئے ہیں جیسے
دیکھ سکتی ہے دل کی ویرانی
آ کے یہ روز و شب کا ہنگامہ
آ کے یہ عمر کی گراں جانی



شکیب ایاز

۱۲ گذری بازار، پٹنہ ۸۰۰۰۰۸

نئے سرقے کی ایک مثال میر حسن دہلوی

"سرقہ" ایک ادبی اصطلاح ہے۔ انگریزی لفظ PLAGIRISM اس کا مترادف ہے۔ فرہنگ ادبی اصطلاحات میں درج ہے۔

PLAGIRISM : سرقہ کسی دوسرے مضمون کی تحریر یا خیال کو اپنانا [۱]

J.A. CUDDON نے A DICTIONAY OF LITERARY TERMS میں یہ لکھا ہے:

PLAGIRISM : KIDNAPPER, LITERARY THIEF [۲]

عطا کاکوی لکھتے ہیں۔

مضمون یا کوئی خیال جو پہلے کسی شاعر نے قلم بند کیا ہے۔ اس کو دوسرے شاعر نے اپنا لیا ہو تو سرقہ کہا جائے گا۔ [۳]

سرقہ کی مندرجہ متعین صورتوں کو پیش نظر رکھئے تو کہنا ہی پڑتا ہے کہ مضامین کی چوریاں عام نہیں تو کم بھی نہ تھیں۔ اس کے سبھی اسیر نظر آتے ہیں۔ کیا انگریزی کیا اردو۔ کلیم الدین احمد نے لکھا ہے

مشہور مصنفوں میں مولیئر STERNE اور DUMAS اس کے مرتکب ہوئے۔ [۴]

J.A. CODDON لکھتا ہے

MUCH PLAGIRISM HAS BEEN THE LIFTING, FINDING OR PIRATING OF OTHERS PEOPLE'S WORKS; A VERY COMMON PRACTICE AMONG DRAMATISTS DURING THE ELIZABATHEN PERIOD. [۵]

چند مثالیں اردو شعرا کے کلام سے درج کی جاتی ہیں۔

۱ — تیز یوں ہی نہ تھی کچھ آتش شوق ‌ ‌ بے خبر گرم ان کے آنے کی [میر]

بے خبر گرم ان کے آنے کی ‌ ‌ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا [غالب]

۲ — امیدوار وعدۂ دیدار مر چلے ‌ ‌ آتے ہی آتے یارو! قیامت کو کیا ہوا [میر]

مدت ہوئی کہ بیٹھے ہیں ہم انتظار میں ‌ ‌ کیا جانے آتے آتے قیامت کو کیا ہوا [مصحفی]

۳ — کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا ‌ ‌ وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا [میر]

ہوس سے ہم کیا تھا عشق اول ‌ ‌ وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا [قائم]

۴ — وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں ‌ ‌ مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں [حسرت موہانی]

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں ‌ ‌ مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں [اقبال]

یہ تو چند مثالیں تھیں۔ اس نوعیت کے بہت اشعار درج کئے جا سکتے ہیں۔ مندرج اشعار کا تجزیہ کیجئے تو صورت حال واشگاف ہو جاتی ہے۔ اور طرز سخن کا پردہ آپ ہی اٹھ جاتا ہے۔ غالب "نہ" "بے" اور "تھی" کے معمولی فرق کے ساتھ میر کا ثانی مصرع سرقہ کر لیتے ہیں۔ غالب کے نزدیک مصرع کا "سرقہ" قرار دے۔ لطف یہ ہے کہ غالب اس پر فخر کرتے ہیں۔

..... ایک مصرعے میں تم کو محمد الحسن شوکت بخاری سے توارد ہوا ہے۔ یہ بھی محل فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچے وہاں تم پہنچے۔ ...... پہلا مصرع تمہارا اگر

اس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا تو میرا دل زیادہ خوش ہوتا...... ۵۵

"آتشِ شوق کی تیزی" کا جواز میر کے ثانی مصرع میں موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کے آنے کی خبر گرم تھی۔ غالب کہتے ہیں کہ: آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا۔ اگر خبر گرم تھی تو بوریا مہیا کیوں نہ ہوا؟ اس کی وجہ نامعلوم رکھی گئی۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ وہ اچانک آگیا اور گھر میں بوریا تک نہ تھا۔ غالب، میر کے شعر سے استفادہ نہ کرسکے لہٰذا سرقے کے مرتکب ہوئے غالب نے میر کے دیوان کا مطالعہ کیا۔ ان سے متاثر تھے۔

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب   جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

یہی نہیں۔ مالک رام کے مطابق غالب نے میر کے دیوان کا انتخاب بھی کیا تھا۔ اور وہ اکمل المطابع دہلی سے چھپا تھا۔

مصحفی بھی میر سے واقف تھے۔:

"چہار دیوانِ ریختہ از نمانۂ فکرش وثنوی ہائے متعدد وشعرکا زمانہ ہائے بے نظیر تماشہ کلکِ ندرت طراز او برصفحۂ زمانہ یادگار است۔ برفقیر بسیار مہربانی می فرماید"۵۶

میر کا ثانی مصرع، مصحفی نے ذرا سے فرق کے ساتھ اپنا لیا۔ میر کہتے ہیں۔

آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

اولیٰ مصرع میں اس کی وجہ ظاہر کردی گئی ہے: امید وارِ دیدۂ دیدار مرچلے۔ گویا انتظار کی آخری حد بھی تمام ہونے کو ہے۔ دیدار مقصود بالذات ہے۔ قیامت کے آنے کی تصدیق ہوچکی ہے۔ دیر کیوں ہو رہی ہے، یہی تشویش کا سبب ہے۔ دیدار کا انحصار قیامت پر ہے۔ لیکن مصحفی کے اولیٰ مصرع میں لفظ "مدت" تعین کا اشارہ ہے۔ مصحفی بھی منتظر ہیں۔ قیامت کا انتظار انہیں بھی ہے۔ مصحفی نے "کیا جانے" کہہ کر اپنی لاعلمی اور بے خبری ظاہر کردی ہے۔ جب کہ میر "آتے ہی آتے" کہہ کر اس آنے اور نزدیکی کا احساس دلاتے ہیں۔ اس صورت میں اسے مسروقہ ہی کہنا ہوگا۔

میر اور قائم کے شعر کا تقابلی تجزیہ کیجئے۔ ایک پرسا خیال باندھ دیا گیا۔ عشق کی ابتدا ہوس سے ہوتی ہے اور یہی اخیر تک فن ٹھہرتا ہے۔ میر نے کہا تھا۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر   مذہبِ عشق اختیار کیا

غرض کہ میر کے شعر سے قائم کے شعر کا موازنہ درست نہ ہوگا۔ میر کا شعر ان کے فن پر خود ان کی تنقید ہے۔ شعر کو "سخن کا پردہ کہنا" نئی بات تھی اور اب بھی ہے۔ پردہ لفظ کا استعارہ ہے اور اسے فن قرار دینا عظمتِ ہنر کی دلیل ہے۔ لہٰذا قائم کا سرقہ بہر طور بھونڈے ترین سرقے میں شمار ہوگا۔

چوتھے اور آخری شعر کے دو شعرا اقبال اور حسرت موہانی معاصرین ہیں۔ زمانے کا بُعد نہیں۔ افسوس کہ   اشعار کی اشاعت یا سنہ تخلیق اب تک معلوم نہیں۔ لیکن اتنا تو کہنا ہی ہوگا دونوں میں سے کوئی ایک سرقے کا مرتکب ضرور ہوا ہے۔

گذشتہ سطروں میں سرقے کی مختلف صورتیں بطور نمونہ پیش کی جاچکی ہیں۔ ایک نئی صورت یا شق دیکھئے، میر حسن جیسا معروف مثنوی نگار، صاحبِ تذکرہ اور نغز گو اپنے معاصر و معروف شاعر کے شعر کا سرقہ کس طرح کرتا ہے۔

شاہ واقف دہلوی گم نام شاعر نہ تھے۔ معاصرین تذکرہ نگاروں نے ان کے فن کا اعتراف کیا ہے۔ اس کی پوری تفصیل راقم السطور کے "مدون دیوانِ واقف" میں موجود ہے۔ میر حسن کا تذکرہ ۱۱۹۱ھ میں مرتب ہوچکا تھا۔ میر حسن پہلے تذکرہ نگار ہیں جو واقف کی گرفتاری کی اطلاع دیتے ہیں۔

"دریں ولا کہ بہ سرکار نواب شجاع الدولہ بہ تہمت نقش نویسی ناحق گرفتار شدہ بود۔   ظاہر ہے کہ محولہ سنہ ۱۱۹۱ کے قریب ہی واقف کی گرفتاری عمل میں آئی ہوگی۔ "مجمع" گلزار ابراہیم" اور "واقف کے بیاض" تذکرہ نگار مبتلا دونوں واقف کی رہائی کی اطلاع دیتے ہیں۔ اس طرح قیاس ہے کہ ۱۱۹۱ تا ۱۱۹۴ھ کے دوران ہی قید و رہائی دونوں عمل میں آئی ہوگی۔ واضح رہے کہ گلشنِ سخن کا سنہ تکملہ ۱۱۹۴ھ ہے۔ واقف نے اپنی گرفتاری کے سانحہ کو غزل کے روپ میں ڈھال دیا۔ اس کی بابت تفصیلات یوں ہیں۔

میر حسن، واقف سے اپنی دوستی کا دم بھرتے ہیں، لکھا ہے:

با فقیر بسیار دوستی دارد۔"

تذکرہ نگار نے یہ بھی لکھا ہے:

"در آں مقدمہ حسبِ حال خود ایں غزل گفتہ [شعر] تمام غزل ہمیں طور ساوا کردہ است۔

میر حسن کے الفاظ سے مترشح ہے کہ واقف نے ایک مکمل غزل کہی تھی لیکن وہ صرف مطلع درج کرتے ہیں۔ دیگر اشعار کیوں تذکرے سے حذف کر دیئے گئے؟ اس کی کوئی توضیح نہیں کی جاتی۔

میں واقف کے معاصرین شعراکی ہم طرح غزلیں مرتب کر رہا تھا۔ دیوان میر حسن بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ واقف کی "پہرے میں" والی غزل کو میر حسن نے طرح قرار دے کر ایک غزل داخل دیوان کی ہے۔ میر حسن نے تذکرہ شعرائے اردو میں اپنے ترجمے بھی پیش کئے ہیں۔ اس میں ان کے دو شعر بھی درج ہیں۔ ان اشعار میں یہ دو شعر بھی موجود ہیں۔

ہے سزا دل کی جو زلفوں کے گیا پہرے میں — شب کو کیوں نکلا اکیلا جو پھنسا پہرے میں
مردم چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں — ایک عالم کو نظر بند کیا، پہرے میں

اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ تذکرہ کی تکمیل تک واقف کی زمین میں میر حسن نے غزل مکمل کر دی تھی۔ اور دو شعر داخل تذکرہ کر دئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ تذکرہ شعرائے اردو میں واقف اور میر حسن دونوں کے ترجمے موجود ہیں۔ واقف کی گرفتاری کے سلسلے میں جو غزل وجود میں آئی اس کا ذکر اور ایک مطلع بھی تذکرے میں درج ہے۔ اور میر حسن نے جو طرح میں غزل کہی اس کے دو شعر بھی اپنے ترجمے میں نقل کر دیئے ہیں۔ میر حسن کو چاہئے تھا کہ وہ یہ بھی اعتراف کر لیتے کہ یہ واقف کی طرح ہے اور میں نے ان کی غزل سے متاثر ہو کر غزل کہی ہے۔ لیکن وہ اس سلسلے تک خاموش ہو گئے۔

تذکروں میں واقف کا ایک مطلع متن کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ درج ہے۔ عبدالباری آسی کی مرتبہ "قدیم بیاضوں کا ایک انتخاب" میں واقف کے مزید تین شعر درج ہیں۔ یہ اشعار کسی تذکرے میں موجود نہیں۔ دیوان واقف بھی "پہرے والی غزل" سے خالی ہے۔ واقف اور میر حسن کی غزلیں درج ذیل ہیں۔

واقف

ملا دور آیا ہے کہ ہیں شاہ و گدا پہرے میں
بے خطا پہرے میں اور اہل خطا پہرے میں
ہ کیا خطا دل کی جو زلفوں نے کیا پہرے میں
شب کو مت پھر تو اکیلا کہ ترا پہرے میں نالہ
مردم چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں
ایک عالم کو نظر بند کیا، پہرے میں
دل کے لگ جانے کو کہتے ہیں میاں قید فرنگ
آیا جو گھاٹی کے اندر سو رہا پہرے میں

میر حسن

۵۸ ہے سزا دل کی جو زلفوں کے گیا پہرے میں
شب کو کیوں نکلا اکیلا جو پھنسا پہرے میں
دل کا لگنا ہی کسی سے ہے تری قید فرنگ
پھر نہ چھوٹا کبھی جو اس کے پڑا پہرے میں
عشق ہی کا یہ پہرہ کہ پھنسے جس میں جی
ورنہ ہوتی ہے کہیں بند ہوا پہرے میں

ق

اس فرنگی بچے کے کوچے میں جو کوئی گیا
نقش پا کے نمط اس جا پہ رہا پہرے میں
مردم چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں
ایک عالم کو نظر بند کیا پہرے میں
عشق نے جرم محبت پہ دیا ہے غم کے
دل جدا پہرے میں اور دیدہ جدا پہرے میں
تھا عدم میں تو ہر اک بند سے آزاد حسنؔ
قید ہستی نے مرے مجھ کو دیا پہرے میں

واقف کا ایک شعر:

مردم چشم نے پلکوں کی چڑھا سنگینیں — ایک عالم کو نظر بند کیا پہرے میں

من وعن میر حسن نے اپنے تذکرے میں اپنے نام منسوب کر دیا ہے اور دیوان حسن میں بھی موجود ہے۔ میر حسن کا سرقہ دوسری نوعیت کا حامل ہے۔ اسے جرأ

سرقہ کہہ سکتے ہیں۔ گویا یہ سرقے کی ایک نئی شق ہے۔ میر حسن کا یہ مصرع بھی قابل گرفت ہے۔

واقف کہتے ہیں۔ دل کا لگنا ہی کسی سے ہے ترکِ تیز رنگ ... دل کے لگ جانے کو کہتے ہیں میاں تیز رنگ

فرق ظاہر ہے لیکن دائرۂ سرقہ سے باہر نہیں۔ اس نوعیت کے سرقے سے صاحب تذکرہ میر حسن کی سیرت مشکوک اور متنازعہ فیہ ہو جاتی ہے۔ مجھے علم نہیں، اس طرح کی مثال کسی تذکرہ نگار کے ہاں بھی ملتی ہے یا نہیں، اس نقطۂ نظر سے شعرائے کے دواوین اور تذکروں کا تقابلی مطالعہ مفید ہوگا۔

حواشی:۔ لے فرہنگ ادبی اصطلاحات۔ مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد ناشر: ترقی اردو بیورو دہلی مطبوعہ ۱۹۸۶ء

ے۔ A DICTIONARY OF LITERARY TERM مرتبہ J.A. CUDDON ناشر PEGUIN BOOK ایڈیشن ۱۹۸۴ء

۳ سرقہ، توارد، استفادہ از عطا کاکوی رسالہ آجکل دہلی شمارہ اگست ۱۹۵۳ء

ع فرہنگ ادبی اصطلاحات مرتبہ پروفیسر کلیم الدین احمد ناشر: ترقی اردو بیورو دہلی ۱۹۸۶ء

ھ A DICTIONARY OF LITERARY TERM مرتبہ J.A.CUDDON ناشر PEGUIN BOOK ایڈیشن ۱۹۸۴ء

لہ تذکرہ ہندی مطبوعہ اترپردیش اکادمی ۱۹۸۵ء

ے مطلع تذکرہ گلشن سخن سے ماخوذ ہے۔ دور آیا ہے کہ ہوں شاہ و گدا بہرے میں [شعرائے اردو] وقت آیا ہے کہ ہوں شاہ و گدا بہرے میں [گلزار ابراہیم نسخہ سرور کشا]

ے غزل ماخوذ از دیوان میر حسن مطبوعہ نولکشور لکھنؤ مطبوعہ ۱۲۳۰ھ ص ۹۹

۹ تین اشعار ماخوذ از دفایاب بیاضیں اور ان کا انتخاب۔ مرتبہ:۔ عبدالباری آسی۔ ناشر:۔ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سنہ اشاعت: ۱۹۴۴ء ص ۹۹

ی لفظ "ترا" ترکی لفظ "تورا" کا مخفف ہے بمعنی چنگیز خاں کا قانون [فیروز اللغات ص ۳۵۰] توڑا بمعنی سونا چاندی کی زنجیر جو پگڑی میں لپیٹتے ہیں۔ گلے میں پہنتے ہیں۔ [فرہنگ عامرہ ص ۱۳۰] اسی کا ٹکڑا [فیروز اللغات] مضبوط و پائیدار [فرہنگ عامرہ] قانون۔ رسم۔ قاعدہ [فرہنگ عامرہ] تورہ [ترکی] بمعنی قانون، دستور العمل [کریم اللغات ص ۹۲]

لفظ تورہ: مجازاً شریعت جو چنگیز خاں نے وضع کی تھی۔ نیز بمعنی حکم شدید شاہی [فرہنگ آصفیہ جلد اول ص ۹۲۳]

نوٹ:۔ شعر کے سیاق میں جو معنی بر آمد ہوتے ہیں صرف وہی درج کئے گئے ہیں۔ ❋

بقیہ صفحہ ۱۵ — اکیلا آدمی

آئی۔ اور نہ کبھی سارا نے آکر میرا حال پوچھا۔ میں نے اپنے آنے کی اطلاع ہیڈ آفس دے دی۔ دفتر سے کار اور فنڈز آگئے۔ اور میں نے سرونٹ کوارٹرز میں رہنے کی عادت ڈال لی۔ ڈاکٹر نے میرا خون ٹسٹ کیا اور علاج شروع کر دیا۔ ایک سال دو مہینے دس دن کے بعد ڈاکٹر نے مجھے مبارکباد دی اور میرے صحت مند ہونے کا سرٹیفکٹ دے دیا۔ ایک سال دو ماہ دس دن کے بعد میں ماریا کی طرف پھر لوٹا۔ بھاگا بھاگا فلیٹ پہونچا اور سرونٹ کوارٹرز میں جانے کی بجائے سیدھا ماریا اور سارا کے پاس پہنچا۔ وہ دونوں مجھے دیوانوں کی طرح آتے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگیں؛

"ماریا۔ سارا دیکھو یہ رہا میڈیکل سرٹیفکٹ۔ میں اب پوری طرح صحت مند ہو گیا ہوں نا۔ میری جلد دیکھو صاف ستھری اور بے داغ ہے۔"

وہ دونوں مجھے چپ چاپ دیکھے گئیں۔

"آؤ سارا اب تو میرے پاس آؤ تاکہ میں تمہیں اسی طرح پیار کر سکوں۔"

"اوہ پاپا ——" سارا نے کہا مگر اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔

"تم صحت کی بات کرتے ہو" ماریا بولی "ہو گئے ہو گے صحت مند مگر وہ تو جلد کا مرض ہے۔ تم جلد کی بیماری میں مبتلا ہوئے اور صحت مند ہو گئے مگر ہم دونوں تو دل کے کوڑھ میں کب کے سڑ گل چکے۔"

"کیا کہہ رہی ہو ماریا"

"پاپا ممی سے کیا پوچھتے ہیں آپ — باپ اگر ساتھ ہے تو کوڑھی ہو کر بھی باپ ہی رہتا ہے۔ چھوڑ کر بھاگ جائے تو —"

"شٹ اپ سارا" ماریا چیخی "مت کرو ایسی باتیں ہمیں ان کی نیم پلیٹ کے سہارے ہی زندہ رہنا ہے۔"

میں سرونٹ کوارٹرز میں لوٹ آیا ہوں اور ایک مدت سے اکیلا ہی اس گوڈری فلیٹ میں رہتا ہوں۔ ❋

مٹھی بھر غزلیں



وامق جونپوری

زندگی اسپتال ہو جیسے
سانس لینا وبال ہو جیسے
خون پیتے ہیں جان کھاتے ہیں
ان پہ ہر شے حلال ہو جیسے
جتنا آسان ہو گیا مرنا
اتنا جینا کمال ہو جیسے
بکتے ہیں مفلسوں کے اعضا یوں
جسم بکری کی کھال ہو جیسے
جنتا کا لوڈرہ اور اکھتی ہے
شاعری سر کا بال ہو جیسے
شاعری کا مزاج پوچھتے ہو
قحبۂ کہنہ سال ہو جیسے
طنز کرتا ہے صاف ذہنوں کو
زنگ پر ریگ مال ہو جیسے
ملک یوں بٹ رہا ہے جھگڑوں میں
کسی مُردے کا مال ہو جیسے
یوں سیاست میں جھوٹ در آیا
بولنا سچ محال ہو جیسے
وامق اب نیند آ رہی ہے مجھے
روتا بچہ نڈھال ہو جیسے

◆

ہم میں کوئی اب ایسا پیمبر ہی نہیں ہے
جس کو رسن و دار کا کچھ ڈر ہی نہیں ہے
شمشیروں پہ ہے جن کی لکھا فتح کا طغرا
آمادۂ پیکار وہ لشکر ہی نہیں ہے
سورج کے تعاقب میں چلا غول بیاباں
سائے تو بہت لمبے ہیں پیکر ہی نہیں ہے
شہروں کی بلندی پہ ہیں زنبور کے چھتے
جنبش و در و دریچہ کوئی منظر ہی نہیں ہے
فٹ پاتھ نہ تھا گھر میں تو سو جاتے تھے مڑ کے
فٹ پاتھ پہ اب تو ہے اک گھر ہی نہیں ہے
اک قید ہے خود جسم کے زنداں سے رہائی
رہنا ہے خلاؤں میں جہاں در ہی نہیں ہے
ہے کوئی جو پتھر میں بدل دے ہمیں وامق
جز بے حسی بیزاری کا منتر ہی نہیں ہے

◆

بس اک اُتھل پتھل کے سوا کچھ نہیں ہوا
ہر شے کا نام بدلا بھلا کچھ نہیں ہوا
آزادی تمام کے ہم ہو گئے غلام
اک قتل عام ہوتا رہا کچھ نہیں ہوا
صد ہا گھروں کو چاٹ گئی شعلے کی زباں
طوفان درد پھیل گیا کچھ نہیں ہوا
خبروں میں اس کا نام نہ تھا شور مچ گیا
اخبار شہر بند ہوا کچھ نہیں ہوا
گر ہے کشیدِ خونِ جگر ہی علاج غم
یہ تو مزید غم کے سوا کچھ نہیں ہوا
وامق یہ کیسا باغ ہے اور کیسے باغباں
کلیوں بہار روٹھ گئی کچھ نہیں ہوا

◆

نہیں غفار تو وہ حاصل بھی نہیں
کوئی اس کا متبادل بھی نہیں
کوئی ٹاپو ہے نہ جنگل ہے نہ شہر
اک خلا سی ہے جو منزل بھی نہیں
تشنۂ شوق ہے یا شب کا خمار
نہیں ہشیار تو غافل بھی نہیں
ترک بادہ سے نہیں ہوتا کچھ
نہیں طوفان تو ساحل بھی نہیں
اس کے مارے نہ مریں گے وامق
جس میں طنازی قاتل بھی نہیں

◆

ہمقدم کہکے پکارے نہیں جاتے ہم سے
سخت راہوں میں جو آگے نہیں جاتے ہم سے
جن کے دکھلانے سے محروم ہوا پختہ شعور
شعبدے ایسے دکھائے نہیں جاتے ہم سے
عقل کا دخل نہ ہو پانسے پہ ہو جن کا مدار
شاطر کھیل وہ کھیلے نہیں جاتے ہم سے
ساتھیو آؤ کہ غم بانٹ لیں اک دوسرے کا
بوجھ تنہا یہ اٹھائے نہیں جاتے ہم سے
ابن مریم سے علاج غم ہستی نہ ہوا
اتنے بیمار تو دیکھے نہیں جاتے ہم سے
زندگی بھر نہ ہوئی جن کی معیت محسوس
مر گئے وہ تو بھلائے نہیں جاتے ہم سے
تیری گفتار قلم شکن کے ہیں بھارت میں
تو زکوں کے تبصرے جھیلے نہیں جاتے ہم سے
پاگلوں سے کوئی بدلا نہیں لیتا وامق
سنگ بیماروں پہ پھینکے نہیں جاتے ہم سے

◆

پہلے بھی حیراں تھے ہم لیکن یہ حیرانی نہ تھی
آج آئینے میں صورت جانی پہچانی نہ تھی
کتنے سیلاب آئے لیکن ایسی طغیانی نہ تھی
زندگی سے ہاتھ دھونے کی یہ آسانی نہ تھی
پہلے بھی قحط و وبا سے بستیاں ویران تھیں
بڑھ گئی آبادی لیکن ایسی ویرانی نہ تھی
پہلے بھی زیر صلیب و تیغ سے ہوتے تھے قتل
قتل گاہوں کی مگر ایسی فراوانی نہ تھی
یوں بکھرتے رہنے سے بہتر تھا اک دن موت کا
خودکشی تھی ٹھیک اس کی کوئی نادانی نہ تھی
سنگباری کرتے کرتے تھک گیا پتھر کا ذہن
ہم تو دیوانے ہی تھے دنیا تو دیوانی نہ تھی
بوالہوس نے دشت کو ویراں کہا وامق مگر
ہم تھے تنہا پر وہاں گھر جیسی ویرانی نہ تھی

◆

دکھ درد کی مہمان سرائے پھر نہ ملے گی
اچھا ہی تو ہے در بدری پھر نہ ملے گی
زخموں پہ اگاتے رہے ہم گلشن تخلیق
جو ہوا ہے یہ گلبدنی پھر نہ ملے گی
وہ شہر ہے چوروں کا وہاں رکیو نہ بابا
کشکول ہے جو چیز گری پھر نہ ملے گی
فن کار اگر اپنی انا بیچ رہا ہے
رو کو اسے یہ کج کلہی پھر نہ ملے گی
گھر اہل قلم کے نہیں آتا وقت یہ
ورنہ تجھے وامق یہ گلی پھر نہ ملے گی

◆

مجبوروں پہ گرتا ہے طوفان عذاب الٹے
پھر کیوں نہ گرے سر پہ موج تہ آب الٹے
دل والوں پہ ہوتا ہے یہ کیسا عتاب الٹے
وہ مانگتے ہیں ہم سے شکووں کا حساب الٹے
پیروں کے تلے ان کے ہم آنکھیں بچھا دیں گے
گلگشت چمن پر وہ آئیں تو نقاب الٹے
الجھی ہوئی الفت کی یہ گتھی نہ سلجھے گی
وہ سیدھے سوالوں کے دیتے ہیں جواب الٹے
مینا بھی مقفل ہے ساقی بھی معطل
پیمانۂ رنداں میں اب کون شراب الٹے
میخانہ کی گرگٹ بھی تو بہنے لگی الٹی
کرتا ہے طلب ساقی رندوں سے شراب الٹے
ہے مقترۂ کیوں شہرہ ہے کہ ہم باور کا فتہ واحق
کس کو ہے دماغ اس کا اوراق کتاب الٹے

● لال کوٹھی، پوسٹ آفس کا جگادی ضلع جونپور (یوپی)



امراؤ طارق

اے-۱۴۰۔ بلاک ۱۳ ڈی، گلشن اقبال کراچی ۴۷ پاکستان

اکیلا آدمی

"میں ایک مدت سے اکیلا ہی اس لگژری فلیٹ میں رہتا ہوں"

"اور تمہاری بیوی اور بیٹی"

"بیوی اور بیٹی دونوں نے مجھے ڈس اون کر دیا ہے"

"ماریا اور سارا نے"

"دونوں نے"

اس نے ایک بہت لمبی سی سسکیوں سے ٹوٹ ٹوٹ جانے والی خودغرض انسان جیسی ٹھنڈی سانس لی جیب سے خوبصورت براؤن رنگ کا پائپ نکالا۔ ٹوبیکو بیگ کے لئے جیبیں ٹٹولیں پھر کرسی سے اٹھ کر رائٹنگ ٹیبل کے اوپر بکھرے ہوئے کاغذوں پر دھپ دھپ ہاتھ مار کر ٹوبیکو بیگ تلاش کرنے لگا۔

وہ ٹوبیکو بیگ لے کر واپس آیا۔ نوکر سینٹرل ٹیبل پر چائے رکھ کر اس کا منہ تکنے لگا۔

"تم جاؤ میں خود ہی بنا لوں گا"

نوکر چلا گیا تو پائپ میں ٹوبیکو ڈال کر انگوٹھے سے ٹھونستے ہوئے بولا۔

"یہ چوڑیوں کے کارخانے اور کالج کے کلاس روم کے تعلق کو یونیورسٹی کے پروفیسر نہیں سمجھ سکتے اور یہ فلسفہ کے جی کے لٹل اسکالرس کی دانش میں آ سکتا ہے۔ اس قدر مہمل بات اس سے پہلے کب اور کس نے سنی ہوگی یہ کوئی دعویٰ نہیں ہے جس کے لئے مخاطب کے سامنے شہادت کی انگلی نچا کر کوئی دلیل لائی جائے۔ ہمارے پاس گفتگو کے لئے جب کوئی موضوع نہیں ہوتا تو ہم اپنے ذہنی دیوالیے پن پر پردہ ڈالنے کے لئے کا سہارا لیتے ہیں۔ اور حسب معمول بحث چل نکلتی ہے۔ اور کافی کی پیالیوں پر پیالیاں اور سگرٹوں پر سگرٹیں پی جاتی ہیں۔ اور انٹیلیکچولز بغیر کسی نتیجے پر پہنچے گئی رات تک غزدگی میں بولتے بولتے اکتا کر اپنی خوابگاہوں کو چلے جاتے ہیں۔ اور بوٹ اتارے بغیر بستروں پر گر کر خراٹے لینے لگتے ہیں۔ اور ایک خوشگوار شام اپنے منطقی انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ کہاں چوڑیوں کا کارخانہ اور کہاں کالج۔ وہ لڑکا جو چوڑیوں کے کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اور شام کو کالج میں پڑھتا ہے۔ مزدور بھی ہے اور طالب علم بھی ہے۔ آپ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایس ایم جی کی نال سے نکلی ہوئی گولی اور چائنا رائفل کی نال سے نکلی ہوئی گولی میں انسانی گوشت کے لئے کوئی فرق نہیں ہے۔

"میں اگر خود نہ بتاؤں، تو کوئی نہیں جان سکتا کہ اسی لگژری فلیٹ میں رہنے والی میری بیٹی اور میرے درمیان جنریشن گیپ کو پاٹنے والا پل کب کا ٹوٹ چکا جو ہمیشہ چھاج میں تلی ہوئی جینی روٹی اور برگر کو کھانے کی ایک ہی میز پر لگا دیتا تھا۔ اور میز پر بیٹھی نئی نسل مجھے چھاج میں توڑی بیسنی روٹی پر سرخ مرچ اور نمک چٹکی بھر بھر کر ڈالتے اور پھر مزے سے کھاتے دیکھ کر منہ بڑے بڑے دیدے نکالتی۔ اور ایک دوسرے کو کہنیاں مارتی تھی۔ اور بڑی بیٹی سارہ کبھی بے مزہ نہ ہوتی۔"

"میں اگر اپنے ہونٹ سی لوں تو کسی کو کبھی علم نہ ہوگا کہ ماریا اور مجھے میں ڈھائی سال کے بعد جب دوبارہ ملے تو مجھے بتایا گیا کہ میری عدم موجودگی میں اس کا آپریشن ہوا تھا اور اس کی ناف کے نیچے اس آپریشن کا مندمل زخم ایک افقی براؤن لکیر میں بدل گیا ہے۔ اور وہ براؤن افقی لکیر اس کی ناف کے نیچے نصف پیٹ کے عرض پر پھیلی ہوئی ہے میں نے مندمل زخم کی وہ لکیر کبھی نہیں دیکھی۔"

"رات شرپسندوں نے ٹریفک پولس چوکی جلا دی۔" ہاکر اخبار بیچنے کے لئے سب سے نمایاں سرخی فروخت کر رہا تھا۔ لوگ اب گھر اور دفتر کے درمیان کے راستوں کی سیکیوریٹی پوزیشن معلوم کرنے کے لئے اخباروں کا بڑی احتیاط اور تفصیل سے مطالعہ کرتے ہیں۔

اس نے بڑی نفاست سے چائے کی پیالیوں میں کیتلی سے چائے

ڈالی لیکن اندر کے جوالا مکھی کی وجہ سے چائے کئی بار میز پر گر گئی اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ چائے میں شکر ملاتے ہوئے کانپتے ہاتھوں سے بجنے والی جلترنگ سب نے سنی۔

"بنگلہ دیش بننے سے پہلے بھی یہی کچھ ہوا تھا۔"

اس نے ماچس کی تیلی جلا کر شعلہ کو غور سے دیکھا اور پھر پائپ سلگانے لگا۔

"اس رات جب شہر پر پہلی بمباری ہوئی تھی تو میرے اعصاب جواب دے گئے تھے۔ میں بالکل ایک خوفزدہ چوہے کی طرح سمٹ کر کسی محفوظ بل میں گھس جانا چاہتا تھا۔ جہاں موت میرے تعاقب میں نہ پہنچ سکے۔ میں نے بھاگنے کے لیے سوتے سے اٹھ کر فرش پر پاؤں رکھے تو یوں لگا جیسے میرے پیروں میں جان نہ ہو۔ بموں کے دھماکے اور تیز روشنی، پھر تیز روشنی اور دھماکے۔ مجھے کوئی تمیز نہ تھی کہ ان دھماکوں میں دشمن کے جہازوں سے گرائے جانے والے بموں کے دھماکے کون سے ہیں۔ اور اینٹی ایئر کرافٹ گن کے دھماکے کون سے ہیں۔ میں اگلے لمحے اور دوسرے دھماکے سے جو میرے خیال سے میرے ہی وجود پر ہونے والا تھا۔ ڈر کر بھاگ رہا۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ اس طرح بھاگتے ہوئے خطرے کی طرف دوڑ رہا ہوں یا خطرے سے دور ہو رہا ہوں۔ شاید اگلا بم یا اگلا دھماکہ مجھے بم باری کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ میں نے فلموں میں بم باری کے بے شمار مناظر دیکھے تھے۔ لیکن فلموں میں ایک منظر دیکھنا اور بات ہے۔ اور اس منظر کا حصہ بن جانا دوسری بات ہے۔

آواز منہ میں دبے ہوئے پائپ کی وجہ سے یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی اپنی مرضی کے خلاف اور جبر کے تحت بول رہا ہو۔

"بھاگتے ہوئے مجھے ماریا یاد آئی سارا یاد آئی۔"

ایرن مور کا دھواں کمرے میں خوشبو کی بوجھ کی وجہ سے ہولے ہولے ڈولنے لگا۔

"ماریا اور سارا کو میں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے بھاگتے بھاگتے اعصاب پر شدید دباؤ کے باوجود سوچا تھا۔ وہ دونوں سوتی رہ گئی تھیں۔ لیکن پھر تو ان کی آنکھ بھی کھل گئی ہو گی۔ شاید وہ دونوں بھی میرے پیچھے پیچھے بھاگی ہوں گی۔ اور کہیں آس پاس چھپ گئی ہوں گی۔ اتنے دھماکوں اور ایسے خوف میں بھلا کوئی سو کیسے سکتا ہے۔ لیکن مجھے اپنی بیوی اور بیٹے کو ساتھ لے کر بھاگنا چاہئے تھا۔ بھلا کوئی اپنی بیوی اور بیٹی کو چھوڑ کر ایسے میں صرف اپنی سلامتی کے لئے کیوں کر بھاگ سکتا ہے۔ کوئی بھی گوشت پوست کا انسان اتنا خود غرض تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا اب تو میں بہت دور نکل آیا تھا۔ واپسی بھلا کہاں ممکن تھی ہو سکتا ہے کوئی بم اب تک آ گرا ہو اور وہاں اب ملبے کا ڈھیر ہو۔ اگر وہ دونوں مر چکی ہیں اور ملبے میں دب گئی ہیں تو — اور اگر وہ زندہ ہیں تو ساری زندگی میں ان سے نظریں کس طرح ملا سکوں گا۔ کوئی بھی ایکسپلینیشن میری بزدلی خوف اور خود غرضی پر پردہ نہ ڈال سکے گا۔

پچھتاوے اور زیاں کا احساس ہوا کے سرد جھونکے کی طرح دل کو مَس کرتا ہوا گزر گیا۔

"ماریا اور سارا اسی گھر میں تھیں جس سے میں بھاگ رہا تھا"

"اوپر سے جہاز گزرا اور دھماکے شروع ہو گئے۔ میں نہ جہاز دیکھ سکا اور نہ مجھے دھماکوں ہی کی تمیز ہو سکی۔ میں زمین پر اوندھے منہ گر کر خوفزدہ چوہے کی طرح بغیر گردن گھمائے یا حرکت کئے دیدوں کی حرکت سے آس پاس دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پسینے سے میری قمیص بھیگ گئی۔ سارا جسم پسینے کے فوارے چھوڑنے لگا۔ کپڑوں میں جس قدر صلاحیت تھی پسینے کو جذب کرتے رہے پھر میرے جسم کے نیچے کی زمین بھیگنے لگی۔

ایسا پسینہ پہلے تو مجھے کبھی نہیں آیا تھا۔ شاید میں خوف، شرمساری اور پچھتاوے سے پگھل رہا تھا۔ وہ پائپ کے کش پر کش لگانے لگا۔

"بنگلہ دیش بننے سے پہلے بھی اسی طرح ہوا تھا۔ وہ رات اور اس کے بعد کے تمام دن جب میں مکتی باہنی کے خوف سے اس تنل میں جانے کس طرح جا گھسا تھا۔ جہاں بہت سے فقیر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک گھر کی طرح رہتے تھے۔ ان میں بوڑھے جوان مرد عورتیں اور بچے سبھی تھے اور سب ایک کنبے کی طرح رہتے تھے۔ کھاتے تھے پیتے تھے اور عورتوں سے ٹھٹھے کرتے تھے۔ اور گالیاں بھیک مانگنے والے لہجے میں بکتے تھے پہلی رات جب انہوں نے مجھے کھانے کے لئے روٹی دینی چاہی تو مجھے ابکائی آ گئی کہ اس رات سے قبل میں ایک نارمل آدمی تھا اور میں کاننا نظریات اور فرد کے بارے میں ایک واضح تصور رکھتا تھا میری اپنی لائبریری تھی۔ جس میں کئی زبانوں کی کلاسیکس تھیں۔ اور فلسفہ میرا محبوب موضوع تھا۔ اور سادگی اور بہترین زبان کے باعث ول ڈورانٹ میرا پسندیدہ فلسفی تھا۔ اور ماریا میری پسند تھی۔ اور قابل اعتبار حد تک محبت کرنے والی لیکن آزاد خیال بیوی تھی۔ میں محبت کے بارے میں زیادہ خوش فہم تھا۔ چیزوں کو ان کی اپنی جگہ دیکھنا پسند کرتا تھا۔ بڑھے ہوئے ناخن، بے پالش جوتے صرف بیماروں اور شہدوں کے معاف کر سکتا تھا

ر جلد پر سفید داغ رکھنے والے برص کے مریضوں سے کھانے پینے
: اشیاء خریدنے سے گریز کرتا تھا۔ اور ایسے لوگوں سے مجبور آ ہاتھ
اکر ہاتھ صابن سے دھوئے بغیر کچھ نہ چھو سکتا تھا۔

"مگر تمہاری بیوی اور بیٹی کا کیا انجام ہوا"

"انجام ابھی کہاں میری بیوی اور بیٹی کو میرے آفس سکریٹری جوشی نے
تان جانے والے ایک وفد کے ساتھ خصوصی طیارے میں کراچی بھجوا دیا
۔ جہاں میرا ایک بہت بڑا لگژری فلیٹ تھا جس میں پانچ جہازی سائز
کمرے تھے۔ دو سرونٹ کوارٹر تھے۔ سپریٹ پارکنگ اسپیس تھی۔
ں کبھی کبھی میں ماریا کے ساتھ چھٹیوں میں جاتا تو وہ ہمیشہ شکایت کرتی
یسا فلیٹ بے کار خالی پڑا رہتا ہے۔ جوشی نے بتایا کہ ماریا اور سارا اسی
ٹ میں رہتی ہیں۔ اور دفتر والوں نے بینکوں سے سارا کیش کراچی منتقل
یا ہے۔ وہ دونوں آرام سے ہیں۔

" اور تم اس ٹنل میں"

"اور میں اس ٹنل میں ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہمیشہ سے تھا۔ وہ ٹنل تو در اصل
ے اندر تھا اور ہمیشہ سے تھا اس رات جب فقیر کے ہاتھ سے اسے
ں میں ملی ہوئی روٹی لینے سے میں نے انکار کیا تو مجھے علم نہ تھا کہ فقیر جو کچھ گڑگڑا
یک میں حاصل کرتے ہیں وہ دوسروں کو بڑے شاہانہ انداز سے عطا
تے ہیں۔ اور میں ان کے ٹکڑوں کے بغیر پل ہی نہ سکتا تھا۔ اور وہ حاکم
نہ تھے۔ اور اس سرنگ پر ان کا قبضہ تھا۔ وہاں دن رات ایک جیسی
ں اور ہر موسم میں ایک جیسی بو رہتی تھی۔ اور سارے شہر کی غلاظت
لے جانے والا سب سے بڑا نالہ اسی ٹنل سے گزر کر شہر سے باہر
تا۔ اور یہ سارے فقیر ان کے بوڑھے جوان اور بچے کوڑھ کے
میں مبتلا تھے تب مجھے علم ہوا کہ میں اپنے گھر سے بھاگ کر کتنی دور
یا تھا۔ تب دوسرے دن گوریا نے مجھے دوپہر میں دو روٹیاں
ن پر رکھا ہوا ملا جلا سالن دیا اور بتایا کہ باہر مکتی باہنی کا راج ہے۔ اور سر
ں پر اٹھائے جا رہے تھے۔ اور یہاں سے میرا باہر جانا ممکن نہیں ہے
نے اس کے ہاتھوں پر دھری روٹیاں اٹھالیں۔ گوریا ٹنل کے
کے باوجود بہت خوبصورت اور جوان تھی۔ اور جگہ جگہ سے بہتے ہوئے
ں سے اس کا بدن آباد دھاپ کر رہا تھا۔ لیکن اسے اس کا کوئی احساس
۔ میں نے روٹی کھالی پھر گوریا میری دوست بن گئی۔ اور آدھی رات
، گدڑی لے کر میرے بازو میں لیٹ گئی۔ کچھ دنوں کے بعد ٹنل کی بو جانے
غائب ہو گئی۔ اور بھیک کی روٹی کے لئے مجھے بھوک لگنے لگی۔ اور

گوریا صرف ایک شفیق عورت بن گئی۔ پھر ایک دن جوشی ٹارچ لئے اچانک
ٹنل میں آ گیا۔ میری فرم نے اسے میری تلاش پر مامور کیا تھا۔ وہ ناک پر
رومال رکھے ٹارچ کی روشنی میں ایک ایک چہرے کو دیکھتا مجھ تک پہنچ
گیا۔ میرے آس پاس بیٹھی عورتوں نے اپنی انگلیوں سے مردم ہتھیلیاں
اٹھا کر آنکھیں ٹارچ کی روشنی سے بچا کر اسے برا بھلا کہا۔ مگر وہ مجھے لے کر
ہی ٹنل سے باہر نکلا اور میرے گھر لے آیا۔ جو ماریا اور سارا کی عدم موجودگی
میں خالی خالی لگا۔

" ماریا" میں نے جوشی کی طرف دیکھا۔

"وہ دونوں پاکستان سولا گیا"

"کس طرح"

"اسپیشل پی مان۔ کورا سی اپنا با شا ئے۔"

"میں نے باتھ روم میں داخل ہونے سے پہلے قمیص اتاری تو جوشی
خوفزدہ ہو کر ٹھٹھک گیا۔ میرے جسم پر چاندی کے روپئے برابر سرخی مائل نشان
گوریا کے بوسوں کی طرح دہک رہے تھے۔"

"سر آپ کو بھکشوں والا بیماری تو لگ گیا۔"

سن سے ایک تیر میرے سینے میں پیوست ہو گیا۔

"وہ تو ہونے کو ماتھا۔ اب سوری کوڑھ سے تو کچھ ہونے کو سکے گا نہیں"

جوشی نے مجھے تیسرے دن کھٹمنڈو کا ٹکٹ، پاسپورٹ اور ڈالروں
سے بھرا ہوا ایک لفافہ دے کر ڈرائیور کے ذریعہ ایرپورٹ بھیج دیا۔ اس
نے مجھے مناسب فاصلے سے رخصت کیا۔ اور مجھ سے ہاتھ نہیں ملایا تھا۔
پر شاید اس نے سیٹ کور اور گاڑی دھلوائی ہو گی۔

"سر آپ کو بے شی مشکل۔ شالا بیماری تو لگ گیا۔ کیا کورسے گا۔" یہ
نے کار میں بیٹھنے کے بعد ایک قدم آگے بڑھ کر مجھ سے کہا تھا۔

جب میں نے کراچی ایرپورٹ سے اپنے لگژری فلیٹ پہنچا
اور کال بیل پر انگلی رکھی تو میرا دل اس طرح دھڑکا جیسے مکتی باہنی میرا پیچھا
کر رہی ہو۔ اور سامنے ٹنل کا دروازہ کھلنے والا ہو۔ فلیٹ کا دروازہ ماریا
نے کھولا اور ایک دم چیخ کر پلٹی اور اندر بھاگ گئی جیسے اس نے دروازے
پر سانپ دیکھ لیا ہو۔ میں بے جان پیروں پر اپنا بوجھ سہارے ماریا
کے پاس گیا۔

میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا ماریا۔ یہ کوئی لا علاج مرض تو نہیں ہے
اس وقت میں تم لوگوں سے الگ سرونٹ کوارٹر میں رہوں گا میں اسی
وقت سرونٹ کوارٹر میں چلا گیا۔ نہ ماریا بھی سرونٹ کوارٹر کی طرف

باقی صفحہ ۲۴۸ پر دیکھئے



کمار پاشی

تو ہی بتادے

میں ساگر سے پوچھوں گا
میں ندیا سے پوچھوں گا
میں دریا سے پوچھوں گا

میرے موتی کہاں گئے
میرا بچپن کہاں گیا
مری جوانی کہاں گئی

تو ہی بتادے اب آکر
دل میں جو میرے رکھی تھی
تری نشانی کہاں گئی

کوئی تنہا نہیں ہوتا

کوئی تنہا نہیں ہوتا
کوئی سورج کوئی تارا
سبھی کے ساتھ چلتا ہے

سفر میں ساتھ چلتا ہے
کوئی رستہ، کوئی سایہ
کوئی دریا، کوئی صحرا
کوئی تنہا نہیں ہوتا

کوئی شیشہ کوئی پتھر
کوئی جگنو، کوئی آنسو
سفر میں زندگی کے، ہر
قدم پر ساتھ چلتا ہے
سبھی کے ساتھ چلتا ہے

◆

اس کو کچھ تو ملتا ہے مجھ پہ ظلم ڈھانے سے
باز وہ نہ آئے گا میرا گھر جلانے سے

گا رہی ہیں دیواریں، رقص میں ہے آنگن بھی
کتنی رونقیں آئیں، تیرے لوٹ آنے سے

آکہ تیرے ماتھے پر اب اسے سجا دوں میں
چاند لے کے آیا ہوں رات کے خزانے سے

وہ بھی ان دنوں یارو اپنی چال میں گم ہے
ہم بھی کچھ نہیں کہتے آج کل زمانے سے

ہم نے اپنی آنکھوں میں خواب کچھ سجائے ہیں
اپنا بھی تعلق ہے زیست کے گھرانے سے

وہ ہے بے نظر پاشی اس کو کیا خبر پاشی
کتنے دل سلگتے ہیں اک دیا بجھانے سے

◆

اب کچھ ایسی کوشش ہو وہ آئے تو
کوئی جائے اور اسے سمجھائے تو

مرے لئے وہ ہر موسم لا سکتا ہے
لیکن اپنے جی کو بھی کچھ بھائے تو

معذوری ہے یا کوئی مجبوری ہے
جو بھی کچھ ہے آکر ہمیں بتائے تو

روشن ہو جائے گی یہ ساری دنیا
من کے آنگن میں وہ دیا جلائے تو

عقل و جنوں کی جنگ اب فیصلہ کن ہوگی
بہت دنوں میں دو پربت ٹکرائے تو

پاشی اسے سنبھلنا بھی آجائے گا
پہلے وہ اس راہ میں ٹھوکر کھائے تو

● اے ۳۴۷، دہلی گیٹ، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

ورینده پٹواری

پریم کنج، بوڑی تالاب تلّو، جموں۔ ۱۸۰۰۰۲



ان کہی

دادی ماں ہر وقت کچھ نہ کچھ بڑبڑاتی رہتی ہے۔ مگر ان کا یہ شکوہ یا شکایت بھی درست ہے کہ گھر کا کوئی فرد نہ تو کھل کر ان سے بات کرتا ہے اور نہ ہی کوئی ان کو یہ بتاتا ہے کہ اس کے اپنے ہی گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ کون کہاں گیا ہے۔ کون کب آیا ہے۔ اور کون کیا کر رہا ہے۔ بقول ان کے وہ بھی گھر کے پرانے فرنیچر کی طرح ایک بے معنی بے مطلب چیز بن کر رہ گئی ہے۔ قصور کس کا ہے یہ شاید وہ خود بھی نہیں جانتی ہے کیوں کہ کبھی بہو کبھی پوتا۔ کبھی اپنا ہی بیٹا یا پوتی یوں نظر آتے ہیں جیسے دروازے پر کھڑا بندوق لئے دشمن۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کی دادی ماں کی اہمیت نہیں ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ سارے گھر کے افراد ایک طرف اور دادی ماں دوسری طرف۔ گویا ٹگ آف وار TUG OF WAR میں دادی ماں سب کو گھسیٹ کے ادھر ادھر لیے جا رہی ہے۔ یا پھر شکست خوردہ افراد خود ہی رسی چھوڑ کر چوہوں کی طرح ادھر ادھر بھاگتے نظر آ رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب کبھی یہ ۷۵ سالہ بڑھیا کمرے سے باہر آتی ہے تو لگتا ہے کہ ہواؤں کا رخ ہی بدل گیا ہو۔ کسی نے کچھ کہا تو گھر میں زلزلہ آ جاتا ہے ہاں! میں ہی تو ایک شخص ہوں کہ جو دادی ماں کو دیکھ کر پریشان ہو تو جاتا ہوں۔ مگر حراساں نہیں۔ بات در اصل یہ ہے کہ میں ٹھہرا کرایہ دار جو صرف دادی ماں کی طرف داری کی وجہ ہی سے نکالا نہیں جا رہا ہوں ورنہ آج صبح ہی مالک مکان یعنی دادی ماں کے بیٹے نے گھر خالی کرنے کی تاکید کی ہے لیکن مجھے فکر کس بات کی ہے۔ دادی جو ہے۔! بچا لے گی مجھے۔!!!

ظاہر ہے کہ دادی ماں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے مجھے ان کی ہر بات سن لینی پڑتی ہے حالانکہ وہ باتیں سینکڑوں بار پہلے سن بھی لی ہوں تب بھی۔ کیا کروں کئی رات جب دادی ماں سے اجازت لے کے جانے لگتا ہوں تو وہ پھر روک کر کہتی ہے۔ لو جو بات مجھے کہنی تھی وہ بتائی ہی نہیں۔ آج میں نے جب صبح سویرے کمرے میں جا کر پوچھا کہ دادی ماں کہہ ہی ڈالیں نا وہ بات۔! تب عین اسی وقت مالک دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوا معمول کے مطابق مالک اشاروں میں بات کر کے مجھ سے پوچھتے رہے کہ کب پیچھا چھوڑو گے ہمارا اور دادی ماں ملتجی نگاہوں سے یہ بتاتی رہیں کہ جو کہنا تھا آج بھی نہیں کہہ سکی۔ اور اس کے بعد میں کمرے سے باہر آیا۔ ان کا بیٹا بھی باہر آیا اور پھر جونہی دادی ماں کمرے سے باہر آ گئی تو گویا جوالا مکھی نے سارے گھر کو ہلا دیا۔ مالک مالکن۔ پوتے اور پوتی کے علاوہ گھر میں کام کرنے والے نوکر چاکر پر لاوا گرتا رہا۔ کچھ دیر بعد جب دادی ماں اپنے کمرے میں چلی گئی تو میں نے ایک نوکر سے پوچھا کہ آج کیا ہوا جو دادی ماں ایک طوفانی دورے پر نکل پڑی تھی۔ بہر حال جواب کوئی نیا تو تھا نہیں۔ وہی پرانی گھسی پٹی باتیں۔ اور دادی ماں کی بات بات پر نکتہ چینی۔ الزامات۔ شکوے شکایتیں۔ وغیرہ۔ آفت گویا ٹل گئی اور سب لوگ مالک کے ارد گرد جمع ہو کر گویا واپسی ہوائی حملے کے بارے میں سوچنے لگے۔ مگر بے چارہ مالک معمول کی طرح سب کو سمجھاتا رہا۔ رہنے بھی دو۔ چراغ سحری ہے۔ لو بھڑک رہی ہے مگر ساتھ ساتھ ٹمٹما بھی تو رہی ہے۔

اپنی ماں کے بارے میں کوئی ایسا کہے تو نفرت ہونی ہی چاہئے۔ ایسے بیٹے پر مگر مجھے اس پچاس سالہ شخص پر رحم آ جاتا ہے۔ جس کو بھگوان نے عزت۔ شہرت۔ دولت دی ہے۔ حالانکہ شروع شروع میں میری سوچ کچھ اور تھی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب یہاں ٹرانسفر ہوئی تھی۔ مجھے کرایے پر مکان نہیں مل رہا تھا۔ ویسے ہی اتفاقاً دادی ماں سے ملاقات ہوئی۔ یوں تو میں اپنے ہی خیالوں میں کھویا رہتا تھا مگر پھر بھی دادی ماں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں اس نے مجھے اپنی زندگی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا یعنی اس کا باپ کسی کلب میں کام کرتا تھا۔ اس زمانے میں بھی وہ اپنے بچوں کے لئے کریم صابن۔ پاؤڈر لایا کرتا تھا۔ انگریزوں کی دی ہوئی چیزیں مثلاً شیشے کے گلاس وغیرہ لایا کرتا تھا۔ شادی ۱۳ سال کی عمر میں ہوئی تو شادی میں ۴۰ تولے سونا پانچ سو باراتی پیدل چل کر آئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ اور وہ

ملول مزے مزے سے یہ سنا رہی تھی جیسے کوئی طالب علم بتا رہا ہو کہ پورس کی فوج میں اتنے ہاتھی آئے تھے۔ اتنے گھوڑے۔ اتنے پیادے۔ اور پھر بات سے بات نکال کر یا جوڑ کر یہ بتایا تھا کہ اس کا بیٹا کنجوس مکھی چوس ہے۔ اور اپنے بیٹے کی بارات میں صرف ۵۰ باراتی لے رہا ہے۔ کٹوا رہا ہے نا ہماری ناک۔ باپ زندہ ہوتا تو شرم سے دم توڑ دیتا۔ اسے وہ تو خوش نصیب تھا۔ اس کی زندگی عدالت کے باہر لوگوں کی عرضیاں لکھتا رہتا تھا۔ لوگ ملنے آتے تھے تو میں بس دو دو کلو دودھ کی نمکین چائے بنایا کرتی تھی۔ اب میرے بیٹے کو دیکھو۔ جج ہے مگر کیا رہا ہے کچھ بھی تو نہیں۔ میرے پتی نے جب پہلی بار اپنی کمائی کے پیسے اپنی ماں کو دیئے تھے تب اس خوش نصیب عورت نے اپنے تمام رشتہ داروں کو ایک ایک چاندی کا روپیہ بھیجا تھا اور ڈھیر سارے شکر پارے الگ جو میری ماں نے بھیجے تھے۔ اب میرے پوتے کو تو دیکھو۔ دادا پر جاتا تو کتنی اچھی بات ہوتی۔ گیا ہے اپنے باپ پر۔ پتہ نہیں تین ہزار یا تین سو روپئے تنخواہ لیتا ہے۔ اور پوچھو اس سے کیا کبھی مجھے تین روپئے بھی دیئے اس نے۔ بس دکھاوا ہے۔ دادی ماں آم لایا ہوں۔ دادی ماں انگور لایا ہوں۔ دادی ماں شال لایا ہوں۔ دراصل قصور میری بہو کا ہے۔ نکمی ہے۔ دن بھر جانے کیا کرتی رہتی ہے۔ کام کاج تو نوکر چاکر کر لیتے ہیں۔ ارے جب میں جوان تھی تب روز بیس آدمیوں کا کھانا بنایا کرتی تھی۔ ڈھیر سارے برتن صاف کیا کرتی تھی پھر چرخہ چلایا کرتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اون تیار کر لیا کرتی تھی۔ خود تو بگڑ ہی گئی ہے پوتی۔ اب اپنی بیٹی کو بھی بگاڑ دیا ہے جبھی تو مریل سی لڑکی ہے۔ ہڈیاں نظر آ رہی ہیں۔ کام کاج کر لیتی تو صحت بھی اچھی رہتی۔ اس کو تو چائے بھی نہیں بنانی آتی۔ دن میں دس بار چائے پی لیتی ہے۔ پڑا یا دھن ہے۔ سسرال جائے گی تو کیا کرے گی وہاں۔ ستار بجائے گی۔ یا پھر وہ۔ آ۔ آ۔ آ گانا گائے گی۔ لو دیکھو مردوں کی طرح سائیکل چلاتی ہے۔ کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو۔ بہو اور پوتی نے مردوں کی طرح بال رکھے ہیں۔ اور میرے پوتے کو تو دیکھو لڑکیوں کی طرح بال اگائے ہیں۔ دیکھو لگ رہا ہے۔ اس روز میں نے دادی ماں کی تمام باتیں خاموشی سے سن لی تھیں۔ بس یہی پسند آیا تھا کہ ان کو خود ہی اپنے بیٹے سے پوچھے بغیر ساتھ والا کمرہ دے دیا تھا۔ تب سے اب تک بس یہی باتیں روز سنتا رہتا ہوں۔ اور گھر کے لوگوں کی بے بسی کا منظر دیکھتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی دادی ماں کی حرکتوں پر غصہ بھی آ جاتا ہے مگر مصلحتاً خاموش رہتا ہوں۔ مکان خالی کرنا پڑا تو؟ ورنہ ایک ذی ہوش انسان کی طرح مجھے دادی ماں کی ہاں میں ہاں ملانے کی بجائے ان سے یہ کہہ دینا چاہیئے کہ یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔

کچھ دن پہلے جج صاحب کا چپراسی کچھ کاغذات لینے گھر آیا تو ملاقات دادی ماں سے ہوئی۔ اپنی شادی سے لے کر پتی کی موت تک کی تمام کہانی قصے سنانے کے علاوہ اس بے چارے کو زبردستی کھانا کھلایا۔ اور نمکین چائے پی کر ہی دفتر جانے کی ہدایت کی۔ مالکن بیچاری بیچ تماشائی کی طرح کھڑی رہی کرتی بھی کیا۔

کل ہی کی بات ہے جج صاحب باغ میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ تو دادی ماں تیل کی شیشی لے کر ان کے گنجے سر پر تیل لگانے لگی۔ وہ بھی اتنا کہ تیل ملتے بہتا ہوا آنکھوں پر رکتا رہا۔ جج صاحب کچھ کہتے بھی مگر میری موجودگی میں دادی شیرنی بن جاتی ہے۔ اور غیر کے سامنے دادی ماں کو ٹوکے یا روکے بھی تو کیا لوگ بیٹے ہی کو قصوروار سمجھیں گے نا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دادی سب مجھے اپنا سا سمجھتی ہے اور جب بھی کسی مہم پر نکلتی ہے۔ تو مجھے ساتھ ساتھ رکھ کر۔ غالباً یہی ہے کہ جج صاحب اور اس کے گھر والے مجھ سے خائف رہتے ہیں۔ اور میری کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر میں بھی تنگ آ چکا ہوں۔ اپنی دیکھوں یا گھر والوں کی بے بسی۔ خیر میں نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ یہی بات جج صاحب کو بتلانے گیا تھا۔ مگر وہ سب لوگ مایوس تھے سب کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ اور وہ کہیں جانے کی تیاریاں کرنے میں مصروف جب کہ دادی ماں ایک جاسوس کی طرح یہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی کہ گھر کیا ہو رہا ہے۔ کبھی بیٹے سے پوچھ لیتی کبھی بہو سے۔ کبھی پوتے اور کبھی پوتی۔ کسی نے کچھ بتایا نہیں تو ہم شروع ہو گئی۔ آندھی طوفان کی مانند دادی ماں کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک کمزور سی عورت تیزی سے ڈرائنگ روم میں شاپ بک کر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس بار حملہ پوتی پر کچھ زیادہ رہا تھا وہ بھی اس حد تک کہ باتوں سے نفرت کی بو آنے لگی تھی۔ میں کمرے داخل ہوا۔ تو چیخ چیخ کر کہنے لگی۔ دیکھو ان لوگوں کو۔ کہاں جا رہے ہیں سب اکیلا چھوڑ کر۔ گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے۔ میرا۔ بیٹا ہی احمق ہے تو کیا کرے سمجھتا نہیں کہ بیوی کو سیر سپاٹے اچھے لگتے ہیں۔ گھر میں رہنا اچھا نہیں لگتا کا کھانا اچھا لگتا ہے۔ ان کو چھوڑو۔ دیکھو تو اس لڑکی کو۔ اپنی دادی کی پرواہ نہیں اسے۔

اور پھر یہ دیکھ کر کسی نے اپنا فیصلہ بدلا نہیں تو دادی ماں اس وقت کمرے سے باہر آئیں۔ جس وقت جج صاحب، اس کی بیوی اور بیٹی کار میں تھے۔ اور دادی ماں کا پوتا کار اسٹارٹ کرنے لگا تھا۔ جج صاحب نے بتایا کہ جا رہے ہیں۔ تب دادی ماں کار کے سامنے کھڑی ہو کر کہنے لگی۔ جہاں بھی جا رہے چلے جاؤ۔ مگر واپسی پر میرے لئے سنگ مرمر کی دو مورتیاں لانا۔ ایک شیو

باقی صفحہ ۱۱۱ پر دیکھئے

مظہر علی شاہ شاؔد سیمابی وارثی

مجھے بھی اپنے عالم گیر جلووں میں نہاں کرلے
مزاجِ جوہرِ آئینہ ہوں میں، امتحاں کرلے [سیماب]

نفس کی آمد و شد جو بہار بے خزاں کرلے
وہی اجڑی ہوئی ہستی کو اپنی گلستاں کرلے

نہ سو آرام سے قدر بہارِ گلستاں کرلے
یہ موقع خوب ہے فکر بنائے آشیاں کرلے

تو اپنے چند سانسوں کے قفس کو آشیاں کرلے
خلوص عشق سے پھر دو جہاں کو گلستاں کرلے

تو اپنی سجدہ گہ دیر و حرم کے درمیاں کرلے
اچھوتا ہے اگر پیدا اچھوتا آستاں کرلے

طریقِ بندگی اپنا زمانے سے نہاں کرلے
لحد میں ذکر ہو فکر اور زمیں کو آسماں کرلے

تصوّر میں قفس کی تیلیوں کو آشیاں کرلے
پھر اس کو اور وسعت دیتے دیتے گلستاں کرلے

بنالے آسماں قافیہ کو جو زمینِ فن سے
وہ شاعر ہے زمینِ شعر کو جو آسماں کرلے

برابر ہوں جسے دیر و حرم درگاہ میخانہ
تمہیں انصاف سے کہدو کہ وہ سجدہ کہاں کرلے

خدا کی ذات پر جس کو بھروسہ ہی نہیں بالکل
وہ اپنے باغِ ہستی کا نیا اور باغباں کرلے

تو کیوں گھبرا رہا ہے ساتھیوں کی رہنمائی سے
ملے جو نقشِ پا، تو اس کو میرِ کارواں کرلے

اُسے دیر و حرم گرجا و گردوارہ سے کیا مطلب
جو دیوانہ ہے وہ سجدہ جہاں چاہے وہاں کرلے

حرم اور دیر والے جس کو دیوانہ سمجھتے ہیں
وہ سجدہ گاہ خود اپنا ہی سنگِ آستاں کرلے

خدا کا تو ہے نافرماں، ہٹ اس کی خدائی سے
نکل جا، اور نئے پیدا زمین و آسماں کرلے

تری تسکینِ خاطر کی نہیں ہے اور کوئی صورت
خدا کے ذکر سے حاصل سکونِ جاوداں کرلے

گذرگاہِ محبت، عشق منزل، سخت مشکل ہے
وہاں کے قصد سے پہلے خود اپنا امتحاں کرلے

خدا سے کیا تعلق ہے ترا اے نفس کے بندے
تمنّاؤں کے گلشن کا اسی کو باغباں کرلے

مشیرِ کار، میرِ کارواں ہونا ضروری ہے
کسی کو رہنما کرلے کسی کو رازداں کرلے

نہ جانے کتنے دیوانوں کا دیوانہ مصنّف ہے
وہ چاہے چار حرفِ آرزو کی داستاں کرلے

تو کیوں دیر و حرم کی الجھنوں میں شاؔد الجھا ہے
تجھے سجدے سے مطلب ہے جہاں چاہے وہاں کرلے

بتانِ دہر کے دیدار کی تجھ کو اجازت ہے
مگر اے شاؔد پہلے جذبۂ ایماں جواں کرلے

ستائش کا اس شاعر کو اک تمغہ عنایت ہو
زمینِ شعر کو اے شاؔد جو بھی آسماں کرلے

● شاد محل، کرّہ شہاب خاں محلہ، اٹاوہ ۔ ۲۰۶۰۰۱ (یوپی)

سعید انجم
NEBBEJORDET - 15, L-65, OSLO-12 (NORWAY)

نارویجن پہاڑ پر چڑھائی

ایک دن ایک ٹورسٹ اوسلو کے کارل یوہان گاتا (مرکزی سڑک) پر واقع کریڈٹ کاسن بنک کی ملٹی اسٹوری بلڈنگ میں داخل ہوا اس کے پاس ۱۵ ڈالر تھے جن کو اس نے کراؤن میں بدل لیا۔ نارویجن کرنسی نوٹوں پر دو تصاویر نمایاں تھیں۔ سو کے نوٹ پر کومیلا کولٹ کی اور ہزار کے نوٹ پر ہنرک البسن کی۔ ٹورسٹ نے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں؟"

"نارویجن ادیب!" کالے بالوں والے لوکل گائیڈ نے جواب دیا۔

"اس ملک کے فنانس کنٹرولر بہت ادیب نواز ہیں!" ٹورسٹ نے تبصرہ کیا۔

"معلوم تو یہی ہوتا ہے۔" تارکِ وطن گائیڈ بولا۔

"ہو سکتا ہے کبھی کسی نارویجن نوٹ پر ایک تارکِ وطن ادیب کی تصویر ہو"

ٹورسٹ نے کہا شاید وہ اپنے گائیڈ کو خوش کرنا چاہتا تھا۔

"ناممکن!" گائیڈ یقینی لہجے میں بولا۔ "ایسا وقت آنے سے پہلے کرنسی نوٹ غائب ہو جائیں گے۔ اور مارکیٹ میں صرف کریڈٹ کارڈ رہ جائیں گے۔

گائیڈ کی ناامیدی کی ممکن وجہ دو میں سے ایک ہو سکتی ہے۔

(۱) تارکِ وطن ادیبوں کی تحریریں اچھی نہیں۔ یا

(۲) نارویجن رویوں نے اسے بدگمان کر رکھا تھا

اس سے پہلے کہ میں تارکِ وطن ادیبوں کی تحریروں پر تبصرہ کروں یا نارویجن رویوں کا تجزیہ، میں چاہتا ہوں کہ پہلے آج کے جلسے کے منتظمین کا شکریہ ادا کروں۔ نوشنک فورفاترسینٹرم (ناروے میں ادیبوں کا مرکز) نے ناروے میں رہائش پذیر ان ادیبوں کو جو نارویجن زبان کی بجائے کسی دوسری زبان میں لکھتے ہیں، کو نارویجن زبان کے ادیبوں کے ساتھ مل بیٹھنے، گفتگو کرنے اور ایک دوسرے کی تخلیقات سننے سنانے کا موقع فراہم کر کے ایک اچھا قدم اٹھایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع آخری ثابت نہیں ہوگا۔ اور نوشنک فورفاترسینٹرم آئندہ بھی ایسے اجتماعات کا اہتمام کرتا رہے گا۔

۱۹۷۵ء میں نارویجن حکومت نے تارکینِ وطن کے ناروے میں داخلے پر پابندی یہ کہتے ہوئے لگائی تھی کہ اس وقت تک ناروے میں آ چکے تارکینِ وطن کیلئے نارویجنوں کے مساوی حقوق و فرائض کے انتظامات کئے جائیں گے۔ ہم تارکِ وطن ادیبوں کے لئے اس مساوات کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے کام کو نارویجن ادیبوں کے کام کی طرح پڑھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے دی جائے گی ۱۹۸۵ء تک کسی تارکِ وطن ادیب کی کوئی کتاب نارویجن زبان میں شائع نہیں ہو سکی تھی۔ حالانکہ کئی مصنفین اپنی کتابوں کے مسودے مختلف اشاعتی اداروں کو دکھا چکے تھے۔ سب مسودوں میں ایک ہی خامی تھی۔ وہ نارویجن زبان میں نہیں لکھے گئے تھے۔

نوشنک فورفاترسینٹرم نے ۱۹۸۵ء میں یومِ کتاب کے موقع پر تارکِ وطن ادیبوں کو اپنی تحریریں پیش کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ اس طرح ادیبوں کے مرکز نے اس نارویجن ادب کا تعارف کرایا تھا۔ جو نارویجن زبان کی بجائے دنیا کی دوسری زبانوں میں لکھا جا رہا ہے۔ حالانکہ سالانہ یومِ کتاب کی روایت یہ ہے کہ نارویجن ادیب اپنی ان کتابوں میں سے کچھ پڑھ کے سناتے ہیں۔ جو اسی سال شائع ہوئی ہوں۔

اس کے بعد دو کتابیں شائع ہوگئیں خالد حسین کی "سرپا کیر" اور "نوجوان ۸۷ء یا ینگ اینس سوشائسی UNG-87" دونوں مسودے نارویجن زبان کے۔ آخر الذکر ایک انتھالوجی ہے جسے اینٹی راسسٹ سینٹر نے ترتیب دیا ہے۔ جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کتاب میں شامل لکھنے والے نوجوان قلم کار ہیں۔ خالد حسین کی کتاب جب شائع ہوئی تو مصنف کی عمر سولہ سال تھی۔

ایک دفعہ مجھے ایک بوڑھے نارویجن جہازی نے بتایا کہ کھلے سمندر میں ڈوبتے جہاز میں سب سے پہلے بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو نکالا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نارو ے میں رہائش پذیر تارکِ وطن ادیبوں کے گروہ کو ایک ڈوبتا جہاز تصور کر لیا گیا ہے۔ تبھی تو بچوں کو حفاظتی کشتیوں میں بٹھا کر محفوظ جزیروں کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے تاکہ باقی لوگ کھلے سمندر میں ایس او ایس (SOS) کے جھنڈوں کے ساتھ مساوی حقوق و فرائض کے چپّو چلاتے رہیں۔

تارکینِ وطن کی ناروے میں آمد کے سترہ برس کے بعد ۱۹۸۷ء میں پہلی مرتبہ ایک اشاعتی ادارے CAPELEN نے نارویجن ثقافتی بورڈ کے مالی تعاون کے ساتھ ایک ایسے مسودے کو شائع کیا۔ جو ادارے کو ایک غیر نارویجن زبان میں بھیجا گیا تھا۔ ایک اونٹ سے بہتر۔ از کیر ولین سوتھلاند) چالیس لاکھ کی آبادی کے ایک چھوٹے سے ملک میں قارئین کی تعداد کم ہے اور اشاعتی اداروں کے لئے مشکلات۔ یہی وجہ ہے کہ نارویجن حکومت نارویجن ادیبوں اور نارویجن اشاعتی اداروں کی دو طریقوں سے مدد کرتی ہے۔ ثقافتی بورڈ کی طرف سے مالی تعاون اور لائبریریوں کے لئے کتابوں کی خرید۔ ان اقدامات کے بغیر ممکن ہے اشاعتی اداروں کا وجود ہی نہ ہوتا اگر ابھی اپنی زبانوں میں لکھنے والے تارکِ وطن مصنفین اشاعتی اداروں کی مشکلات کو سمجھتے ہیں۔ جب ہمارے مسودوں کے لئے نارویجن ثقافتی بورڈ کا مالی تعاون اور لائبریریوں کے لئے کتابوں کی خرید کے مواقع موجود نہیں ہیں تو کیا ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ ثقافتی بورڈ نارویجن پبلک لائبریری کو اور نارویجن قارئین کو جدید ادب مہیا کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ جو ان کے اپنے ملک میں دوسری زبانوں میں لکھا جا رہا ہے؟ کیا اس بات کا یہ مطلب ہے کہ ثقافتی بورڈ کو ناروے کے لئے ایک آفاقی ادب کی ضرورت نہیں ہے؟۔

اس وقت مجھے ایک پنجابی لوک گیت یاد آ رہا ہے۔ جس کا آغاز یوں ہوتا ہے، واسطہ ای رب دا توں جائیں وے کبوترا۔ اس گیت میں کبوتر رابطے کا واحد وسیلہ رہ گیا ہے جس کو درخواست کی جا رہی ہے کہ وہ جدائی کے درد کو پیغامات کی ترسیل سے سہلا دے۔ ادب لکھا ہی اس لئے جاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان واقعات، خیالات اور انسانوں کے متعلق جانیں جو ادیب کو متاثر کرتے ہیں۔ اب اگر تارکِ وطن ادیب یہ چاہتے ہیں کہ ان کے جذبات کی ترسیل ان کے نارویجن ہمسایوں، ساتھ کام کرنے والوں، دوستوں، جاننے والوں اور نہ جاننے والوں تک ہو سکے۔ تو ان کو چاہئے کہ وہ نارویجن کبوتروں کو اپنی مدد کے لئے بلائیں۔ جو اپنے پروں کی طاقت سے ان دیواروں سے بلند ہو جائیں جو نارویجن ثقافتی بورڈ نے تارکِ وطن ادیبوں اور نارویجن قاری کے درمیان کھڑی کر رکھی ہے۔ اگر واقعات، تجربات، مشاہدات کے بارے میں بتایا نہ جائے تو وہ اپنی اقدار کھونے لگتے ہیں۔

تخلیقی تصورات کا ایک انسان سے دوسرے انسان کی طرف منتقل ہونا ایک دور رس اور معنی خیز عمل ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے ہی کا نتیجہ ہے کہ تارکِ وطن ادیب نارویجن تخلیق کاروں کی تحریریں اپنی اپنی زبانوں میں منتقل کرتے رہے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں ہنرک ایبسن کے ڈرامے، کنوت ہامسن اور یوہان بورگن کے افسانے، ہالدِس موں ویساس اور گنر رائس اندرسن کی شاعری کے ساتھ ساتھ یورگ وک، تھوروے نیلسن، تھورسے طوانت اور تھور مور ہائم کی تحریریں، مسعود منور، ہرچرن چاؤلہ، انیس احمد اور سعید انجم نے اردو زبان میں منتقل کی ہیں۔ نئی نارویجن (نارویجن زبان کا ایک دوسرا روپ) جاننے والے شہریار سوس اور شارٹن فلو ستاد کے ترجمے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ یہ اس کار کردگی کا ذکر ہے جو میرے علم میں ہے۔ اس کا مکمل ذکر کرنا مشکل ہے۔

دراصل اب انسان نے اپنے تجربے سے یہ دریافت کر لیا ہے کہ ساری زبانیں اور ساری ثقافتیں قابلِ احترام ہیں۔ ہر زبان اور ثقافت کو ہر قسم کے تعصبات اور امتیازات سے آزاد بڑھنے اور ترقی کرنے کا یکساں حق حاصل ہے۔ اب دنیا میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جو ادب کو ناقابلِ تقسیم سمجھتے ہوئے ہر زبان کے علمی اور ادبی سرمائے کو عالمی ادب کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے صرف وہ تارکینِ وطن ہی اہم کام نہیں کر رہے جو نارویجن ادب کے ترجمے میں مصروف ہیں۔ بلکہ ان ماہرین کی کوششیں بھی قابلِ ستائش ہیں جو مشرق کی قدیم تہذیبوں کے کھنڈرات میں گھوم پھر کر چٹانوں پر کھدی ان تحریروں کو پڑھنے کی کوشش میں مصروف ہیں جو پچھلی صدیوں کے مصنفین کے خیالات کا پتہ دیتی ہیں۔ تب انسانیت کا بچپن تھا۔

میں اگر اپنے بچپن پر نظر ڈالوں تو مجھے خود پر پہلا اثر مقامی ثقافت کا نظر آتا ہے۔ پنجابی زبان۔ دیہاتی ماحول اور فطرت کی قربت اس کے بعد

تحریر تھا قومی زبان کا۔ اردو ادب۔ شاعری افسانہ۔ تیسری ایک دریافت تھی عالمی ادب۔ اس دریافت کا ایک تاریک پہلو بھی تھا۔ پاکستان کا خطہ چونکہ انگریز کی کالونی رہا تھا۔ اس لئے ہم طالب علم انگریزی کا ادب ہی کو عالمی ادب سمجھتے تھے۔ ناروے پہنچ کر معلوم ہوا صرف انگریز خواتین ہی قلمی نام سے نہیں لکھتی رہیں کورا سانڈل بھی قلمی نام ہی تھا۔ صرف جین آسٹن ہی نے بین الاقوامی ادب تخلیق نہیں کیا بلکہ امالیہ سکرام بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہوں یہ ضروری ہے کہ میں وضاحت کر دوں کہ اِس وقت میں صرف اپنے لئے، پاکستان کے لئے یا اردو پنجابی لکھنے والے ادیبوں کے لئے بات نہیں کر رہا بلکہ ناروے میں رہائش پذیر تمام اقوام اور زبانوں کے حوالے سے بات کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ حوالے جو میں استعمال کر رہا ہوں ممکن ہے میرا، میری زبان کا اور میرے ملک کا تاثر دیں۔ لیکن میری حدود صرف ان زبانوں کے ادب تک ہیں جو میں جانتا ہوں۔

جب میں نے دریافت کر لیا کہ نارویجن ادب عالمی ادب کا بھی حصہ ہے تو میرے ذہن میں سوال پیدا ہوا: عالمی ادب میں اردو کہاں ہے؟ کیا پنجابی آدب بھی بین الاقوامی ادب کا حصہ ہے؟ غالب، اقبال اور فیض کی شاعری۔ پریم چند، منٹو، کرشن چندر کے افسانے، بلھے اور وارث شاہ کا کلام عالمی ادب میں شامل نہیں؟ اگر یہ ہے۔ اور یقیناً یہ ہے۔ میں نے ان تمام ادیبوں کے بارے میں ادب کی لاراؤسے ڈکشنری میں مضامین دیکھے ہیں۔ تو یہ نام ڈائکمانسکے (ناروے کی مرکزی لائبریری) کے نارویجن کیٹلاگ میں کیوں موجود نہیں ہیں؟

آج کی نشست کے شرکا کو یہ یاد کرانے کی تو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ نوبل انعام یافتہ امریکن ادیب آئزک سنگر پولینڈ میں پیدا ہوا۔ نیویارک میں رہتا ہے۔ اور مخلوط عبرانی زبان میں لکھتا ہے۔ جیمز جوائس اور بیکٹ، گراہم گرین کی طرح فرانس میں رہے۔ ایک اور نوبل انعام یافتہ گبرائیل گارسیا مارکیز کولمبیا میں پیدا ہوا اور میکسیکو میں رہتا ہے۔ میں اس فہرست کو آپ ہی کی طرح جاری بھی رکھ سکتا ہوں۔ نارویجن ثقافتی بورڈ شاید اس یاد دہانی سے خوش نہ ہو کہ ڈیکارٹس نے اپنی زندگی کے آخری سال ملکہ کی دعوت پر سویڈن میں گذارے۔

میں نے اپنی بات ایک امیگرنٹ گائیڈ سے شروع کی تھی جو ناروے میں رہائش پذیر تھا اور تارک وطن ادیبوں کے مستقبل سے مایوس تھا۔ اس کی مایوسی کی ممکن وجہ دو میں سے ایک ہو سکتی ہے۔

تارک وطن ادیبوں کی تحریریں اچھی نہیں۔ یا نارویجن رویّوں نے اسے بدگمان کر رکھا تھا۔

جہاں تک تارکِ وطن ادیبوں کی تحریروں سے مایوسی کا تعلق ہے تو یہ تبھی ممکن ہے جب وہ پڑھی جائیں گی اور یہ پڑھی تب جائیں گی جب ان کا ترجمہ نارویجن زبان میں ہو گا۔

اگر نارویجن ثقافتی بورڈ تارک وطن مصنفین کے غیر نارویجن زبان میں لکھے گئے مسودوں کے ساتھ نارویجن ادیبوں کے لکھے ہوئے مسودوں کے مساوی سلوک نہیں کرے گا تو اشاعتی اداروں کو کیسے پتہ چلے گا کہ کونسا تارک وطن ادیب سو کراؤن کے نوٹ کی اہمیت کا ہے اور کون سا ہزار کراؤن کے نوٹ کی اہمیت کا۔ اسی لئے کسی ٹورسٹ گائیڈ کے لئے ممکن ہی نہیں کہ وہ فی الحال تارکِ وطن ادیبوں کی تحریروں سے مایوس ہو۔

باقی رہے نارویجن رویّے تو ان کے بارے میں تارکینِ وطن کا تجربہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا ناروے کو تیل کا۔ تیل کی پیداوار اور قیمت کا تعین اوپیک کا کام ہے۔ نارویجن رویّوں کا اتار چڑھاؤ عوامی رائے کے جائزے بتاتے ہیں۔ تارکینِ وطن کے تجربے تارکِ وطن ادیب بتا سکتے ہیں اور وہ فی الحال بند گلیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ مساوی حقوق کو فرائض کے نقشوں پر دکھائی گئیں تمام سڑکیں تارکِ وطن ادیبوں کے لئے عملی طور پر بند ہیں۔ لیکن اس صورت حال سے گھبرا کر ہم نے لکھنا بند نہیں کیا۔ ہم لکھ رہے ہیں چونکہ ہمیں معلوم ہے کہ زندہ رہنے والی تحریریں تباہ شدہ جہاز کے تختوں پر بہہ کر یا کبوتروں کے پروں میں چھپ کر اپنی اپنی منزل تک پہنچتی رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ نارویجن پہاڑوں پہ لکھی گئی غیر نارویجن زبانوں کی وہ تحریریں جن میں زندہ رہنے کی قوت ہو گی ایک نہ ایک دن اپنے قارئین تک پہنچ جائیں گی۔ ✸

۱۹۹۱ء کی مردم شماری میں اپنی مادری زبان اُردو لکھوائیں



محمد مشتاق شارق

ـہ ہوس کار تو کچھ غازیٔ گفتار بنے
ـس ایماں تھا جنھیں صاحب کردار بنے

ـرنسیاں میں تھے پوشیدہ ہزاروں موتی
ـن میں تھی آب خودی وہ در شہوار بنے

ـنِ تعمیر تو دیکھا نہیں دیکھا ہم نے
ـس کے ہاتھوں سے ہمارے در و دیوار بنے

ـہوں نہ اِس عظمت کردار پہ ہو ناز ہمیں
ـم سے دل والوں کی خاطر رسن و دار بنے

ـں کی افسردگیٔ رنگ بھی ہے ایک سوال
ـہوں کوئی ہاتھ لگانے کا گنہگار بنے

ـر ہے آج کی تنظیم سیاست شارق!!
ـر میں رہتے ہوئے ہم بے در و دیوار بنے

● ۵۶ - کوٹلہ، میرٹھ (یوپی)



زاھد کمال

زخم کا جو مرہم ہوتے ہیں
لوگ ایسے اب کم ہوتے ہیں

سورج ڈوب کے پھر ابھرے گا
کیوں اتنے ماتم ہوتے ہیں

کمسن لفظوں کے سینوں میں
گہرے مطلب کم ہوتے ہیں

لمحہ لمحہ عمر خوشی کی
صدیاں صدیاں غم ہوتے ہیں

پہلے آپ سمندر بنیے
دریا خود ہی ضم ہوتے ہیں

● ۰۷، گدروادا چیمبر، احمدیہ اپارٹمنٹ، پونا-۲



ساحر شیوی

جو ترے پہلو میں گذری زندگی اچھی لگی
غم ترا اچھا لگا تیری خوشی اچھی لگی

یاس کے موسم میں اس کی دل لگی اچھی لگی
آنکھ نم ہو کر بھی ہونٹوں پہ ہنسی اچھی لگی

دکھ بھی اس کی راہ میں ہیں سکھ بھی اس کی راہ میں
موت سے ہر آدمی کو زندگی اچھی لگی

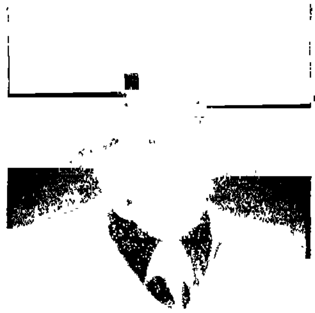
حادثے پر حادثے ہی ہو رہے ہیں، کیا خبر
آسماں والے کو میری بے بسی اچھی لگی

ہو گئے گمراہ وہ آکر تمھارے شہر میں
سب کو اب تہذیبِ نو کی روشنی اچھی لگی

خواب کی وادی میں تنہا پھر رہا ہوں روز و شب
دوستی اچھی نہ مجھ کو رہبری اچھی لگی

جاگتی آنکھوں سے ساحرؔ دیکھتا ہوں دہر کو
گلستاں میں کھلنے والی ہر کلی اچھی لگی

● پوسٹ بکس نمبر ۵۱۱۰۰، نیروبی (کینیا)



رضا احمد ادیب

٦- این، ون ٹائپ، آؤٹر سرکل روڈ، جمشیدپور- ٥

جنگل کتھا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب یہاں میں نیا نیا ٹرانسفر ہوکر آیا تھا مجھے حکام سے حکم ہوا تھا کہ اس جنگل سے لکڑیاں کافی مقدار میں چوری ہو رہی ہیں اور اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو یہ جنگل ایک چٹیل میدان ... مجھے ہدایت ملی تھی کہ میں تحقیق کروں کہ اس چوری میں کون لوگ ملوث ہیں۔ میں نے چارج لیتے ہی اپنے عملے کے ساتھ جنگل کا معائنہ کیا۔ معائنے کے دوران میں نے جنگل کے بیچوں بیچ ایک عجیب وغریب چیز دیکھی۔

ایک بہت بڑا اور ہیبت ناک "الاؤ" روشن تھا۔ جس کے شعلے آسمان کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے آتے ہی تحقیقات شروع کردی۔ عملے کے دوسرے افراد سے معلوم ہوا کہ لکڑیوں کے لئے چور باہر سے نہیں آتے ہیں۔ یہ چوری راجہ کے مخصوص مشیرکار کرتے ہیں۔ اور یہ جو ایک مہان الاؤ روشن ہے اسے راجہ نے تخت نشیں ہونے کے بعد اپنے مخالفین کے لئے روشن کیا ہے۔

آپ سے پہلے بھی کئی افسر آچکے ہیں۔ انہوں نے چور کی نشان دہی کی تو ان کا تبادلہ ہوگیا یا پھر الاؤ کے ایندھن......

ان لوگوں نے مزید مجھ سے کہا۔

اپنی زندگی پیاری ہے تو خواہ مخواہ اس معاملے میں......

ایسا نہ ہوکہ آپ کو اس کی بھاری قیمت...

میں نے ان لوگوں سے کہا۔

انجام کی فکر نہ کرو۔ مجھے الاؤ کے قریب جانے کا انتظام کرو۔ تم لوگ پروگرام بناؤ۔ ہم لوگ رات کو چھپ کر دیکھیں گے۔

یہ تو اور بھی خطرناک ہے ایک نے کہا۔

"کیسا خطرہ؟"

اکثر رات میں راجہ راج دربار لگاتا ہے۔ اور فریادیوں کی فریاد سنتا ہے۔ ایسے میں کسی آدم زاد کی موجودگی بے حد خطرناک ہے۔

راجہ کو آدم زاد کی بو لگی۔ اور وہ الاؤ کی نذر رہا۔

"کیا آپ کو بو نہیں آرہی ہے!"

فضاؤں میں گوشت کی سوندھی بو پھیلی ہوئی تھی۔

راجہ کے کسی مشیرکار نے خواہ مخواہ شکایت کردی کہ حضور! فلاں نے حکومت پر سخت تنقید کی ہے۔

"ڈال دو سالے کو الاؤ میں"

"عزت مآب! فلاں نے آپ کو ڈکٹیٹر سے تشبیہ دی ہے۔"

"اس کمینے کو بھی اٹھا کر الاؤ میں پھینک دو۔"

"بات بات پر الاؤ......" "سو آپ رات میں جانے کا خطرہ مول نہ لیں۔

میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

اب تو ضرور دیکھوں گا۔ "میں بھی راجہ کا راج دربار..." "تم لوگوں نے ایک حیرت ناک اور تعجب خیز واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

دوسرے نے کہا۔

"اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ راجہ گوشت خور نہیں ہے"

راجہ کے پاس ایک نہایت ہی حسین خوبصورت، اور تندرست بکری ہے وہ اسی کا دودھ پیتا ہے اور جنگلی پھل اور سبزیوں پر گذارہ کرتا ہے۔"

پھر پروگرام کے مطابق ایک شام سورج ڈھلتے ہی ہم لوگ ایک گھنے درخت پر چڑھ گئے۔ عملے کے تیسرے شخص نے کہا

"سر! راجہ نے بظاہر جنگل کے تمام جانوروں کو مساوی حقوق دے رکھے ہیں۔ لیکن اس پر عمل درآمد کبھی نہیں ہوتا۔ راجہ کے کچھ خاص مشیر ہیں ان مشیروں نے اپنی ایک متوازی حکومت بنا رکھی ہے، یہ مشیر اپنی من مانی کیا کرتے ہیں۔ راجہ دن بدن سمٹ کر بادشاہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک رات ان مشیروں نے راجہ سے کہا۔

"جہاں پناہ! آپ دن بدن لاغر اور کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کی صحت اسی طرح گرتی رہی تو ہماری سلامتی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی پڑوسی راجہ اس جنگل پر غاصب ہو سکتا ہے۔"

ہم لوگ اپنے راجہ کو اس طرح تباہ و برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔

"عالم پناہ آپ کی غذا گوشت ہے اور گوشت نہ ملنے کے کارن آپ کس قدر لاغر اور کمزور ہو گئے ہیں۔"

راجہ کی زندگی کو بچانے کے لئے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ سب ایک زبان ہو کر بولے

پھر دوسری رات راجہ کے دربار میں مشیر کار حاضر ہوئے۔

"عزت مآب! جان کی امان ہو۔ ہم لوگ ایک نایاب تحفہ لائے ہیں۔"

فضاؤں میں گوشت کی سوندھی بو پھیلی ہوئی تھی۔ تیتر، کبوتر اور فاختے راجہ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے بولے۔ "سرکار کی نذر ہے اسے نوش فرمائیں۔" اس سے آپ کی صحت دوبارہ بحال ہو جائے گی۔ راجہ نے گوشت مزے لے کر کھایا اور ایک نئی لذت سے روشناس ہوا۔ اس طرح وہ بھی گوشت خور بن گیا۔ دھیرے دھیرے حرص میں اضافہ ہوتا رہا۔ اب وہ گوشت کے لئے حکم دیتا اور مشیر راجہ کے لئے جنگلی پرندوں کا شکار کرتے، تھوڑا بہت راجہ کی خدمت میں پیش کرتے اور باقی خود شکم سیر ہو کر کھاتے، دن بدن ان کی ہوس بڑھتی گئی۔ اب دن دہاڑے جنگلی جانور اور پرندوں کو کھا جانے کا سلسلہ چل نکلا۔ کسی کی جان و مال محفوظ نہیں تھی۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم تھا، چاروں طرف ایک طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک پتوں کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ محفل کے ایک شخص نے کہا، راجہ آ گیا آپ لوگ سمٹ جائیں اور اس طرح خاموش ہو جائیں جیسے پتھر کا مجسمہ یا کوئی لاش۔ ہم لوگوں نے راجہ کو آتے ہوئے دیکھا۔ آگے آگے راجہ اور اس کے پیچھے تمام مشیر کار۔ راجہ ایک اونچے پتھر پر اس طرح بیٹھ گیا۔ جیسے وہ تخت طاؤس پر جلوہ افروز ہے۔ پھر تمام چرندوں، پرندوں نے راجہ کی خدمت میں باری باری عرض داشتیں پیش کیں۔ اور اپنی اپنی داستانِ غم سنائی۔!

سب سے پہلے ایک معمر فاختہ نے اپنی دکھ بھری کہانی سنائی!۔

"ظلِ سبحانی! جان کی امان ہو۔ اب آپ کے دورِ اقتدار میں ہماری عزت جان و مال کچھ بھی محفوظ نہیں ہے۔ ہمارے ننھے منے بھولے سے کومل بچے، رشتہ دار اور ساتھی لقمۂ اجل ہو رہے ہیں، ہم نے آپ کے آدمیوں کی منتیں کیں، خوشامدیں کیں، ان کے آگے روئے اور گڑگڑائے کہ اس طرح آپ ہم پر ظلم و ستم نہ کریں۔ ہم بھی اسی جنگل کے باسی ہیں۔ اور اس جنگل پر ہمارا بھی اتنا ہی حق ہے۔ جتنا آپ کا، لیکن ظلم و تشدد میں بجائے کمی کے لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔ اس معمر فاختہ نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔" اس جنگل میں جان بوجھ کر نئے نئے مسائل کھڑے کر دئے گئے ہیں، امن و قانون کی صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ اور صورت حال کا سب سے خطرناک اور عبرت انگیز پہلو یہ ہے کہ خود جنگل کے اتحاد و سالمیت کی دہائی دینے والے اور قومی اتحاد و یکجہتی کے علمبردار عہدہ دار ہی بڑی حد تک اس کے ذمہ دار ہیں اور فطری طور پر ان حالات کا اثر ہماری قوم پر پڑا ہے۔

پھر ایک حسین اور خوبصورت خرگوش کھڑا ہوا۔ براق کی طرح سفید جس کے بال ریشم کی طرح ملائم تھے۔ بڑی بڑی داڑھی اور آنکھیں شعلوں کی طرح سرخ۔ جیسے اس کی آنکھوں کے اندر بھی ایک الاؤ روشن ہے۔ اس نے کہا۔

"سطوت مآب بادشاہ! حضور کا اقبال بلند ہو"، میں اپنی قوم کا نمائندہ ہوں اس سے قبل بھی کئی بار حضور کی قدم بوسی کیلئے حاضر ہو چکا ہوں۔ اب ایک بار پھر سرکار کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ عالم پناہ ہم اسی جنگل کے باسی ہیں جو کبھی رواداری، شرافت، ہم آہنگی خلوص و محبت اور بھائی چارگی کے لئے شہرت رکھتا تھا، لیکن اب یہاں کی ندیوں کا پانی ہمارے خون سے سرخ ہو گیا ہے۔ خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ قانون کی دھجیاں اڑائی جا رہی ہیں، چہار طرف ایک طوائف الملوکی پھیلی ہوئی ہے۔ نظم و نسق کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ لوٹ کھسوٹ، فتنہ و فساد، قتل و غارتگری چور بازاری، اغوا اور عصمت دری کے واقعات روزانہ کا معمول بن گیا ہے۔ سب سے زیادہ ظلم و تشدد اور ناانصافی کا شکار ہماری قوم ہو رہی ہے۔ اتنی کثیر آبادی کے ساتھ امتیازی سلوک ہو رہا ہے۔ اور ہمارے ساتھ ہماری نسل کشی ہو رہی ہے۔ ہمارے خلوص پر شک کیا جا رہا ہے، ہم سے بار بار وفاداری کا ثبوت طلب کیا جاتا ہے، جب کہ اس جنگل کا چپہ چپہ ہماری بہادری اور شجاعت کا گواہ ہے، جب بھی اس جنگل پر برا وقت پڑا ہے، ہم نے دشمنوں کی دھجیاں بکھیر دی ہیں، بہادری اور دلیری کی ایک نئی تاریخ بنائی ہے، پھر بھی ایک طویل عرصے سے ہمیں لوٹا جا رہا ہے، تباہ و برباد کیا جا رہا ہے۔ ہمارے وجود کو نیست و نابود کرنے کے لئے نئے طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ہم نے حالیہ فسادات میں تاخت و تاراج علاقوں کو دیکھا ہے، وہاں ہماری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا الفاظ ان کی لرزہ خیزی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان مناظر نے ہمارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہے، ایسے مناظر جن کا تصور بھی خوف سے خوفناک خوابوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بستیاں جہاں کبھی زندگی کی بھرپور سرگرمیاں نظر آتی تھیں۔ اب وہاں پر ہول سناٹے بولتے ہیں۔ ان بستیوں کو بڑے ہی منظم اور جدید طریقوں سے لوٹا گیا۔ اور تاراج و مسمار کیا گیا۔ قریہ در قریہ وسطی

کی غارت گری کے مشابہ نظر آتی ہے اور جو ثبوت ہے اس بات کا کہ جدید عہد کے انسان کی تباہ کارانہ صلاحیتوں میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔

علاقائیت اور علیحدگی پسندی کا جذبہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا ہے۔ زبان و کلچر کے نام پر تقسیم کا کام انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا جا رہا ہے۔ سرکا نہیں کسی کچھ سمجھتی رہی اب نہ ہی کچھ ہمارا خون پی پی کر بہت طاقت ور ہو گئے ہیں۔ اور ایک عظیم طاقت بن کر ابھر رہے ہیں۔ بار بار داد و فریاد کے باوجود سرکار کی طرف سے بے اعتنائی اور لاپرواہی برتی جا رہی ہے۔ ایسا کیوں!!؟

اس طرح ہرن، مور، تیتر، مرغ، بندر، بھالو، ہاتھی اور دوسرے جنگلی جانوروں نے بھی اپنی اپنی شکایتیں بیان کیں۔

آخر میں لمبے لمبے بالوں والا ایک بھیڑیا کھڑا ہوا آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ تھیں۔

جیسے آنکھوں کی جگہ دو دہکتے ہوئے انگارے رکھ دئے گئے ہوں۔ اس نے شعلوں کی طرح لپکتے ہوئے کہا۔ "عالی جاہ۔ آپ پر ہزار دں جانیں قربان اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اسی لئے ایک بار پھر حضرت مآب کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

ہماری قوم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں، ہماری نسل کشی ہو رہی ہے، ہمارے دھرم کو نشٹ کیا جا رہا ہے، زبان و کلچر کو مٹایا جا رہا ہے۔ ہماری عبادت گاہیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔"

"میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی۔"

"میں نے خوشبو چاہی تھی۔"

"میں پھولوں کا شیدائی تھا۔"

"میں پاکیزگی کا سودائی تھا۔"

"میں اجالوں کا تمنائی تھا۔"

"میری نظروں نے نظارے طلب کئے تھے۔"

"میں نے زبان و کلچر کا تحفظ چاہا تھا۔"

"لیکن مجھے راتوں کی سیاہی ملی۔"

"امنڈتے ہوئے طوفان ملے۔"

"نفرت ملی۔"

"قدم قدم پر کانٹے ملے۔"

"زہر بھرے جام ملے۔"

"مجھے انتہا پسند کہا گیا۔"

"دہشت گرد گردانا گیا۔"

"علیحدگی پسند مانا گیا اور غدار جیسے لفظوں سے نوازا گیا۔"

"کیا چاند اور ستاروں کی تمنا غداری ہے؟۔"

"کیا خوشبو انتہا پسندی کی علامت ہے؟"

"کیا محبت کی خواہش جرم ہے؟۔"

تمام لوگوں کی داد و فریاد سن کر راجہ نے کچھ دیر کیلئے توقف کیا۔ پھر گویا ہوا میں آپ تمام لوگوں کے جان و مال، تہذیب اور کلچر کے تحفظ کا وعدہ کرتا ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے راج دربار کو برخاست کر دیا۔ میں نے حیرت و تعجب کے ساتھ یہ سارا تماشہ دیکھا۔ لیکن راجہ کا وعدہ کسی معشوق کے وعدے کی طرح رہا۔ اور اس پر عمل درآمد کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ بلکہ ظلم و استبداد میں مزید شدت آ گئی۔ اور اب خاص طور پر اس ظلم و تشدد کا شکار بھیڑیے ہونے لگے۔ ان پر لمحہ بہ لمحہ نت نئے مظالم ایجاد ہوتے رہے۔ اور ڈھائے جاتے رہے۔ پھر یوں ہوا کہ ایک دن ایک بھیڑیا آیا اور راجہ کی بکری کو اٹھا کر لے گیا۔

راجہ غضبناک ہو گیا۔ غصہ میں تھر تھر کانپنے لگا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا اس نے تمام جانوروں کو طلب کیا اور حکم دیا کہ سب مل کر ایک ساتھ طوفان کی طرح بھیڑیوں کے استھان پر ٹوٹ پڑیں۔ اور استھان کو نیست و نابود کر دیں اور...... اور...... بھیڑیے کو زندہ یا مردہ.........."

سردار کے مرنے کے بعد بھیڑیوں کی ایک ہنگامی میٹنگ ہوئی اور کئی قراردادیں پاس ہوئیں۔ پھر سوال کیا گیا۔

"تم میں وہ کون بہادر ہے جو انتقام لینے کیلئے عہد کرے اور قسم کھائے؟"

"ہم قسمیں کھاتے ہیں اور عہد کرتے ہیں۔ ایک ساتھ کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

بھیڑیے موقع کی تلاش میں تھے اور انتقام کی آگ میں جل رہے تھے کہ ایک روز سے انہیں خبر ملی۔

"آج رات میں راجہ سیر و تفریح کی غرض سے آ رہا ہے۔"

تمام بھیڑیے الاؤ کے چاروں طرف چھپ کر بیٹھ گئے۔ راجہ اپنے مشیر کاروں کے ہمراہ چہل قدمی کرتے ہوئے الاؤ کے قریب پہنچا اچانک تمام بھیڑیے ایک ساتھ اس پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حملہ اس قدر دہشت انگیز، منظم اور غیر متوقع تھا کہ راجہ دہشت زدہ ہو گیا اور جان بچانے کی خاطر بھاگا لیکن ایک ٹیڑھی کائی سے ٹکرا کر الاؤ...... اور فضاؤں میں گوشت کی بو پھیل گئی۔

اور آج میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ جنگل کتھا کہیں میری کہانی تو نہیں!

ستیہ پال آنند



ہمزاد

جس کسی روز میں نہیں ہوتا
میرے کپڑوں میں کوئی دیگر شخص
چھپ کے رہتا ہے ۔ ایسے دن اکثر
آتے رہتے ہیں ، اور مرا ہمزاد
بے دھڑک ، میرا جامہ پہنے ہوئے
گھومتا ہے نہ جانے کن لوگوں ،
بدمعاشوں کی صحبتِ بد میں
سارا دن کاٹتا ہے ۔ اور دیگر
اپنے جیسے ہزار لوگوں کو
جو کسی اور کی قبا پہنے
گھومتے ہیں ، (جو خود نہیں ہوتے) ،
ڈھونڈتا ہے کہ ان کو قتل کرے !

تن تنہا

وہ جو ہر روز اپنی کھڑکی سے
جھانکتا ہے کہ دور سے کوئی
راہرو آئے ، اور وہ اس کو
گھر میں مدعو کرے ، محبت سے
بیٹھ کر گفتگو کرے ، اُس کو
اس حقیقت کا کوئی علم نہیں
نسلِ آدم نے خودکشی کرلی ۔
شہر کی موت ہو چکی ، اور وہ ،
(اپنی کھڑکی سے جھانکنے والا)
اک اکیلا ہے ساری دنیا میں
نسل کا آخری نمائندہ !

● ۱۷۔۱۔۹۲ ، سیکٹر ۱۴ ، چنڈی گڑھ

[بنگلہ]

سبھاش مکھوپادھیائے
مترجم : [illegible]

حفاظتی دستہ

اچانک دھول اڑا کر چلا گیا
جنگ سے لوٹا ہوا ایک حفاظتی دستہ
جوش میں آئے ہوئے ٹڈی دل کی طرح
شاہراہ کو حیران کر کے

آگے آگے توپ لیے
پیچھے لیے رسد اور کھانے کا سامان

میں تاریخ کا طالب علم ہوں
کھڑکی سے نظر میں نے ہٹالی
تاریخ کی طرف

وہاں بھی دیکھتا ہوں ایک جنونی ، حفاظتی دستہ
دوڑتا آرہا ہے کتنے زمانوں کے راج پتھ سے ہو کر
سامنے دھواں اگلتی ہوئی توپ ،
پیچھے غلّے سے لپٹی ہوئی جنتا ۔
میں نے توپ کے دھوئیں کے پیچھے دیکھا ،
انسان !
اور پیچھے فصل کے لیے ان کی روایتی ممتا
انیک یگ ، انیک جنگل ، پہاڑ اور سمندر پار کر کے
وہ لوگ بڑھے آرہے ہیں تھے ہوئے سخت چہرے لیے

● محلہ ممّلہ پٹی ، موتی ہاری (مغربی چمپارن)

جوگندر پال
۲۴ منداکنی انکلیو، کالکاجی نئی دہلی - ۱۹-۰۰۱۱

خواب رَو

قسط نمبر ۹

۹

بانگ گونجے تو اب کے دوراہے پر منوا چوکیدار نے عزیز چائے والے سے آنکھیں بچا کر نکل جانا چاہا ہے۔ مگر عزیزو نے اسے دیکھ لیا ہے۔ اور صدا بلند کی ہے۔ "چوری چوری کدھر کھسکے جات ہو منوا چچا؟ آج چائے نہ پیو گا؟"

"چائے کیسے پیوں؟" منوا چوکیدار عزیزو کے پاس آ بیٹھا ہے کہ کیا کھدا نخواستہ منو میں کوئی گڑبڑ ہوئے گئی؟"

"پیسہ نہ ہوئے تو ٹھیک منھ لے کے کا کروں؟"

"اپنے محلا سیتا پور کے بھوت ہو چچا، تم سے پیسہ کب مانگت ہوں۔" وہ اس کے لئے چائے تیار کرنے لگا ہے۔ "پر ایک بات پوچھوں؟ تمرا پیسہ جات کدھر ہے؟ ہمیشہ ندارت رہت ہو۔"

"جات کدھر؟ گھر میں تمری چچی نہیں بیٹھی کا؟" منوا چوکیدار نے اسے خالی کپ میں شکر ڈالتے ہوئے دیکھ کر گویا ابھی سے چائے پینا شروع کر دیا ہے۔ "اسی لئے ہر ایک سے کہت ہوں، جو چاہو کرو، بس ایک شادی نہ کرو۔"

"نہ چچا، اپنی جورو نہ ہوئے۔" عزیزو نے منوا چوکیدار کی طرف چائے کا پیالہ بڑھایا ہے۔ "تو ہمری جان نکل جائے۔ پر چھوڑو، کوئی اور بات کرو۔"

"ہاں!" چائے کا پیالہ دونوں ہاتھوں میں لے کر منوا کو بھی اپنی جورو اچھی لگنے لگی ہے۔ "جورو جیسی بھی ہوئے پھر جورو ہوت ہے۔ کوئی کھبر ورہ کوئی اور ہم تو نہیں سوچتا۔"

"نہیں، وہی کل والا کا کہت ہے؟ دلی تک سارے شہر کی دیواروں پر لکھا ہے۔" عزیزو نے اپنے لئے بھی چائے کا ایک پیالہ تیار کر لیا ہے۔ "جمنا دیوی گھاٹ کے اوپر چڑھا رہے۔ تین آدمیوں اور ایک کھابہ سرا کے چکر سے اڑ گئے۔"

"کھابہ سرا: کبھی تو آدمی ہی ہوت ہے۔ اسے الگ کو سمجھت ہو؟"

"ہاں منوا چچا، بچارے کا ہونی ادھر لے آئی۔ ادھر آوے سے پہلے ادھر ہمرے ساتھ چائے پیت رہے — ان کا کا پتہ رہے، آخری پیالی پیت رہے۔ ہم کو بھی کا پتہ رہے، نہیں تو سپیشل بنا کر دیتا۔" عزیزو نے سڑک پر آنکھیں پسار کر چائے کی چسکی لی ہے۔ "تم کا کا جانو چچا، ایسا کچے وارث کے گھر لیٹ پہنچنے پر جورو ہمیشہ طعنہ دیتی، آج پھر وہ کھانا آ گئی تھی کا؟ واہ! کا آدمی رہے! آپ تو مرا ہی مرا، سالا ہم کو بھی مار گیا۔"

"یہ سائیں لوگ بھرے پیچھے ہاتھ دھو کے کاہے پڑے ہیں؟ ہم اتنی سا سمجھے ہیں چچا، کا چھونے سے پہلے ہاتھ بھی نہ دھو سکے گے؟ ہہ ہہ ہا!"

نامعلوم عزیزو کو ہنستے پا کر منوا کو غصہ آیا ہے، یا اس لئے کہ دو ہی چسکیوں میں اس کی ساری چائے ختم ہو لی ہے۔

"ہر بات ہنسی میں اڑا دینے کی نہ ہوت ہے اچیو۔"

"لیو، میں تمرے لئے ایک کپ چائے اور بنا دیت ہوں۔" عزیزو کو احساس ہو گیا ہے کہ منوا کی تسکین نہیں ہوئی ہے۔ "ہمیں تو کہت ہے چچا، میری جورو بھی ادھر ہی کے سائیوں کی بیٹی ہے۔ ہم نے اس سے پوچھا، تمرے سائیوں نے اتنا اودھم کاہے کو مچا رکھا ہے؟ بولی، ہم تم گریبوں کے پاس ہتھیاروں لاکھوں کم کدھر سے آئیں گے؟ جورو کو سدھ نہیں؟ یہ تو اپنے کے بڑے بڑے سائیوں اور بیوپاریوں کا کام ہے۔"

"لیو کر لیو بات۔ اپنے بیوپاریوں کو کا پڑی ہے کہ اپنوں کو ہی اڑا دیت کریں۔"

"جورو کی اکل تو ایڑی میں ہوت ہے چچا۔ اس کا چھوڑو۔" عزیزو نے کسی سیاسی کے ماہرات کی تہہ تک پہنچنے کا پوز بنا لیا ہے۔ "سوچنے کی بات ورا ای، کے کرنا اور کون پر آیا۔ ہم تو اپنی جورو کو بھی اپنا نہیں سمجھت۔ چار دن روٹی کے پیسے نہ ہوں تو گھر سے نکال دیوے۔" وہ منوا چوکیدار کے قریب سرک آیا ہے۔ "اس کو چھوڑ ہم کا ایک لاکو روپیہ دیجو۔ اور پھر اسی گلا کٹوا لیجیو۔ بولو منجور؟" اسی دوران عزیزو کا ایک اور گاہک گویا اٹھتے ہوئے آگے نکل رہا ہے۔ اس نے پکار کر کہا "کلن میاں، چائے نہیں پیو گے؟ اتنی شکر ملا دوں گا کہ شہد کی نہر بہ نکلے گی۔"

"نہیں عزیزو، اپنا جلدی ہے۔" کلن آگے بڑھ گیا ہے تو عزیزو گویا ہوا ہے

"متوا چچا، ہمری کھری بولی بھی بہت سندر ہے۔ پر کلن میاں سے نکھلو سہر کی ناکواس اردو بول کے آجاوت ہے۔" پھر اس نے شکایت کی ہے۔ "آج کوئی گاہک سالا نکھے میں نہیں آوت ہے۔ مورے بابا کے اس لئے بھی کہت رہے، میں ایک نہیں دس ہوں۔ پر کا سمجھا نرہ؟ دسوں کے ایک بھی کمائی نہیں جرٹت ہے میرا تو جی چاہت ہے، کوئی ہم کا بھی بم سے اڑا دے۔" اس نے اپنی چائے کا آخری گھونٹ بھرا ہے، یا پھر اپنے ہوں یا گیر، میں ہی دس کو اڑا کے رکھ دیا" وہ اپنے خالی کپ کو دھونے لگا ہے۔ "جے باتیں اس لئے کہوں کے کر رہے ہن کی تم رات کے چوکیدار ہو۔ تم کا، کا پتہ کہ پھرے دن چائے کے چھوٹے چھوٹے پیالوں میں کتنا تو سچان پیار رہت ہے۔ اس نے متوا چوکیدار کا پہلا خالی کپ بھی دھونے کے لئے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ "کھیر، دن بھر کی کھبریں تو پوری ہو گئیں۔ اب تم رات کی کھبریں سناؤ۔ تم کہت ہو سارا نکھلو کھابوں کے راستے بکار میں اتر آوت ہے۔"

"ہاں، اچھو، آج رات کی کتھا سنانے کے لئے ہی ہم بیٹھت رہے۔ باتوں باتوں میں بھول ہی گئیو۔" متوا اپنی داستان شروع کرنے سے پہلے اپنی دوسری چائے کا آخری گھونٹ پینے کے لئے ذرا اٹھ گیا۔

"تو پھر ہو جاؤ سرو، چچا"

"آج رات تو بڑا ہو گئی گیا۔ بہت رات کے بیچ کے میدان میں لوگوں کے سٹ کے سٹ جماں ہوت رہن اور میدان میں تل دھرنے کا جگہ نہ رہے۔ میں نے ایک سپید داڑھی والے بزرگ سے پوچھ تاچھ کی۔ مالوم ہوا کہ دو بجے چائے کھانے کے اوپر جو بم پھٹ رہے۔ اس سے سارے نکھلو اور آس پاس سکت گڑبڑ ہونے لگی۔ یہ سارے لوگ اب جلوس بنا کے دیوانے مولوی ساب کی سرداری میں لاٹ ساب بہادر کے بنگلے کی اور جات ہیں۔"

"ہم ہا ہم۔ ہم ہا۔" عزیز دولے اختیار ہنس پڑا ہے۔ "بڑے لوتیو کی کھبر سنائی، چچا متوا۔ جو کچھ جیتے جاگتے ہوئے کار ہے، اج لامہ دولے نے اوکا جھوٹ سوتے کر دکھایا۔ ہم ہم ہا۔"

"لکھی کھو کیسے جات ہو، نکھلو کا بچہ بچہ کھابوں کے راستے مدرسہ ادھر پہنچا تھا۔

ہم ہا ہم۔ ہم ہا۔"

"اچھو، ہی ہی ہنسے جاؤ گے تو میری کھبر ادھوری کھتم۔" "نہیں، چچا، آگے بولو۔"

"مورے من میں چور پیدا ہو گئے۔"

"چچا، چوکیدار کے من میں بھی چور پیدا ہو وے تو پھر ہمرا اللہ حافظ"

"تو کوئیتھ۔ ہمرے من میں چور پیدا ہوا اور ہم نے ہم کا سمجھایا، ایسے کام نہیں چلے گا متوا۔ ایک تم ہی تم ہو جو جاگ رہے ہو۔ ان لوگوں کے جلوس میں سامل ہونا ہے۔ تو پہلے ان کی تراں تم بھی سو جاؤ۔ سو کیا ہم۔ للو دنیائی کی اندھیری گلی میں جا پہنچے۔ اور وہیں کسی چبوترے پر لیٹ کر چادر سے سر منہ لپیٹ لیا۔ ہمرے ہاتھ پیر تو ٹوٹت ہی رہیں، سر منہ لپیٹت ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اور کھابوں کے راستے سیدھے جلوس میں آن ملے۔ اس وکھت جلوس چلت پھرت رہے۔ کندھے سے کندھا چھیل کریں۔ آگھر دیوانے مولوی کے پاس ہی آن پہنچا۔ ان کی سان کیسے بیان کروں۔ ان کی ترکی ٹوپی کا پھندنا اس تراں لہرات رہے جیسے لال آندھی میں جہاد کا جھنڈا۔ مولوی ساب پہلے تو اپنی پاٹ دار آواز میں نعرہ تکبیر لگاتے رہے۔ پھر کا پتہ، کا سوجھی؟ لاوڈ اسپیکر پر ایک دم پورے جور سے پکار اٹھے۔ لے کے رہیں گے؟ اور جانت ہو اچھو، سارے جلوس نے آواز ملا کر کہا — پاکستان! بس پھر جو ہر ان دو آنکھوں سے دیکھا اور دو کانوں سے سن کر بھی یکین نہیں آتا۔ دیوانے مولوی ساب تو ہیں ہی دیوانے، ان کا تو مالوم تھا پاکستان بنے لگ بھگ آدھی صدی ہونے کو آئی۔ جے سوچو! اچھو، ساری کھلکت کو کا ہو گیا؟ بھوس پتا کھود سے وہ بھی دیوانی ہو گئی کا؟ ارے سیاہ کھلکت کو بھی بھول جائے۔ ہم کا بھی کا ہو گیا؟ بس جے ہی مالوم ہوت رہے کہ آجادی کے پہلے کے دن پلٹ آئے ہیں۔ اور ویسا ہی جیالوں کا جلوس پرانے نکھلو میں نکل پڑے ہیں اور وہ تمام نعرے لگا رہا ہے:

لے کے رہیں گے؟

پاکستان!

پاکستان کا مطلب کا؟

لا الٰہ الا اللہ! [باقی آئندہ]

مردم شماری میں زبان کے خانے میں پہلی زبان اردو اور صرف اردو لکھوائیں

مردم شماری ۱۹۹۱ء، آپ اور اردو



ذکاء الدین شایاں

تیر پہلو سے نکالا جائے گا
زخم کو کیسے سنبھالا جائے گا

اک قیامت اور ہوگی اپنے سر
جسم کو سانچے میں ڈھالا جائے گا

مسئلے شام و سحر کے زیرِ بحث
اس کی آنکھوں کا حوالا جائے گا

دل رہے گا اس کی یادوں کا اسیر
اب یہ جذبہ بھی نکالا جائے گا

موم کی صورت پگھلتا وہ بدن
آہنی حلقوں میں ڈھالا جائے گا

دور تک پرچھائیں مہکی میرے ساتھ
دور تک جیسے اُجالا جائے گا

آدمی صدیوں رہا جنت بدر
اب یہاں سے بھی نکالا جائے گا

● زنجمادہ اردشاہی پوسٹ آفس، پکھنڈپار، پلی بھیت (یوپی)



اختر انولوی

سوچوں تو لطف آئے، ستائش نہ کر سکوں
تو وہ ہے جس کو پانے کی خواہش نہ کر سکوں

آتی ہے یوں قریبِ رُخِ زندگی کی آنچ
میں سرد اپنے شوق کی آتش نہ کر سکوں

سر پر تو رکھ دیا مرے بارِ غمِ حیات
یہ اہتمام بھی ہو کہ لغزش نہ کر سکوں

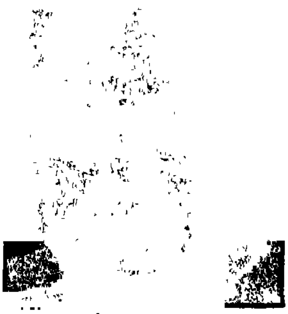
ہر شاخِ گلستاں کو جلایا گیا کہ پھر
تعمیرِ آشیاں کی میں کوشش نہ کر سکوں

یہ شرط ہے کہ ان کا رہوں میں خلوص مند
لیکن تمام عمر گذارش نہ کر سکوں

اتنا بھی اعتماد میں کوئی نہ لے مجھے
خود پر کبھی نگاہِ نوازش نہ کر سکوں

دشمن بھی اتنے پیارے ہیں اختر کہ میں کبھی
ان کے خلاف کوئی بھی سازش نہ کر سکوں

● ۲۷ چوک، سرکلر روڈ، ڈھاکہ (بنگلہ دیش)



انور سدید

زیست کو یوں تو روز و شب دیکھا
اب کھلا ہم پہ بے سبب دیکھا

تیرگی میں کرن نئی چمکی
اک نظر اس نے مڑ کے جب دیکھا

آنکھ پر کچھ بھی اختیار نہ تھا
جو بھی آیا نظر، وہ سب دیکھا

نہر پانی سے بھر کے چلتی رہی
اور کھیتوں کو تشنہ لب دیکھا

چھاؤں کے ساتھ دھوپ بھی دیکھی
لطف کے ساتھ کچھ غضب دیکھا

● ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور۔



فضل حسنین
۱۷۷، سبزی منڈی، الہ آباد - ۳

مانگ کر پڑھنا

پڑھنے کی افادیت سے بھلا کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن ہم بات کر رہے ہیں مانگ کر پڑھنے کی۔ کیوں کہ یہ مرض رفتہ رفتہ وبائی شکل اختیار کرتا جا رہا ہے۔

یوں تو مانگ کر پڑھنے کا سلسلہ صبح آنکھ کھلتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ جب پڑوسی اخبار کی جستجو میں آنکھ ملتے ہوئے دروازے پر حاضر ہو جاتے ہیں۔ اتفاق سے ہم نے لکھنے پڑھنے کو ہی اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے۔ اس لئے ہمارے پاس اخبار و رسائل آتے بھی رہتے ہیں۔ جن میں سے بیشتر ہمارے شناسا ہی پڑھتے ہیں۔ کیوں کہ جب ہمارے پڑھنے کا نمبر آتا ہے تو رسالہ عموماً اس قابل رہ ہی نہیں جاتا کہ اسے پڑھا بھی جا سکے۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ کتاب یا رسالہ مانگ کر پڑھنے والے مانگنے میں جس قدر چست ہوتے ہیں۔ واپس کرنے میں اتنے ہی سست واقع ہوتے ہیں۔ ایک صاحب سے جب ہم نے اس کا گلہ کیا تو موصوف ہمیں ہمدردانہ لہجے میں سمجھانے لگے۔ "دیکھئے صاحب! سیدھی سی بات ہے۔ کتاب کلی طور پر حفظ کر لینے سے کہیں زیادہ آسان کتاب رکھ لینا ہوتا ہے۔ جو وقت ضرورت کام آ سکے۔ غالباً اسی لئے لوگ کتاب یا رسالہ واپس کرنے سے حتی الامکان پرہیز کرتے ہیں۔" چوں کہ بیشتر رسالے ہمارے پاس اعزازی طور پر آتے ہیں۔ اس لئے لوگ انہیں مانگ لے جانے میں اور بھی عار محسوس نہیں کرتے بلکہ اکثر تو ان کا انداز کچھ یوں ہوتا ہے گویا کہہ رہے ہوں "میاں! ایک تو ہم تمہارے اتنے رسالے پڑھ بھی لیتے ہیں اوپر سے احسان ماننے کی بجائے رسالہ ہمارے حوالے کرتے ہوئے تمہیں گراں گزرتا ہے۔" غالباً اسی حقیقت کے عوض لوگ رسالہ یا کتاب رکھ لینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ البتہ کچھ معصوم قسم کے قاری واپسی کی رسم کو اب بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس طرح رسالہ واپس [illegible]

رسالہ واپس ملنے پر ہمیں گمان گزرتا ہے جیسے اسے کوڑے سے اٹھا کر لایا گیا ہو۔ اور ورق پھٹے ہوتا تو خیر کوئی خاص بات نہیں۔ اکثر ٹائیٹل کور تک نذار ور ہتا ہے۔ چنانچہ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ باقی ماندہ صفحات کس رسالے سے تعلق رکھتے ہیں، ہمیں متعدد صفحات پڑھنا پڑتے ہیں۔ کیوں کہ ٹائیٹل کور کے ساتھ صفحۂ اول کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اس لئے صفحۂ اوّل ٹائیٹل کور سے جدا رہ ہی نہیں سکتا۔ اور رفاقت نبھاتے ہوئے پیچھے بھی ٹائیٹل کور کے ساتھ ہی رہ جاتا ہے۔ جو صفحات بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، ان میں اکثر طرح طرح کی ڈیزائنوں سے مزین نظر آتے ہیں۔ یعنی رسالہ مستعار لے جانے والے کے اہل و عیال رسالے کے حسن میں اضافہ کی کوشش میں اکثر چٹنی اچار اور سالن وغیرہ تک کا استعمال کر ڈالتے ہیں۔ ایک صاحب سے جب ہم نے اس کی باز پرس کی تو موصوف نے نہایت مسرت آمیز لہجے میں فرمایا، "معلوم ہوتا ہے میرا چھوٹا والا بچہ بڑا ہو کر کوئی ادیب یا کم از کم نقاد تو ضرور بنے گا کیوں کہ وہ دسترخوان عموماً کسی رسالے ہی کو بناتا ہے۔ چونکہ بچہ ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ اشیائے خوردنی دسترخوان یعنی رسالے کی نذر ہو ہی جاتی ہے: ہم نے جب نبچے کے اس کارنامے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تو موصوف نے اگلے روز رسالے کے چند صفحات بھجوا دیئے۔ ہم نے حیرت سے ان کے انداز واپسی کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے معصومیت سے فرمایا۔ "بات یہ ہے کہ میرے یہاں کے تقریباً سارے بچے بڑے خود سر واقع ہوئے ہیں۔ کسی کی کوئی بات ماننا جیسے گناہ سمجھتے ہیں۔ اس لئے میں نے یہ صفحات جیسے ہی ختم کئے انہیں فوراً آپ کے پاس پہنچا دینے میں ہی عافیت سمجھی کہ بچے انہیں مزید گندہ نہ کر ڈالیں یا پھر کہیں ان سے ناؤ یا جہاز وغیرہ نہ بنا ڈالیں۔ اب تو میں نے طے کر لیا ہے کہ رسالہ جیسے جیسے پڑھتا جاؤں گا [illegible]

تھا نہ سکے اس سے تو یہی بہتر ہوگا کہ ورق ورق ہی سہی رسالہ آپ کے پاس مکمل پہنچ تو جائے گا۔" ایک صاحب نے یہ طریقہ بنا رکھا ہے کہ جب وہ رسالہ واپس کرنے کی غرض سے وارد ہوتے ہیں تو پہلے کوئی نیا رسالہ اپنے ہاتھ میں اٹھا لینے کے بعد ہی ہمیں پڑھا ہوا رسالہ واپس تھماتے ہیں۔ اگر کبھی کوئی نیا رسالہ نہ ملا تو موصوف اپنے ساتھ لایا ہوا رسالہ واپس لے جاتے ہوئے بڑی مایوسی سے کہتے ہیں۔ "کوئی بات نہیں۔ میں اسی کو ایک بار پھر دہرا کر کام چلا لوں گا۔ کل تک تو کوئی نہ کوئی چیز آ ہی جائے گی۔" یعنی ہمارا کچھ نہ کچھ ان کے قبضے میں رہنا ہی چاہئے۔

اکثر رات گئے دروازے پر دستک سن کر ہم باہر آتے ہیں تو کوئی صاحب بڑی عاجزی سے فرماتے ہیں۔ "بھائی صاحب! نیند نہیں آ رہی ہے اگر کوئی کتاب مل جاتی تو آج کی رات کسی طرح کٹ جاتی۔"

مانگ کر پڑھنے کے سلسلے میں اس ایک واقعے کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جب گذشتہ عید قرباں کے موقعے پر محلے کے ایک صاحبزادے بھاگے بھاگے آئے اور بولے۔ "ذرا وہ بقر عید والا پرچہ تو دے دیجئے جلدی۔" کچھ نہ سمجھتے ہوئے ہم نے حیرت سے پوچھا۔ "کیسا بقر عید والا پرچہ؟" صاحبزادے کچھ جھلاتے ہوئے بولے۔ "ہمارے ابو بکرے کو لٹا چکے ہیں، جلدی سے پرچہ دے دیجئے، تو قربانی والی دعا پڑھ کر چھری چلا دیں۔" واضح رہے کہ موصوف ہر سال قربانی بڑی پابندی سے کرتے ہیں لیکن قربانی کی دعا مانگ کر ہی پڑھتے ہیں۔

یہ باتیں تو گھر کی ہوئیں۔ سفر کے دوران مانگ کر پڑھنے والوں کی حالت تو اور بھی خراب ہے۔ مثلاً دورانِ سفر ہم نے اپنا اخبار نکالا نہیں کہ اس پاس بیٹھے مسافروں کا شوقِ مطالعہ فوراً بیدار ہو جاتا ہے۔ اکثر تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اخبار ٹھیک سے کھول بھی نہیں پاتے کہ فرمائشوں کی یلغار سی ہو جاتی ہے۔ "بھائی صاحب! ایک صفحہ ہمیں بھی عنایت کر دیں۔" ہم بادلِ ناخواستہ اخبار تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور اپنے حصے کا اخبار پڑھنا شروع ہی کرتے ہیں کہ بغل والے صاحب اخبار پہ اس طرح جھک پڑتے ہیں کہ ہم صرف ان کی زلفِ مبارک کا ہی نظارہ کر سکتے ہیں۔ جیسے جیسے ہم زاویۂ نگاہ بدلتے جاتے ہیں موصوف کی زلف بھی ساتھ ساتھ حرکت میں رہتی ہے۔ جب ہم صفحہ بدلنا چاہتے ہیں تو بیک وقت متعدد صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ "بھائی صاحب ابھی رکے رہئے، بس ذرا یہ خبر ختم کر لوں۔" ایک بار چڑھ کر ہم نے اخبار سمیٹنا ہی شروع کر دیا تو ہماری بغل میں ایک صاحب کی گردن دھتے دبتے بچی کیوں کہ موصوف پشت کی جانب سے ہمارے بازو کو کوئی محراب تصور کرتے ہوئے اپنی گردن اس میں داخل کرکے اخبار کا نشانہ باندھے ہوئے تھے۔ اکثر تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی نیا رسالہ یا اخبار خریدتے وقت قیمت تو ہم ادا کرتے ہیں۔ لیکن مطلوبہ شے وصول کوئی ہم سفر کرتا ہے۔ کچھ دیر انتظار کے بعد جب ہم اسے سوالیہ نظروں سے گھورتے ہیں تو وہ جرح کے انداز میں گویا ہوتا ہے۔ "ارے صاحب! میں ذرا ایک نظر ڈال لوں، آپ تو گھر پہنچ کر بھی اطمینان سے پڑھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہ مال ہے پھر آپ ہی کا۔" ایک بار ہم نے چڑھ کر کہہ بھی دیا۔ "جناب! ہاکر کے پاس اور بھی جلدیں ہیں۔ آپ اپنے لئے کیوں نہیں خرید لیتے؟" اس پر موصوف آنکھوں میں فاتحانہ چمک پیدا کرتے ہوئے بولے۔ "بات یہ ہے صاحب کہ اس ناچیز نے آج تک کبھی رسالہ یا اخبار خرید کر نہیں پڑھا۔ آپ کیوں خواہ مخواہ میرا اتنا پرانا ریکارڈ خراب کرنا چاہتے ہیں؟" اس پر ایک اور صاحب نے ان کی حمایت میں وکالت کرنی چاہی کہ اخبار و رسائل اب اتنے مہنگے ہوتے جا رہے ہیں کہ چاہتے ہوئے بھی بہت سے لوگ خرید نہیں پاتے ہم نے ان سے دریافت کیا کہ صاحب! قیمت کس چیز کی نہیں بڑھ رہی ہے؟ لیکن اور چیزیں تو لوگ اسی طرح خرید رہے ہیں۔ پھر کتب و رسائل کے معاملے میں اس قدر قباحت کیوں؟" ـــ ہمارے سوال کا جواب دینے کے بجائے موصوف نو دو گیارہ ہو گئے۔

دورانِ سفر اپنی منزلِ مقصود سے کئی اسٹیشن قبل ہی ہمیں اپنے رسائل و اخبارات یکجا کرنے کی فکر لاحق ہو جاتی ہے کیوں کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ ہم سفر مسافروں کو الوداع کہتے وقت ہم اپنے اخبار و رسائل مکمل طور پر واپس حاصل کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہوں۔

آخر میں یہ انکشاف کرنے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں کہ اب ہم بھی سفر کے دوران حتی الامکان اسی طرح مانگ کر پڑھنے پر ہی اکتفا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح اخبار یا رسالہ غائب ہونے کا اندیشہ نہیں رہتا اور ہم پورا سفر بغیر کسی ذہنی تناؤ کے طے کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔

اور آپ سے سچ بتائیں جب سے ہم نے بھی مانگ کر پڑھنا شروع کر دیا ہے اب رسالہ یا اخبار خریدتے وقت ہمیں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم واقعی کسی نامعقول حرکت کے مرتکب ہو رہے ہوں۔ غالباً مانگ کر پڑھنے کا مرض اسی طرح بڑھتا رہے گا لیکن اس سلسلے میں گھبرانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ جب خریدار ہی نہ رہیں گے تو اخبار و رسائل چھپیں گے ہی کیوں کر اور جب رسائل چھپیں گے نہیں تو یہ مانگ کر پڑھنے کی وبا خود بخود ختم ہو جائے گی۔

مصطفےٰ مومن

حقیقت خواب کی معلوم ہوتی
تو میرے جسم پر مرقوم ہوتی

جھکی شاخوں کو تتلی چومتی کیوں
فضا کس واسطے مسموم ہوتی

بلائیں ڈھونڈتی خاموش گوشہ
مگر حرف و نوا کی دھوم ہوتی

لرزتی دھوپ سائے سے لپٹتی
ہوا سے تازگی معدوم ہوتی

بناتیں نئے معنی قلم کو
کہانی پیار کی موہوم ہوتی

● رحمت گنج پالی ٹکنک، دھنباد (بہار)

نیاز جیراج پوری

انسان کے سینے میں اگر دل نہیں ہوتا
ممکن ہے کہ جینا اسے مشکل نہیں ہوتا

یہ آئینہ جھوٹا جو نہیں ہے تو کیوں ایسا
مجھ جیسا کوئی میرے مقابل نہیں ہوتا

حالات اسے کہیئے کہ مجبوریاں کہیئے
ورنہ کوئی اپنا ہی تو قاتل نہیں ہوتا

اب اس میں جو اترے ہو تو بس ڈوبتے چلو
بکھرے ہوئے افکار کا ساحل نہیں ہوتا

یہ حُسن پرستی بھی عجب شوق ہے جس میں
حاصل بھی جو ہوتا ہے وہ حاصل نہیں ہوتا

رہتا ہے سدا راہِ تجسّس ہی میں لیکن
وہ شخص کبھی بھیڑ میں شامل نہیں ہوتا

اس جرم کے بدلے میں سزا ہے کہ جزا ہے
یارب میں تری یاد سے غافل نہیں ہوتا

● نسیم کلیکٹرس ۵۵/۵۱ ٹینک اسٹریٹ۔ بمبئی ۸

بشیر فاروقی

•

شہرِ فصلِ گل سے چل کر پتھروں کے درمیاں
زندگی آجا کبھی ہم بے گھروں کے درمیاں

اس ہجومِ غمگساراں میں تو کچھ قاتل بھی ہیں
رو رہے ہیں جو سرِ مقتل سروں کے درمیاں

پہلے ہم نے گھر بنا کر فاصلے پیدا کیے
پھر اٹھا دیں اور دیواریں گھروں کے درمیاں

عہدِ حاضر میں اخوت کا تصور ہے مگر
تذکروں میں کاغذوں پر رہبروں کے درمیاں

جانے کس دن جاگ اٹھے میرے اندر کا ضمیر
تم پڑا رہنے دو مجھکو ٹھوکروں کے درمیاں

اڑ گیا تو شاخ کا سارا بدن جلنے لگا
دھوپ رکھ لی تھی پرندے نے پروں کے درمیاں

یہ جو خانہ ہے سکوت کا یہاں لکھ دو بشیر
پھول ہوں لیکن کھلا ہوں پتھروں کے درمیاں

● ۵۱۵۔ مراد علی لین، لکھنؤ، (یو پی)



ندا فاضلی
۱۰۳ - امرا اپارٹمینٹ، ڈانڈپاڑہ - ۱، کھار (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۲

دیواروں کے بیچ

قسط نمبر ۱۵

ندا کی جیب میں ایک چھوٹی سی سونے کی زنجیر پچھلے کئی دنوں سے اس کی ایمانداری کا امتحان لے رہی ہے۔ یہ زنجیر اسے کمرہ میں پڑی ہوئی ملی ہے۔ یہ عشرت کی سہیلی وجیہ کی ہے۔ جو اس کے فوجی دوست کی دست درازیوں سے گھائل ہو کر، پلنگ کے پائے کے آڑ میں پناہ لئے ہوئے تھی۔ اس درمیان وہ کئی بار عشرت کے ادھر ادھر مل چکا ہے۔ ہر بار وہ اس کو واپس کرنے کا ارادہ بھی رکھتا ہے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ جب سے اس کی ایمان داری نے اس کی نوکری کی قربانی وصول کی ہے۔ وہ اس سے خائف سا ہے اس ایمان داری کی شہرت نے چھوٹے شہر میں ذریعۂ معاش کے دوسرے ذرائع بھی ختم کر دئے ہیں۔ ندا کو اپنی غلطی کا احساس ہے گوالیار میں اب رہنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ وہ مجبوراً ایک دن اپنی جیب میں چھپی ایمان داری کو صرافے میں نوٹوں میں تبدیل کرتا ہے۔ اور مکان کا کئی مہینے کا چڑھا ہوا کرایہ اور دوسرے چھوٹے موٹے ادھار ادا کر کے ایمان داروں میں اپنا نام لکھاتا ہے۔ باقی کے جو پیسے بچتے ہیں ان سے ٹکٹ لے کر دہلی کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ اس نے عشرت سے جلد لوٹنے کا وعدہ کیا ہے اس سفر میں عشرت کے کئی خط اور دائیں ہاتھ کی بیچ کی انگلی میں، اس کی ایک چاندی کی انگوٹھی جس پر اس کے نام کا پہلا حرف "آئی" کندہ ہے ندا کے ساتھ ہیں......

دہلی میں ندا کی ایک خالہ رہتی ہیں۔ کٹرہ مہرپرور میں ان کا بڑا سا دو منزلہ مکان ہے۔ ندا سیدھا وہیں جاتا ہے وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ناشتہ تک پورے خاندان کی تاریخ دہرائی جاتی ہے بعد میں اس کے آرام کے لئے ایک کمرہ کھول دیا جاتا ہے۔ شروع میں مہمان کی طرح خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ لیکن جب مہمان نئے سے پرانا ہوتا ہے تو میزبانی مہربانی میں تبدیل ہونے لگتی ہے ان کا رویہ بدلنے لگتا ہے۔ ایک رات وہ دن بھر دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب کی سیر کر کے لوٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سامان قریب کی ایک مسجد کے حجرہ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ مسجد میں رہنے کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ ان آداب میں سحر خیزی ضروری شرط ہے۔ رات کو دیر سے آنے کی طرح، صبح چار پانچ بجے جاگ کر مجبوراً سر بہ سجدہ ہونا روز کا معمول ہے۔ کبھی اتفاق سے جلدی آنا ہو تو عشاء کی نماز کے بعد مسجد کے امام کا وظیفہ پڑھنے تک یا دخدا میں دوزانو بیٹھنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں جب تھکن نیند بن کر آنکھوں سے جھانکتی ہے تو امام کے وظیفے کی آواز تسبیح کے دانوں سے باہر نکل کر کانوں سے ٹکراتی ہے۔ اور نیند خدا کے گھر میں خدا کی ہیبت سے کوسوں دور ہو جاتی ہے۔ یوں تو وہ وظیفہ ختم ہوتے ہی وہ اپنے گھر چلے جاتے ہیں لیکن جب بڑھاپا گھر کا فاصلہ بڑھا دیتا ہے تو وہ مسجد میں ہی رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں نوجوانوں کی بے راہ روی اور اسلام کے فیوض پر ان کا دیر تک وعظ فرمانا ضروری ہے۔ ان بابرکت کلمات سے اپنی عاقبت سنوارنا سننے والے کی مجبوری ہے۔ مسجد کا حجرہ، وضو کے حوض کے قریب ہے۔ حجرہ کی دیوار کے ساتھ وہ لمبا سا تختہ رکھا ہے۔ جس پر لٹا کر محلے کے مرحومین کو آخری غسل دیا جاتا ہے۔ یہ تختہ اور دیگر متعلقہ چیزوں کی طرح مسجد کی ملکیت بھی ہے۔ اور آمدنی کا ذریعہ بھی۔ یہ تختہ ہفتہ میں ایک دو بار اجتماعاً باہر جاتا ہے اور اپنا فرض پورا کر کے، خود بھی بہا دھو کر اپنی جگہ آ کر ٹک جاتا ہے۔ اور مرنے والے کے غم میں دیر تک بوند بوند آنسو ٹپکاتا رہتا ہے۔ اس کی جھریوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں نے بنا کھڑکی اور روشن دان کے نیم تاریک کمرہ کی فضا کو ہی غمناک نہیں بنایا ہے۔ اس غم میں خود بھی کالا اور کھردرا ہو گیا ہے۔ فرش پر نہ جانے کب کی بچھی ہوئی پرانی دری بھی اس سوگ میں برابر شریک رہتی ہے۔ مسلسل سیلن سے اس کے نقش و نگار دھندلا چکے ہیں فرش اور دری کے اس مشترک غم نے دونوں کا رشتہ اتنا اٹوٹ بنا دیا ہے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا کارِ محال ہے۔ دری کو جدھر سے اٹھاؤ ساتھ میں فرش بھی کراہتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ رات ہوتے ہی، قریب کی تنگ گلیوں سے آ کر تہجد گذار پھر شب بھر خود بھی عبادت کرتے ہیں اور دوسرے سونے والوں کو بھی خوفِ خدا سے بیدار رکھنے کا نیک کام انجام دیتے رہتے ہیں۔

ندا جس مقصد سے دہلی آتا ہے وہ پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ کوئی ذریعہ معاش پیدا نہیں ہوتا۔ ایک وعدے سے دوسرے وعدے تک وقت لگاتار

گردش کرتا رہتا ہے۔ دن بھر کام کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنا، اور شام کو دیر تک کافی ہاؤس میں نئی نظم اور نئی غزل کے بحث و مباحثہ میں خود کو الجھا کر تھکانا۔
اور اس تھکن کو چندہ سے خریدی ہوئی شراب سے (جسے کوڑے کرکٹ کو کوکا کولا کی بوتلوں میں ڈال کر جسم میں انڈیلا جاتا ہے) مٹانا ہر دن کا آخری کام ہوتا ہے۔۔۔
کافی ہاؤس میں روز کے آنے والوں میں بانی، کمار پاشی، محمود ہاشمی، شہاب جعفری، وشوناتھ درد، کرشن موہن، ہیں۔ محمود ہاشمی جدید ادب کے حمایتیوں میں ہیں۔
وہ لکھتے کم ہیں بولتے زیادہ ہیں ان کی زبانی تنقید ہر روز نئے فکشن اور نئی شاعری پر نئے نئے فتوے صادر فرماتی رہتی ہے۔ روزانہ جدید شاعروں اور افسانہ نگاروں
کی فہرستیں تیار ہوتی ہیں ان فہرستوں میں فہرست سازوں کے ذاتی تعلقات کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ ہر ادیب اور شاعر کی جیب میں اپنے پسندیدہ ناموں کی ایک
لسٹ ہوتی ہے۔ اور یہی روز کے ملنے جلنے والوں میں اختلافات کی وجہیں بنتی ہیں۔ عمیق حنفی نئے نئے بھوپال سے ٹرانسفر ہو کر آئے ہیں۔ انہوں نے نہایت
سنجیدگی سے نئی شاعری کا ایک دستور العمل تیار کیا ہے۔ جس کو وہ مختلف شہروں میں پوسٹ کر رہے ہیں۔ ترقی پسندوں سے مورچہ لینے کے لئے انہیں ایک مورچہ کی
ضرورت ہے۔ قاضی سلیم نے کئی دنوں کی محنتوں کے بعد جدید شاعری کا ایک منشور تحریر کیا ہے۔ اس پر وہ کئی تقریریں فرما چکے ہیں۔ ان کے خیالات کافی ہاؤس
کی میزوں تک پہنچ چکے ہیں۔۔۔۔۔ ! خوشتر گرامی کے بیسویں صدی اور یونس دہلوی کی شمع میں سیدھی سادھی کہانیاں لکھنے والے سریندر پرکاش کو محمود ہاشمی
نے نئے پن کا فارمولا تھما دیا ہے۔ جس پر وہ عقیدتاً عمل پیرا ہیں۔ محمد علوی اپنے ایک دو اردلیوں کے ساتھ دہلی میں کسی بڑے ہوٹل میں آکر ٹھہرتے ہیں۔ اور ٹیلیفون
کر کے سارے نئے ادیبوں کو بلاتے ہیں۔ اور انہیں شراب پلا کر اپنی شان میں قصیدے پڑھواتے ہیں۔ ان قصیدوں میں جہاں کہیں متوقع مدح کی کمی محسوس
ہوتی ہے تو قصیدہ گو گالیوں اور کبھی مار پیٹ سے نوازے جاتے ہیں۔ اس گالم گلوچ اور مار پیٹ میں ان کے اردلی بھی نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔ محمد علوی کا مجموعہ
خالی مکان شائع ہو چکا ہے۔ اس پر سوغات میں محمود ایاز کے تبصرہ کی کافی دھوم ہے اسی دھوم دھام کا نظارہ کرنے کے لئے محمد علوی اسی شاہانہ انداز میں مہینے میں ایک
دو بار راجدھانی ضرور آتے ہیں۔ جب تک ان کا قیام رہتا ہے اکثر نئے ادیب ان کے ارد گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ ان محفلوں میں محمد علوی اور ان کی شاعری
کے علاوہ کسی بھی دوسرے موضوع کا داخلہ ممنوع ہے۔

سلام مچھلی شہری آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہیں ندا کی ان سے شناسائی گوالیار کے مشاعروں سے ہے۔ وہ ندا کی بے روزگاری پر ترس کھا کر تھوڑے
تھوڑے وقفے کے بعد اس سے کلام شاعر کے پروگرام میں شعر پڑھواتے رہتے ہیں۔ شعر پڑھنے کا معاوضہ پچیس روپئے کا چیک ہوتا ہے جو ریڈیو کے سامنے
کے بینک سے پانچ بجے سے پہلے ہی کیش ہو کر آجاتا ہے۔ ہر بار چیک کی رقم سے کناٹ پلیس میں رینگر کے پاس سے شراب کی بوتل خریدنا اور پھر ٹیکسی میں انہیں
گھر تک پہونچانا ندا پر واجب ہے۔

ہر ریڈیو پروگرام کی یہ وہ شرائط ہیں جو گورنمنٹ کنٹریکٹ فارم میں ہر بار درج کرنا بھول جاتی ہے۔ سلام کو ہی انہیں بار بار دہرانا پڑتا ہے۔ اور ضرورت مندوں
کو خاموشی سے نبھانا پڑتا ہے۔ سرکار کی اس قسم کی غلطیوں کو سدھارنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کی شراب نوشی ان دنوں عروج پر ہے۔ اس میدان میں دہلی میں
ایک نریش کمار شاد ہی ان کے حریف ہیں۔ سماج سے دونوں کی لڑائی کی شدت تو ایک سی ہی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ شاد افسران کی قدر افزائی کے کارن دن
میں بھی رات کا چاند بنے رہتے ہیں۔ اور سلام پیشہ ورانہ مجبوریوں کے تحت سورج اور چاند کو الگ الگ ناموں سے پکارتے ہیں۔ صرف مشاعروں والی ہی میں وہ نظام قدرت
کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں۔ عام طور سے ان کی ہر رات دیر تک جاگتی ہے۔ رات کا خمار سارے دن ان کی دفتری ذمہ داریوں سے الجھتا رہتا ہے جسے ٹالنے کے لئے
وہ لگاتار چار مینار کا کڑوا دھواں اپنے اندر اتارتے رہتے ہیں۔ اور جب دیکھو سونے اور جاگنے کی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان کی محدود آمدنی میں ان کی مدہوشیوں
کے لئے گنجائشیں ممکن نہیں ہیں۔ اپنے گھر کے تعلق سے وہ نہایت ہی ذمہ دار انسان ہیں۔ ملازمت سے جو کماتے ہیں اس کا بیوی بچوں کو حقدار بناتے ہیں، اپنے شوق
کے لئے دوسرے ذرائع اپناتے ہیں۔ ان کی اس روش مندی نے انہیں بھلے ہی منتشر کیا ہو لیکن گھر کو بکھرنے سے محفوظ رکھا ہے ان دوسرے ذرائع میں مقامی
و بیرونی مشاعرے، ریڈیو کنٹریکٹ کی زبانی شرائط، عوامی رسائل میں فرمائشی شاعری سب شامل ہیں۔ روز کی یہ تگ و دو انہیں ہمیشہ سوسائٹی کے کیپٹلسٹ نظام کا ناقد بنائے
رکھتی ہے۔ سماج میں فنکار کی ناقدری کا دن بھر ان کی گفتگو کا موضوع رہتا ہے۔ سماج کی یہی ناانصافی انہیں انتقاماً زیادہ پینے اور خیالی محبوباؤں اور تصوراتی دنیاؤں
کی تخلیق پر مجبور کرتی ہے۔ ان دنیاؤں کے وہ ہیرو ہوتے ہیں۔ جن کے آگے پیچھے ہمیشہ بچے بنے بنگلوں کی تعلیم یافتہ خوبصورت لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ یہ لڑکیاں ہمیشہ
عمر میں کبھی آدھی اور کبھی تین چوتھائی سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ شاعر کو اپنا آئیڈیل بنا کر اپنی حسین تنہائیوں کو آباد کرتی ہیں۔ شاعر والے اسٹیج اور رسائل کے صفحات کے ذریعہ
وہ ان کے نام منظوم خطوط بھی پوسٹ کرتے ہیں۔ ان کے جوابات بھی خود منظوم کر کے انکی طرف سے اپنے نام ارسال کرتے ہیں۔ اسٹیج پر وہ شعر کم سناتے ہیں، تماشہ

زیادہ دکھاتے ہیں۔ ہاتھ میں سلگتی چار مینار کندھے پر اسٹیکر لگا بیگ، سرکیس، پاؤں کیس کے عالم میں مائک کے سامنے آتے ہیں نئی نظم کے دھوکے میں ایک بار پھر سامان کی فہرست ان کی قیمتوں کے ساتھ دہرانے لگے۔ سننے والے، کریم، سالسی خال، کنگھی، بیرپن، پاؤڈر اور ایسی ہی دوسری اشیاء کے ناموں کو بھی ان کی اظہار سمجھ کر داد سے نوازتے رہے۔ سامعین سے سوال و جواب ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ نظم پڑھتے پڑھتے میں کسی لفظ پر اچانک رک جاتے ہیں۔ جیسے نظم مصرع آیا۔

بار بار آئینے کے سامنے جایا نہ کرو

سامعین نظم کے آگے بڑھنے کے منتظر ہیں۔ مگر نظم آگے نہیں بڑھتی۔ سامعین اور شاعر کے درمیان صرف ایک لفظ آئینہ ٹنگا ہوا ہے۔ جسے بار بار نئے انداز سے دہرایا جا رہا ہے۔ اور پھر یوں ہوتا ہے ایک بار وہ آئینہ کہتے ہیں اور اس کے جواب میں پورا ہال کورس میں آئینہ بولتا ہے۔ یہ تکرار جب زیادہ بڑھ... تو وہ یکسانیت سے اوب کر سامعین سے مکالمہ شروع کر دیتے ہیں۔

"جانتے ہو آئینے کا مطلب کیا ہے؟" ——— "نہیں آپ بتلائیں، ادھر ادھر سے دو چار آوازیں آتی ہیں۔

"میں شاعر ہوں، مزدور نہیں ہوں، میں شعر سناؤں گا اور مطلب تم........" ——— "اب بتا بھی دو صاحب کوئی بناوٹی لہجہ میں کہتا ہے۔"

"آئینہ" جھنجھلا کر سلام کہتے ہیں۔ ——— "آئینہ، سارے سننے والے ہنستے ہوئے دہراتے ہیں۔

اس طرح، اس دو طرفہ مکالمہ بازی سے سنجیدہ محفل قہقہہ بن جاتی ہے۔ ایسے وقت اگر کسی منتظم کی شامت آتی ہے تو وہ بیچارہ دخل اندازی کی ہمت کر بیٹھتا ہے۔ اور سلام اور سامعین کے معاملہ میں مداخلت کر کے اپنے حسب نسب کی رسوائی کا باعث بنتا ہے۔ سارا مشاعرہ اب سننے سے زیادہ دیکھنے کی چیز ہے۔ ان کے اصرار پر، ان کے بعد جس شاعر کو زحمت کلام دی جاتی ہے وہ سلام کے بنائے ہوئے ماحول میں اپنے آپ کو اجنبی پا کر واپس لوٹ آتا ہے۔ بار بار کو بلا کر پڑھوایا جاتا ہے۔ دکھایا جاتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں جو چاہتے ہیں پڑھتے ہیں۔ یا صرف کھڑے ہو کر مسکراتے ہیں۔ سننے والے ان کی ہر ادا کا شور مچاتے ہیں۔ مشاعرہ کی صبح رات کی کامیابی کے صلہ میں۔ وہ معاوضہ کی رقم میں کچھ اضافہ کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔ سلام کی دن بھر کی دبی گھٹی شو ہر رات اسی طرح نشے کی سیڑھیوں سے حسرتوں کی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ اونچائیاں اتنی ہوتی ہیں کہ وہاں سے خود ان کے لئے اترنا مشکل ہوتا ہے ایسے موقعوں پر اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے دوسروں کو مدد کے لئے آنا پڑتا ہے۔ اور انہیں باہر لے جا کر دو تین گھنٹوں کی نیند کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔

رات کی ہر بات وہ صبح بھول جاتے ہیں۔ اس لئے پچھتاوے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

فرزانہ نشے میں ہے دیوانہ نشے میں ہے جب میں نشے میں ہوں تو زمانہ نشے میں ہے

ان کی ہر رات کا نازبردار کوئی نہ کوئی ہوتا ہے اکثر تو ان کی شامیں باہر گزرتی ہیں۔ لیکن جب گھر جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا تو کسی نہ کسی کو ساتھ لے لیتے ہیں۔ یہ ساتھ کا آدمی دفتر سے ان کے ہمراہ کناٹ پلیس آتا ہے۔ اور وہاں مہمان ہوتے ہوئے بھی میزبانی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ان فرائض کی ادائیگی میں، برانڈ سے لے کر دوسرے لوازمات تک خود ان کی پسند نت نئی دلیلوں کے ساتھ رہنمائی کرتی ہے۔ مختصر سی اس شاپنگ میں وہ فروٹس بھی تاکیداً حاصل کر لئے جاتے ہیں جو کسی شریف گھر یا کسی شریف مہمان کی پہلی آمد کی تہذیبی شرط ہے۔ سلام کا گھر یو پی کے نچلے متوسط طبقے کا نمائندہ گھر ہے۔ اس تہذیب کے ادب و آداب ہر جگہ ہیں۔ ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ نظر آتی ہے۔ سلام کے بوہیمین مزاج سے یہاں کی فضا بالکل مختلف ہے۔ سلام کرتے ہوئے آتے جاتے بچے، دعائیں دیتی بزرگ، دھیمی آواز میں بولتا زنان خانہ، دیواروں کے رنگوں کے مطابق کھڑکیوں کے پردے، تکیوں پر نیند کے موضوع پر کڑھے ہوئے اساتذہ کے اشعار، ایک کونے میں دھلا دھلایا اگالدان، میز پر سجا تازہ پھولوں کا گلدان، دیواروں پر لکڑی میں کھدے ہوئے اللہ اور دیگر بزرگان کے نام۔ ندا اس گھر میں پہلی بار آیا ہے۔ شام شروع ہونے سے پہلے گھر کے چھوٹے بڑوں سے اس کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اس کی خاطر مدارات کے لئے خانگی احکامات صادر فرمائے جاتے ہیں۔ فرمائش کر کے گھر کے سامنے شعر سنے جاتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے بوتل میں چاند نیچے اترنے لگتا ہے سلام جذباتی ہوتے جاتے ہیں۔

اے ناقدانِ زندگی آوارگی معاف جب جانو میری طرح دو دن گزار لو

پچھلا شہر سے دلی تک کے سفر میں ان کے ساتھ ان کے معاصرین اور حالات نے جو بدسلوکیاں کی ہیں وہ ایک ایک کر کے انہیں یاد آتی ہیں۔ ان گلوں کے ساتھ وہ اپنے گھر والوں کی قربانیاں بھی دہراتے جاتے ہیں اور شراب کو گناہ ٹھہراتے ہیں۔ لیکن پیگ کے بعد پیگ بنائے جاتے ہیں۔ نشہ جب زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ رونے اور مسکرانے کی درمیانی کیفیت میں آ جاتے ہیں۔ اس کیفیت میں وہ اچانک اپنی لڑکیوں کی بڑھتی ہوئی عمر اور ان سے باخبر ہو جاتے ہیں۔ اور ایک نوجوان مہمان کے ساتھ گھر

باقی صفحہ ۹۴ پر

دھنک رنگ

جسونت سنگھ راز

اک شب غم ہے، سحر کی داستاں بھی ہے
زندگی ہے کشمکش ہے، امتحاں بھی ہے
اٹکھیلیاں کرتے ہوئے ساغر بکف ساقی
تر آستیں اشکوں کا اک سیلِ رواں بھی ہے
رکھنا ہے اس کی راہ میں آہستہ آہستہ
سویا ہوا صدیوں سے کوئی کارواں بھی ہے
آتی سمجھ میں بات یہ مجھکو زمانے کی
بے مہر ہے لیکن کہیں پر مہرباں بھی ہے
یوں راز دنیا سے امیدِ غم گساری ہو
کا در کھلا ہے، واسطے تیرے جہاں بھی ہے

۲۲/۲۳۴ ۔ اے چنڈی گڑھ

تجمّل اظہر

سے بال گرد سے چہرہ اٹا ہوا
ز یہ زندگی سے کہاں سامنا ہوا
ت کا فیصلہ تھا ہوا پر لکھا ہوا !!
ن ہوا کا چہرا تھا مجھ سے چھپا ہوا!!
جست ہی میں آسماں مٹھی میں تھا مگر
بدن تھا مجھکو مقیّد کیا ہوا !!
خود بھی خود سے ملنے پلٹ کر نہ آسکا
ساری آس میں تھا کوئی در کھلا ہوا
کر ہجوم غم سے جو تنہائی اوڑھ لی
جاکے اپنے آپ سے کچھ سامنا ہوا

۱۸ ۔ ۷ ۔ ۲۶۶ / ۳۲۵، بھوانی نگر، حیدرآباد

بدر نظیری

جذبۂ دل کی عمارت ہے عجب تعمیر سی
اشک کے ہر ایک قطرہ میں ہے اک تصویر سی
رات کے مضمون کی سُرخی تھی کیتنی خوفناک
تیر تھا چلّہ پہ اور بجتی ہوئی زنجیر سی
برق سی لہرا کے آخر رہ گئی مغرب کی شام
صبح مشرق میں ابھی تک ہے وہی تنویر سی
شب کے سنّاٹے سے نکلی صبح گھبرائی ہوئی
شام کل دکھلا گئی تھی خوں بھری شمشیر سی
لمحہ لمحہ زندگی کا، نیند کی آغوش میں
اور امیدوں کی دنیا خواب کی تعبیر سی

معرفت ظفر صادق انڈیا اسلامک کلچر سنٹر نیو دلی ۱۱۰۰۰۳

ترلوچن

الکمات دیکھا عجب چیز پالی
تمہاری ہنسی یاد کر لی، چرالی
اِدھر دکھ اُدھر دکھ ملے ہم جو دونوں
تو آنکھوں سے کانوں کی سن لی سنالی
بھروسہ تمہارا کیا جو ذرا سا
یہی بھول کی اور آفت بلا لی
بھلا وا کہیں اور کو دینا اب سے
بہت بھول میں نے بھی دیکھی، دکھالی
ترلوچن یہی کم نہیں تم نے اب تک
اگر لاج دنیا میں اپنی بچالی

جاوید اقبال، لوک مت بھون، جواہر لال نہرو مارگ ناگپور

ہندی سے ترجمہ

عزیز پری ہار

تھکن سے چور ابھی وہ رہِ عذاب میں ہے
نئے جہان کا منظر تو اس کے خواب میں ہے
خزاں کے دور کا حاصل ہیں ٹوٹتے رشتے
کھلیں گلاب، وہ موسم ابھی سراب میں ہے
دیارِ فن میں تو منزل کا کچھ نشاں ہی نہیں
شمار ایک دو قدموں کا کس حساب میں ہے
سحر سحر میں جو دوشن ہے دھڑکنوں کی طرح
وہ کیوں ہے ہم سے گریزاں وہ کیوں حجاب میں ہے
مرے دکھوں کا مداوا ہے جس کے پاس عزیز
بچھڑ کے مجھ سے وہ خود بھی تو اضطراب میں ہے

شعبۂ انگریزی، گورنمنٹ کالج، لدھیانہ پنجاب

بلقیس ظفیر الحسن

کوئی وعدہ کوئی اقرار نہ ہی کوئی امید
انتظار اس کا کیے جائے مگر حسرتِ دید
کس سے کیا کہیئے عجب عالمِ حیرانی ہے
حالِ دل ایسا کہ جس کی نہ کوئی دید شنید
ہاں بچھڑتے ہیں، مگر ایسے بچھڑتا ہے کوئی
نہ کوئی قول و قسم ہے نہ ہی وعدہ نہ وعید
رات پر رات در آتی رہی غم خانے میں
روز لوٹ آکے مرے در سے گیا روزِ سعید
ہوش کی لیجیے بلقیس ابا دسے کیا ہیں
دیکھئے یہ موسم پری خواہش قربِ خورشید!

۲۰۴ ۔ ۔ ۔ ۔ مثل روڈ ۔ ۔ ۔ ۲

بنگلہ: سمرش. بوسو

اردو: کمال احمد
ڈی ۱/۳/۳۲، سرسید احمد روڈ، کلکتہ ۱۴ ۔ ۷۰۰۰



جادوگر

گاؤں کے اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی نوکول کو عجیب سا احساس ہوا۔ کیا یہ وہی گاؤں ہے جسے وہ چھوڑ گیا تھا۔۔۔۔؟ ریل کی پٹریوں پر سے گاؤں اب کچھ کچھ شہر سا لگنے لگا ہے۔ پکے مکانات اور کارخانوں کے سلسلے جانے کب گاؤں کو ہڑپ کر گئے تھے۔ اور اگلا تھا دھوئیں اگلنے والا چمنیوں کا شہر۔

اس نے لمبا سانس کھینچا۔ لیکن اس کی ہوا۔۔۔۔؟ آج بھی وہی اپنائیت ہے اس میں۔ دوسرے لمحے وہ سانس اگلتے ہوئے ہنس پڑا۔ تو یہ گاؤں بنیا پالی، اس کی جنم بھومی ہے۔ پورب کی طرف ہی تو ہے وہ بنیا ہاٹ۔۔۔۔ سامنے میدان میں گائیں چرآتا ہوا شاید وہ داسو ہی تو ہے۔ ایک ایک کرکے گاؤں کے سب لوگ اس کو یاد آنے لگے۔ جب سب اسے دیکھیں گے تو حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ جانے کیا کیا پوچھیں گے۔ اس خیال ہی سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور ماں۔۔۔۔۔؟

کیا وہ آج بھی زندہ ہے، اور بہن۔۔۔؟ شاید اب تک کنواری بیٹھی ہو۔۔۔۔! کون بیاہ کریگا اس سے، اس بارش ٹپکتی چھت سے کون لے جائے گا اسے۔؟ اس کے قدم اچانک تیز ہو گئے۔ اور گیٹ پر پہنچ کر ایک جھٹکا سا لگا اسے۔ اسٹیشن ماسٹر تو بدل گیا ہے۔ ٹکٹ تھما کر عزارادی طور پر نمسکار کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"آپ نئے ہیں شاید۔؟"

دبلا پتلا گھنی زلفوں والا اسٹیشن ماسٹر متعجب ہو کر اس کی طرف تکنے لگا۔

"نیا تو نہیں ہوں۔۔۔۔۔۔ لیکن تم کو پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔"

نوکول کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"میں اس بنیا ہاٹ کا پرانا باسی۔ نونی دیگھور کا لڑکا۔ نوکول چندر گوئین۔" وہ اچانک رک گیا۔ دیگھور تو اس کا سرنیم ہونا چاہئے تھا۔۔۔۔ اسٹیشن ماسٹر سے رہا نہ گیا۔

"دیگھور کا لڑکا گوئین۔۔۔۔ جادو ٹونا سیکھا ہے کیا۔۔۔۔۔؟"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ وہ، جس طرح ہم انجن چلانے والے کو ڈرائیور کہتے ہیں نا، اسی طرح۔" نوکول نے دلیل پیش کی۔

"ہوں۔۔۔۔ جیسے میں کیشٹو پال سے اسٹیشن ماسٹر ہو گیا۔" اسٹیشن ماسٹر قائل ہو گیا۔ "ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا ہے۔" نوکول خوش ہو کر بولا۔

گیٹ سے نکلتے وقت اسٹیشن ماسٹر نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا گوئین۔ گاہے بگاہے ملنے آنا۔"

"ضرور، ضرور" دوسری بار پیشانی تک ہاتھ لے جا کر اس نے سلام کیا اسٹیشن ماسٹر نے اسے گوئین کہہ کر پکارا تھا۔ اس خیال سے وہ اتنا خوش ہوا کہ اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔

اسٹیشن سے باہر آ کر اس نے سائیکل رکشوں کی قطار کو دیکھا اس سے کچھ دوری پر ایک بیل گاڑی اور اس کا گاڑی بان سواری کے انتظار میں، اس نے غور سے گاڑی بان کو دیکھا۔ ارے وہ قاسم ہی تو ہے۔ اس کا لنگوٹیا یار سالا الو کی طرح تک رہا ہے مجھے پہچان نہیں پا رہا ہے شاید۔ گمبیر پر مالش بناتے ہوئے سبھوں پر نگاہ غلط دوڑاتے ہوئے وہ قاسم کی طرف بڑھا۔ قاسم بڑبڑا کر گاڑی سے اتر پڑا۔ "کہاں جائیں گے بابو۔؟"

نوکول آنکھیں بھینچے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ قاسم اسے بونقوں کی طرح تکنے لگا۔

"ارے سالے! مجھے پہچانا نہیں۔ میں ہوں نوکول۔ نونی دیگھور کا لڑکا۔"

قاسم نے اسے پہچان لیا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ "اب کب کے گئے آج لوٹے ہو"۔۔۔ قاسم شکایت بھرے لہجے میں بولا۔

"دو آٹھ برس ہی تو ہوئے ہیں۔" نوکول نے جواب دیا۔

"یہ کیا کم ہے؟"۔۔۔ قاسم کا گلا بھر آیا: "اس دوران بہت کچھ بدل

گیا ہے۔ ملک کے ٹکڑے ہوگئے۔ "ہندوستان پاکستان بنا۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم لوگ آرام سے رہو۔ کس کی مجال ہے جو تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔" نوکول ایسے بولا جیسے وہی اس کا محافظ ہو۔

اس دوران نوکول کے گرد غیر شناسا چہرے جمع ہوگئے۔ قاسم نے سبھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ سب تمہارے بیناہاٹ کے رہنے والے ہیں۔ یہ کانتو باگری کا لڑکا للت۔ بڑا ہوگیا ہے۔ رکشہ چلاتا ہے۔"

"او! کانتو کا لڑکا...... اتنا بڑا ہوگیا ہے۔" نوکول اس کی طرف اپنائیت سے دیکھتا ہوا بولا۔ اور للت کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اسے آپ کہہ کر مخاطب کرے یا تم۔ بچپن سے سنتا آیا تھا کہ گاؤں کا ایک لڑکا کہیں چلا گیا ہے۔ کھو گیا ہے۔ اس کے متعلق جتنے لوگ اتنی باتیں۔ آج نوکول کے ہاتھوں میں کا سوٹ کیس اور بدن پر صاف ستھرے کپڑے دیکھ کر اس نے اندازہ لگایا کہ شہر سے کافی روپئے کما کر لایا ہے۔ اس کا چرچا پوچھے باہر کیا لیا ہو لیتی ہیں۔ یہاں سے نکل کر کچھ کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ للت چونک پڑا۔ نوکول قاسم سے کہہ رہا تھا۔

"ارے بھئی یہ سب قسمت کا کھیل ہے۔ جہاں بھی جاؤ۔ قسمت نے ساتھ دیا۔ تو کامیابی یقینی ہے۔ لیکن ہاں۔ باہر جانے سے دل میں ایک مضبوط ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ پیسہ کمانے کا...... لیکن میں نے کبھی اس پر دھیان نہیں دیا۔ البتہ اپنے گرو سے کچھ منتر و تنتر سیکھ کر ادھا بن گیا ہوں۔ بھوت اتار سکتا ہوں۔ اسے قبضہ میں کر سکتا ہوں اور صرف بھوت ہی کیوں، جسے چاہوں اسے منتر کے ذریعہ اپنے بس میں کر لوں۔"

یہ سن کر کچھ لوگ تو گھبرائے۔ کچھ مایوس ہوگئے۔ اور چند ایک حیرت سے تکتے رہ گئے۔

نوکول نے ڈرتے ڈرتے للت سے پوچھا۔

"اچھا...... میری ماں کیسی ہے...؟"

"ہاں۔ ہاں۔ سب خیریت ہے۔ ماں بالکل بوڑھی ہوگئی ہے۔ کبھی ساگ سبزی بیچ لیتی ہے۔ کبھی ریلوے سے کوئلہ چن کر گذارہ کر لیتی ہے اور......" للت بولتے بولتے رک گیا۔ نوکول آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگا۔

"رادھا ــــ تمہاری بہن...... چلی گئی ہے...." للت پھر رک گیا۔ نوکول سے کچھ کہا نہ گیا۔ بہن چلی گئی یا کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے لیکن اس کا ذمہ دار وہ تو نہیں ہے۔ اس نے گاؤں یوں ہی تو نہیں چھوڑا تھا...... یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ دو پیسے کا روزگار نہیں۔ اوجھا اور سانپ کے پیچھے دن دن بھر مارا پھرتا تھا۔ ماں صبح و شام کوستی اور رادھا بھی اسے بڑے بھائی کا سمان نہیں دیتی تھی۔ اور پھر اس عمر میں جو ہوتا ہے وہی اس کے ساتھ ہوا۔ اسے ہری متی سے عشق ہوگیا...... اسی للت کی بہن ہری متی سے۔ جس کا اظہار اس نے کبھی نہیں کیا۔ ہمت ہی نہیں ہوئی۔ کس بل پر بیاہ کرتا۔ بیکار ــــ نکما ــــ اور اچانک ایک دن اس نے گاؤں چھوڑ دیا۔ پیسے کما کر لائے گا اس لئے ــــ لیکن اب کیا فائدہ...... بہن بھی رہی نہیں۔ اچانک اسے شدید غصہ آیا۔ کس سالے کے ساتھ بھاگ گئی ہے وہ۔ ختم کر ڈالوں گا اسے جیسے وہ واقعی جادو کے زور سے بھسم کر ڈالے گا۔ لیکن گرو نے کہا تھا غصہ نہیں کرتے اس خیال سے وہ چپ رہ گیا۔

"فکر کیوں کرتے ہو۔ ماں تو ہے...... چلو گھر چلو۔" اتنا کہہ کر للت نے اس کے ہاتھ سے سوٹ کیس لے لیا۔ اور رکشہ پر رکھ کر خود سائیکل پر سوار ہوگیا

"اچھا بھائی قاسم ــــ اچھا......" سبھوں سے بدائی لے کر نوکول رکشہ میں بیٹھ گیا۔ رکشہ چل پڑا۔

"کانتو کیسا ہے" نوکول نے پوچھا۔

"ویسا ہی ہے...... نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے...... مر بھی جائے تو......" للت رک گیا۔

بوڑھا بیمار باپ جب زندہ ہو تو لوگ ایسا ہی سوچتے ہیں۔

"اور ہری متی؟...... کیسی ہے وہ؟...... کہاں بیاہ دیا اس کو؟..." نوکول کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

للت سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بیاہ تو دیا تھا لیکن وہ دو ہو کر گھر میں بیٹھی ہے۔"

نوکول کا دل خوشی سے اچھل پڑا مگر اس نے اپنے چہرے کی تبدیلی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"چچ چچ ــــ جوانی میں بیوہ......" پھر ڈرتے ڈرتے اس نے پوچھا ــــ "کوئی بچہ وچہ......؟"

"ہاں۔ ایک بچہ ہوا تھا۔ وہ بھی مر گیا" للت تیزی سے پیڈل پر پاؤں مارتے ہوئے بولا۔

نوکول کو اب بیناہاٹ اچھا لگنے لگا۔ رکشہ جیسے محلے میں داخل ہوا تو ایک شور مچ گیا کہ بیراگی نوکول واپس آگیا ہے۔ بوڑھی ماں تو چیخ مار کر اس سے لپٹ گئی۔

گاؤں کے لوگ اسے دیکھنے آئے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ نوکول جادوگر بن گیا ہے۔ اور بھوت کو قبضے میں کر سکتا ہے تو سبھی مرعوب ہو گئے۔ اور دوسرے دن ہری متی بھی آئی۔ پان چباتے ہوئے سرخ ہونٹوں سے جب ہری متی نے پوچھا۔

"مجھے پہچان نہیں پائے"۔ ؟ تو نوکول گھبرا اٹھا۔

"کیسے نہیں پہچانوں گا۔ بیٹھو۔ بیٹھو"۔ اس نے مونڈھا بڑھایا۔ ہری متی بیٹھ گئی۔ نوکول کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"ماں ...... ماں ...... ہری متی آئی ہے ...... ماں"۔ اونچی آواز میں اس نے ماں کو پکارا۔

"سنا ہے تم بہت بڑے جادوگر ہو گئے ہو؟"

"ہاں! کچھ کچھ سیکھا ہے۔"

"میں بھی کچھ منتر جانتی ہوں۔"

"اچھا تو پھر مجھے اپنا شاگرد بنا لو۔"

"مگر وِدیا ایسے ہی مل جاتے ہیں۔ اس کے لئے امتحان دینا پڑتا ہے۔"

"امتحان بھی دوں گا۔ کب لو گی ......"؟

"وقت آنے پر"۔۔۔ ہری متی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور نوکول اسے گھورتا رہ گیا۔

ہری متی اس کی تیز نگاہوں سے گھبرا کر جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ نوکول اسے راستے تک چھوڑنے آیا اور ہری متی کو جاتے ہوئے تکتا رہا۔ اسے اپنی زندگی میں ایک خوش گوار تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ ہری متی نے اس کی بے معنی زندگی میں دوبارہ معنی پیدا کر دئے تھے۔ پہلی بار تو وہ اسے پا نہ سکا تھا لیکن اس بار وہ اسے حاصل کر کے ہی رہے گا۔ گرو سے جتنے منتر سیکھے تھے وہ سب آزمائے گا۔ اماوس کی رات کو مردے کی ہڈی ہاتھ میں دبائے تالاب میں سانس روکے ہری متی کے لئے منتر جاپ کرتا رہے گا۔ پھر ہری متی اس کے قبضے میں ہو گی۔ ایسا ہی گرو نے کہا تھا۔ ہاں ہری متی۔ ہاں۔ اس بار میں تمہیں کھوؤں گا نہیں۔ میں نے تمہیں پانے کا جادو سیکھ لیا ہے۔ تمہیں قابو میں کرنے کا منتر مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ اس بار تم کسی اور کی نہیں ہو سکتیں۔

گاؤں میں آئے نوکول کو کئی دن بیت گئے۔ دن بھر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا کبھی اس کے گھر کبھی اس کے گھر، اور ایک دن جب وہ ماسٹر جی کے گھر بیٹھا تھا۔ تو اچانک اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر انہوں نے کہا۔ "نوکول۔ تو اب کسی گرو کو تلاش کر لے۔ بغیر گرو کے تیرے منتر کسی کام کے نہیں"۔۔۔ اور نوکول کے سامنے ہری متی کا چہرہ گھوم گیا۔ اس نے گرو تلاش تو کر لیا ہے

لیکن اسے مستقل طور پر حاصل کرنے کے لئے ابھی کچھ عمل باقی ہے۔ اسے انتظار ہے تو اماوس کی رات کا۔ ! اور دو دن کے بعد وہ رات آ ہی گئی۔

کالی ڈراؤنی بھیانک اماوس کی رات۔

آدھی رات کے وقت نوکول ہاتھ میں کدال لئے گھر سے نکل پڑا۔ اور ڈراؤنی رات نوکول کے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ کر رہی تھی۔ لیکن تیز قدموں سے چلتا ہوا قبرستان پہنچ گیا۔ جلدی جلدی اس نے اپنے ننگے بدن پر راکھ ملی اور پھر قبر کھودنا شروع کر دیا۔ اس کے بازو شل ہو گئے۔ لیکن ایک لگن تھی کہ وہ کدال چلائے جا رہا تھا۔ آخر مردے کی ایک ہڈی اس کے ہاتھ لگی۔ اس نے مٹھی میں اسے بھینچ لیا۔ کدال وہیں چھوڑی اور تالاب کی طرف دوڑتا ہوا تالاب تک پہنچ گیا۔ تیزی سے منتر پڑھنے لگا۔ اور آنکھیں موند چھپاک سے پانی میں کود پڑا۔ پانی سے اوپر اس کی بند مٹھی میں مردے کی ہڈی اور وہ خود پانی میں ڈبکی لگائے سانس روکے ہری متی کا منتر جاپ کر رہا تھا کیونکہ اس بار ہری متی کو ہمیشہ کے لئے پانا تھا۔

لیکن شاید اس بار پھر منتر میں کہیں بھول ہو گئی تھی۔ نوکول دوبارہ سے سر نہ اٹھا سکا۔

ڈوب گیا وہ۔۔۔!

دوسرے دن تیسرے پہر لوگوں نے نوکول کی لاش پانی پر بہتے، لاش کی بند مٹھی میں دبی مردے کی ہڈی۔ کھدی ہوئی قبر کے قریب کدال نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

"مردے سے جادو کھیلنا آسان نہیں۔ جان بھی جا سکتی ہے"۔ شاید کو یہ معلوم نہیں تھا، لیکن حقیقت تو صرف ہری متی جانتی تھی۔

کھلے آسمان کی طرف ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ہری متی بڑبڑائی۔

"نوکول! تو میرے دل کی بات نہ سمجھ سکا۔ میں تو بنا کسی منتر کے تیرے بس میں تھی۔ ایک بار صرف پوچھ کر دیکھا تو ہوتا۔" ❋

مکتوبات

پہلے اسے پڑھ لیجئے

*

شاعر کے گزشتہ شماروں میں شائع ہونے والے بعض مضامین اور ان سے متعلق خطوط کا شدید ردِ عمل ہوا ہے۔ ضروری اور غیر ضروری خطوط کا ایک سلسلہ ہے کہ ان تمام کا "مکتوبات" کے کالم میں شامل کرنا ممکن بھی نہیں جس کے لئے ہم اپنے قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

عبدالغفور دسنوی صاحب کا مقالہ "مدد ور سو د سے بزر سو دنگ" ان دونوں کتابوں پر پھیلی ہوئی منفی بحث کو سمیٹنے کی ایک خوب صورت کوشش تھی۔ شاعر کے اس اقدام کو جہاں سراہا گیا وہیں اسے غیر ضروری بھی سمجھا گیا۔ اس ضمن میں صرف ایک خط مظفر فیروز آبادی صاحب کا شامل کیا جا رہا ہے۔ اب اس موضوع پر کوئی خط یا مضمون شامل نہیں کیا جائے گا۔

علی جواد زیدی اور شان الحق حقی صاحبان کے مضامین پر موصولہ خطوط [یا مضامین؟] میں سے صرف دو شامل کئے جا رہے ہیں۔ آئندہ کوئی طویل خط یا مضمون مذکورہ مضامین پر شائع نہیں کیا جائے گا۔ ہاں! زبان و بیان کے متعلق نئے مباحث کے لئے شاعر کے صفحات حاضر ہیں۔ تاہم اختصار سے کام لینے کی گزارش ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر نثار احمد فاروقی کی علمی ذاتی نوعیت کی ہو گئی ہے۔ شاعر ایک خالص علمی، ادبی اور تہذیبی جریدہ ہے۔ وقتی سنسنی خیزی، سستی شہرت اور شخصی یا گروہی مصلحت پسندی سے شاعر کو ہمیشہ پاک رکھا گیا ہے۔ مگر افسوس ہوا بعض جملے یا فقرے دونوں ہی حضرات کے خطوں میں در آئے کہ ایک علمی بحث "ذاتی" ہو کر رہ گئی۔ ہمارے لئے دونوں ہی حضرات محترم ہیں۔ اب اس نوعیت کی کوئی بھی تحریر شاعر میں شائع نہ ہو سکے گی۔

شاعر میں شامل خطوط سے مدیرِ شاعر یا ادارۂ شاعر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ یہ آپ کا اپنا کالم ہے۔ ایک اہم ترین کالم ہے زیادہ سے زیادہ خوب صورت اور معیاری بنائے رکھئے۔ اس کے لئے بعض امور کو بطور خاص ملحوظ رکھنے کی درخواست کی جاتی ہے۔ خطوط مختصر ہوں، شاعر کے مندرجات سے متعلق یا اس کے حوالے سے ہوں۔ صاف و خوش خط اور علیحدہ کاغذ پر ہوں۔ ذاتیات سے پاک ہوں اور سرسری و توصیفی کم اور مسائل زیادہ ہوں۔ جو خطوط اس معیار کے نہ ہوں گے وہ ضائع کر دئے جائیں گے۔ [ادارہ]

معیاری زبان کا سوال مزید صراحتیں

علی جواد زیدی

"شاعر" کا تازہ شمارہ ملا۔ اس میں آپ نے میرا وہ مضمون شائع کرکے کرم فرمایا جو میں نے معیاری زبان کے متعلق مکرمی شان الحق حقی کے مضمون کی صدائے بازگشت کے طور پر ان سے دو تین برس پہلے تحریر کیا تھا۔ چونکہ اس مضمون میں ایک اہم سوال اٹھایا گیا تھا اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اس کے مندرجات سے اپنے اہلِ ملک کو بھی آگاہ کرکے انہیں اس موضوع پر سوچنے کی دعوت دوں۔ اس برِصغیر کا یہ بڑا المیہ ہے کہ جو کتابیں "نمایاں کتابیں" سرحد کے دونوں طرف برابر شائع ہوتی ہیں ان سے ہم مطلع نہیں ہو پاتے۔ حقی صاحب کی کتاب "نقد و نگارش" انہیں کی عنایت سے مجھے ۱۹۸۲ء میں ملی تھی۔ ویسے تو اس مجموعے میں کئی اور خیال انگیز مضامین شامل تھے، لیکن اس مضمون کو میں نے خصوصیت سے اس لئے چنا کہ ہماری زبان میں شکست و ریخت کا فطری عمل جاری و ساری ہے اور بعض حالتوں میں جس کی نوعیت اور سمتیں غیر متعین سی ہوتی جا رہی ہیں ان کے پس منظر میں بدلتے معیاروں بلکہ خود معیاروں کا سوال ابھر کر سامنے آ گیا۔

میری مجبوری یہ تھی کہ نہ تو میں حقی صاحب کا پورا مضمون نقل کر سکتا تھا نہ اس کے طویل اقتباسات دے کر ہر پہلو پر اظہارِ خیال کر سکتا تھا۔ اس لئے میں نے کچھ تاریخی پس منظر اور کچھ مستقبل کے امکانات پر ایک سرسری نظر ڈالی تھی۔ آپ نے پورا مضمون شائع کرکے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ شان الحق حقی صاحب نے کچھ اور ضمنی یا بنیادی باتیں بھی سامنے رکھی ہیں۔ ان سب پر کھل کر بات ہو جائے تو اچھا ہے۔

حقی صاحب نے تدوینِ لغت اردو کے سلسلے میں معرکہ آرا کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنے تمام سکالرانہ ساتھ بیٹھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ فیصلہ لغت بورڈ کا بھی ہے کہ بشمول لغت کی حد تک معیار تو از ہوگا اور تواتر کے لئے دو مثالیں اور یہ ممکن نہ ہو تو ایک ہی کافی سمجھی جائے گی۔ لیکن انہوں نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے بعد بھی "معیار کا مسئلہ اپنی جگہ پر موجود ہے۔"

اردو ایک بین علاقائی اور بین ملکی زبان ہے۔ اس میں نئے نئے الفاظ اور محاورے انفرادی اور اجتماعی سطح پر آتے رہتے ہیں۔ حقی صاحب کا خیال اردو کی عام لسانی اور ادبی پالیسی کا اظہار ہے کہ ہم سب سمتیں کھلی رکھنا چاہتے ہیں، مگر ایسا نہ ہو کہ ایک سمت کا ریلا اس کے خدوخال ہی پر پانی پھیر دے۔ یہی وہ پہلو ہے جو دانش وروں کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ اور جس کے لئے میرا خیال ہے کہ ہماری اکادمیوں کو متوجہ ہونا چاہئے۔ بدقسمتی سے اکادمیوں کا ڈھانچہ غیر علمی ہوتا جا رہا ہے۔ عملِ کل میں جمہوریت کی حد بندیاں ہیں۔ ان کے عام کام، جن میں زبان و ادب کا عمومی فروغ شامل ہے جمہوری فیصلے کا طالب ہے۔ لیکن خالص علمی اور فنی مسائل کے لئے خالص دانش ورانہ تکنیکی ہیئت کی ضرورت بھی مسلم ہے۔ اس کی عدم موجودگی اور اس سلسلے میں کسی معینہ پالیسی کے فقدان کی بدولت اکثر اقدامات دو سالہ منصوبے سے بھی رہ جاتے ہیں۔ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اکادمیوں کے لئے کیسا ڈھانچہ بنایا جائے کہ دونوں طرح کے کام آگے بڑھتے رہیں۔ ساہتیہ اکادمی اور دوسری اکادمیوں کی تنظیم کے سلسلے میں ایک کمیٹی بٹھائی گئی تھی اس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے۔ اور اخبارات میں اس کا ایک مبہم سا خاکہ شائع بھی ہوا ہے۔ کاش تمام اردو اکادمیاں اس رپورٹ کا مطالعہ پوری توجہ سے کر سکیں اور اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ سب اکادمیاں ایک مرکزی کمیٹی کی تشکیل کریں جو آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرے تاکہ ایسے بنیادی مسائل جیسے تدوینِ لغات و محاورات وغیرہ اور معیاری زبان کے متعلق مسئلوں پر بھی گفتگو اور غور و فکر ہو۔ یہ طویل المدت منصوبہ ہوگا۔ لیکن اس پر غور کرکے جو قدم اٹھایا جائے گا۔ ہم اس پر فخر کرتے ہیں کہ آج اردو کے بولنے والے سارے کرۂ ارض پر پھیل گئے ہیں۔ لیکن وہ معیاری لکھنا اور بولنا چاہتے ہیں اور انہیں خطوط پر اپنے بچوں کو تعلیم دلانا چاہتے ہیں۔ ان کے لئے معیار کا مسئلہ اہم ہے۔ اور اسی کے لئے لکھا ہے!

میرے مضمون میں دو گزارشوں کا چھپنا لازمی ہے۔ میرا مضمون جس سے متعلق رہتا ہے وہ ایک کی طرف خصوصیت سے اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ص ۱۱ س ۱۹۔ یورپ غلط، یوروپ صحیح۔ ص ۱۲ س ۳ ہر حاضر یا علی کے بعد کچھ چھوٹ گیا ہے۔ شاید "دہلوی یا لکھنوی کہلوا" اسی سطر پر یہ لفظ کے خانے پر اضافہ طلب: پہلا سوال ہوگا کہ تذکرہ ... ۱۰ اسی صفحے پر نیچے سے تیسری سطر کے آخر میں اضافہ طلب: لغات میں نئے استعمال اور متروکات اصطلاحات کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جائے؟

اے -۵ گرین فیلڈ، ہالال کیو زرود، اندھیری [ایسٹ] ممبئی ۹۳

۱۵

معیاری زبان کا تعین

عصمت جاوید

زبان کے معیار کے مسئلے پر جناب شان الحق حقی صاحب کا مبسوط مقالہ شاعر کے حالیہ شمارہ "۳ [۱۹۹۰]" میں نظر سے گزرا۔ شان الحق حقی صاحب کا نام ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے اردو دنیا میں ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس لئے توقع تھی کہ مقالۂ مذکورہ میں اس مسئلے کا خاطر خواہ جواب تلاش کرنے یا اس کا تشفی بخش حل نکالنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ لیکن پورا مقالہ پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوا۔ پڑھنے کے بعد محسوس کیا کہ بات جہاں سے چلی تھی وہیں آکر رک گئی ہے۔ آگے نہ بڑھ سکی۔ اس لئے کہ فاضل مقالہ نگار نے مقالے کے مرکزی موضوع پر گفتگو کرنے کے بجائے ایسے ضمنی مسائل کے تناسب سے زیادہ بحث کی ہے۔ جو مرکزی موضوع کو سلجھانے میں کوئی مدد نہیں دیتے بلکہ قاری کے ذہن کو بھٹکا دیتے ہیں۔ مثلاً اردو زبان کی قوتِ تصرف سے متعلق یا عربی فارسی اور انگریزی کے اردو زبان کی برتری کا دعویٰ [ص ۴۰] یا اردو زبان کے سابقوں اور لاحقوں سے متعلق یہ دعویٰ کہ "اس میں سابقوں لاحقوں کی تعداد غالباً ہر زبان سے زیادہ ہے۔" [ص ۴۱] ان تمام باتوں کا اردو زبان سے تعلق تو ہے لیکن اردو زبان کے معیار سے ان کا دور کا واسطہ ہے جو مقالے کا پر دوہرانے کی حد تک ہے۔ اس طرح زبان کے معیار کا جو سوال قاری کے ذہن میں سوالیہ نشان بنا رہتا ہے جوں کا توں...

ہے کہ حقی صاحب نے نفسِ مضمون سے ہٹ کر اردو زبان کی امتیازی لسانی خصوصیات سے متعلق جتنے دعوے کئے ہیں اور اس کی برتری دنیا کی اکثر زبانوں پر ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ہر ماں کو اپنا بچہ سب سے زیادہ پیارا ہوتا ہے اس لئے وہ اسے سب سے زیادہ حسین بھی سمجھتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ تاثراتی و موضوعی حقیقت تحقیق و تجزیہ کی کسوٹی پر کھری اترتی بھی ہے؟

مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ اردو میں "نئے مصادر ڈھالنے کی بڑی صلاحیت موجود ہے جو عربی، فارسی اور انگریزی میں نہیں۔۔۔۔ ان زبانوں کے مادّے اور مصادر لگے بندھے ہیں۔۔۔۔" [ص ۲۰] حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس فہرست میں صرف عربی ایسی زبان ہے جس کے مادّے اور مصادر لگے بندھے ہوتے ہیں کیونکہ اس کا تعلق سامی خاندان السنہ سے ہے۔ فارسی اور انگریزی تحلیلی زبانیں ہیں۔ فارسی میں اسم و صفت سے مصدر ڈھالنے کی صلاحیت اردو سے شاید کم ہو لیکن انگریزی اس باب میں اس قدر آگے ہے کہ اردو اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچی۔ انگریزی میں سابقوں اور لاحقوں کے اضافے سے اسماء صفات سے افعال بنانے کی صدہا مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ انگریزی میں ایسے افعال کی بھی کمی نہیں جو بطور اسما بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً YOU، WORK، SLEEP وغیرہ۔ حقی صاحب فرماتے ہیں "'آنا'، 'نا' اور 'یانا' لاحقوں کے ساتھ بیشتر نئے مصادر بنائے جا سکتے ہیں۔ جیسے برقانا، فلمانا" [ص ص ۲۸-۲۹] "بنائے جا سکتے ہیں" اور "بنائے جاتے ہیں" میں وہی فاصلہ ہے جو قول و فعل کے درمیان ہوتا ہے۔ اردو تو جھینانا، انگلیانا، تلاشنا، اپنانا جیسے نئے وضعی مصادر کو بھی ہضم نہیں کر سکی، اس میں کوئی شک نہیں کہ خریدنا، بخشنا، بدلنا، تراشنا جیسے چند مصادر جن کی مثالیں حقی صاحب نے دی ہیں چلن میں ہیں لیکن اردو زبان کے جملہ مصادر کے مقابلے میں ان کی تعداد آٹے میں پائے جانے والے روایتی نمک سے بھی کم ہے۔ اس گنی چنی تعداد کی اساس پر بلند بانگ دعوے کرنا کہاں تک مناسب ہے کہ اردو اس خصوصیت میں انگریزی سے بڑھی ہوئی ہے۔ جب کہ انگریزی میں اس قسم کے صدہا مصادر چلن میں ہیں۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ "اس میں [اردو میں] سابقوں اور لاحقوں کی تعداد کسی بھی زبان سے زیادہ ہے۔" [ص ۲۹] دلیل طلب ہے۔ پھر یہ ادعا بھی عجیب ہے کہ اردو کی ترکیب نحوی ایسی ہے "جو ایک آغوشِ کشادہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ہر بیرونی لفظ کو آسانی سے سما لیتی ہے" [ص ۲۹] حقی صاحب اس دعوے کی دلیل میں مندرجہ ذیل مثال پیش کرتے ہیں۔

"میں جنرلی سپیکنگ آپ سے ایگری کرتا ہوں مگر پلیز آپ ایک دو پوائنٹس پر مائنر سے ڈفرینس آف اوپینین کو مائنڈ نہ کریں" [ص ۲۹] پھر لکھتے ہیں "آپ انگریزی جملے میں اس طرح اردو ملا کر نہیں بول سکتے کہ اسم، فعل، حرف، متعلق فعل، حکائیہ، ندائیہ سب بلاتکلف کھپتے چلے جائیں" [ص ۲۹] اس دعوے کو وہی شخص قبول کر سکتا ہے جو لسانیات کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ ہر زبان میں افعال، ضمائر اور حروف جار اس کی بنیادی ساخت کا درجہ رکھتے ہیں۔ یعنی دین کے عمل سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یعنی دین کا عمل اسما صفات تک زیادہ محدود ہے۔ اور متعلقات فعل اور حرف عطف و حروف ندائیہ وغیرہ بھی کم کم۔ اس سلسلے میں مثال کی بات نہیں کرتا کہ یہ ساری زبانوں کا ہے لیکن حقی صاحب نے اردو کی ترکیب نحوی کی جو امتیازی خصوصیت بتلائی ہے وہ ہند یورپی خاندان السنہ کی عام خصوصیت ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اپنی کتاب "اردو پر فارسی کے لسانی اثرات" میں کھل کر بحث کی ہے۔ یہاں صرف حقی صاحب کی دی ہوئی مذکورہ بالا مثال کا تجزیہ کروں گا۔ مذکورہ جملے میں جو اردو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔

"میں ۔۔۔۔ آپ سے ۔۔۔۔ کرتا ہوں مگر آپ ایک دو ۔۔۔۔ پر ۔۔۔۔ سے ۔۔۔۔ کو ۔۔۔۔ نہ کریں۔"

۱۔ میں اور آپ ضمائر شخصی ہیں ۲۔ کرتا ہوں اور کریں افعال ہیں ۳۔ پر، سے، کو حروف جار ہیں۔ ۴۔ ایک دو صفات عددی ہیں اور یہ بدل سکتے ہیں ایک دو پوائنٹس کی جگہ وَن، ٹو پوائنٹس بھی کہہ سکتے ہیں۔ جملے کی ساخت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا ۵۔ مگر حرف استثنا ہے نہ حرف نفی۔ [مگر BUT میں تبدیل ہو سکتا ہے]

مذکورہ جملے میں فعل، ضمیر اور حروف جار بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو بدل دیا تو زبان بدل جائے گی۔ یہ اردو ہی کی نہیں بلکہ ہند یورپی خاندان کی عام خصوصیت ہے۔ اس لئے مذکورہ بالا انگریزی الفاظ ملا کر آپ اس قسم کا تجزیہ مراٹھی میں بھی کر سکتے ہیں اور گجراتی میں بھی۔ یہ تجزیہ مذکورہ اردو الفاظ ملا کر انگریزی میں بھی اس کے بنیادی اجزائے کلام کو برقرار رکھتے ہوئے کیا جا سکتا ہے مثلاً DON'T MIND، مہربانی I AM مجموعی حیثیت ← متفق WITH YOU BUT IF THERE IS معمولی سا ← اختلاف رائے ON ONE OR TWO نکات

یہ جملہ آپ کے کانوں کو عجیب و غریب ضرور لگے گا یوں کہ اردو ملا کر انگریزی بولنے کا چلن اس لئے نہیں ہے کہ انگریزی سیاسی و ثقافتی اعتبار سے ہم پر حاوی رہی ہے۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو انگریزی کی ترکیب نحوی بھی اردو کے لئے آغوش کشادہ رکھتی اور اس قسم کے جملوں سے ہم اسی طرح گوش آشنا ہوتے جس طرح آج کل انگریزی ملی اردو سے مانوس ہیں یہاں اردو کی ترکیب نحوی کی کشادگی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

خیر یہ تو مقالہ ہٰذا کی وہ ضمنی باتیں ہیں جن کی اصل موضوع سے نسبت تو ہے لیکن ان بحثوں کو کچھ سے بہرحال دور کی نسبت ہے۔ مقالے کا اصل محور زبان کی معیار بندی کا ہے۔ اس موضوع پر شان الحق حقی صاحب نے کچھ کارآمد معلومات بھی فراہم کی ہیں انہوں نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ زبان ایک تغیر پذیر نامیہ ہے۔ اس لئے "فصاحت کا معیار دور بہ دور بدلتا رہا ہے" [ص ۲۵] "ایک زمانہ تھا، جب شہنشاہی یا جاگیردارانہ معاشرے میں کلام الملوک کو اصح الکلام سمجھا گیا ہے۔" [ص ۲۶] "پھر وہ بساط الٹ چکی جاگیرداری دور بھی ختم ہو رہا ہے" [ص ۲۷] اب اہل زبان کا دور بھی ختم ہو گیا" "جہاں تک گنے چنے اہل زبان کا تعلق ہے ان کی اولاد اتنی ہی دور یا قریب ہے جتنے کہ مقامی لوگ یا ان کے بچے۔ حق یہ ہے کہ اس دور میں مقامی لوگوں نے اردو کا جتنا دامن بھرا ہے اتنا اہل زبان کا مقدور نہ تھا" [ص ۲۷] اگرچہ حقی صاحب نے پاکستان کو پیش نظر رکھ کر یہ باتیں لکھی ہیں لیکن ہندوستان میں بھی جہاں اردو اس کے مستقر اور اس میں بھی نہ رہی' اہل زبان تیزی سے 'ہجرت زدہ' ہو رہے ہیں۔ اور اردو ادب کا دامن بھرنے والوں میں غیر مقامی اہل قلم ہی کا پلہ بھاری ہے۔ حقی صاحب کا یہ خیال بھی درست ہے کہ "ہر بڑی زبان میں کچھ علاقائی تنوع ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف انسانی گروہ اپنے اپنے پیشے، تربیت، ماحول، مذاق کے لحاظ سے کسی قدر مختلف لسانی رجحانات رکھتے ہیں۔ چند حساس کان نہ صرف مقامی لہجے اور محاورے کو پہچان جاتے ہیں بلکہ مختلف پیشوں، حرفوں، طبقوں، محلوں، گھرانوں تک کی بولی کو تاڑ لیتے ہیں" [ص ص ۲۶، ۲۷] یہ سب کچھ کہنے کے باوجود حقی صاحب نے معیاری زبان کے تعین کے بارے میں رہنما اصولوں کی نشاندہی نہیں کی ہے اور یہی کمی اس مقالے میں کھٹکتی ہے۔

حقی صاحب نے درست فرمایا ہے کہ "ایک جمے جمائے معاشرے میں ہر زبان کی ایک معیاری بولی ہوتی ہے اور کئی فروعی اور تحتی بولیاں جو اس کے ارد گرد بستی ہیں۔ ایک انگریزی مصنف [ENGLISH] نے ان کا نقشہ یوں پیش کیا ہے۔ کہ زبانوں کی ایک کھڑی تقسیم ہوتی ہے اور ایک پڑی تقسیم ڈائیلکٹ افقی یا پڑی تقسیم میں آتے ہیں۔ ان کا [illegible] جغرافیائی یا مقامی ہوتا ہے۔ کھڑی یا عمودی تقسیم طبقہ داری ہوتی ہے" [ص ۲۹] میں کہتا ہوں کہ یہ تقسیم انتہائی معقول ہے۔ عمودی تقسیم میں معیاری زبان سر فہرست ہوتی ہے۔ گلیسن نے معیاری زبان کی یہی تین قسمیں کی ہیں۔ ۱۔ شستہ زبان CULTIVATED SPEECH ۲۔ عام زبان COMMON SPEECH اور ۳۔ عوامی زبان FOLK SPEECH یہ دراصل ایک ہی زبان کی تین سماجی بولیاں ہیں۔ شستہ بولی یا شستہ زبان ہی دراصل معیاری زبان ہے جسے استعمال کرنے والے تعلیم یافتہ شہری اور عام طور پر متوسط یا اعلیٰ طبقے کے افراد ہوتے ہیں یہی اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ ادب کی تخلیق بالعموم اسی زبان میں ہوتی ہے۔ اسی میں عالمانہ مقالے لکھے جاتے ہیں۔ اور یہی زبان معاشرے میں اعتبار کا درجہ رکھتی ہے۔ عوامی زبان کے استعمال کرنے والے زیادہ ان پڑھ یا معاشرتی اعتبار سے سب سے نچلے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں یا دیہات میں رہنے والے لوگ۔ بیوپاری، شہری، مزدور، اور اہل حرفہ بھی بالعموم "عوامی زبان" بولتے ہیں۔ عام زبان بقول گلیسن شستہ زبان اور عوامی زبان کے مابین پائی جانے والی مختلف سطحوں کے ایک بڑے سلسلے کا سہولت بخش نام ہے۔

چونکہ ہماری زبان اردو، ہند۔ پاک گیر زبان ہے۔ اور اس کا جغرافیائی حلقہ بہت وسیع ہے۔ اس لئے افقی سطح پر اس پر مختلف علاقائی زبانوں کے اثرات کا پڑنا لازمی ہے۔ زبان کا معیار متعین کرنے کے سلسلے میں لہجہ بڑی اہمیت اختیار کرتا ہے۔ کیونکہ اصل زبان وہ ہے جو بولی جاتی ہے ایک زمانے میں دلی کی اردو کے محلّے، لکھنؤ کی اردو کے معلّا اور پورب کا لہجہ بالعموم مستند مانا جاتا تھا۔ یہ اہل زبان کا معیاری لہجہ تھا۔ لیکن اب صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی زبان کے لہجے بھی مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ میں نے اپنی تصنیف نئی اردو قواعد میں لکھا ہے۔

"معیاری زبان بھی اتنی ہی فطری ہوتی ہے جتنی غیر معیاری زبان۔ جب ایک زبان کا دائرہ استعمال پھیلتے پھیلتے دوسرے لسانی خطوں میں بھی در اندازی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس زبان پر علاقائی رنگ کا چڑھنا ایک ناگزیر امر ہے۔ چونکہ کسی لسانی خطے کی زبان اس خطے کی عام زبان ہوتی ہے۔ اس لئے وہ "دو زبانی" فرد جو اپنی علاقائی زبان کے علاوہ کوئی بین علاقائی زبان اپنے گھر میں استعمال کرتا ہے، موخر الذکر کو غیر شعوری طور پر اپنے علاقائی لہجے میں ادا کرنے پر مجبور ہوتا ہے اس لئے لہجے اور لفظیات کے اعتبار سے پنجابی اردو، میسوری اردو، بہاری اردو، مراٹھی اردو اور مدراسی اردو آپس میں اتنی ہی مختلف ہوتی ہیں جتنی دہلی کی معیاری اردو سے مختلف [illegible]

اپنے پنجابی پن اور بہار والے بہاری پن کا اظہار کرتا ہے جیسا کہ اپنی اردو میں شرفِ ملت اور حصص کی نمائندگی کرتا ہے۔" [قواعد اردو ص ۱] ان مختلف لہجوں میں سے کسی ایک لہجے کو برتری حاصل نہیں ہے۔ پھر کئی مختلف لسانی علاقوں کے وہ لوگ جن کی مادری زبان اردو ہے، اپنے گھروں میں علاقائی لہجے و لفظیات میں بات چیت کرتے ہیں لیکن علمی محفلوں اور تہذیبی مجالس میں جب وہ شستہ زبان میں گفتگو کرتے ہیں تو ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے علاقائی لہجہ پر قابو پائیں۔ یہ اور بات ہے کہ بہت کم لوگ اس کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک وسیع پیمانے پر بولی جانے والی زبان کے معیاری لہجہ کا تعین بے سود ہے۔

اب تلفظ کی باری آتی ہے کہ شستہ زبان کا معیاری تلفظ کیا ہو۔ اردو اپنے شین قاف سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اہل پنجاب اور اہل آندھرا پردیش [قدیم ریاست حیدرآباد] قاف کے اردو تلفظ پر قادر نہیں۔ ایسے اہل پنجاب رک ر اور حیدرآبادی رخ ر میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ اختلاف صرف بول چال کی حد تک ہے ورنہ دونوں علاقوں کے اردو بولنے والے تحریر میں ق پر مشتمل الفاظ میں ق رکھتے ہیں جیسے اقبال، ورق وغیرہ۔ میں حقی صاحب سے متفق ہوں جب وہ فرماتے ہیں "معیار کی ضرورت تسلیم لیکن تلفظ کے ان اختلافات کو اہمیت دینا بے جا ہوگا جو فطری مخارج سے تعلق رکھتے ہیں۔" [ص ۲۰] لیکن اتنا اضافہ ضرور کروں گا کہ "ص" کی جگہ "س"، "ز" کی جگہ "ج" کا تلفظ [جیسے ضربت کی جگہ سربت اور ہزار کی جگہ ہجار، کہنا] اسی طرح غ کی جگہ گھ اور خ کی جگہ گ کا تلفظ معیاری زبان میں ناقابل قبول ہوگا۔ "ع" کے تلفظ پر اہل اردو بالعموم قادر نہیں ہیں وہ عورت کا تلفظ اورت اور علم کا تلفظ آلم ہی کی طرح کرتے ہیں۔ اس لئے اردو میں ع کا یہی معیاری تلفظ ہے اسی طرح اہل اردو ہائے حطی اور ہائے ہوز کے تلفظ میں عربوں کی طرح امتیاز نہیں کرتے۔ اس لئے اردو میں حاد کو ہاد ہی بولتے ہیں۔ البتہ تحریر میں ث، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع کو عربی و فارسی الفاظ میں کہیں ان زبانوں کی تقلید میں اور کہیں ان کے برخلاف "تحریری حروف" ORTHOGRAPHEMES کی حیثیت سے باقی رکھا گیا ہے۔ اور یہی اردو زبان کا معیاری املا ہے۔ یہ تو صوتیوں کی ادائیگی کی بات تھی۔ لیکن اردو میں ایسے صدہا مستعار الفاظ ہیں، چاہے وہ پراکرت سے مستعار ہوں، چاہے انگریزی یا عربی و فارسی سے، جن کا اہل اردو اپنے طور پر تلفظ کرتے ہیں اور یہ تلفظ اکثر صورتوں میں اصل زبانوں کے تلفظ سے ممتاز ہوتا ہے۔ اردو نے پراکرت کے علاوہ عربی و فارسی مستعار الفاظ میں صوتی، صرفی اور معنوی تصرفات بہت بڑے پیمانے پر کیے ہیں۔ اردو کی اس زبردست قوتِ تصرف کا اندازہ خاکسار کے مطبوعہ تحقیقی مقالے "اردو پر فارسی کے لسانی اثرات۔ تصرف کے آئینے میں" کو پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ اس مقالے میں انشا کے اس لسانی اصول کو بنیاد بنایا گیا ہے کہ

"جو لفظ اردو میں آیا وہ اردو ہو گیا۔ خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی۔۔۔۔ اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح وہ لفظ اردو کا لفظ ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح اس کی صحت و غلطی اس کے اردو میں رواج پانے پر منحصر ہے۔" [دریائے لطافت]

اس بنیادی اصول کی رو سے وہی تلفظ معیاری ہے جسے شستہ زبان بولنے والوں کی اکثریت نے غیر شعوری طور پر اور اپنی لسانی عادات کی مطابقت میں قبول کیا ہے۔ اگرچہ اکثریت خذر، شمع، فجر، چند، آتش، نثر، شہر، عطر [تمام درمیانے نام] وغیرہ کو جو اردو نے اصل ساکن الاوسط ہیں متحرک الاوسط بنا کر ادا کرتی ہے تو یہی اردو کا معیاری تلفظ ہے۔ البتہ 'عوامی زبان' اور ایک حد تک 'عام زبان' میں جبر، سخت، اصل، عشق، صبر، علم، نظم، شعر وغیرہ کو بھی متحرک الاوسط بنا کر ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ 'شستہ زبان' میں اس صوتی تصرف کو قبولِ عام کا درجہ نہیں ملا ہے۔ اس لئے ان الفاظ کا اردو تلفظ معیاری نہیں بلکہ کم معیاری SUB STANDARD کہلائے گا۔ اسی طرح الفاظ مرض، عرق، تلف، اور شرف وغیرہ عام زبان میں برخلاف اصل ساکن الاوسط استعمال ہوتے ہیں لیکن شستہ زبان میں اصل زبان کے تلفظ کی پیروی کی جاتی ہے اس لئے ان الفاظ کو ساکن الاوسط بنا کر استعمال کرنا کم معیاری کہلائے گا۔ اسی طرح شستہ اردو میں آصف [بجائے آصَف] جواد [بجائے جوّاد] آزردہ [بجائے آزُردہ] خودرو [بجائے خودرَو] درجہ [بجائے دَرَجہ] مثلاً [بجائے مَثَلاً] معیاری تلفظ ہے۔

اس معیاری تلفظ کو عربی و فارسی الفاظ کی حد تک وہ پڑھے لکھے لوگ قبول نہیں کرتے جو عربی و فارسی سے واقف یا ان زبانوں کے عالم ہیں لیکن یہ ان کا غیر لسانی رویہ ہے کیوں کہ بقول انشا یہ اردو لفظ ہو گئے ہیں اس لئے ان پر عربی و فارسی کے نہیں بلکہ اردو تلفظ کے صوتی رجحانات کا اطلاق ہوگا۔ اس لئے اردو میں شَجاعت نہیں شُجاعت، ثَبوت نہیں بلکہ ثُبوت۔ قِیامت نہیں قَیامت، وُضو نہیں وَضو، المِیہ نہیں المیَہ، فَتوی نہیں فتوٰی وغیرہ ہی معیاری تلفظ کے ذیل میں آتے ہیں۔ البتہ ان عربی و فارسی الفاظ کے اصل تلفظ کو شاعری کی زبان میں برقرار رکھنے کا جو رجحان پایا جاتا ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اس کی ضرورت لسانی نہیں فنی زیادہ ہے۔

چوں کہ اردو رسم الخط میں اعراب بالخصوص زیر، زبر، پیش اور علامت تشدید [ّ] کا استعمال نہیں ہوتا اس لئے اکثر الفاظ کا غلط تلفظ بھی عام زبان میں رائج ہو گیا ہے۔ اور یہ تلفظ کم معیاری نہیں بلکہ غیر معیاری ہے جیسے سر پینٹل کو سر پھٹل یا ہیرا پھیری کو ہیرا پھری وغیرہ کہنا۔

معیاری تلفظ کے اس اصول کا اطلاق صرفی و معنوی تصرفات پر بھی ہوتا ہے۔ اگر شستہ اردو بولنے والوں کی اکثریت مشکور کو شکر گزار، راشی کو رشوت لینے والا اور عرق گلاب کو، گلاب کے معنوں میں اور گلاب کو ایک مخصوص قسم کے پھول کے معنوں میں استعمال کرتی ہے تو شستہ اردو میں ان الفاظ کے یہی معیاری معنی ہیں۔ اسی طرح صرفی اعتبار سے شریف الخاندان، دائم المریض، سمجھ دار، ناسمجھ، نامردگی، ادائیگی، ممبرانِ پارلیمنٹ، لب سڑک، بوالہوسی ڈاک، ڈاکخانہ، پیکر یت، اپنائیت، اور لاچار جیسے صدہا الفاظ و مرکبات جن کا شستہ اردو میں چلن عام ہے۔ معیاری الفاظ ہیں۔

رہا تذکیر و تانیث کا معاملہ تو اگر کچھ الفاظ دہلی میں مذکر اور لکھنؤ میں مونث ہیں تو ایسے الفاظ کی دوہری جنس معیاری ہے جسے شستہ زبان میں عام تائید حاصل ہے۔ مثلاً فکر اور سانس دہلی میں مذکر ہیں لیکن عام طور پر شستہ اردو میں یہ دونوں الفاظ مونث استعمال ہوتے ہیں اس لئے ان کی معیاری جنس تانیث ہے۔ اسی طرح "لفظ" کو لکھنؤ میں مونث قرار دیا جاتا ہے اور اسی کی جمع شخصیں کو بھی مونث بولا جاتا ہے لیکن اردو میں یہ مذکر ہی بولا جاتا ہے۔ اور یہی اس کی معیاری جنس ہے۔ کچھ الفاظ مختلف فیہ ہیں جیسے نشوونما، طرز، لغت، ناول، سگریٹ، مول وغیرہ۔ ان کی دونوں جنس معیاری ہے۔

ترقی اردو بیورو دہلی کے عہدیداروں نے شستہ اردو میں خاصا املائی انتشار پیدا کیا ہے۔ اس معاملے میں بھی اردو کے املائی تصرف اور املا کے چلن کو نظر انداز کر کے ہی معیاری املا کے تعین میں مدد مل سکتی ہے۔ عربی میں انشاء اللہ کو ان شاء اللہ، منجانب کو من جانب، بلکہ کو بل کہ لکھتے ہیں لیکن اردو میں ان الفاظ کا اردو املا ہی معیاری ہے۔ اسی طرح فارسی میں خورد [جیسے خوردہ و کلاں] کا املا خُرد ہے لیکن اردو میں اس لفظ میں واوِ معدولہ کا استعمال ہی صحیح ہے۔

غرض معیاری زبان کے تعین کے یہ چند رہنما اصول ہیں۔ ان کے اطلاق سے اردو زبان کے معیار کا مسئلہ بڑی حد تک سلجھ سکتا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ کسی زندہ زبان کا معیار اور اسے جانچنے کے اصول متعین نہیں کر سکتے۔ بلکہ وہ لسانی رجحانات متعین کرتے ہیں جن کا اظہار اس زندہ زبان کی مسلسل اور غیر محسوس تبدیلیوں میں ہوتا ہے اس کا قوی امکان ہے کہ آج کی معیاری زبان کل کی معیاری زبان سے صوتی، صرفی، املائی اور معنوی سطحوں پر بالکل ہی مختلف ہو۔

۲۷-۲۲-۱۰، پھول بند کیارٹی پورہ اورنگ آباد [مہاراشٹرا]

معیاری زبان — کچھ نئے سوال

سلیم شہزاد

"شاعر" ہی کے توسط سے زبان کے معیار سے متعلق دو گرانقدر مضامین مطالعے میں آئے۔ محترم علی جواد زیدی کا مضمون "معیاری زبان کا سوال" ظاہر ہے کہ جناب شان الحق حقی کے مضمون "زبان کے معیار کا مسئلہ" سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے جسے آپ نے ان کی کتاب "نقد و نگارش" سے نقل کیا اور یہ اچھا ہی ہے کہ آپ نے حقی صاحب کا مضمون شائع کر دیا کیونکہ زیدی صاحب کے مضمون میں اس کے متعدد حوالے موجود ہیں۔ اور اب ایک طرح کا تقابل بھی ممکن ہو گیا ہے۔

زبان کے معیار کا سوال یا معیاری زبان کا سوال اردو کیا کسی بھی زبان کے لئے نیا نہیں ہو سکتا کیونکہ زبان ہر عہد میں اس لسانی معیار کی متلاشی، اس کی تعین کیلئے کوشاں اور اس کی دعوے دار رہی ہے لیکن جس طرح اس سوال یا مسئلے کو زیدی صاحب نے براہ راست اٹھایا ہے حقی صاحب نے کئی موڑ کاٹے اور بات خلاصہ میں کہی ہے دکھتی ہے۔ ویسے ان کا مضمون زیدی صاحب کے لئے کتابیاد [استفادہ تحریک] ہو گیا انہوں نے معیاری زبان کے سوال کا انا جداگانہ عملی خاطر جائزہ لے ڈالا اور اس من میں کئی اہم سوالات بھی اٹھائے اور ان کے جواب کی کوشش بھی یعنی ایک معیاری زبان کا خاکہ متشکل ہو سکتا ہے۔ نے اپنے موضوع کی تجزیے کے سبب [تیسرے طلبی کی زبان کا معیار] یا کسی بھی زبان کا معیار، یقیناً اس معیار ایک تجزیاتی تعریف ہے [...] سے وقت میں سمیٹے گئے ثبت اپنے مضمون میں [...] کے ابتدا اور وقت کو تعدد مرحلے مراحل کو آپ نے اور [...] معیاری اردو کی تعین کے حوالے فال کیا ہے۔

تمہید میں حق صاحب رقمطراز ہیں:

ہر شائستہ زبان کے لئے ایک معیار کا ہونا ضروری ہے۔
اور حتی الامکان اس کی پابندی شرط ہے۔

"شائستہ زبان" سے آپ کی کیا مراد ہے؟ پھر "شائستہ زبان کا ایک معیار" الفاظ کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر زبان شائستہ ہے تو کیا "شائستگی" اس کا معیار نہیں ہو سکتی؟ یا سوال یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ کیا "شائستہ زبان" غیر معیاری بھی ہوتی ہے؟ [یقیناً غیر معیاری زبان شائستہ نہیں ہوتی] پھر اس معیار کی پابندی کی شرط کس خانے میں ڈالی جائے جو ابھی آپ دریافت ہی نہیں کر سکے۔

ہر زبان کا ایک معیاری یعنی شائستہ بلکہ آئیڈیل روپ ضرور ہوتا ہے اور بیشتر بولنے اور لکھنے والے اپنے لسانی تعلقات میں اس کی لاشعوراً پابندی بھی کرتے ہیں لیکن زبان کا یہ معیار ہر عہد میں بدلتا بھی رہتا ہے۔ یعنی کہہ سکتے ہیں کہ زبان کے معیار کا یا معیاری زبان کا سوال اپنی انچائیلی کیفیت کے سبب واقعی تجریدی تصور ہے جس کا ایک بھی نمونہ آپ اپنے مضمون میں نہیں پیش کر سکے۔ کل دہلی اور لکھنؤ کی اردو کو معیاری حیثیت حاصل تھی آج اردو کے بیشتر مراکز پھیل کر بمبئی، پٹنہ، ۔۔۔ اور لندن تک جا چکے ہیں۔ اردو کے دو گیر دوش دوسری زبانیں بھی رو بعمل ہیں۔ اور جن لسانی اثرات کے تحت ذخیرہ ہائے الفاظ کا لین دین شدت سے جاری ہے۔ اس صورت میں کیا آپ اسی زبان کو معیاری کہیں گے جس کا حوالہ آپ نے اپنے مضمون میں دیا ہے [اگرچہ معیاری زبان کی حیثیت سے نہیں] یعنی "میں جنرل سپیکنگ آپ سے ایگری کرتا ہوں وغیرہ"

حق صاحب نے درست لکھا ہے کہ زنانہ اور مردانہ بولی میں واضح امتیاز تھا [بلکہ ہے] لیکن ان کے اگلے جملے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ کہتے ہیں:

زنانہ اور مردانہ بولی میں واضح امتیاز تھا اور یہ صرف واحد متکلم کے لئے مؤنث یا مذکر صیغوں کا اختلاف نہ تھا۔

معیاری زبان لکھنی ہو [" لکھنا ہو" بھی کہہ سکتے ہیں] تو "زنانہ اور مردانہ بولیاں" لکھنا چاہیے۔ اس سے قطع نظر زنانہ اور مردانہ بولیوں کا فرق واحد متکلم کے لئے مؤنث یا مذکر صیغوں کے اختلاف میں تو اردو میں کبھی نہیں پایا گیا۔ بولی زنانہ ہو یا مردانہ ضمیر واحد متکلم [بلکہ ضمیر جمع متکلم بھی] دونوں میں ایک ہی استعمال کیا جاتا ہے یعنی میں [جمع میں ہم] دونوں بولیوں میں یہ فرق تو واضح طور پر اسمائے صفات اور افعال سے ظاہر ہوتا ہے [میں آیا ہوں۔ مذکر: میں آئی ہوں مؤنث، ہم آئے ہیں: مذکر، ہم آئی ہیں۔ مؤنث وغیرہ] اور زندگی کے مختلف شعبوں میں [حق صاحب کے مطابق] عورتیں جب مردوں کے دوش بدوش آتی جائیں گی یہ امتیاز کم ہو جائے گا الا یہ کہ آپ دونوں جنسوں کے لئے ایک ہی اصول برتنا شروع کر دیں [انگریزی کی طرح]

آپ چاہیں متفق نہ ہوں ادبی زبان بہر حال عام بول چال اور روز مرہ سے واضح طور پر مختلف رہی ہے اور رہے گی [کیا آپ عام بول چال میں پنا یہ مضمون لکھ سکتے تھے یا نظم کے جو اشعار آپ نے حوالے میں دیے ہیں کیا وہ عام بول چال کی زبان میں لکھے گئے ہیں؟] آپ نے جس "صحت کے معیار" کی طرف زیدی صاحب نے اپنے مضمون میں صرف اشارہ کر دیا ہے آپ اس موضوع پر روا روی میں کچھ کہہ گزرنے کی بجائے تفصیل سے خیال آرائی فرماتے تو شاید معیاری زبان کا مسئلہ اپنے کسی حل کو پا لیتا۔ لیکن آپ ترقی اردو بورڈ [پاکستان] کے تاریخی اعتبار سے مرتب کئے گئے "اردو لغت" کی ترتیب و تدوین کی تفصیل تفصیل سے بیٹھے اور زبان کا معیار دھرا کا دھرا رہ گیا بلکہ آپ کے پیش نظر صرف پاکستانی اردو کا معیار [سوالیہ نشان کے ساتھ] رہ گیا جو آپ کے خیال میں سرچشمہ اقتدار، ایک خصہ دولت اور ایک عظمت جمع ہو جانے سے پیدا ہو سکتا ہے۔ [یہ بوالعجبیت؟]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا "جدید سائنسی اصول پر آکسفورڈ کی کلاں ڈکشنری" کی طرح اردو لغت مرتب کرنا معیاری اردو کے مسئلے کا حل ہو سکتا ہے؟ [آپ کا اقتدار، دولت اور عظمت والا اصول ملحوظ ہے]

اس ضمن میں آپ جو اردو کی تین خصوصیات گناتے ہیں [بلکہ تین کہہ کر چار خصوصیات آپ نے گنا دی ہیں] تو یہ کہاں تک معاونت کر سکتی ہیں مسئلے کے حل میں؟ میرے خیال میں زبان کی صوتیات، صرفیات اور نحویات وغیرہ کے وسیع تر ہونے کے باوجود معیاری زبان کا سوال جوں کا توں قائم رہتا ہے۔ یہ خصوصیات اسی تلاش میں مدد و معاون ضرور ہو سکتی ہیں۔ معیار کا بدل نہیں ہو سکتیں۔

زبان پر بحث کرتے ہوئے آپ نے ایک مزیدار ترکیب "ہونہار لفظ" استعمال کی ہے: ممکن ہے آپ اسے "اصطلاح" بھی سمجھتے ہوں لیکن لفظ ہونہار ہوتا ہے نہ پھسڈی۔ یہ صفات تو لفظ کو برتنے والے کے لئے مختص ہیں۔

درست فرمایا آپ نے کہ زبان کی عہد بعہد تبدیلی اور ترقی ایک فطری اور اندرونی عمل ہے اور یہ بیرونی اثرات کا تابع بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد آپ کے خیالات پھر وہی استاد شعراء سے سند لینے کے مترادف ہو گئے ہیں کہ اپنی زبان کی لطافتوں اور رنگارنگی کو محفوظ کریں [آدمی کہاں ہیں یہ لطافتیں اور رنگارنگی؟ استاد شعراء کے کلام میں] زیدی صاحب نے اپنے مضمون کے تیسرے حاشیے میں اساتذہ قدیم سے سند لینے کے متعلق یہ لکھا ہے کہ حالات حاضرہ پر منطبق نہ ہو تو ماضی سے سند لینا مناسب نہیں۔ اور یہ طریق کار غیر تشفی بخش ہے۔

فرماتے ہیں حق صاحب کہ "ہم تمہیں کھلا رکھنا چاہتے ہیں مگر ایسا نہ ہو کہ ایک سمت کا ریلا اس کے [زبان اردو کے] خد و خال ہی پر پانی پھیر دے۔ ابھی تک انگریزی کے خال خال الفاظ ہی نے اردو کے مدون لغت میں بار پایا ہے۔"

اپنے طویل تجزیاتی مقالے "اردو لغت اور لغت نگاری" میں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے حق صاحب کے "اردو لغت" کی ورق گردانی بھی کی ہے۔ اور ان کے مطابق مذکورہ لغت کے مرتبین نے "اصول قائم کئے ہیں لیکن ان کے اصول "آصفیہ" اور "نور" کے بے اصولے پن سے بدتر ہیں۔" اور انہوں نے متعدد بے سند یا کم سند الفاظ کی تابڑ توڑ اردو لغت میں ٹھونس دیے ہیں۔ حق صاحب کے "دخیل انگریزی الفاظ" کی فہرست ملاحظہ کریں جو فاروقی صاحب کے مقالے سے ماخوذ ہے۔

این فدسری، ایونٹگ پارٹی، ایپل فائز، آل سائٹ امیری ایفی تھیٹر، اسپوک، اسپون، اسپینیش فلائی، اسپیل۔ یہ مطالعہ صرف الف اور ب پر مشتمل پہلی جلد کا مطالعہ ہے۔ اگر ایسے الفاظ کی مکمل فہرست بنائیں تو صفحات بھرے جا سکتے ہیں۔ ایمانداری سے کہیں کیا یہ اردو معاشرہ میں بول چال کے الفاظ ہیں جن کے بل بوتے پر آپ معیاری زبان کا نقشہ بنانا چاہتے ہیں۔ اور کیا ایک سمت کا ریلا اردو کے خد و خال پر پانی پھیرنے کے لئے جبیں چلا آرہا؟

علامہ اقبال کے حوالے سے حق صاحب اختتام پر کہتے ہیں کہ اردو ابھی دور تشکیل میں ہے پھر جھٹ یہ کہہ ہوت کی ہر زبان پر چسپاں کر دیا جاتا ہے تو جناب اگر اردو یا ہر زبان ابھی محض دور تشکیل میں ہے تو معیاری زبان کا سوال بھی فضول محض ہے۔ معیاری زبان تو مکمل نشو و نما پائی ہوئی یعنی اپنے دور تشکیل کے بعد پوری طرح مجسم و متشکل زبان کا مسئلہ ہے۔ اگر اردو میں، کسی اور زبان میں بھی، مختلف زبانوں کے الفاظ بار پاتے رہتے ہیں تو اس کا یہ مفہوم قطعی نہیں ہوتا کہ ہر زبان نامکمل منت پذیر شناسہ ہے۔ موجودہ تیز رفتار سائنسی زندگی نے مکمل و متشکل زبانوں کو بھی مجبور کر دیا ہے کہ مختلف زبانوں کے الفاظ سے احتراز نہ کریں پھر جدید زندگی کا ساتھ دینا تو اردو کی خاص مجبوری ہے۔ لیکن ان دخیل یا بار پائے ہوئے الفاظ کو اردو معاشرہ اسی وقت قبول کرے گا جب قبول عام کی سند وہ پیش کریں گے ورنہ ایسے الفاظ سے لغت کو ضخیم بنانا بے مصرف ہے۔ نہ ان کے انفرادی عمل سے معیاری زبان کا نقشہ ہی سامنے آسکتا ہے۔

معیاری زبان کے سلسلے میں منظر دناجی اور ناسخ و انشا کے معیارات بھی آج کے لسانی اور اظہاری سیاق میں مجبر مطابق ہوں گے جن کا زیدی صاحب کے مقالہ میں جائزہ لیا گیا ہے۔ معیاری زبان کی تشکیل و تعیین میں ان حضرات کی کاوشوں کا یہ تذکرہ مودب ہے لیکن موجودہ سیاق میں اس لسانی منظر کی ضرورت کی طرف صرف اشارہ کر کے رہ گیا ہے اس لئے یہ تشنہ سا لگتا ہے۔ کیا زیدی صاحب اس تعلق سے بحث کو مزید طول دینا پسند کریں گے؟ کیوں کہ طوالت ناگزیر ہے۔

۲۲۴، منگل وار واڑ مالیگاؤں [مہاراشٹرا]

ورود مسعود کے بارے میں کچھ اور

محمد عظیم فیروز آبادی

"ورود مسعود" ذکر مسعود تک کے عنوان سے جناب عبدالقوی دسنوی کا ایک مقالہ شاعر [جلد ۱۶ شمارہ ۲] میں شائع ہوا ہے۔ اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ ان کتابوں کی اشاعت سے نہ صرف پروفیسر موصوف کو بلکہ اردو کے بہت سے ادیبوں کو اذیت پہنچی ہے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ ان کی بنا پر اردو ادب کی چار مقتدر ہستیاں نبرد آزما ہو گئیں اور ان میں تو تکار کی نوبت آگئی جو انتہائی افسوسناک بات ہے۔ اسی لئے قوی صاحب نے مسعود صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ ان کتابوں کے جن الفاظ یا جملوں سے اردو کے مشاہیر کو تکلیف ہوتی ہے آئندہ ایڈیشن میں انہیں حذف کر دیا جائے۔

مسعود صاحب نے دیباچے میں واضح کر دیا ہے کہ اس خود نوشت سوانح کو لکھتے وقت صداقت نگاری ان کا آئیڈیل رہا ہے۔ اور اس میں انہوں نے خود اپنے گریبان کے چاک ہو جانے یا کرنے میں تامل نہیں کیا ہے۔ کہنا آسان ہے لیکن یہ مشکل آئیڈیل ہے، ناممکن کی حد تک۔ اللہ اس معیار پر اردو ہی نہیں، دوسری عالمگیر زبانوں کی معروف ہستیاں بھی پوری نہیں اترتیں۔ جواہر لال نہرو نے اپنی سوانح حیات میں ابہام

کلاڈے کا قول نقل کیا ہے۔ "اپنے بارے میں لکھنا بڑا ہی نیک و دشوار مسئلہ ہے۔ اپنی بڑائی بیان کیجیے تو آپ کو قبا ہوتا ہے اور تعریف کیجیے تو دوسروں کو گراں گزرتا ہے۔" یہی نہیں، دوسرے بھی آپ سے اپنی تعریف سننے کے متوقع رہتے ہیں۔ اور اگر آپ اپنے دل کی بات کہہ دیا ان کے بارے میں جو واقعی آپ کی رائے ہے، خلوص سے اس کا اظہار کریں تو انہیں ٹھیس پہنچتی ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس کتاب میں کہیں مسعود صاحب اپنے خلاف دشمن کی ریشہ دوانیوں میں بیٹھے ہوں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اشارتاً کہا تھا کہ موصوف کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے سگے بھتیجے ہیں۔ جو ان کے لئے شجر سایہ دار کی طرح تھے جس کے نیچے میں خان صاحب عمر بھر امون و مصئون شاد و فرحاں رہے۔

یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نام سے اگر مسعود صاحب نے فائدہ نہ حاصل کیا ہو تو آج کی دنیا میں ان سے زیادہ احمق اور کون ہو سکتا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کے داخلے سے لے کر اپنے تقرر اور ترقی تک، کہاں کہاں ذاکر صاحب کی نسبت سے مسعود صاحب فیض یاب ہوئے ہوں گے۔ اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اور نہ مجھے اس کا علم ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب سے لگاؤ کی بنا پر اگر رشید صاحب مسعود صاحب کے داخلے کی گراں باری کو اپنے سر لے لیں۔ اور ان کا قیام جب یہ مرحلے ہو جائے یا تاریخ سے اردو کے شعبے میں منتقل ہونے میں انہیں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے یا شعبہ میں ترقی کے وقت کسی سینیر استاد کی جگہ سلیکشن کمیٹی ان ہی کو منتخب کرے تو اس کار خیر کے انجام دینے سے وہ اسے کیسے باز رکھ سکتے تھے اور کیوں یہ ضروری ہے کہ اشارتاً یا کنایتاً اگر مسعود صاحب نے ذاکر صاحب کے فیضان کا اعتراف کیا ہوتا تو اسلوب صاحب یا پروفیسر گیان چند کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ ملتا۔

اس کے ساتھ ساتھ اسلوب صاحب کو انسان کی یہ فطرت بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اسے اپنے بزرگوں سے جو فیض پہنچتا ہے اس کا اعتراف کرنے میں وہ اپنی سبکی سمجھتا ہے۔ اسے اپنی بڑائی اس میں نظر آتی ہے کہ اس نے جو منصب حاصل کیا ہے وہ اس نے اپنے بل بوتے پر کیا ہے۔ پدرم سلطان بود پر وہی فخر کرتے ہیں جن کی گرہ میں مال نہیں ہوتا۔ یا جو ذاتی اہلیت اور خود اعتمادی کی دولت سے محروم ہوتے ہیں۔ مسعود صاحب نے اگر ذاکر صاحب کے فیضان کو نظر انداز کیا ہے تو یہ اسی انسانی فطرت کا مظاہر ہے جو اپنی کامیابی کو اپنی اہلیت کا ثمرہ سمجھتی ہے۔

قوی صاحب کا خیال ہے کہ صداقت نگاری کو بے مقصد نہیں ہونا چاہئے۔ صداقت نگاری اگر کسی مقصد کے تحت کی جائے تو وہ صداقت نہیں رہتی۔ مصلحت نگاری ہو جاتی ہے۔ اور اردو سوانح عمریوں میں یہ نقص عام رہا ہے کہ وہ شبلی کے الفاظ میں مدلل مداحی سے آگے نہیں بڑھتیں۔ اردو سوانح نگاروں کو یہ احساس نہیں کہ صداقت کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو، اظہار کا رابطہ اسی سے وابستہ ہے۔ ہمارے ممدوح میں اس کمالات کے ساتھ اگر کچھ کمزوریاں اور خامیاں بھی ہیں [اور کون دنیا میں کامل ہے] تو دیانت داری یا صداقت نگاری کا اقتضا ہے کہ ان کے محاسن کے دوش بدوش اس کی کوتاہیوں پر بھی پردہ نہ ڈالا جائے۔ ہمارا یہ خیال غلطی سے خالی نہیں کہ اپنے ممدوح کی خامیوں

کو بے نقاب کرنا، اس کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کرنا ہے یا اس کے ساتھ اپنی ہمدردی اور محبت کے رشتے کو منقطع کر کے، اپنی خباثت نفس کا ثبوت دینا ہے۔ مشہور فرانسیسی مصنف جنری ٹرائٹ HENRY TROYAT کی تالسٹائی پڑھیے۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ کسی شخص کی عظمت کا نقش ثبت کرنے میں صداقت نگاری کتنا اہم رول ادا کرتی ہے۔ ٹالسٹائی بلا کا نفس پرست تھا۔ اس کے گھر کا کام کاج یا صفائی کرنے کے لئے جو نوکرانیاں آتی تھیں، انہیں بھی اپنی ہوس کا شکار بنائے بغیر نہیں چوکتا تھا حتیٰ کہ ایک نوکرانی سے جو لڑکا پیدا ہوا اسے اس نے اپنا کوچوان بنا لیا اور یہ کوچوان اس کی نظر میں سدا ملازم ہی رہا۔ بیٹا کبھی نہیں بن سکا۔ زندگی کی آلودگی سے صاف ہونے سے پہلے ہی ٹالسٹائی اپنی شریک حیات کے کمرے میں جا گھسا۔ بیوی بیمار ہو گئی اور کئی مہینے کے علاج معالجے کے بعد صحت یاب ہو سکی۔ اس کی بیوی کے بقول، سکریٹری چرٹ کوف CHERT KOV سے اس کے جنسی تعلقات تھے۔ خود اس کی بیوی کا ایک پیانو ٹیچر HOSKIN سے ناجائز تعلق تھا۔ جس نے ان کی زندگی میں زہر گھول دیا تھا۔ ان تمام گندگیوں اور آلودگیوں کے دوش بدوش، ٹرائٹ نے ٹالسٹائی کی اس اعلیٰ فنکارانہ صلاحیت جذبۂ فطرت اور عوامی مزاج کو اجاگر کیا ہے۔ جس کے تحت وہ اپنی لاکھوں روپے کی جائداد اور کتابوں کی رائلٹی کو عوام کے لئے وقف کر دینا چاہتا تھا۔ اور جوتے گانٹھ کر اپنے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے ایک مفلوک الحال کسان یا مزدور کی طرح سادہ زندگی بسر کرنا، اس کا مطمح نظر تھا۔ ٹالسٹائی کی اس خود ساختہ مفلسی یا بیوی کی نظر میں لاعلاج حماقت کی وجہ سے دونوں میں آئے دن جھگڑا رہتا تھا۔ دونوں کی ڈائریاں جو کتنی ہی ناگفتہ بہ کرتوتوں اور بدگمانیوں کی رازدار تھیں، چھپ چھپا کر ایک دوسرے کی نظر سے گزرتی تھیں۔ وہ اور بھی ان روزانہ کے جھگڑوں پر تیل کا کام کرتی تھیں۔ ٹالسٹائی کی زندگی کی یہ پوری داستان، ٹرائٹ نے کامل دیانت اور خلوص سے مرتب کی ہے جس میں توصیف یا تنقیص کا جذبہ سرے سے غائب ہے۔ اور مبالغہ نام کو نہیں۔

اس کے برعکس مولانا آزاد کی انڈیا ونس فریڈم اور غبار خاطر دیکھیے۔ یہ دونوں کتابیں گویا مولانا آزاد کی رجز خوانیوں کی مظہر ہیں جن میں انہوں نے اپنے اور اپنے اسلاف کے علمی اور عملی کارناموں اور سیاسی تدبر کو نمایاں کرنے پر پورا زور قلم صرف کر دیا ہے۔ ٹالسٹائی اور غبار خاطر [یا انڈیا ونس فریڈم] کا موازنہ کیجیے۔ ایک کا مقصد مولانا کی عظمت کے مینار کو بلند کرنا اور دوسری کا مطمح نظر حقیقت نگاری ہے اور یہ حقیقت نگاری کا فیضان ہے کہ ٹالسٹائی کی عظمت کو غبار خاطر اور انڈیا ونس فریڈم نہیں پہنچتیں۔

قوی صاحب نے لکھا ہے کہ "کم صلاحیت کے لوگ یہ سب کریں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ بے صلاحیت لوگ اگر فساد برپا کریں تو حیرت نہیں ہوتی۔ لیکن منتخب روزگار لوگوں کا اس طرح ایک دوسرے کی رسوائی کا باعث بننا افسوسناک ہے۔" سوال یہ ہے کہ مسعود صاحب نے اپنی سوانح حیات کیوں لکھی۔ اس کتاب کی تصنیف کا محرک کوئی بھی جذبہ رہا ہو۔ ایک بات بہت واضح ہے کہ اس کتاب کی تخلیق سے ان کا مقصد دل کے پھپھولے پھوڑنا، کسی کی تضحیک کرنا یا کسی دوسرے کو رسوا کرنا ہرگز نہیں تھا۔ کسی سے پیچھا چھڑانا ہی مقصود ہوتا تو اس کے لئے دوسرے بہتر ذرائع ہو سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے سرور صاحب سے ان کا کسی بات پر اختلاف

ہو گیا ہو۔ لیکن رشید صاحب کی محبت اور شفقت کے سوا ہونے کے باوجود ضعیفی کے وجہ سے ان کی تدریسی صلاحیتوں سے عدم اطمینان کا اظہار کرنا، اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ صداقت اور صاف گوئی ان کے مزاج کا تقاضہ رہا ہے۔ کسی کے بارے میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنے خیالات کے اظہار میں انہیں باک نہیں ہوتا۔ اپنے مزاج کے بارے میں کئی جگہ انہوں نے اقبال کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

حالانکہ پہلے مصرعے میں بیگانے کی جگہ وہ بیگانے لکھتے بولتے ہیں۔ میں سرور صاحب سے واقف نہیں اور مجھے نہیں معلوم کہ ان کی حق گوئی و بیباکی پردہ کس رنگ کا رہا ہے۔

سرور صاحب کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں تضحیک کا نہیں، انحراف کا جذبہ کار فرما ہے۔ رشید صاحب کی مہمان نوازی کی تعریف کرتے ہوئے کہ انہیں کھلانے میں مزہ آتا ہے۔ رشید صاحب علامہ زیر القرآن کی طرح رنگ نہ خراب ہونے تک اٹھی اور ان کا قطعہ نقل کیا۔ سرور صاحب کو کھلانے میں۔ یہ میرے نزدیک وہ کمال رشید صاحب نے اضطراری طور پر اپنے ایک شاگرد رشید کے ذریعہ اپنا جوہر خاص کیا ہے۔ سرور صاحب یا ان کے ہمدردوں کو اس پر آزردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں میں مسعود صاحب کی وکالت نہیں کر رہا ہوں، جو کچھ پایا، ظاہر کر دیا، رشید صاحب سے آزردہ اور برہم وہ آل احمد سرور تھے اور رشید احمد صدیقی مرحوم تھے۔ مجنوں صاحب نے اس کا اظہار رشید صاحب سے کیا اور رشید صاحب نے خلیق احمد نظامی صاحب کے نام خط میں کیا ہے۔

مسعود صاحب نے سرور صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس میں اگر انحراف کو دخل نہیں تو میرا تجربہ مسعود صاحب سے مختلف ہے۔ مسعود صاحب ان کے شاگرد رہے ہیں۔ برسہا برس علی گڑھ میں ان کا ساتھ رہا ہے۔ وہ سرور صاحب کو یقیناً مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ غالباً سنہ ۔۔۔ میں سرور صاحب کو اسلامیہ انٹر کالج فیروز آباد میں کسی موضوع پر تقریر کرنے کے لئے دعوت دی۔ نسیم قریشی صاحب، رفیع اللہ عباس صاحب اور عنایت الرحمٰن صاحب وغیرہ کے ہمراہ تشریف لائے۔ ان حضرات کے کرنے کے لئے ہم گئے۔ اس سلسلے میں سرور صاحب کو کچھ پیش کرنا ہماری غیرت نے گوارا نہیں کیا۔ کالج میں متاثر کن تقریر کی۔ رات میں ایک مشاعرے کی صدارت کی۔ صبح ناشتے کے بعد قریشی صاحب کے اصرار پر شکوہ آباد تشریف لے گئے۔ دوپہر کے کھانے کا افراد کے ساتھ اہتمام تھا لیکن کالج ہونے کی وجہ سے شرکت نہیں کر سکے۔ بہت یاد آتا ہے مجھے یاد ہے انجمن ترقی اردو علی گڑھ میں ٹرین کا کرایہ بار بار مانگنے پر نوازش کی۔ ان دنوں ذوقی صاحب غالباً سکریٹری تھے کیسے فرش گفتار کتنے زندہ دل۔

قوی صاحب کی یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آتی کہ کم صلاحیت کے لوگ اپنی تحریروں سے فتنہ پھیلاتے ہیں۔ اور اعلیٰ صلاحیتوں کے افراد ایسی تحریروں یا موشگافیوں سے اجتناب کرتے ہیں جو کسی کی کم علمی اور سطحیت کو بے نقاب کرے۔ اور اس کی سبکی اور رسوائی کا باعث ہو۔ کم ظرف حضرات میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی رائے کا بے باکی سے اظہار کر سکیں۔ اعلیٰ ذہانت کو کلام رائے [illegible] سرور صاحب کی رائے کو دیکھ ... [illegible]

کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ اور کبھی مجبوراً انہیں اپنی برہمی کا اظہار کرنا ہی پڑتا ہے۔ فرود تو کسی رسالے دینے سے گریز کرتے ہیں اور یوں بھی اور دوسروں کو بھی کہہ کر فرار کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ صحیح اور برمحل الفاظ و تراکیب کے استعمال میں نیاز صاحب سے بڑا پارکھ اردو نے پیدا نہیں کیا۔ مشاہیر اردو شعرا اور کم فہم مولویوں کی گمراہی اور بدذوقی کو نمایاں کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ ظاہر ہے جس شاعر اور تنقیدی نظر ڈالتے وہی ان سے برہم ہو جاتا۔ جگر صاحب ایسے نرم مزاج اور مقبول شاعر نے اعلان کر دیا تھا کہ جس مشاعرے میں نیاز صاحب ہوں گے اس میں وہ شرکت نہیں کریں گے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ بظاہر یہ حضرات ان سے برہمی اور ناراضگی کا اظہار کرتے تھے لیکن دل میں نیاز صاحب کی ژرف نگاہی اور نکتہ سنجی کے معترف ہو جاتے تھے۔ اور یہ احتیاط رکھتے تھے کہ دوبارہ ان سے یہ غلطیاں سرزد نہ ہوں جن کی نیاز صاحب نے نشان دہی کی تھی۔ کہتے ہیں جوش ملیح آبادی سرور کے عالم میں وہ دون کی لیتے تھے کہ مولانا آزاد بھی اپنی لن ترانیاں بھول جائیں گے۔ اسی سرخوشی کے دوران میں ان کے ایک نیازمند نے ٹوکا۔۔۔ کہ نیاز صاحب نے جواب پر اعتراض کئے ہیں۔ اپنے اس ملنے کو قائم رکھتے ہوئے جوش نے فخریہ کہا ۔۔۔ جی ہاں نیاز صاحب نے کسی اور نے نہیں۔ تو یہ تھا مقام نیاز صاحب کا۔ پروفیسر ضیا انصاری نے بجا فرمایا ہے کہ اگر نیاز صاحب کی تحریریں نہ ہوتیں تو کتنی گمراہیاں سند کا درجہ حاصل کر لیتیں۔ آج بھی اردو ادب کو نیاز صاحب جیسے کشور بت شکن یا دل شکن لیکن صاحب نظر نقاد کی ضرورت ہے۔ جو ہماری حالی آزادی یا برہمی کا خیال کئے بغیر ہماری غلطیوں سے آگاہ کرے اور ہمیں صحیح راہ دکھلائے لیکن نیاز صاحب کی ہی طرح اس کی سطح خالص علمی اور ادبی رہے۔

دن رات ایسے مضامین نظر سے گذرتے ہیں جن میں زبان و بیان و اقعات اور نقطہ نظر کی غلطیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ لیکن ان سے کہیں زیادہ یہ مضامین، مضمون نگار کے عدم خلوص —— NON SINCERITY غیر ذمہ داری اور بے اعتنائی کے گلہ گزار ہوتے ہیں۔ صاحب نظر ناقدین کو مدلل اور مفصل طور پر ان کا محاسبہ کرنا چاہئے۔ مثال کے طور پر فکر و نظر کا شمارہ نامور ان علی گڑھ [دوا...] دیکھئے۔ اس میں زیادہ تر مضامین ڈاکٹر صاحبان [پی ایچ ڈی حضرات] کے قلم کے رہین منت ہیں۔ انہیں دیکھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا علمی معیار کس قدر گر چکا ہے۔ اسی شمارے میں دوسرا مضمون پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب کا ہے۔ اسے پڑھ کر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ یہ مضمون اس ممتاز دانش ور یا نقاد کا ہے۔ جسے مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے صدر ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جسے کئی بار انٹر میڈیٹ، بی اے و غیرہ کے امتحانات میں اول آنے پر سر مزمل اللہ گولڈ میڈل سے نوازا گیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی مدافعت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ موصوف انگریزی کے پروفیسر رہے ہیں۔ اس لئے اردو الفاظ کے معانی اور ان کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہیں یا یہ کہ موصوف انگریزی میں سوچنے کے خوگر ہیں اور اردو میں لکھتے کے وقت انگریزی مسائل یا الفاظ کے مترادفات انہیں ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ اگر صحیح الفاظ یا مترادف نہ ملیں اور آپ فہرست تو ان کے صحیح استعمال سے وہ واقف نہیں۔ کہا جائے اور کیسے کہا جائے۔ یہ سنجیدہ سوال کے برعکس اور دوسری مترادفات کے استعمال

لگا لیتے۔ اور چوں کہ انہیں اردو سے نہ عاشقی اور نہ واسطہ نہیں رہا ہے۔ اس لیے ان کی اس قسم کی فروگذاشتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے لیکن اپنے موضوع سے انکی بے اعتنائی دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ ایک ذمہ دار شعبے کے سربراہ کو اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہونا چاہئے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے۔ اس پر نظر ثانی کرنے کی بھی زحمت گوارا نہ کرے۔ اسی مضمون میں نواب مزمل اللہ خاں کی پیدائش کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

" نواب سرمزمل اللہ خاں ۱۸۶۵ء میں اپنے آبائی قطعے بھیکم پور میں پیدا ہوئے" صفحہ ۱

نواب حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی، نواب مزمل خاں صاحب سے عمر میں دو سال چھوٹے تھے۔ وہ ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئے [صفحہ ۲۱]

اور خاں صاحب مجھے معاف فرمائیں [مسعود حسین خان] الفاظ کا صحیح استعمال انہیں بھی نہیں آتا۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب کے متعلق فرماتے ہیں " علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کے سابق چیئرمین اسلوب احمد انصاری نے ۔۔۔ اپنی معروف زمانہ خبث باطنی کا ثبوت دیتے ہوئے دررود مسعود کو ڈھنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ میں عام طور پر کم اور کج فہموں کا جواب خاموشی سے دینا پسند کرتا ہوں لیکن چوں کہ تصنیف مذکور اب کیاب بلکہ نایاب ہو گئی ہے اس لئے مبادا قارئین کی رسائی اس تک نہ ہو سکے اور وہ اسلوب انصاری صاحب کی رکاکت اور دریدہ دہنی [یہ الفاظ موصوف نے میرے لئے استعمال کئے ہیں] تک محدود ہو کر نہ رہ جائیں۔ بعض دوستوں کے اصرار پر جواب دینا مناسب سمجھا۔"

قطع نظر اس کے، کہ پروفیسر مسعود حسین صاحب کو علمی وقار قائم رکھنا چاہئے۔ اور ذاتیات کو زیر بحث لانے سے گریز کرنا چاہئے خواہ اس رکاکت اور دریدہ ذہنی کی ابتدا پروفیسر اسلوب احمد انصاری صاحب کی طرف سے ہی کیوں نہ ہوئی ہو۔ [اور یہی غیر علمی اور بے ادبی کی سطح ہے۔ جس سے پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب اور دوسرے ہمدردان اردو کو اذیت پہنچی] مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ خود خاں صاحب بھی "انصاری" کے مفہوم اور منصب سے واقف ہیں اور نہ دھنئے کے اور نہ پیشہ ور کے۔ انصاری کا کام اناج بانٹے کا ہوتا ہے یہ تعمیری ہوتا ہے۔ دھنا دھننے کا کام ہوتا ہے جو تخریبی ہوتا ہے۔ اور پیشہ ور کا مفہوم؟ یہ واقعہ تب کا کہ آتش جوان تھا۔ ایک دوپہر دو علاقہ ہماری ایک دوکان کرائے پر لینے آئی۔

میں نے پوچھا دکان کا کیا کرو گی کہنے لگی پیشہ
میں نے کہا: پیشہ کسے کہتے ہیں۔ فرمایا۔ رنڈی پیشہ۔
نادر بخش اینڈ کمپنی فیروز آباد [یوپی]

علمی و ادبی مباحث یا ذاتیات

گوپی چند نارنگ

نثار احمد فاروقی کا جو خط آپ نے شاعر کے پچھلے شمارے [۲/۹۱] میں شائع کیا ہے، اس میں انہوں نے نہ صرف طنز و تشنیع اور سب و شتم کی انتہا کر دی ہے۔ بلکہ میری ذات پر بھی حملہ کیا ہے اور میری کردار کشی کی بھی کوشش کی ہے۔ میرے مضمون "اردو اسلوب اور لسانیات" میں نثار احمد فاروقی کا کوئی ذکر نہ تھا۔ لیکن انہوں نے اسی بہانے سے آپ کو خط لکھ کر مجھے گالی دینے کی کوشش کی۔ اب کی اپنے دوسرے خط میں انہوں نے پھر نہایت غیر شائستہ لہجہ اختیار کیا ہے۔ اور میرے مذہب پر بھی حملہ کیا ہے۔ یہ ایک شرمناک حرکت ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ نثار احمد فاروقی کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ ایک مغلوب الغضب آدمی ہیں۔ کچھ لوگ انہیں چڑھا دیتے ہیں اور وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ایسے شخص کا علاج یہی ہے کہ اس کو نظر انداز کیا جائے۔ لیکن نثار احمد فاروقی نے جو بہتان تراشی کی ہے ان غلط بیانیوں کا جواب ضروری ہے۔ انہوں نے پہل کی تھی۔ میں نے مناسب جواب دے دیا تھا۔ انہوں نے پھر کرم فرمایا ہے۔ مجبوراً جواب دے رہا ہوں۔ یہ بھی میرے مزاج کے خلاف ہے مجھے یہ بھی یقین ہے کہ "شاعر" ایسا رسالہ نہیں کہ دوا دیوں کو لڑوانے کا کام کرے۔ اس کے بعد اگر پھر کوئی کوشش کی گئی تو بہر حال مجھے معذور سمجھا جائے۔ اس وقت بھی میں گفتگو کو نہایت ضروری امور تک محدود رکھوں گا۔ مشو و زوائد کو نظر انداز کر دوں گا۔

۱۔ میں پھر عرض کرتا ہوں کہ میں لطیف الزماں خاں کو نہیں جانتا، نہ کبھی ان سے ملا ہوں نہ ان سے خط کتابت ہے ——

————————

————————

———————— یقین نہ آئے

تو ان سے قسمیہ معلوم کریں۔ اور اگر ان سے میرے تعلقات کا نہ ہونا ثابت ہو تو بس اتنا کریں کہ آئندہ دروغ بافی سے توبہ کر لیں!

۲۔ دوسری بہتان تراشی نثار احمد فاروقی نے یہ کی ہے کہ میں نے لطیف الزماں خاں کی مرتبہ کتاب نقا میں لگوائی ہے۔ یہ جھوٹ بھی ویسا ہی جھوٹ ہے ————————

———————— اگر ایسے کسی تعلق میں میری شرکت ثابت ہو تو نثار صاحب خاکسار کی تنخواہ لے جائیں یا اپنا چیک دے جائیں، اور اگر دونوں میں سے کسی کو توفیق نہ ہو تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود سے شرمندہ ہوں!!

۳۔ رہا میرے مذہب کا معاملہ تو علمی بحث میں مذہب کہاں سے آگیا؟ ظاہر ہے ایسے اوچھے وار وہ کرتا ہے جو علمی دلیل سے بے بس ہو جائے۔ یا جو فرقہ وارانہ ذہنیت کا شکار ہو۔ نثار احمد فاروقی دہلی میں رہتے ہیں۔ ان کو اچھی طرح معلوم ہے کئی برس پہلے بعض حاسد ولوں نے سازش کی تھی۔ دہلی کے ایک رسالے نے اس کو چھپوایا بھی گیا۔ مجبوراً میں نے قانونی نوٹس دیا اور پریس کونسل آف انڈیا میں کیس دائر کر دیا۔ تقریباً دو برس تک کیس چلتا رہا۔ بالآخر مدیر محترم نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر معذرت نامہ داخل کیا کہ اس کا پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔۔۔۔ یہ غیر اصل اور جعلی ہے اور اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رسالہ ۔۔۔۔ صحافتی اقدار کے پیش نظر اس کی تردید کرتا ہے اور اس کی اشاعت سے اگر کوئی غلط فہمی پیدا ہوئی ہے تو اس کے لئے معذرت خواہ ہے۔ [دستخط بیان صفحہ ۲۵۔ اگست ۱۹۸۸ منقول از روداد پریس کونسل

نہ انڈیا ٹائمز دہلی] پریس کونسل اپنے فیصلوں کو ہندوستان بھر کے اخبارات میں مشتہر کراتی ہے اور یہ فیصلہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ دہلی کے ایک ماہنامے میں یہ بیان لفظاً لفظاً چھپا ہے۔ [ملاحظہ ہو شان ہند کا شمارہ اگست ۱۹۸۶ء صفحہ ۸ اور ۹] ادبی اختلافات ہوا ہی کرتے ہیں۔ جتنا نثار صاحب کا جی چاہے وہ اختلافات کریں، لیکن الزامات پر اتنا ایسی حرکت ہے جس کا جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ اختلافات کے باوجود میرے دل میں ان کے لئے بہت احترام تھا، لیکن اس حرکت نے اسے پاش پاش کر دیا۔ وہ برسوں سے مجھے جانتے ہیں، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرا ہندو ہونا مجھے اسلام کے احترام سے منع نہیں کرتا۔ میرا لکھا ہوا ایک ایک لفظ شاہد ہے کہ میں صدق دل سے اسلام کا احترام کرتا ہوں اور اس سے میرے ہندو ہونے پر حرف نہیں آتا۔ میرا مذہب تو دوسرے مذاہب کے احترام سے خواہ وہ اسلام ہو یا سکھ یا عیسائیت یا جین یا بدھ مانع نہیں آتا۔ لیکن کاش اگر انہوں نے اسلام کی رواداری اور بھائی چارے کی تعلیم پر عمل کیا ہوتا تو وہ دوسروں پر ایسے رکیک حملے نہ کرتے۔

۴۔ ستم بالائے ستم یہ کہ علمی بحث کا ان امور سے کیا تعلق۔ ایک علمی بحث علمی وقار سے کرنا چاہئے نہ کہ ذاتیات پر حملہ کر کے اور وہ بھی اس لہجے میں جو نثار صاحب نے اختیار کیا ہے۔ شاید ان کو اپنی اسی طاقت لسانی کا دعویٰ ہے۔ نثار صاحب خود کو فرشتہ سمجھتے ہوں گے خدا نخواستہ میں ایسی کوئی خوش فہمی نہیں۔ انسان اول و آخر خطا کار ہے، اور میں تو اس معاملے میں ہمیشہ سے غالب کا قائل ہوں۔

خوئے آدم دارم آدم زادہ ام
آشکارا دم ز عصیاں می زنم

کردہ گناہوں کی فہرست بھی طویل ہے۔ اور ناکردہ گناہوں کی حسرت بھی بہت ہے۔ کوچہ دبازار کی رسوائی بھی مول لی ہے۔ اور معتقدوں، تیرہ باطنوں کے تیر بھی کھائے ہیں اور افترا پردازوں اور حاسدوں کے زخم خنجر کی لذت بھی چکھی ہے۔ باری تعالیٰ سے امید ہے کہ بارگاہ رحمت سے عفو و کرم کا سزاوار سمجھا جاؤں گا اور بخشش خاص سے نوازا جاؤں گا، لیکن وہ لوگ جو بظاہر پاکبازی کا ڈھونگ رچاتے ہیں اور در پردہ ریاکاری اور منافقت کا کاروبار کرتے ہیں، افسوس صد افسوس کہ ان کا کیا ہوگا!؟

۵۔ کسی کی ذات کو نشانہ بنانا نہایت آسان ہے۔ لوگ کس کیسے ایسے ویسی باتیں بغیر ملتے ہیں۔ میں نے اس سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ پھر جب سے پاکستان والا مضمون چھپا ہے، جہاں یہ اٹھو کر گئے اُن کے دوستوں نے کہا "معلوم ہے پاکستان میں کیا کہتے ہیں؟" دوسرے نے گرہ لگائی "ماہنامہ علی" تیسرے نے کہا "آج مزاج علی نہیں" تو کل امر یعنی"! ممکن ہے یہ سب مذاق ہو اور غلط ہو، لیکن کیا اپنی ہی احساس نہیں ہے۔

سخن تو بھی جہان میں ہے ترا فسانہ کیا
کہتے ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

۶۔ اب جو نثار احمد فاروقی نے خاکسار کی ذات کو نشانہ بنایا ہے تو میں سمجھتا ہے کہ ان کو میرے اہل و عیال کے بارے میں بھی کر کہ پھر مجھ سے سیدھا اور پہلی بیوی سے اولاد اور دوسری سے ترکِ پہلی بیوی

سے طلاق ہو گئی۔ باقاعدہ قانونی طور پر [اور اس کا کوئی تعلق اس کردار کشی سے نہیں ہے جس کی آڑ لے کر انہوں نے میری ذات پر حملہ کیا ہے] دوسری شادی ہونے کچھ مدت کے بعد کی۔ جب میں راجندر نگر میں مقیم تھا تب بھی اور سر دوسرے انگلینڈ میں بھی نثار احمد فاروقی صاحب قدم رنجہ فرماتے رہے ہیں اور ماحضر تناول فرما کر میری عزت بڑھاتے رہے ہیں۔ سویرے اہل و عیال میرے بھائیوں کی طرح ان کا احترام کرتے رہے ہیں۔ ارون بھی اردو پڑھ چکے ہے اور ترن نے بھی اور ہمارے گھر میں اردو ہی بولی جاتی ہے خواہ کیسی ہی ہو۔ ارون اب ماشاء اللہ ڈی ایس ہے اور ترن ڈینٹل ڈاکٹر ہے اور ترن سے دہلی میں نثار صاحب میر و غالب کا کلام سن چکے ہیں۔ اور داد دے چکے ہیں ابھی چند برس پہلے تور نٹو میں اقبال کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر ارون نارنگ نے تمام مندوبین کو عشائیے پر زحمت دی تو علی سردار جعفری ان کی بیگم صاحبہ اور ہمشیرہ [جو پاکستان سے آئی ہوئی تھیں] اور ڈاکٹر شارب ردولوی بھی شریک ہوئے۔ نثار احمد فاروقی تو "صاحب ذوق" ہیں۔ کاش وہ بھی اس موقع پر موجود ہوتے تو شاید تمام کدورت "دھل" جاتی۔ ان کو یہ معلوم ہو کر خوشی ہوگی کہ حال ہی میں ارون کے یہاں بیٹا ہوا ہے۔ نام کرن سنسکار ادر منائن کے لئے میرا انتظار تھا۔ مئی میں مانٹریال کے غالب سمپوزیم سے فارغ ہو کر ٹورنٹو پہنچا تو ختم ہفتہ پر تقریب منعقد ہوئی، بچے کا نام "رشی" رکھا گیا ہے۔ نثار احمد فاروقی نے ایک نقاب "صوفی صافی" ہونے کی بھی اوڑھ رکھی ہے۔ دادا بھائی ہونے کے ناتے ان کا فرض ہے کہ سکھ پوتے کی درازی عمر اور اقبال کے لئے دعا فرمائیں۔

۷۔ جب کوئی ذاتیات کی سطح پر اتر آئے تو ظاہر ہے کہ علمی مکالمہ نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے موصوف نے لسانیات، اسلوبیات، ساختیات، جانے کس کس کو واہیات کہہ دیا ہے۔ حضرت مجھے برا بھلا کہئے، علم کو کیوں کوستے ہیں۔ کسی بھی ضابطۂ علم کو گالی وہ دیتا ہے جس نے عقل و ہوش کو بالائے طاق رکھ دیا ہو۔ جواباً یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ کچھ "واہیات" لوگ "واہیات" کام کرتے رہیں گے، آپ کیوں "زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا" کی مثال بنتے ہیں۔ اپنی راتوں کی نیند خراب کیجئے، کاش آپ یہ فرما دیتے، بہتو لفظ ساختیات بیچ میں آ گیا۔ [ویسے یہ میری جاگیر بھی نہیں، ہندوستان پاکستان میں تو یہ پندرہ بیس برسوں سے رائج ہے] اب تو میرے آپ کے چاہنے سے بھی کچھ نہیں ہو سکتا، اردو زبان ہی ایسی ہے کہ اس میں ملاکی ملائیت چلتی ہے نہ برہمن کی برہمنیت۔ جس اعتبار سے ان کو ساختیات پر اعتراض ہے، اسی نقطۂ نظر سے ان کو ہندی سماجی سے "سماجیات" یا "ادبی سماجیات" پر بھی اعتراض ہوگا یا مارکس سے "مارکسیت" اور ہندی میں مارکس سے "مارکس وادی" پر بھی اعتراض ہوگا۔ ہونا بھی چاہئے۔ بے شک اگر زبان کا معیار نثار احمد فاروقی جیسوں کو خاطر میں نہ لائے تو قصور زبان کا ہے۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ زبان بے حد بڑی سر پھری چیز!

۸۔ انہوں نے لفظ "تجینت" پر بھی پھبتی کسی ہے۔ مسئلہ دو مختلف الاصل لسانی عناصر یا الفاظ کے ملاپ کا ہے۔ لفظ "تجینت" کے ثبوت کے لئے ملاحظہ کریں "افادات سلیم" از وحید الدین سلیم مرتبہ "حیدر میر کی زبان" طبع حیدرآباد صفحہ ۸ سطر ۱۸۔ اور اگر ان

پر بھی اطمینان نہ ہو تو مولانا وحید الدین سلیم کی روح سے استفسار فرمائیے بلکہ اگر وہ غلط ہیں اور بے شک کسی کا کہا ہوا وحی یا الہام نہیں ہے تو آپ کا کہا ہوا بھی وحی یا الہام کیوں کر سمجھا جائے۔ یہ امر بیان کر نثار احمد فاروقی جیسے دس بارہ بھی پیدا ہوں تو بھی وحید الدین سلیم کے رتبے کو نہیں پہنچ سکتے۔ کیونکہ اپنے زمانے میں انہوں نے تن تنہا زبان کے کتنے مسائل کی ایک پورے دور سے ٹکر لی۔ لیکن کتنے ملا تو ہر عہد میں پیدا ہوتے رہیں گے۔ سودا کے مشہور قصیدے "اٹھ گیا بہمن دے کا چمنستان سے عمل" کا یہ شعر بھی نثار صاحب نے نہ دیکھا ہوگا۔

"بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی
پرستش چمن تہ عمل کارِ پر رشتۂ ریمل"

یقیناً نثار احمد فاروقی نے "جبر و کرد درشن" اور "کیہ مرتبہ" کبھی نہ سنا ہوگا جنہیں جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے۔ مزید مثالیں "عربی لفظوں کا ملاپ ہندی لفظوں کے ساتھ" "فارسی لفظوں کا ملاپ ہندی لفظوں کے ساتھ" نیز "عربی کا فارسی کے ساتھ" یا "اسما ترکی کا ترکی کے ساتھ" دیکھنا چاہیں تو ملاحظہ فرمائیں، وحید الدین سلیم کی معرکۃ الآرا کتاب "وضع اصطلاحات" طبع اول صفحہ ۲۲۱ اور ۲۲۲ جس میں درجنوں مثالیں دی گئی ہیں جنہیں کہاں تک نقل کیا جائے۔ غلطی سے کوئی بشر بالاتر نہیں لیکن حیات اور دے لسانیات بھی ہے وہ تو سب ہے اور اگر کسی کتنے ملا کی خوشی کے لئے میں کسی بات کو مان بھی لوں تو میرے ماننے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے۔ "زمین تو پھر بھی اپنے مدار پہ گھومتی رہے گی"۔ علمیت برحق لیکن اگر انداز نظر اور سب غلط ہے تو دیوانی قرار دے ہی جائے گی۔

۹۔ قطع نظر دوسری فروعی باتوں کے موصوف نے مشورہ دیا ہے "ایاز قدر خود بشناس، ایاز تو روز اول سے قدر خود جانتا ہے، بھلا جو زبان نہ ہو، جس کی مادری زبان سرائیکی ہو، وہ بھلا اپنی اوقات کیسے بھول سکتا ہے۔ یہ کم سواد تو بے شک ابھی تک دیوار دبستاں پر الف لکھتا ہے لیکن الحمد للہ تجربہ کر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہوں گے جو بطن مادر سے علم کی دولت سے مالا مال ہو کر آتے ہوں گے۔ [نثار صاحب کا حافظہ بھی شاید اب ان کی علمیت کی طرح بڑھ رہی چال چلتا ہے ورنہ انہیں خوب یاد ہوتا کہ ۱۹۵۲ میں خاکسار کروڑی مل کالج میں ایم اے میں تھا، موصوف البتہ ادیب، ادیب ماہر کے چکر میں تھے اور لوگوں سے منشی فاضل کا راستہ پوچھا کرتے تھے] اب وہ بفضلہ "ماہر" بھی ہیں اور کامل بھی، کم از کم "سند اور خطاب" کے بعد تو ان کی علمیت کا قائل ہو جانا چاہئے۔ اگرچہ اس میں بھی کسی اصلی جدید دار کی کریم النفسی کا احترام لوگوں کو اس کا خوب اندازہ ہے۔ میں بھلا کس شمار قطار میں ہوں۔ البتہ علم کی جو طلب روز اول تھی وہ آج بھی ہے۔ نثار احمد فاروقی کچھ کرم فرما حضرات ہیں کو بڑھاتے رہتے ہیں یہ ان کا کرم ہے۔ تفصیل کے لیے تو دفتر درکار ہے۔ بلا مبالغہ نثار صاحب کے سیکڑوں خطوط مشاہیر کے خطوط کے ساتھ میرے پاس محفوظ ہوں گے۔ ان میں علم کی سعی و جستجو اور محنت و ریاضت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، ان کے ایک خط کی عبارت کو بغیر کسی تبصرے کے نقل کرتا ہوں۔ یہ خط تیس بتیس برس پہلے کا ہے] اور ان کے الفاظ نامے کا یہ انداز ابھی چند برس پہلے تک قائم رہا ہے] "نثار احمد فاروقی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح کا خاکہ اڑانے میں جواب نہیں رکھتے، جملوں کا آہنگ

مخطابِ یونیورسٹی لائبریری.

دسمبر ۱۹۵۰ء

رفیق و صدیق گرامی برادر محترم و مکرم۔ آداب و تسلیمات.

آج اگر تمام الفاظ پیکر مادی میں مجسم ہو کر میرے سامنے آجائیں. اگر مجھے عربی کی فصاحت و بلاغت، فارسی کی شیرینی اور قدوبت، اردو کی لطافت و نفاست اور انگریزی کی ہمہ گیری و وسعت پر مالکانہ اقتدار نصیب ہو جائے ۔ انداز بیان کے سارے پیرائے دست بستہ میری چاکری و خدمت کے لئے متعین کر دیئے جائیں، ساکن و جامد الفاظ میں ہیجانی و ہیجانی کلام بھرنے لگیں، تب بھی، ان تمام کو اس مسرت کا اظہار نہیں کر سکتا جو مجھے کل حاصل ہوئی ہے اس بات کی مسرت کہ آپ کو ڈاکٹریٹ کی سند عطا کی گئی۔ آپ نے جس پُر خلوص دل، بے کدورت اور بے لوث جذبہ پایا ہے اسے دیکھتے ہوئے تو یہ سند ایک پرزہ کاغذ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی. شاید مجھ جیسے انسانوں کی نسل کے اخلاق و اعمال، سیرت اور خلوص میں تو علاوہ چاندی کے ٹکڑوں یا کاغذ کے پرزوں تک نہیں تولتا. اور میں اسے آپ کے لئے کوئی قابلِ فخر بات بھی نہیں سمجھتا کہ اب آپ ڈاکٹر بھی ہو گئے ہیں. پھر خوشی صرف اس بات کی ہے کہ آپ نے زندگی میں مقصد کے لیے جو سفر شروع کیا تھا وہ ابھی تک ایک تنہا اور مبہم تھا. امید کی ایک ہلکی سی کرن زندگی کی بھیانک تنہائیوں اور تاریکیوں میں مدعوں پر منزلیں طے کر رہی تھی. آپ نے اپنی شخصیت اور سیرت کے ایوان کی ایک ایک اینٹ اپنے ہاتھوں سے رکھی، اپنی راہ کا ایک ایک کانٹا خود ہی صاف کیا۔ خود ہی اپنی رہبری کی اور خود ہی اپنی منزل کا سراغ لگایا۔ کسی دوسرے کی رہنمائی کا احسان نہ اٹھایا۔ بقول میر

اپنا ہی ہاتھ سر پہ رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں!

سو آج راستے کی تاریکیاں بھاگ گئی ہیں۔ اجالوں کی حکمرانی شروع ہو گئی ہے۔ آج آپ کا سفر کسی موہوم منزل کی طرف نہیں بلکہ واضح مقصد کی طرف شروع کر سکیں گے۔ خدا آپ کا معاون و ناصر ہو آپ کو دل کا اطمینان، ذہن کا سکون، کام کا حوصلہ، صلہ و ستائش سے بے نیازی اور علم و عمل سے استفادہ و افاضہ کی توفیق عطا فرمائے ادب کو آپ کے ذہن کی روشنی سے اور ہمیں آپ کے قلب کی گرمی و گداز سے بہرہ مند کرے۔ میری طرف سے ہزار ہزار مبارکباد۔ اس سعید موقع پر قبول فرمائیے۔ اور یقین کیجئے کہ اس نیاز مند کے دل سے جو وقت آپ کیلئے دعا نکلتی ہے۔ آپ نے اور تمام دن سب مجھ سے ملے خیر۔ نثار احمد فاروقی

کہاں الطاف و اکرام اور مہر و اخلاص کا یہ اظہار بے پایاں اور کہاں وہ سب دشنام اور طعن و تشنیع جو انہوں نے "شاعر" کے مراسلے میں ارزانی رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان بہکانے والوں اور سازشیوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتا ہے یا حسد یا بغض و غضب کی آگ کا شکار ہوتا ہے، اور انسانیت کی سطح سے گر جاتا ہے تو کس طرح اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور اسفل السافلین تک جا پہنچتا ہے۔ بی جمالو قسم کے لوگ البتہ اس آگ سے ہاتھ تاپتے ہیں۔ ایسے تماشائیوں کو تماشا دیکھنا چاہیں تو شوق سے دیکھیں۔ میرا حال تو یہ ہے کہ باری تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ اس نے ہمیشہ اپنی بخشش سے نوازا ہے اور ہر طرح کے صلہ و ستائش اور داد و تحسین سے بے نیاز رکھا ہے۔ معاذ اللہ کو اگر شروع ہی سے اپنی بے مائیگی اور کم سوادی کا احساس نہ ہوتا تو نثار احمد فاروقی جیسوں کی تعریف و تحسین سے ان تیس برسوں میں دماغ خراب نہ ہو گیا ہوتا۔ خدا کا شکر ہے کہ بے لوث محبت کرنے والوں اور کلمۂ حق کہنے والوں کی آج بھی کمی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حاسدوں کی سازشوں اور فتنہ پردازیوں کے باوجود کام میں حرج نہیں ہونے پاتا اس بات کا بھی شکر ہے کہ اس نے محسود بنایا ہے کسی کا حاسد نہیں۔ فارسی گو نے کہا ہے "آواز سگاں کم نکند رزقِ گدا را" مخالفین کو آوازِ سگاں سے تعبیر تو نہیں کرتا تاہم یہ حقیقت ہے کہ وہ رزاق کسی گدائے صادق کی جھولی کو علم کی موتیوں سے خالی نہیں رکھتا بہرحال حسد کرنے والے اپنے کام سے لگے ہیں۔ ہم سے جو بن پڑے گا ہم اپنا کام کرتے رہیں گے۔ آخر میں یہی عرض کرنا ہے کہ اگر راقم الحروف کی کسی بات سے دانستہ یا نادانستہ کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ اور نثار احمد فاروقی کی افسوس ناک حرکت سے جو تکلیف پہنچی ہے، باری تعالیٰ اس کے لئے انہیں معاف فرمائے نیز یہ بھی کہ اگر آئندہ پھر اس طرح کی کوئی کوشش کی گئی تو اس پر تقصیر کو مزید کسی فضول بحث میں پڑنے سے بہرحال معذور سمجھا جائے اور کسی جواب کے لئے ہرگز پابند نہ سمجھا جائے۔

ڈی۔ ۲۵۲، سرور دے انکلیو، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷۔

بقیہ صفحہ ۱۸ — اَن کہی

اور دوسری کرشن بھگوان کی۔ وہ پوری کھا دیکھی۔

ایسی اوٹ پٹانگ باتوں یا فرمائشوں پر دادی ماں کا پارہ مکمل کھلا کرتی تھی پڑھتا مگر آج اس نے بھی کچھ نہیں کہا۔ اور کار حرکت میں آگئی۔

کار چل پڑی تو گھر کی نوکرانی نے اپنی بھیگی آنکھیں صاف کر کے مجھے بتایا [illegible] پر اصرار تھا کہ رو کر بیٹا کا آپریشن کامیاب رہے۔ سنا ہے خطرناک بیماری ہے آپریشن [illegible] الفاظ سنتے ہی دادی ماں پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں گھبرا [illegible] جانے کیا ہونے والا ہے۔ مگر جب بوڑھیا کانپنے لگی پیچھے [illegible] کرتی ہوتی دھڑام سے سڑک پر گر گئی تب میں نے پوچھا [illegible] دادی ماں؟ وہ آہستہ سے پوچھنے لگی۔ کیا ہوا ہے میری بچی کو۔ میں اس کی بلائیں لوں گی۔ کیا ہوا میری پوتی کو میری راجکماری کو۔ وہ رو پڑی۔ اور پھر اس کی زبان پر مہرِ خاموشی لگ گئی۔ گذشتہ رات جب میں دادی ماں کے کمرہ میں چلا گیا۔ تو اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں آنسوؤں میں دب کر یوں نظر آرہی تھیں جیسے ایک گہرے تالاب میں کسی ڈوبے ہوئے ننھا سا چہرے کو دیکھ رہی ہوں۔ اس کے ہونٹ ہل تو رہے تھے مگر آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ گھبرا کر جب میں نے اس کے پوتے کو آواز دی تو وہ اپنی دادی کو دیکھ کر چیخ پڑا۔ کیا ہو گیا میری دادی کو۔ دادی کچھ بول کیوں نہیں رہی ہیں۔ انکل! دادی ماں کے ہاتھ پاؤں اتنے ٹھنڈے کیوں ہیں۔ اور پھر وہ ڈاکٹر کو بلانے کی خاطر تیر کی طرح دروازے سے نکل پڑا۔ وہ رو رہا تھا۔

یوں آدھی رات گذر گئی ہے۔ اور جب بھی میں دادی ماں کے پوتے کو تسلیاں دے کر دادی ماں کے چہرے سے چادر ہٹا دیتا ہوں تو اس کے پیکر کے ہونٹ دیکھ کر یوں لگتا ہے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ بہت کچھ کہا لیکن وہ کبھی نہ کہہ پائی جو در اصل کہنا چاہتی تھی۔ کسی سے بھی نہیں، تم سے بھی نہیں۔ ❋

بقیہ صفحہ ۳۶ — دیواروں کے بیچ

بچے کی غلطی انہیں پریشان کرتی ہے۔ اس غیر تہذیبی عمل کا سارا قصور مہمان کا ہوتا ہے۔ اس قصور کی سزا اسے یوں دی جاتی ہے کہ اندر سے آتا ہوا کھانا واپس کر دیا جاتا ہے ان کی آواز کا مدوجزر آپ ہی آپ بڑھ جاتا ہے۔ اور مہمان کا ایسے ماحول میں زیادہ بیٹھنا محال ہو جاتا ہے وہ اپنی آبرو کی خاطر زیادہ بے آبرو ہونے کے ڈر سے واپس لوٹ آتا ہے کہ کیوں آئے تھے اور کیا کر چلے۔ [باقی آئندہ]

Price: Rs.5

THE 'SHAIR" (MONTHLY) BOMBAY-400 008.

61 Years of Publication * *(Publishing Date: 27-28)* * Issue No 5-12 1990 * Telephone No 359904

Registered with the Registrar of Newspapers at R N No. 14482/57

مٹی ہوائے کرا اڑی گھومی پھری واپس مڑی   قبروں پہ کتبوں کی طرح لکھی ہوئی ہے زندگی

پڑوس کی مسجد کے اونچے مینار سے فجر کی اذان کی کرن پھوٹتی ہے۔ اللہ اکبر: خاموشیوں کے دھندلکوں میں صبح کی پہلی آہٹیں جگمگاتی ہیں۔ تانگوں میں جتے گھوڑوں کی گردنوں میں بندھی گھنٹیاں، دور سڑک سے قریب آتے آتے کھنکتی ہوئی سرگوشیاں بن جاتی ہیں۔ فطرت کسی انجانی زبان میں روز کی طرح آج بھی کچھ دہرا رہی ہے۔ شہر کے ایک خاموش علاقے سے اندھیرے کی چادر اٹھتی ہے۔ کھلے دالان کے سامنے، پرانی لکڑی کا دروازہ آدھا کھلا اور آدھا بند ہے۔ عشاء کی اذان کے ساتھ یہ دروازہ بند ہو جاتا ہے، اور صبح مسلمان پرندوں کی کلمہ گوئی کے ساتھ کھلتا ہے۔........ ہر روز کی طرح دودھ والا موہن راوجا کا سنسار گنگناتا ہوا سائکل پر آتا ہے۔ اور اس دروازہ کے پاس رکھے ہوئے چینی کے ایک خالی پیالے میں اپنے پیتل کے برتن سے دودھ نکال کر ڈالتا ہے اور دروازہ کی پیتل کی کنڈی بجاتا ہے۔ کنڈی کی آواز سن کر آج اندر سے کوئی آواز نہیں آتی۔ دودھ کی خوشبو پاتے ہی ایک بلی باہر آتی ہے۔ آدھی کالی آدھی سفید بیچ دروازہ میں کھڑی ہو کر انگڑائی لیتی ہے۔ اور دودھ والے کو گھورتی ہوئی، برتن میں منہ ڈال دیتی ہے۔ یہ بلی جس کا یہاں کا نام 'ریشم' ہے، پچھلے کئی مہینوں سے یہیں رہتی ہے۔ پیدائش کے دو تین دن بعد ہی اس کے دوسرے بہن بھائی محلے کے الگ الگ گھروں میں تقسیم ہو کر بچوں کا کھلونا بن جاتے ہیں۔ ان سب کے نام مکانوں کے مذہب کے لحاظ سے ہندو مسلم اور سکھ ہو جاتے ہیں۔ مگر ریشم اپنی ماں کا ساتھ نہیں چھوڑتی ایک دن سڑک پار کرتے ہوئے اس کی ماں ایک تانگے کے پہیے میں ایسی آتی ہے کہ وہ وہیں ڈھیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ بے چاری دن بھر ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی اسی کے دروازہ کے سامنے پیٹ میں منہ ڈال کر بیٹھ جاتی ہے۔ صاحب خانہ کو اس پر دیا آجاتی ہے۔ ایک تنہائی دوسری تنہائی کا سہارا بن جاتی ہے۔ روز کی طرح آج بھی اس کے لئے دودھ آتا ہے۔ لیکن سہارا اس گھر کا آخری دودھ ہوتا ہے۔ مکین کے جاتے ہی مالک مکان پانی کی کئی بالٹیوں سے کمرہ کو موت کے اثرات سے پاک کر لیتا ہے۔ کمرہ میں تالا ڈال کر مکان کرائے کے لئے خالی ہے۔ کی پرانی تختی پھر لٹکا دی جاتی ہے۔ کل تک اس کی مکین زیبن تھی۔ محلے کا بنیا اور بنارسی پان والا اپنے کھاتوں میں زیبن (زیب النساء) کے نام پر سرخ لکیر پھیر چکے ہیں لیکن ریشم کے ذہن میں وہ شاید کھوڑا سا دودھ کے روپ میں ابھی تک زندہ ہے۔ وہ دودھ کی امید میں ادھر آتی ہے۔ اور جب مقررہ وقت پر دودھ کا برتن اپنی جگہ پر نہیں پاتی تو بند دروازہ میں لگی پیتل کی نوکیلی کنڈیوں میں پنجے چلا کر خود کو زخمی کر لیتی ہے۔ آس پڑوس کا خیال ہے کہ وہ مرحومہ کی محبت میں ایسا کرتی ہے۔ زیبن کے رخصت ہوتے ہی، ریشم کے علاوہ، اس کے دیگر اسباب کو کئی ٹھکانے مل جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد اس کے کئی وارث نمودار ہوتے ہیں۔ چھوٹی بہن اس کا لڑکا آصف، ستار کے بڑے لڑکے کی بہو اور نہ جانے کون کون۔ مردہ کی زندہ ملکیت نے زندوں سے رشتہ جوڑ لیا ہے۔ دوسرے گھر کی رہائش نے ریشم کی پرانی عادت کو بھی دھندلا دیا ہے۔... !! زیبن کو اسی کے ماں باپ کی قبروں کے پہلو میں دفن کیا گیا ہے۔ زیبن کی ایک غزل کا مقطع ہے۔

داستاں کی داستاں تصویر کی تصویر ہے   ہے ادائے عرض مطلب پیکر خاموش میں

زیب النساء تصویر نے خود شاعری کم کی ہے۔ اپنے شاعرانہ رکھ رکھاؤ سے شاعروں کو زیادہ متاثر کیا ہے۔ ان متاثرین میں دعا ڈبائیوی کا نام بھی ہے ٧ ٣ ١٩ میں چھپے ان کے پہلے مجموعہ کا نام انہی کے تخلص کی رعایت سے تصویر دعا ہے۔ اس کے پہلے ورق پر ایک انتسابی مطلع درج ہے۔

اس میں روداد محبت اے دعا تحریر ہے   یہ مرا دیوان میرے حال کی تصویر ہے

دعا کی یہ روداد محبت ان کے پاکستان جانے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اب وہ نئے ماحول میں رچ بس کر ماضی کو بھول چکے ہیں۔ ہندوستان کی شیروانیاں اور رواں اور جارجیٹ کے کرتے اب پٹھانی شلوار قمیص میں بدل کر اسلامی ہو جاتے ہیں۔ وہ پانچوں وقت ایک سو ایک دانوں کی تسبیح پر خدا اور رسول کے ناموں کو دہراتے ہیں۔ اور اپنے بیوی بچوں کی خوش حالیوں کے لئے دعا فرماتے ہیں۔ لیکن زیبن کے پاس اپنی تنہائی کو بہلانے کے لئے ماضی کی یادوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا وہ آخری وقت تک انہیں سے چمٹی رہتی ہے۔ مرنے سے ایک دن پہلے وہ منذاکرے کے سامنے سے گذرتی ہوئی رکتی ہے۔ اور وہی بار بار پوچھے جانے والا سوال پھر سے دہراتی ہے۔

"تمہارے باپ کا کوئی خط آیا۔ وہ کیسے ہیں؟"

"جی ہاں اچھے ہیں" مختصر سے سوال کا مختصر سا رسمی جواب سن کر اللہ کا شکر ہے کہتی ہوئی وہ آگے بڑھتی ہے۔ اور دوسرے دن ماضی و حال کی کشمکش سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتی ہے۔

— قریب کی ہر موت، اور گرد کی بے معنی اشیاء میں کچھ دیر کو نئے معنی پیدا کر دیتی ہے۔ سورج، پرندے، پھول، جانے انجانے چہرے سب زندگی